DECEMBER 2011

کرن

کرن پکوان

انٹرویو

ناول

مکمل ناول

ناولٹ

افسانے

زرِ سالانہ بذریعہ رجسٹری

پاکستان (سالانہ)	600 روپے
ایشیا، افریقہ، یورپ	5000 روپے
امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا	6000 روپے

مستقل سلسلے

دسمبر 2011
جلد 34 شمارہ 9
قیمت 50 روپے

خط و کتابت کا پتہ
کرن
37- اردو بازار کراچی

خط و کتابت کا پتہ: ماہنامہ کرن، 37- اردو بازار، کراچی۔

پبلشر آزر ریاض نے ابنِ حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام: بی 91، بلاک W، نارتھ ناظم آباد، کراچی

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 92-21-32766872
Email: khawateendigest@hotmail.com , info@khawateendigest.com

منیرہ

اداریہ

دسمبر کا شمارہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔
عیسوی سال کا اختتام ہے اور اسلامی سال کے پہلے مہینے محرم الحرام کا آغاز ہو چکا ہے۔
حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ سال بارہ ماہ کا ہوتا ہے جن میں چار حرمت والے مہینے ہیں۔ تین تو مسلسل ہیں۔ یعنی ذیقعد، ذی الحج اور محرم اور چوتھا ماہ رجب جو جمادی الثانی اور شعبان کے درمیان ہے۔ محرم الحرام یعنی حرمت اور بزرگی والا مہینہ۔ اسی ماہ میں شہادت کا وہ عظیم واقعہ پیش آیا۔ جس کی مثال تاریخ میں نہیں ملتی۔ صرف بہتر رفقا کے ساتھ ہزاروں کے لشکر کا بھوک و پیاس کی حالت میں مقابلہ کر کے امام عالی مقام نے ظلم کے سامنے سینہ سپر ہوتے اور حق کی آواز بلند کرنے کی جو نظیر قائم کی وہ آج بھی دنیا بھر کے مظلوموں کے لیے ایک مثال ہے۔ امام عالی مقام انسانیت کے علمبردار ہیں۔

قتلِ حسینؓ اصل میں مرگِ یزید ہے
اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

حضرت امام حسینؓ نے اپنے اقدام کے ذریعے حق کا وہ معیار قائم کیا جو رہتی دنیا تک مینارۂ نور کی مانند نسل انسانی کی ہدایت کا فریضہ سرانجام دیتا رہے گا۔

اس شمارے میں،

- اداکار "نیر اعجاز" سے شاہین رشید کی ملاقات،
- اداکار "فواد خان"، دو کے پہاڑے کے ساتھ،
- "مجھ سے ملیے"، نادیہ امین کی باتیں،
- "آواز کی دنیا سے" ایف ایم کے آر جے "محسن عباس حیدر" کی باتیں،
- رائٹر "فصیح باری خان"، قارئین کی عدالت میں،
- نبیلہ عزیز اور فوزیہ یاسمین کے ناول،
- "او رے پیا"، نایاب جیلانی کا طویل مکمل ناول،
- "مقیدِ خاک"، ضو باریہ ساحر کا طویل دلچسپ ناول،
- "آتشِ درد دل"، سفینہ یاسمین کے ناولٹ کی تیسری اور آخری قسط،
- "آماج"، "روداد قفس کے لیے" روشنی بخاری کی ایک دلچسپ تحریر،
- نازیہ جمال، ملیحہ رفیق اور سنبل کے ناولٹ،
- صائمہ نورین، صباحت یاسمین اور شازیہ جمال نیر کے افسانے اور مستقل سلسلے،

مفت،

کرن کتاب "کرن پکوان"، ہر شمارے کے ساتھ مفت پیشِ خدمت ہے۔ استفادہ کریں۔

حمد باری تعالیٰ

میں نے تری آنکھوں میں پڑھا اللہ ہی اللہ
سب بھول گیا یاد رہا اللہ ہی اللہ

پھولوں میں بسی چاندنی راتوں کی نمازیں
خوشبو ہی ستاروں کی دعا اللہ ہی اللہ

پیڑوں کی صفیں پاک فرشتوں کی قطاریں
خاموش پہاڑوں کی ندا اللہ ہی اللہ

بادل کی عبادت ہے برستا ہوا پانی
آنسو کی غزل حمد و ثنا اللہ ہی اللہ

بشیر بدر

نعت رسول مقبول ﷺ

تو جو اللہ کا محبوب ہوا خوب ہوا
یا نبیؐ خوب ہوا خوب ہوا خوب ہوا

شبِ معراج یہ کہتے تھے فرشتے باہم
سخنِ طالب و مطلوب ہوا، خوب ہوا

اے شہنشاہِ رُسل، فخرِ رُسل، ختمِ رُسل
خوب سے خوب خوش اسلوب ہوا خوب ہوا

فخرِ آدم کو نہ ہوتا جو فرشتہ ہوا
بنی آدم سے جو منسوب ہوا خوب ہوا

داغ ہے روزِ قیامت مری شرم اس کے ساتھ
میں گنا ہوں سے جو مجوب ہوا خوب ہوا

داغ دہلوی

نیّر اعجاز سے ملاقات

شاہین رشید

کچھ شخصیات ایسی ہوتی ہیں جو اگر فن کی دنیا میں آجائیں تو ان پر یا تو نیگیٹو رول اچھے لگتے ہیں یا پھر کریکٹر ایکٹر نیر اعجاز نے ان دونوں کرداروں میں اپنی پہچان کرائی ویسے تو انہیں بہت زیادہ شہرت ایک ڈرامہ سیریل میں "خواجہ سرا" کا کردار ادا کرنے پر ملی اور ان کی پرفارمنس کو ہی پھر بہت سارے فنکاروں نے فالو کیا۔ نیر اعجاز کافی زمانے سے اس فیلڈ میں ہیں اور بے شمار کردار کرچکے ہیں۔ انہیں اگر ورسٹائل فنکار کہا جائے تو غلط نہ ہو گا۔ ان سے کچھ گفتگو ہوئی جو قارئین کی نذر ہے۔

★ "کیسے ہیں نیر اعجاز صاحب اور کیا ہو رہا ہے آج کل؟"

* "اللہ کا شکر ہے کچھ ڈرامے آن ائیر ہیں کچھ انڈر پروڈکشن ہیں ان میں کچھ ٹیلی فلمز اور سیریل ڈرامے ہیں۔ سوپ ہیں، تین فلمیں ہیں۔ بس اللہ کا کرم ہے کہ اس نے کام سے لگایا ہوا ہے اور عزت کی روٹی مل رہی ہے۔"

★ "آپ کی آواز بہت رعب دار ہے۔ کیا وائس اوور بھی کرتے ہیں؟"

* "نہیں جی وائس اوور کبھی نہیں کی اور اس کی وجہ یہ ہے کہ میں تو بندہ ہوں ایکسپریشن کا تو وائس اوور میں آواز ایک جگہ رک جاتی ہے۔ اس لیے میں وائس اوور نہیں کرتا۔"

★ "آپ کافی عرصے سے اس فیلڈ میں ہیں۔ کچھ

ابتدائی دور کے بارے میں بتائیے؟"

* "میں کوئٹہ میں پیدا ہوا۔ 11 ستمبر 1964ء میری تاریخ پیدائش ہے اور ابتدائی تعلیم یعنی پانچویں جماعت تک میں نے کوئٹہ سے تعلیم حاصل کی اس کے بعد میں لاہور میں اپنے بھائی کے پاس شفٹ ہو گیا اور میٹرک تک تعلیم لاہور سے ہی حاصل کی۔ میرے والد محمد شریف لاہور سے کوئٹہ ریڈیو پہ ٹرانسفر ہوئے تھے اور وہ ریڈیو پہ میوزک کے پروڈیوسر تھے اور میں آپ کو یہ بھی بتادوں کہ میرا نام اعجاز حسین تھا لیکن میرا نام میرے بڑے بھائی سلامت علی نے نیر اعجاز رکھ دیا انہوں نے کہا کہ اب تمہارا نام نیر اعجاز ہو گا میں نے بھی کہا ٹھیک ہے۔"

★ "بچپن میں انسان کے بہت سے خواب ہوتے ہیں۔ جو شخصیت اچھی لگ رہی ہوتی ہے اسی کی طرح بننے کی خواہش کرتا ہے۔ آپ کے کیا کیا خواب تھے؟"

* "بچپن میں تو انسان کو پتا ہی نہیں ہوتا کہ اس نے کیا بننا ہے۔ کبھی میرا دل چاہتا تھا کہ میں فوجی بن جاؤں کبھی دل چاہتا تھا کہ کرکٹر بن جاؤں۔ ویسے میں کرکٹ بہت اچھی کھیل لیتا تھا۔ سو طرح کی خواہشات تھیں۔ لیکن انسان وہی کچھ بنتا ہے جو اس کے نصیب میں لکھا ہوتا ہے۔"

★ "قسمت انسان کو وہیں لے جاتی ہے جہاں اس کا دانہ پانی لکھا ہوا ہوتا ہے۔ تو قدرت آپ کو اس فیلڈ کی طرف کیسے لے کر آگئی؟"

* "اس طرح کہ جب میں کوئٹہ گیا تو ان دنوں میری چھٹیاں تھیں اور "قنبر علی شاہ" لاہور ٹی وی سے ٹرانسفر ہو کر کوئٹہ آئے ہوئے تھے۔ تو ایک دن میں کوئٹہ میں ایک دوکان سے کچھ خریدنے گیا تو دکاندار سے بات کر رہا تھا تو وہاں قنبر علی شاہ بھی کھڑے تھے انہوں نے مجھے بات کرتے دیکھا تو کہنے لگے کہ آپ کی آواز بہت خوب صورت ہے آپ ڈراموں میں کام کریں گے۔ میں نے کہا کہ جی مجھے تو پتا ہی نہیں کہ ڈرامہ کیا ہوتا ہے۔ تو کہنے لگے کہ آپ اس کی فکر نہ کریں وہ ہمارا کام ہے اور بس۔"

★ "پھر کون سا ڈرامہ کیا؟"

* "پہلا ڈرامہ ہی میرے لیے تو یادگار ثابت ہوا۔ میرا پہلا ڈرامہ نجمہ محبوب صاحبہ کے ساتھ تھا۔ میرا پہلا ڈرامہ تھا اور ان کا آخری۔۔۔۔ اسی ڈرامے میں وہ ریلوے کے حادثے میں وفات پا گئیں اور ڈرامے کا نام تھا "زندگی کس کے نام" پہلا ڈرامہ چلا تو مزید آفرز آنا شروع ہو گئیں اور میں ساتھ ساتھ پڑھتا بھی رہا اور کام بھی کرتا رہا۔ اس دوران پی سی ایس آئی آر میں جاب بھی کی اور یہ کام چل ہی رہے تھے کہ مجھے لاہور سے فلم میں کام کرنے کی پیش کش ہوئی اور فلم کی وجہ سے میں لاہور شفٹ ہو گیا اور سلسلہ چل پڑا۔"

★ "کبھی ایسا سوچا کہ اس فیلڈ میں نہ ہوتا کچھ اور کر رہا ہوتا؟"

* "نہیں ایسا کبھی نہیں سوچا اور ایسا انسان اسی وقت سوچتا ہے کہ جب آمدنی کم ہو، کام کم ہو اور اخراجات زیادہ ہوں۔ لاہور آیا تو اللہ تعالیٰ نے کام میں کمی ہونے ہی نہیں دی تو اس لیے کسی اور جانب جانے کا سوچا ہی نہیں۔"

★ "اب تو چینلز کی وجہ سے کام اور بھی بڑھ گیا ہو گا، ایک شہر سے دوسرے شہر بھی آنا جانا لگا رہتا ہو گا؟"

* "جی بالکل۔۔۔۔ چینلز کی وجہ سے کام کافی بڑھ گیا ہے میں رہتا لاہور میں ہی ہوں لیکن کام کی وجہ سے کراچی آنا جانا لگا رہتا ہے نا صرف کراچی بلکہ پورے پاکستان میں آنا جانا لگا رہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اسی طرح اپنا کرم رکھے تو مزے ہی مزے ہیں۔"

★ "آپ کے والد میوزک پروڈیوسر تھے۔ آپ کے بڑے بھائی بھی ماشاء اللہ بہت اچھے گلوکار ہیں۔ تو آپ کا اس طرف دھیان نہیں گیا؟"

* "بات یہ ہے کہ جب کوئی چھوٹا ہوتا ہے تو بڑوں کا سارا غصہ اسی پہ نکل رہا ہوتا ہے۔ تو بس میرا اس

طرف رجحان ہی نہیں تھا۔ میں تو اپنے آپ میں رہنے والا ایک بچہ تھا جو اپنی کسی بات کو ایکسپریس نہیں کر سکتا تھا۔ اگر کوئی کہتا تھا کہ "یہ نہیں کرنا" تو میں وہ نہیں کرتا تھا۔"

★ "اب تو بڑا نام ہے آپ کا اپنی زندگی سے مطمئن ہیں؟"

✳ "جی اللہ نے بڑا کرم کیا ہوا ہے۔ زندگی اچھی گزر رہی ہے۔ میرے والد صاحب کا انتقال ہو چکا ہے۔ والدہ حیات ہیں اللہ انہیں لمبی زندگی دے وہ میرے ساتھ ہی رہتی ہیں۔"

★ "مادری زبان آپ کی کیا ہے اور آپ کے بہن بھائی؟"

✳ "مادری زبان ہماری پنجابی ہے اور ہم گیارہ بہن بھائی تھے۔ آٹھ بھائی اور چار بہنیں دو بھائی اور ایک بہن کا انتقال ہو گیا ہے اور باقی ماشاء اللہ سب حیات ہیں اور نانا دادا بن چکے ہیں اور چونکہ میرا نمبر سیکنڈ لاسٹ ہے اس لیے میں ابھی نانا دادا کے رتبے پہ نہیں پہنچا۔"

★ "بہن بھائی سب ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں..... آپ مزاجاً کیسے تھے؟"

✳ "میں بہت زیادہ خاموش طبیعت کا مالک تھا اور شرارت تو میرے قریب سے بھی نہیں گزری تھی۔ ایک نارمل سا بہت زیادہ سوچنے والا اور بہت لیے دیے رہنے والا انسان تھا کہ کس سے ملنا ہے۔ کس سے بات کرنی ہے کس کے ساتھ کیسا رویہ رکھنا ہے۔"

★ "انسان کی شخصیت پر گھر کا ماحول اثر انداز ہوتا ہے یا سب کچھ قدرت عطا کرتی ہے؟"

✳ "میرے خیال میں انسان کی شخصیت پر اس کے گھر کا ماحول زیادہ اثر انداز ہوتا ہے اور کچھ قدرتی بھی ہوتا ہے..... میں اپنے بڑے بھائیوں کو دیکھتا تھا ان کا زیادہ فوکس اپنی پڑھائی پہ ہوتا تھا اور مجھے سمجھ میں ہی نہیں آتا تھا کہ مجھے کرنا کیا ہے۔ تو بس اپنے میں مگن رہتا تھا بس پھر ایک دن عقل میں یہ بات آئی کہ دنیا میں بولنا بھی بہت ضروری ہے اور سوشل ہونا بھی بہت ضروری ہے..... اور لوگوں سے میل ملاپ رکھنا بھی بہت ضروری ہے، جھوٹ بولنا بھی بہت ضروری ہے۔ بناوٹ کرنا بھی ضروری ہے..... اور میں نے سب چیزوں کو اپنے اندر گرائنڈ کر لیا ہے اس طرح جو آپ کی اپنی قدرتی خوبیاں ہوتی ہیں وہ ڈسٹرب نہیں ہوتیں جو آپ کا خالص پن ہے اس کو برقرار رہنا چاہیے۔"

★ "بچپن سے آج تک فضول خرچ رہے یا شاہانہ خرچ کیا؟"

✳ "بچپن میں مجھے دو آنے خرچ ملا کرتا تھا اور دو آنے میں اتنا کچھ آجاتا تھا کہ اس سے زیادہ کی طلب بھی نہیں ہوتی تھی اور مزے کی بات یہ کہ دو آنے میں سے بھی کچھ نہ کچھ بچ بھی جایا کرتا تھا میں فضول خرچ نہیں تھا بلکہ کفایت شعار تھا۔ مڈل کلاس والوں کو تو کچھ حاصل کرنے کے لیے اور اپنے خوابوں کی تعبیر پانے کے لیے کفایت شعار ہونا پڑتا ہے تب ہی تو وہ اپنی خواہشات کو پورا کر سکتے ہیں۔"

★ "بہن بھائی زیادہ ہوں تو والدین انصاف نہیں کر پاتے یا پھر کسی سے بہت پیار، کسی کو بہت ڈانٹ..... ایسا تھا؟"

✳ "والدین نے ہم سب کی پرورش بہت ہی انصاف کے ساتھ کی اصل میں بات یہ ہے کہ میرے والد اپنے والدین کی پہلی اولاد تھے۔ یہ دو بھائی تھے اور پانچ بہنیں تو جب میرے ابو کی شادی ہوئی تو ان کا خیال تھا کہ بچے زیادہ ہونے چاہئیں اور نسل بڑھنی چاہیے.....

جب میں کافی چھوٹا تھا تو بڑے بہن بھائیوں کی شادیاں ہو گئیں پھر بھانجے بھتیجے بھی ہو گئے اور ابو خوش ہوتے تھے سب کو دیکھ کر ان کو بچے اور بڑی فیملی بہت اچھی لگتی تھی اور ہمارے ماں باپ نے ہم سب بہن بھائیوں میں اتنی محبت ڈالی ہوئی تھی کہ لڑائی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا اور آج بھی میں اپنے بڑے بھائیوں کے سامنے اونچی آواز میں بات نہیں کر سکتا۔ اس طرح بہنوں اور بھائیوں کی اولادیں ہمارے سامنے اونچی آواز میں بات نہیں کرتے۔ ہمارا بہت احترام کرتے ہیں۔"

★ "آج کے دور میں یہ بہت عجیب سی بات لگتی ہے؟"

✳ "ہاں ہے تو..... لیکن ہمارے یہاں ایسا نہیں ہے سب بچے بہت اچھے اور فرماں بردار ہیں۔ آج بھی ہماری ماں ہم بھائیوں کو ہماری بیویوں کے سامنے ڈانٹ دے تو ہم جواب نہیں دیتے۔"

★ "تعلیم کہاں تک حاصل کی اور تعلیم کے دوران کچھ کیا یا ساری توجہ تعلیم کی طرف ہی تھی؟"

✳ "تعلیم کے دوران میں ڈراموں میں کام کرتا تھا اور ابتدائی تعلیمی مدارج طے کرتا ہوا میں ایم اے تک آیا اور پولیٹکل سائنس میں ایم اے کیا مگر پرائیویٹ اور پی سی ایس آئی آر میں گریڈ 16 کی جاب بھی کی..... اور دنیا کا ہر کام میں نے کیا ہے اور اس بات کو گرہ میں باندھا کہ محنت میں عظمت ہے۔"

★ "نوجوانی کے دور میں محنت بھی ہو رہی ہوتی ہے فیوچر کے لیے اور ساتھ ہی ساتھ کچھ اور مشاغل بھی ہوتے ہیں..... کچھ بتائیں گے آپ اس بارے میں؟"

✳ "جی جی..... کچھ اور بھی مشاغل ہوتے ہیں اور میں سمجھ گیا آپ کی بات..... اور میں آپ کو بتاؤں کہ میں تو قدم قدم پہ عشق کرنے کا قائل ہوں..... لمبی اور خوب صورت حسین خواتین مجھے بہت پسند ہیں۔ خواہ وہ عمر کے کسی بھی حصے میں کیوں نہ ہوں۔ جو مجھے اچھی لگتی ہیں میں ان سے برملا اظہار کر دیتا ہوں کہ آپ مجھے اچھی لگتی ہیں اور آپ خوش رہیں آپ بہت خوب صورت ہیں..... ان باتوں کو کہنے سے میں گھبراتا یا شرماتا نہیں ہوں..... اور وہ برا بھی نہیں مانتیں کیونکہ میں بہت عزت اور ادب کے ساتھ کہتا ہوں۔"

★ "ویسے کسی سے عشق و محبت ہوئی؟"

✳ "بچپن میں ایک ہی گھر کی تین بہنوں سے عشق ہوا تھا اور تینوں سے ناکام بھی ہوا۔ پھر کوئی دلچسپی نہیں رہی اور کوئی عشق وشق نہیں کیا۔ بس تعریف کی حد

تک بات رہ گئی تھی اور ابھی بھی تین خوب صورت خواتین مجھے بہت پسند ہیں ان میں ایک "مشمیتا سین' تبو اور فریال گوہر ہیں" حالانکہ میری شادی ہو گئی ہے اور میری بیوی بھی لمبی اور خوب صورت خاتون ہیں اور میرے بیوی کو پتا ہے کہ میرا شوہر عملی طور پر ایک شریف انسان ہے' کرپٹ انسان نہیں ہے۔"

★ "شادی کب ہوئی.... پسند سے ہوئی؟"

✻ "میری شادی کو تقریباً" چھ سال ہو گئے ہیں اور میری ماں بہنوں بلکہ گھر والوں کی پسند سے ہوئی اور مجھے بالکل بھی اپنی بیوی کے بارے میں کچھ پتا نہیں تھا کہ وہ کون ہے اور پہلی رات گھونگھٹ اٹھا کر پہلی مرتبہ اس کی شکل دیکھی۔"

★ "آپ نے ایسا کیوں کیا جبکہ آپ تو بچپن سے حسن پرست رہے اور جب شادی کا موقع آیا تو لڑکی بھی نہ دیکھی؟"

✻ "ہمیشہ سے میری خواہش رہی ہے کہ گھر میں سکون رہے اور میں اپنا اور اپنے گھر کا سکھ چاہتا تھا.... اور پھر میں نے یہ تجزیہ بھی کیا کہ پرانے وقتوں میں اس لیے شادیاں کامیاب ہوتی تھیں کہ لڑکی اور لڑکے نے ایک دوسرے کو دیکھا ہوا نہیں ہوتا تھا اور جب زندگی ایک ساتھ گزارتے تھے تو بھرپور گزارتے تھے تو میں نے یہی سوچا تھا کہ مجھے ایک گھریلو لڑکی چاہیے جس کے ساتھ مجھے زندگی بسر کرنی ہے.... تو الحمد للہ کہ بیگم بہت اچھی ہیں' روبینہ ان کا نام ہے اور کشمیری بٹ فیملی سے ان کا تعلق ہے۔"

★ "آپ مزاج کے کیسے رہے.... تبدیلیاں آئیں یا ایک جیسے رہے؟"

✻ "میں غصے کا تیز ہوں اور کوئی ناجائز بات مجھے برداشت نہیں اور اب تو میں یہ کرتا ہوں کہ ان لوگوں کے ساتھ نہیں بیٹھتا جو مجھے غصہ دلاتے ہیں جھوٹ اور مکاری پہ غصہ آتا ہے اور صبر مجھ میں بہت ہے لیکن جب کوئی بات ناقابل برداشت ہو جاتی ہے تو سامنے والا یا تو میرے ہاتھ سے مار کھائے گا یا پھر کچھ ہو جائے گا اسے.... تو میں اپنے غصے کو بہت کنٹرول کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔"

★ "ملک سے باہر جانے کا بھی اتفاق ہوا اور ایوارڈ ملے آپ کو؟"

✻ "جی بالکل.... اور پاکستان میں ایوارڈ ملنے پر یقین نہیں کرتا کیونکہ اگر یہاں ٹیلنٹ پہ ایوارڈ ملتا تو میرا خیال ہے کہ مجھے دس بارہ ایوارڈز مل چکے ہوتے اور میں نے باہر کی دنیا بہت دیکھی ہے۔ منیلا' بنکاک' تھائی لینڈ' سنگاپور' ترکی' یورپ کے تقریباً" تمام ممالک اور بھی بہت سے ممالک گیا۔ اس لحاظ سے یہ ایک مزے دار فیلڈ ہے۔"

★ "ڈراموں کے لیے بھی گئے۔ کچھ یاد ہے' ڈراموں کی تعداد؟"

✻ "بالکل گیا۔ یو اے ای کی تقریباً" تمام ریاستوں میں گیا.... اور سچ پوچھیں تو ڈراموں کی تعداد بالکل بھی یاد نہیں ہے۔"

★ "آپ نے خواجہ سرا کے رول بھی کیے.... یہ تجربہ کیسا رہا؟"

✻ "خواجہ سرا کے رول دو مرتبہ کیے۔ بس ہٹ زیادہ ہو گیا تو لوگ سمجھتے ہیں کہ شاید میں نے زیادہ کیے ہیں اور آپ یقین کریں کہ جب میں نے یہ رول کیا تو مجھ پر تنقید نہیں ہوئی اور نہ ہی لوگوں نے ناپسندیدگی کا اظہار کیا بلکہ لوگوں نے تعریف بہت زیادہ کی.... پہلے لوگ میرے بارے میں کہتے تھے کہ آپ تو نگیٹو رول زیادہ کرتے ہیں لیکن جب سے میں نے تنویر فاطمہ بی اے میں پوزیٹو رول کیا ہے۔ لوگ میرے ساتھ روتے ہیں اور میرے ساتھ ہی ہنستے ہیں۔"

"واقعی آپ ایک بہت اچھے فنکار ہیں۔"

اور اس کے ساتھ ہی ہم نے نیر اعجاز صاحب سے اجازت چاہی۔

✡ ✡

فواد خان

شاہین رشید

1 "آپ کے دو پسندیدہ نام جن کے لیے آپ سوچتے ہیں کہ کاش یہ میرے ہوتے؟"

☆ "آیان جو کہ میرے بیٹے کا نام ہے اور روفیل جس کا مطلب فیل Feel کرنا ہے۔"

2 "آپ کے دو لکی نمبر؟"

☆ "میں ان چیزوں پر یقین نہیں رکھتا۔"

3 "دو تاریخی ادوار جن میں آپ جانا چاہتے ہیں؟"

☆ "رومن تہذیب (civilization) کا دور اور مصر کی تہذیب کا دور جس میں الیگزینڈریا کھڑا کیا گیا تھا۔"

4 "کن دو افراد کے ایس ایم ایس کے جواب آپ فوراً" دیتے ہیں؟"

☆ "اپنی والدہ اور اپنی بیگم کے ایس ایم ایس کے جواب فوراً" دیتا ہوں۔"

5 "کوئی دو بری عادتیں جن سے آپ چھٹکارا چاہتے ہیں؟"

☆ "سگریٹ اور غصہ ان دونوں سے چھٹکارا چاہتا ہوں۔"

6 "دو جھوٹ جو آپ اکثر بولتے ہیں؟"

(قہقہہ....) "اگر بتا دیے تو پھر پکڑا جاؤں گا اور آئندہ وہ جھوٹ بول نہیں سکوں گا۔"

7 "اپنے بارے میں کن دو باتوں کو سن کر آپ کو غصہ آتا ہے؟"

☆ "کہ اگر کوئی کہے کہ میں اپنے آپ کو بہت اونچی چیز سمجھتا ہوں' جبکہ ایسا نہیں ہے.... اور دوسری بات یہ کہ جو لوگ مجھ سے یہ شکایت کرتے ہیں کہ میں ان سے پیار نہیں کرتا۔"

8 "حالات حاضرہ کے دو اینکر جو آپ کے خیال میں پرچی سے آئے ہیں؟"

☆ "میں حالات حاضرہ کے پروگراموں کو بالکل بھی پسند نہیں کرتا۔ مجھے لگتا ہے کہ عام طور پر ان پروگراموں میں ایسی چیزیں ایسی باتیں کی جاتی ہیں جو mishaps ہوتی ہیں اور ان کے نیگٹو پہلو کو ہی کور کیا جاتا ہے اور نگیٹو پہلو کو دکھا کر پیسہ کمانا.... تو اس چیز سے میں تو پرہیز ہی کرتا ہوں.... کیونکہ پھر ایسے پروگرام مجھے اپ سیٹ کر دیتے ہیں۔"

9 "مارننگ شو کے دو پسندیدہ اینکر؟"

☆ "کاش کہ میں اتنی جلدی اٹھ جاتا کہ مارننگ شوز دیکھ پاتا۔"

10 "دو دوست جن پر آپ بھروسہ کر سکتے ہیں؟"

☆ ”اپنی ماں پر اور اپنی بیگم پر اور اگر آپ تین کا کہتی تو میں اپنی بہن کا ذکر ضرور کرتا۔“

11 ”دو مشہور شخصیات جن کے ساتھ آپ دنیا گھومنا چاہتے ہیں؟“

☆ ”اپنی ماں اور اپنی بیگم کے ساتھ۔“

12 ”دنیا کی دو ایسی شخصیات جن کی قسمت پر آپ کو رشک آتا ہے؟“

☆ ”علی ظفر اور عاطف اسلم ۔ اگر میں بہت زیادہ سوچ کر بولوں تو پھر مجھے تاریخ کی شخصیات کو دیکھنا پڑے گا۔ مگر موجودہ دور کی تو یہی دو شخصیات ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے بہت کامیابیاں دی ہیں۔“

13 ”دو تہوار جو آپ شوق سے مناتے ہیں؟“

☆ ”اپنے بیٹے کا برتھ ڈے کچھ لوگ عید کے دن کو بھی خاص کہتے ہیں اور یہ ٹھیک ہے کہ عید کے دن روٹھے ہوئے آپس میں مل جاتے ہیں اور ایک دوسرے کے گھر جاتے ہیں۔ مگر یہ کوئی پرسنل دن نہیں ہے یہ تو سب ہی مناتے ہیں۔ تو میرے لیے میرے بیٹے کا برتھ ڈے ہی اہم ہے۔“

14 ”دن کے چار پہر میں کون سے دو پہر اچھے لگتے ہیں؟“

☆ ”شام کا پہر اور وہ بھی سردیوں کی شام اور سردیوں کی وہ صبح جب دھند ہوتی ہے۔“

15 ”پہلی ملاقات میں کون سے دو جملے لازمی بولتے ہیں؟“

☆ ”کیا حال ہیں آپ کے اور زندگی رہی تو پھر ملاقات ہوگی۔“

16 ”دو کھانے جنہیں کھا کر آپ کبھی بور نہیں ہوتے؟“

☆ ”آلو مٹر پلاؤ رائتہ کے ساتھ اور بیسنی روٹی رائتہ کے اچار کے ساتھ۔“

17 ”دو افراد جن سے معافی مانگنے میں شرم محسوس نہیں کرتے؟“

☆ ”دو تو نہیں ہیں اور میں اپنی غلطی بھی کم ہی مانتا ہوں۔ لیکن اگر مجھے اپنی غلطی کا احساس ہو جائے تو پھر کوئی بھی ہو مانگ لیتا ہوں۔ ویسے غصے میں لوگ اکثر حد سے تجاوز کر جاتے ہیں اور ایسا ہونا نہیں چاہیے۔“

18 ”دو کھلاڑی جن کی وجہ سے آپ کرکٹ میچ دیکھتے ہیں؟“

☆ ”میں سچ بتاؤں آپ کو مجھے کرکٹ قطعی پسند نہیں۔“

19 ”کن دو خوب صورت دنوں کے منتظر ہیں؟“

☆ ”پڑھنے والے ضرور سوچیں گے کہ میں اپنے بیٹے کا ذکر بار بار کر رہا ہوں تو آج کل جس طرح کی زندگی ہم سب گزار رہے ہیں اور جس دور میں ہم رہ رہے ہیں تو اس میں انسان کو پرسنل چیزیں ہی متاثر کرتی ہیں تو میری خواہش ہے کہ ایک دن میرا بیٹا مجھے کہے کہ پاپا میں اپنی لائف کو انجوائے کر رہا ہوں۔ اور دوسرا وقت وہ ہوگا جب مجھے لگے گا کہ میں نے اپنی زندگی کے سارے ادھار چکا دیے ہیں ادھار سے مطلب کہ میں نے اپنے فرائض پورے کر دیے ہیں۔“

20 ”دو چیزیں جنہیں لیے بغیر آپ گھر سے نہیں نکلتے؟“

☆ ”میں شوگر کا مریض ہوں تو انسولین اور اپنا والٹ۔“

21 ”دو پسندیدہ صحافی؟“

☆ ”ایمانداری سے بتاؤں..... کوئی نہیں۔“

22 ”سات دنوں میں سے کون سے دو دن اچھے لگتے ہیں؟“

☆ ”اس سوال کا تو میں جواب نہیں دے سکتا، کیونکہ ہمارے کام میں کوئی دن ہمارا نہیں ہوتا..... ہفتہ اتوار ہو صبح و شام ہو سب کام میں گزر جاتا ہے تو کیا بتا سکتا ہوں۔“

23 ”بارہ مہینوں میں کون سے دو مہینے اچھے لگتے ہیں؟“

☆ ”سال میں دو مہینے ایسے ہوتے ہیں کہ اگر ان میں بھرپور ٹھنڈ ہو اور دھند ہو تو پھر وہ میرے پسندیدہ ہو جاتے ہیں۔“

24 ”اپنے گھر میں دو پسندیدہ جگہیں؟“

☆ ”یہ تو بہت پرسنل سوال آپ نے پوچھ لیا..... مجھے تو اپنے گھر میں رہنا اچھا لگتا ہے خواہ وہ کوئی بھی کمرہ ہو۔“

25 ”گھر کے دو کام جو آپ کو کرنا پسند نہیں؟“

☆ ”بہت سے کام ہیں۔ کون کون سے بتاؤں..... میں کہتا ہوں کہ پیسے لے لو اور کام کر دو..... میں ایمانداری سے بتاؤں کہ گھر کے کاموں کے لیے ایک سست انسان ہوں۔ ہاں کوئی ایسی ذمہ داری مجھ پر آجائے کہ جو میرے سوا کوئی نہ کر سکے تو پھر میں اسے بہت خوش اسلوبی سے نبھاتا ہوں۔“

26 ”دو پسندیدہ پکنک پوائنٹس؟“

☆ ”پکنک اب کون مناتا ہے۔ اب رواج ہی کہاں رہ گیا ہے..... جب چھوٹا تھا تو والدین کے ساتھ پکنک منانے جاتا تھا۔ اب ایسا کچھ نہیں ہے۔“

27 ”دو سیاست دان جو ہمارے ملک کے لیے بوجھ ہیں؟“

☆ ”جو سیاست کرتا ہے وہ ملک کے لیے بوجھ ہے خواہ وہ عام انسان ہو، کھلاڑی ہو کوئی امیر غریب شہری ہو، کسی عہدے پر فائز ہو یا نہ ہو جو سیاست کرے گا وہ ہی ملک کے لیے بوجھ ہوگا۔“

28 ”کن دو ممالک کی ترقی سے متاثر ہیں؟“

☆ ”جاپان اور جرمنی کی۔“

29 ”کون سے دو رنگ کے لباس پسند ہیں؟“

☆ ”بلیک اینڈ وائٹ۔“

30 ”اپنے ملک کے دو پسندیدہ شہر؟“

☆ ”لاہور اگرچہ میں کراچی کی پیدائش ہوں۔ لیکن

مجھے لاہور بہت پسند ہے اور دوسرا شہر وہ کہ جب عموماً" ریٹائر ہوتے ہیں تو اس شہر میں بسیرا کر لیتے ہیں کہ دوسرے شہروں کی بہ نسبت وہاں سکون ہے اور وہ شہر اسلام آباد ہے۔"

31 "لڑکیوں کے لیے دو نصیحتیں؟"

☆ قہقہہ۔۔۔۔ "ابھی بہت عمر پڑی ہے میرے بوڑھا ہونے میں اور میرا کیریئر ختم ہونے میں۔ تو آپ اس طرح کے سوال پوچھ کر کیوں مجھے بوڑھا کرنا چاہتی ہیں۔"

32 "سال کے چار موسموں میں کون سے دو موسم پسند ہیں؟"

☆ "سردیاں اب ہمارے یہاں بہار کا موسم اس طرح آتا نہیں ہے جس طرح کسی زمانے میں آیا کرتا تھا۔ ورنہ تو مجھے بہار کا موسم بھی بہت پسند ہے۔"

33 "صبح اٹھتے ہی کون سے دو کام پہلے کرتے ہیں؟"

☆ "ٹوتھ برش کرتا ہوں اور منہ ہاتھ دھوتا ہوں۔"

34 "دو خواتین جنہوں نے آپ کی زندگی بنانے میں اہم رول ادا کیا ہو؟"

☆ "دو نہیں ہیں تین ہیں، میری ماں میری بہن اور میری مسز۔"

35 "آپ کے نزدیک دنیا کی دو خوب صورت ترین خواتین؟"

☆ "میری ماں اور میری نانی اور یہ دو خواتین جو میری زندگی میں آئیں ان کے لیے میں لفظ "Genune" استعمال کروں گا اور ایسے لوگ اس زمانے میں بہت کم ہوتے ہیں مخلص اور خالص۔"

36 "دو پسندیدہ پروفیشن؟"

☆ "میرا خیال ہے کہ اگر میں اداکار نہ ہوتا تو میں وکیل ہونا زیادہ پسند کرتا تو ایک تو میں وکیل ہوتا اور ایروناٹیکل انجینئر بننے کا بھی بہت شوق تھا اور میرا ایروناٹیکل انجینئرنگ میں داخلہ بھی ہو گیا تھا رسالپور میں، بس پھر کچھ وجوہات کی بنا پر اس پروفیشن میں بھی نہ آسکا۔"

37 "دنیا کے دو بہترین سیاست دان آپ کی نظر میں؟"

☆ "میں سیاست سے بھاگتا ہوں سیاست دانوں کی مثال تو ایسی ہی ہے کہ سفید کے اندر کالا ہے اور کالے کے اندر سفید ہے اور پھر ایک سفید بھی ہے اور ایک کالا بھی ہے پولٹکس بہت پرانی چیز ہے اور عرصہ دراز سے کھیلی جا رہی ہے لیکن پھر بھی کسی کا نام لوں گا تو وہ چنگیز خان ہے وہ ایک بہترین سیاست داں تھا۔ ویسے مجھے سیاست سے نفرت ہے۔"

38 "والدین کی دو نصیحتیں جو آپ نے گرہ سے باندھ لی ہوں؟"

☆ "جھوٹ نہ بولنا اور اس کی خلاف ورزی میں کئی مرتبہ کر چکا ہوں اور بہت مرتبہ اس وقت بولا ہے کہ کسی کا دل نہ دکھے اور دوسری نصیحت جو والد صاحب نے کی کہ کمانے کے دو طریقے ہیں ایک حلال طریقہ اور دوسرا حرام طریقہ۔۔۔۔ حرام سے آپ بہت جلدی کما سکتے ہیں اور حلال سے کمانا مشکل ہے لیکن اس کمائی سے خوشی اور اطمینان بہت ہوتا ہے۔۔۔۔ اور واقعی ایسا ہے اور میں اپنی حلال کی کمائی سے بہت خوش ہوں۔"

39 "آپ کے اپنے دو ڈرامے جنہیں بھلا نہیں سکتے؟"

☆ "کوئی نہیں ہیں، ابھی کرنے ہیں۔"

40 "اپنے کیے گئے دو فیصلے جو غلط ثابت ہوئے ہوں؟"

"میرا خیال ہے کہ اگر میں بتاؤں گا تو بہت سے لوگ کہیں گے کہ یہ صحیح تھا۔۔۔۔ تو سب کی رائے اپنی اپنی ہوگی۔ اس لیے اس سوال کو رہنے دیں۔"

41 "پانچ وقت کی نمازوں میں کون سی دو وقت کی نمازیں لازمی پڑھتے ہیں؟"

☆ "نہیں جی، میں نماز کا پابند نہیں ہوں۔"

42 "کن دو باتوں سے بچنے کی کوشش کرتے ہیں؟"

☆ "کسی کو کسی بات کا الزام دینا اور سڑک پہ کسی کو راستہ نہ دینا۔۔۔۔ راستہ دے دینا چاہیے کیونکہ کسی کو بھی کوئی ایمرجنسی ہو سکتی ہے۔"

43 "بیرون ملک شاپنگ میں کیا دو چیزیں لازمی خریدتے ہیں؟"

☆ "اچھا کھانا، اچھا پینا، اور سگریٹ۔"

44 "دو لوگ جن کے غصے سے ڈر لگتا ہے؟"

☆ "اب نہیں لگتا۔"

45 "کن دو لوگوں کی تعریف میں کنجوسی سے کام نہیں لیتے؟"

☆ "اگر کوئی اچھا کام کرے تو اس کی تعریف میں کنجوسی سے کام نہیں لیتا۔"

46 "دو پسندیدہ مشروب جن کے بغیر نہیں رہ سکتے؟"

☆ "ایسا کوئی مشروب نہیں ہے کہ جس کے بغیر نہ رہ سکوں۔"

47 "آج کے دور کے آپ کے دو پسندیدہ گلوکار؟"

☆ "آج کی انٹرٹینمنٹ ایک بزنس بن گئی ہے۔ موبائل کے کارڈ کی طرح۔"

48 "شادی کی دو رسمیں جو آپ انجوائے کرتے ہیں؟"

☆ "شادی بہت زیادہ اوور گلیمرس ایونٹ ہے اور میں ایک بہت سادہ انسان ہوں تو شادی کی رسمیں مجھے Irritate کرتی ہیں۔"

49 "دو باتیں جو آپ کا موڈ خراب کر دیتی ہیں؟"

☆ "باتیں! مجھے اچھا لگتا ہے اگر کوئی بہت اچھی بات کرے کوئی اچھا ڈسکشن کرے کیونکہ مجھے لگتا ہے کہ اچھی فلاسفی میں بھی Logic ہوتی ہے لیکن غیر منطقی باتوں سے میرا موڈ آف ہو جاتا ہے یا پھر کوئی بہت ہی جاہلانہ کام کی بات کرے تب۔"

50 "اپنے لباس میں کن دو باتوں کا خاص خیال رکھتے ہیں؟"

☆ "میں بہت زیادہ خیال نہیں رکھتا سادہ بندہ ہوں۔"

51 "کن دو افراد کے ساتھ بارش انجوائے کرتے ہیں؟"

☆ "بارش تو میں اکیلے میں بھی انجوائے کر لیتا ہوں۔ ضروری نہیں کہ کوئی دو افراد ساتھ ہوں۔"

52 "کن دو کیڑوں سے ڈر لگتا ہے؟"

☆ "کوئی ایسا کیڑا جو دیکھنے میں بہت ہی معصوم لگتا ہو لیکن جب کاٹنے پہ آئے تو بہت ہی خطرناک کاٹتا ہو اور ایسے کیڑے جو اکٹھے ہو کر آپ پر حملہ کرتے ہوں اور ایسا صرف کیڑوں پر نہیں ہے کسی بھی جاندار کے لیے آپ ایسا کہہ سکتے ہیں۔"

53 "دو ریسٹورنٹ جہاں آپ کھانا کھانا پسند کرتے ہیں؟"

☆ "کراچی میں تھائی فوڈ ریسٹورنٹ "اوشا" کا کھانا مجھے بہت اچھا لگتا ہے اور جہاں کوئی بھی ایسا ریسٹورنٹ ہوگا خواہ وہ سڑک پہ ہو یا کوئی ڈھابا بھی ہو اگر اچھا کھانا ہوگا تو وہاں کھانا پسند کروں گا۔"

54 "اپنے ملک کے دو شاپنگ مال جہاں سے آپ شاپنگ کرنا پسند کرتے ہیں؟"

☆ "کوئی نہیں، بہت مجبوری میں شاپنگ کر لوں گا۔ مگر یہاں پہ شاپنگ کا مزا نہیں۔"

55 "دو ٹی وی چینل جو آپ شوق سے دیکھتے ہیں؟"

☆ "ہسٹری چینل اور کوئی بھی مووی چینل۔"

56 "دو تبدیلیاں جو آپ اپنی شخصیت میں لانا چاہتے ہیں؟"

☆ "غصہ اور سگریٹ کم کرنا چاہتا ہوں۔"

57 کھانے کی ٹیبل پہ کون سی دو چیزیں نہ ہوں تو کھانے کا مزا نہیں آتا؟"

"دہی اور اچار۔"

☆ ☆

سرورق کی شخصیت

ماڈل ــــــ مہوش آفتاب
ڑالنسپرنسی ــــــ موسٰی رضا
میک اپ ــــــ روز بیوٹی پارلر

محسن عباس حیدر

شاہین رشید

ایف ایم کے آر جے اپنی آواز اپنے انداز اور اپنی خوب صورت باتوں سے سامعین پہ ایک سحر ساطاری کر دیتے ہیں اور سامعین کی فرمائشوں کا ایک سلسلہ شروع ہو جاتا ہے کہ ان کے انٹرویو شائع کریں..... انہی میں "محسن عباس حیدر" بھی ہیں۔

محسن عباس حیدر صرف آر جے ہی نہیں ہیں بلکہ اور بھی بہت سی خوبیوں کے مالک ہیں..... یہ گلوکار، شاعر، اداکار Mimicker بھی ہیں۔ سیلف میڈ ہیں آج جو عزت شہرت اور مقام انہیں ملا ہے صرف اور صرف اپنے زور بازو پر حاصل کیا اور بغیر کسی سہارے کے کامیابی کی منزلیں طے کی ہیں وہ بھی صرف پچیس سال کی عمر میں۔ اس بار آواز کی دنیا میں محسن عباس کا انٹرویو شامل کر رہے ہیں۔

★ "کیسے ہیں؟"

✲ "جی اللہ کا شکر ہے۔"

★ "ماشاء اللہ بہت سی خوبیوں کے مالک ہیں۔ آپ سے اور بھی باتیں ہوں گی۔ لیکن پہلے اپنا فیملی بیک گراؤنڈ بتائیں؟"

✲ "ہمارا تعلق فیصل آباد سے ہے والد صاحب ایک میڈیسن کمپنی کے سیلز منیجر تھے جبکہ والدہ ہاؤس وائف ہم سیلف میڈ لوگ ہیں۔ آج ہم جو کچھ بھی ہیں اپنی محنت کی وجہ سے سیلف میڈ ہونا ہمیں، ہمارے والد صاحب کی طرف سے ملا ہے۔ میری دو بہنیں ہیں جو کہ ماشاء اللہ شادی شدہ ہیں اور مجھ سے بڑی ہیں میں اکلوتا بیٹا ہوں اور اکلوتا ہونے کی وجہ سے نا صرف بہت زیادہ لاڈ پیار کروائے بلکہ اپنی ہر طرح کی خواہشات کو بھی پورا کروایا اور اپنے شوق کو پورا کرنے کے لیے گھر والوں کو تھوڑا بہت مالی نقصان بھی پہنچایا۔ میں کرکٹر بننا چاہتا تھا اور انڈر 19 تک کھیلا راولپنڈی سے، میں گلوکار بننا چاہتا تھا فیصل آباد کی میڈیا مارکیٹ جو کہ بہت چھوٹے پیمانے پہ تھی وہاں کچھ کرنا چاہتا تھا لیکن مجھے ایک شخص نے لوٹا۔ جس کی وجہ سے میرا کافی نقصان ہوا..... خیر چھوڑیں یہ ایک دردناک کہانی ہے..... میں فیصل آباد میں 18 اگست 1986ء میں پیدا ہوا۔ فیشن ڈیزائننگ میں میں نے ماسٹرز کیا ہے۔"

★ "اگست میں 14 اگست والوں میں غصہ بہت ہوتا ہے اور آپ نے فیشن ڈیزائنگ میں ماسٹرز کیا ہے ڈگری کام آرہی ہے؟"

✲ "مجھے اپنی سب سے زیادہ بری عادت بھی یہی لگتی ہے اور میں اپنی اس عادت کو بہت کنٹرول کرنے کی کوشش کرتا ہوں اور ابھی تک تو یہ ڈگری میرے کام نہیں آئی۔ فیصل آباد سے ہی میں نے ماسٹرز کیا اور جب مجھے پتا چلا کہ کراچی میں "ناپا" کے نام سے ایک اکیڈمی کھلی ہے تو پھر میں کراچی آگیا۔ اور پھر یہاں آکر میں نے میوزک میں گریجویشن کیا اور شادی میری ابھی ہوئی نہیں اور نہ ہی ارادے ہیں۔ ہاں حادثاتی طور پر ہو جائے وہ اور بات ہے۔"

★ "آج کا نوجوان پہلے ٹی وی کا رخ کرتا ہے اور پھر ریڈیو کا آپ ریڈیو اور وہ بھی ایف ایم کی طرف آئے۔ کیوں؟"

✲ "جب میں فیصل آباد میں یونیورسٹی کا طالب علم تھا تو مجھے پتا چلا کہ ایف ایم 89 لاؤنچ ہو رہا ہے۔ تو فارم وغیرہ جمع کردیں تو دو خواتین کو لیگ کی کال آگئی مگر مجھے نہیں آئی۔ جس دن ان کو آڈیشن دینے جانا تھا میں بھی ان کے ساتھ چلا گیا..... وہاں اور لوگ بھی تھے۔ سب کے آڈیشن ہو گئے میں اکیلا رہ گیا تو وہ بندہ جو سب کو نیکسٹ کہہ کر اندر بلا رہا تھا وہ سمجھا میں بھی ہوں..... اس نے کہا کہ آپ بھی آڈیشن کے لیے ہی آئے ہیں نا..... میں نے کہا جی جی، میں اندر چلا گیا مائیک ٹیسٹ ہو گیا۔ سب کچھ پرفیکٹ ہو گیا..... اب کہانی میں موڑ یہ آیا کہ وہ خواتین ریجیکٹ ہو گئیں اور میں سلیکٹ ہو گیا۔ حالانکہ مجھے آڈیشن کی کال بھی نہیں آئی تھی۔ تو بس پھر ایف ایم 89 سے شوز شروع ہو گئے۔ میں خود ہی اسکرپٹ لکھتا تھا اور بہت دل لگا کر شو کرتا تھا۔ پروگرام کا فارمیٹ مجھے دے دیا گیا تھا اور اسی فارمیٹ کے تحت میں لکھتا تھا اور بولتا تھا۔ مجھے شاعری کا شوق تھا مگر شاعری کے پروگرام مجھے نہیں ملے۔ البتہ گزشتہ سال ایک پروگرام میں نے شاعری کے موضوع پر کیا۔"

★ "پھر ایف ایم 107 تک کیسے رسائی ہوئی؟"

✲ "پھر ہوا یہ کہ "محسن" کو بہت آگے جانے کا شوق تھا اور اس نے اپنا بوریا بستر اٹھایا اور کراچی آگیا۔ یہاں بھی میں نے اپنے اکلوتے ہونے کا فائدہ اٹھایا میں نے کراچی آنے کی ضد کی تو سب نے میری ضد کے آگے ہتھیار ڈال دیے۔

جب میں نے کراچی آنے کا ارادہ کیا تو وہاں ریڈیو پہ بھی ایک صاحب فرخ فرہاد تھے انہوں نے مجھے کہا کہ کراچی جا کر فلاں شخص سے مل لینا۔ فیصل آباد میں ہی میں نے ایک ایڈورٹائزنگ کمپنی میں بھی کام کیا اور وائس اوور بھی کی اور جنگل بھی گائے..... اور جب کراچی آیا تو بہت دھکے کھائے۔ بہت جدوجہد کی، لوگوں نے بہت زچ بھی کیا۔ یہ ایک لمبی کہانی ہے..... زندگی میں پہلی دفعہ کراچی آیا تھا یہاں کے بارے میں مجھے کچھ نہیں پتا تھا۔"

★ "ایک لاڈلا بچہ جو گھر میں اٹھ کر پانی بھی نہ پیے۔ جب کراچی میں دھکے، دھوکے کھائے تو خیال نہیں آیا کہ واپس چلا جاؤں؟"

✲ "میں آپ کو یہ بھی بتاؤں کہ میں بائے نیچر ایک کمزور بچہ تھا۔ لیکن کراچی آکر مجھ میں بہت چینج آگیا اور اتنا بہادر ہو گیا کراچی آکر افسر اعوان صاحب سے ملا

۔ عمران عابد صاحب جو FM-107 کے پروگرام منیجر تھے ان سے ملا آڈیشن دیا۔ غزل شو کا آڈیشن دیا اور اپنی سی وی بھی دی۔ جو کہ ایک مرتبہ پھر نظر انداز ہو گئی۔ آڈیشن دیا تو کہا گیا کہ آپ کو ہم خود کال کر لیں گے۔ کافی دن جب کال نہیں آئی تو میں نے خود ہی کال کر لی اور اپنا آڈیشن اور اپنی سی وی یاد دلائی..... تو کہنے لگے۔
"ہاں ہاں یار تم آجاؤ اور جوائن کر لو۔ سی وی کی ضرورت نہیں ہے تمہارا آڈیشن ہم نے سن لیا تھا۔" بحیثیت جونیئر پروڈیوسر کے جوائن کیا اور بس پھر آہستہ آہستہ شوز بھی شروع کیے اور قدم جمنے شروع ہو گئے اور اب میں پروڈیوسر اور آر جے ہوں۔"

★ "فیصل آباد کے ہیں آپ کی پنجابی مادری زبان ہے۔ مگر ٹی وی پہ اور ریڈیو پہ پنجابی مختلف لہجے اور تلفظ کے ساتھ تو یہ سب کچھ کہاں سے سیکھا! جیسے سکھوں کی پنجابی بہت اچھی بولتے ہیں؟"

✳ "جو پنجابی میں بولتا ہوں وہ فیصل آباد کی ہے نہ ہی پنجاب سائیڈ کی وہ بنیادی طور پر سکھوں کی ہی پنجابی ہے شکار پور سائیڈ کی پنجابی ہے اور یہ کوئی پریکٹس سے نہیں آئی یہ وہ پنجابی تھی کہ جو میں دوستوں کے درمیان بیٹھ کر ایسے ہی بول دیتا تھا مجھے نہیں پتا تھا کہ یہی میرا ذریعہ روزگار بن جائے گا ہمارے تو گھر میں بھی پنجابی نہیں بولی جاتی بچوں کے ساتھ سب اردو میں بات کرتے ہیں۔"

★ "آر جے سے اداکار کیسے بنے یا ٹی وی تک کیسے آئے؟؟"

✳ "ہمارا ایک شو ہے "لی فار بھنگڑا" یہ پنجابی شو ہے ریڈیو کے اس شو کو "فارمین شو" کے مرتضیٰ کی کال آئی..... دلچسپ بات یہ کہ نہ مجھے سیاست سے لگاؤ تھا اور ہی میں نے کبھی فارمین شو دیکھا تھا البتہ 107-FM کے سب لوگ اس پروگرام کو بہت شوق سے دیکھتے تھے اور بہت تعریف کرتے تھے تو چلتے پھرتے کچھ نظر پڑ جاتی تھی۔ تو مرتضیٰ چوہدری کی کال آئی اور اس نے اپنا تعارف بھی خالد بٹ کی حیثیت سے کرایا تو میرے ذہن میں فوراً "پروگرام کے حوالے سے خالد بٹ کا نام آگیا تو میں نے کہا جی جی فرمائیے تو مرتضیٰ نے کہا کہ ہم آپ سے ملنا چاہتے ہیں.....
میں میرا دوست علی سفینہ اور مسعود ہم تینوں نے جدوجہد کا پریڈ ایک ساتھ گزارا ہے۔ ہم تینوں ہی ایک بائیک پہ پھرا کرتے تھے میں اور علی سفینہ آج ٹی وی پہنچے جہاں ہمارا آڈیشن ہوا..... اور آڈیشن کیمرہ ٹیسٹ تھا۔ پھر پنجابی آئٹم کی بات ہوئی۔ ان دنوں کشمیر سنگھ کا مسئلہ گرم تھا۔ تو جو نیا آئٹم اس پروگرام میں شروع کیا گیا وہ کشمیر سنگھ کے حوالے سے شروع ہوا..... وہ کردار بہت پسند کیا گیا اس کے ساتھ ساتھ دوسرے کردار بھی کیے جیسے مائیکل جیکسن، حسن جہانگیر، عاصمہ جہانگیر کا کیا اور اس کے علاوہ بھی کئی کردار کیے اور یوں میں ٹیم کا حصہ بن گیا۔"

★ "شاعری کی صلاحیت تو خداداد ہوتی ہے۔ کچھ اس کے بارے میں بھی بتائیں ریڈیو پہ بھی چلتی ہو گی شاعری؟"

✳ "شاعری کے شوق میں ہی ریڈیو پہ آیا اور جب آڈیشن دیا شاعری کے حوالے سے ہی دیا اور آپ بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں کہ شاعری کی صلاحیت خداداد ہوتی ہے اور معروف شاعر محسن نقوی ہمارے فیملی فرینڈ ہیں اور میرے دو بڑے ماموں بھی شاعر ہیں اور گھر کا ماحول بھی ادبی تھا، تو مجھے بھی شاعری کا شوق ہوا اور شاعری لکھ کر اپنے ماموں کو دکھاتا تھا۔ تو وہ صلاح کر دیتے تھے اور پھر آہستہ آہستہ شاعری میں بھی پختگی آتی گئی۔"

★ "سب محفوظ ہے آپ کے پاس اور ماموں کے نام بھی بتائیے؟؟"

✳ "آپ میری اسے لاپرواہی ہی کہہ لیں یا یادداشت کی کمزوری ہے کہ میں بہت سی چیزیں ضائع کر دیتا ہوں اور اب ذرا اس بات کو میں نے سنجیدگی سے لینا شروع کیا ہے۔ لیکن اپنی کتاب سے پہلے میں اپنے ماموں کی کتاب چھپوانا چاہوں گا۔ کیونکہ وہ مجھ سے بھی زیادہ لاپرواہ ہیں..... میرے ایک ماموں کا نام امتیاز حسین شانی ہے اور دوسرے ہیں ریاض انجم۔"

★ "اتنی جدوجہد، اتنی محنت کے بعد یہ مقام حاصل کرنا کیسا لگ رہا ہے؟؟"

✳ "سب کچھ بہت اچھا لگ رہا ہے۔ لیکن مجھے ایسا لگتا ہے کہ ابھی میرے پاس دو پتے ہیں جو پھینکنا باقی ہیں اور ایک پتہ تو میں پھینک ہی چکا ہوں اور وہ ہے گلوکاری کا میرا پہلا ڈیبیو سانگ میرے ماموں ریاض انجم نے ہی لکھا ہے اور ابھی اس کا آڈیو ریلیز کیا ہے جس کا بہت اچھا رسپانس ملا ہے۔ "بے پرواہ ڈھولا" کے نام سے اس کا میوزک وکی حیدر نے دیا ہے اور دوسرا پتا ہے اداکاری کا مجھے لگتا ہے کہ آنے والے وقت میں میں ایکٹنگ بھی کروں گا۔"

★ "اداکاری تو آپ کرتے ہی ہیں پی این این کے تحت جو ٹیلی فلم "پنڈورا" بنائی ہے اس میں آپ نے اداکاری ہی تو کی ہے؟؟"

✳ "جی جی..... بالکل میں اداکاری میں بھی مقام حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ بس اللہ کا شکر ہے کہ اس نے اس میں عزت دے دی..... مبین، وحید، شفاعت اور مصطفیٰ بہت جلدی پک کر لیتے ہیں mimic کو اتنی جلدی میں نہیں کر سکتا۔ میں تھوڑا سلو ہوں۔ میں لکھ لیتا ہوں۔ ایکٹ کر لیتا ہوں لیکن کاپی کرنا میرے لیے تھوڑا مشکل ہے۔ مگر پھر بھی جتنا بھی کام کیا اس کا اچھا رسپانس ملا۔"

★ "ایف ایم کے شوز کے بارے میں کچھ بتائیں اور یہ بھی بتائیں کہ کس عمر کے لوگ آپ کا پروگرام زیادہ شوق سے سنتے ہیں؟"

✳ میں نے "سدا بہار" کے نام سے شو شروع کیا تھا۔ اتوار کے دن ہوتا تھا اور پرانے گانوں کا یہ پروگرام تھا۔ چونکہ اس زمانے میں پروڈیوسر بھی تھا تو میری کوشش تھی کہ نوجوان پرانے گانوں کو سنیں۔ تو اس انداز میں پروگرام کیا کہ اسے ہر عمر کے لوگوں نے بہت شوق سے سنا اور میرے لیے یہ بڑی دلچسپ بات ہے کہ میں نے مارننگ شو سے لے کر رات کا آخری شو تک کیا ہے۔ یعنی ہر ٹاپک پہ شوز کیے ہیں میں نے..... پانچ کا پہاڑا کے نام سے ہم نے ایک پروگرام کیا وہ ایک کاؤنٹ ڈاؤن شو تھا۔ بہت دلچسپ شو تھا اور اس میں کافی ہوم ورک کیا اسے میں، جواد، شعیب اور آصف مل کر کرتے تھے۔
ایک شو فن کی ٹنکی اسے یاسر جلوانی اور میں مل کر کیا کرتے تھے۔ اس شو کو خالصتاً "نوجوان ہی سنتے تھے

اور جو سب سے زیادہ مقبول شو ہے وہ بی فار بھنگڑا ہے اور یہ نیٹ کے ذریعے پورے دنیا میں سنا جاتا ہے۔

★ ”اصل میں پنجابی زبان میں مٹھاس بہت ہے؟“

✳ ”بالکل ٹھیک کہا آپ نے اور پنجابی کو پرموٹ کرنے والوں میں ہمیں احسان مند ہونا چاہیے یو کے پنجابی بینڈ کا انہوں نے پنجابی کو ایسا رنگ دے دیا کہ اسے نوجوانوں نے بھی سننا شروع کر دیا۔“

★ ”کن باتوں پر غصہ آجاتا ہے؟“

✳ ”مجھے رویے بہت تنگ کرتے ہیں۔ مجھے کوئی نظر انداز کرے تو غصہ آتا ہے۔ میں بہت چھوٹی چھوٹی باتوں کو نوٹ کرتا ہوں..... اور یہاں کراچی آنے کے بعد اس فیلڈ میں آنے کے بعد ان باتوں کو زیادہ نوٹس کرنے لگا ہوں..... یہاں لوگ عجیب انداز میں ری ایکٹ کر رہے ہوتے ہیں آپ کے اردگرد اگر کوئی ایک مرتبہ پیار سے بلائے گا تو میں اسے دس مرتبہ اسی پیار سے جواب دوں گا لیکن اگر کوئی مجھے اگنور کرے تو میں بہت ہرٹ ہوتا ہوں اور میں اس چیز کو حاوی کر لیتا ہوں اور پھر سارا دن میرا بہت برا گزرتا ہے..... اور میرا ہی ایک شعر ہے۔

ہماری جان پہ دوہرا عذاب ہے محسن
کہ دیکھنا ہی نہیں ہم کو سوچنا بھی ہے

تو بس بہت دیر تک سوچتا رہتا ہوں۔ تو پھر بڑا مسئلہ ہو جاتا ہے لیکن اکیلے رہنے کا ایک فائدہ یہ ہوا ہے کہ میں نے اپنی اس خامی کو کافی تک کنٹرول کرنا سیکھ لیا ہے۔“

★ ”آپ بتا رہے تھے کہ وائس اوور بھی کرتے ہیں تو کمرشل کی کرتے ہیں یا ڈاکومنٹریز کی؟“

✳ ”جی کمرشلز کی بھی کرتا ہوں اور ڈاکومنٹریز کی بھی کرتا ہوں، جنگل کے لیے بھی کرتا ہوں۔“

★ ”کچھ بننے کی خاطر جب گھر سے نکلے تھے تو کیا سوچتے تھے؟“

✳ ”جب [illegible] سے [illegible] تھا تو سوچتا تھا کہ جس دن میں دس ہزار [illegible] سیٹل ہو گیا ہوں اور جب میں پندرہ ہزار کمانا شروع کر دوں گا تو میں شادی کر لوں گا اور میری لائف سیٹ ہو جائے گی۔ لیکن جب کام شروع کیا تو بہت برا وقت بھی دیکھا۔ جب میں فیصل آباد میں تھا تو بہت اچھا کماتا تھا لیکن جب کراچی آیا تو میں نے رہائش کے لیے جو کمرہ لیا اس کا کرایہ زیادہ تھا بہ نسبت میری کمائی کے جبکہ فیصل آباد میں پارٹ ٹائم کام کر کے اچھا خاصا کما لیتا تھا جب یہ بات میں نے اپنے ادارے کے سر سے کہی تو انہوں نے کہا کہ ابتدا میں تو ایسا ہی ہو گا۔

تو اس لحاظ سے میں نے بہت مشکل دن دیکھے اور گھر والوں کو کہہ کر آیا تھا کہ آپ سے کوئی مدد نہیں لوں گا..... لیکن اب اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ میں بہت اچھا کما لیتا ہوں اور مجھے فخر ہے کہ آج میں پاکستان کی سب سے بڑی آرگنائزیشن کے ساتھ کام کر رہا ہوں اور میرے پاس پہلا اور آخری فخر ہی یہ ہے کہ میں سیلف میڈ ہوں اور سیلف میڈ کا ٹیگ مجھے اپنی فیملی سے ملا ہے۔“

★ ”گھر والے خوش ہیں؟“

✳ ”جی بہت، جب فیصل آباد اپنے گھر جاتا ہوں تو میری اماں سب کو فخر سے بتاتی ہیں کہ میرا بیٹا کراچی سے آیا ہے اور میرا بیٹا تو بہت مشہور شخصیت ہے۔ میری دونوں بہنوں کی شادیاں ہو گئی ہیں اور وہ بھی مجھ پر بہت فخر کرتی ہیں۔“

★ ”اور کچھ کہنا چاہیں گے؟“

✳ ”نہیں جی..... بہت شکریہ انٹرویو دے کر بہت اچھا لگا۔“

اور اس کے ساتھ ہی ہم نے محسن عباس حیدر سے اجازت چاہی۔

☼ ☼

فصیح باری خان

نازیہ کنول نازی

فصیح باری خان ٹیلی وژن اسکرین کے نا صرف باکمال آرٹسٹ ہیں، بلکہ بہترین لکھاری بھی ہیں۔ بہنوں کی طرف سے ہمیں ٹی وی آرٹسٹ جناب عابد علی صاحب کے لیے سوالات موصول ہوئے مگر ناگزیر وجوہات کی بنا پر اس ماہ ان سے ملاقات ممکن نہ ہو سکی، تو ہم نے فصیح باری خان صاحب کو اس عدالت میں مدعو کر لیا۔ عابد علی صاحب کے لیے آپ کے سوالات محفوظ ہیں جو ان شاء اللہ اگلے ماہ شامل ہو سکیں گے۔ جناب عابد علی صاحب کے بعد ہماری اگلی مہمان شخصیت حمیرا ارشد ہوں گی۔ اپنے سوالات بروقت ارسال فرمادیں، تاکہ وہ سلسلہ کی زینت بن سکیں۔

○ ”السلام علیکم فصیح کیسے ہیں آپ؟“

☆ ”جی وعلیکم السلام، الحمدللہ میں بخیریت ہوں، آپ سنائیں۔“

○ ”کرن ڈائجسٹ کا سلسلہ ہے ”قارئین کی عدالت“ اور اس سلسلے میں کچھ قاری بہنوں کی فرمائش پر اس ماہ ہم آپ کو مدعو کر رہے ہیں۔“

☆ ”بہت شکریہ، پوچھیں کیا پوچھنا ہے۔“

○ ہمارے پاس یہ سب سے پہلا سوال چک لالیکا بہاول نگر سے ہماری بہت پیاری بہن نازیہ عمار صاحبہ نے ارسال کیا ہے آپ کی ٹیلی فلم ”برنس روڈ کی نیلوفر“ انہیں بہت پسند ہے، یہ پوچھتی ہیں۔

○ ”فصیح بھائی! آپ بہت اچھے فنکار بھی ہیں اور لکھاری بھی، کس فیلڈ کو پہلے جوائن کیا؟“

☆ ”دیکھیے، ایکٹنگ کی طرف تو میں یوں ہی اتفاقیہ آگیا تھا۔ بنیادی طور پر لکھاری ہی ہوں۔ ٹیلی فلم کی پسندیدگی کے لیے بہت شکریہ۔“

آپ کے لیے یہ دوسرا سوال چک نمبر دو ہارون آباد سے ہماری بہن انیلہ صداقت نے ارسال کیا ہے۔

○ ”خالہ کلثوم کا کنبہ“ نے آپ کی شہرت میں بڑا اہم کردار ادا کیا۔ آپ نے ٹی وی کے علاوہ کہیں اور بھی کام کیا ہے؟“

☆ ”جی ہاں، ٹی وی کے علاوہ میں نے تھیٹر پر بھی کام کیا ہے۔ بلکہ کام کا آغاز ہی تھیٹر سے کیا تھا اور میرا جو پہلا کردار تھا وہ ایک عیاش نوجوان کا کردار تھا۔“

فصیح ہمارے پاس یہ سوال ہے فرح نذیر چوہدری کا کوٹ رادھا کشن سے پوچھتی ہیں۔

○ ”آپ کا نک نیم کیا ہے؟ ڈیٹ آف برتھ اور تعلیم بھی بتا دیجیے؟“

☆ ”نام تو میرا فصیح ہی ہے، گھر والے بھی پیار سے فصیح کہہ کر ہی بلاتے ہیں، ڈیٹ آف برتھ 18 مارچ اور تعلیم میں، میں نے ایم اے اردو کیا ہوا ہے۔“

یہ دو سوال ہمیں موصول ہوئے ہیں بہت پیاری بہن ایمن صادق کے بہاول پور سے اور یہ ہی سوال کہروڑ پکا سے بہن سدرہ اسلم نے بھی پوچھا ہے ان کا پہلا سوال ہے۔

○ ”ایکٹنگ اور رائٹنگ دو مختلف چیزیں ہیں، آپ دونوں میں سے کسے زیادہ انجوائے کرتے ہیں؟“

☆ ”جی میں لکھنے میں زیادہ دلچسپی لیتا ہوں، ایکٹنگ مجھے بالکل پسند نہیں ہے۔“

ان کا دوسرا سوال!

○ غصہ آتا ہے یا نہیں؟ اگر آئے تو غصے کا اظہار کیسے کرتے ہیں؟“

☆ ”غصہ بہت آتا ہے اور میں غصے میں ہمیشہ موبائل توڑتا ہوں، قیمتی سے قیمتی موبائل دیوار پر دے مارتا ہوں اور وہ ٹوٹتے بھی یوں ہیں کہ کوئی پرزہ سلامت نہیں رہتا۔ یوں سمجھ لیں کہ میں نے موبائل فون کمپنیوں کو بڑا فائدہ پہنچایا ہے۔“

فصیح ہمارے پاس یہ سوال ہے جہلم سے ——— صدف ثاقب آپ کی بہت بڑی

فین ہیں اور شعاع، کرن میں شائع آپ کے ہر انٹرویو کو بہت شوق سے پڑھتی ہیں، ان کا آپ سے سوال ہے۔

○ ”ہم ٹی وی کب اور کیوں جوائن کیا؟“

☆ ”مزے کا سوال ہے، ویسے ٹی وی تو اب میں چھوڑ بھی چکا ہوں اور کب جوائن کیا تو یہ تقریباً ڈیڑھ دو سال پہلے جوائن کیا تھا۔ جہاں تک بات ہے کیوں جوائن کیا کی تو یہ ایسے ہوا کہ میں ایک پلے کے سلسلے میں محترمہ سلطانہ صدیقی صاحبہ کے پاس گیا تھا تو انہوں نے مجھے دیکھتے ہی جاب آفر کردی۔ یہ اصل میں میری پہلی باقاعدہ جاب تھی۔ اس سے پہلے میرا نہ ایسا کوئی اتفاق تھا، نہ ارادہ، اسی دوران پلے رائٹنگ کی ورکشاپ بھی تھی جو یہاں کراچی میں ہوئی تھی وہ بھی میں نے کی، اس میں آپ کے کافی رائٹرز نے شرکت کی تھی۔“

فصیح ہمارے پاس یہ سوال ہے میرپور آزاد کشمیر سے، بہت پیاری بہن فرح احمد کا، پوچھتی ہیں۔

○ ”اب تک آپ کے لکھے کتنے افسانے ڈرامائی تشکیل پا چکے ہیں؟“

☆ ”تقریباً“ تیس سے اوپر تو ہو چکے ہیں اور ان میں ”برنس روڈ کی نیلوفر“ پر تو بیسٹ رائٹر ایوارڈ حاصل کر چکا ہوں۔“

اوکاڑہ سے بشریٰ باوجوہ سوال پوچھتی ہیں۔

○ ”آج تک آپ نے جتنے بھی کردار کیے اس میں آپ کا سب سے پسندیدہ کردار کون سا تھا؟“

☆ ”مکھی چوس“ کا کردار۔ یہ ایک دلچسپ مزاحیہ کردار تھا۔“

فورٹ منرو سے دانیہ خان نے آپ کے لیے سوال بھجوایا ہے۔

○ ”کتنے بہن، بھائی ہیں اور آپ کا نمبر کون سا ہے؟“

☆ ”جی ہم سات بہن بھائی ہیں اور میرا نمبر پانچواں ہے۔“

دانیہ کا آپ سے دوسرا سوال ہے۔

○ ”ہاتھ کی لکیروں پر کتنا یقین رکھتے ہیں؟“

☆ ”بالکل یقین نہیں رکھتا، اپنے مالک پر مکمل بھروسہ ہے۔“

فصیح ہمارے پاس یہ سوال ہے چنیوٹ سے بہت پیاری بہن اقصیٰ شاہد کا اور یہ ہی سوال بہاول پور سے ہماری بہن اریبہ شاہ نے ہمیں بھجوایا ہے، پوچھتی ہیں۔

○ ”بچپن کیسا گزرا اور بچپن کی کوئی یادگار بات؟“

☆ ”بچپن میں میری امی کہتی ہیں کہ میں بہت شرارتی تھا۔ وہ کسی بھی شرارتی بچے کو شرارتیں کرتے دیکھ کر شرارتی نہیں کہتیں، کیونکہ انہوں نے میری شرارتیں دیکھی ہوئی ہیں۔ میرے ابو کو کراکری کا بہت شوق تھا، تو انہوں نے گھر میں بہت خوب صورت کرسٹل کے برتن لا کر الماری میں سجا رکھے تھے، تو ایک دن میں الماری کو پکڑ کر اس کے اوپر چڑھ گیا، جب واپس نیچے اترا تو سارے برتن میرے اوپر آگرے اور ٹوٹ گئے۔“

○ ”پھر پٹائی تو خوب ہوئی ہوگی آپ کی؟“

☆ ہنستے ہوئے ”نہیں پٹائی تو نہیں ہوئی، البتہ ڈانٹ ضرور پڑی تھی۔“

○ ”سنا ہے بچپن میں بلیوں وغیرہ کا بھی بہت شوق تھا آپ کو؟“

☆ ”نہیں ایسا کوئی خاص شوق تو نہیں تھا، ہاں میں تنگ بہت کرتا تھا ان کو، ہمارے گھر میں مجھے یاد ہے کہ ایک خوب موٹا تازہ بلا آتا تھا تو میں جب اسے دیکھتا تھا تو اس پر بیٹھ جاتا تھا اور اسے دونوں کانوں سے پکڑ کر سارے گھر میں گھماتا تھا، بہت مزے کا وقت تھا وہ بھی۔“

ہمارے پاس یہ سوال ہے، بہن زوبی رانا کا، شاہ کوٹ سے اور یہ ہی سوال کوٹ رادھا کشن سے ——— بہن حمیرا عرفان نے ہمیں ارسال کیا ہے، پوچھتی ہیں۔

○ ”آپ کے خیال میں شادی لو ہونی چاہیے یا ارینج؟“

☆ ”جی میں تو دونوں کے حق میں ہوں۔ میرے ذاتی

خیال کے مطابق میاں، بیوی دونوں کے درمیان انڈر اسٹینڈنگ ضرور ہونی چاہیے، ایک کامیاب اور خوش گوار ازدواجی زندگی کے لیے یہ بہت ضروری ہے۔“

سیالکوٹ سے ہماری بہن ام امید نے آپ کے لیے خصوصی سوال بھجوایا ہے اور یہ ہی سوال ہمیں موصول ہوا ہے، ہری پور زادہ سے ——— عالیہ راجہ کا، پوچھتی ہیں۔

○ ”فرصت کے وقت میں آپ کے کیا مشاغل ہیں؟“

☆ ”فرصت کے وقت میں بس اچھی اچھی فلمیں دیکھتا ہوں، دوستوں کے ساتھ گپ شپ لگاتا ہوں اور کبھی ہم دوست مل کر کراچی سے باہر مختلف علاقوں کی سیر کے لیے نکل جاتے ہیں، کبھی پنجاب کی طرف تو کبھی کسی اور اچھے سے تفریحی مقام کی طرف۔“

سمندری سے ابابیل اور سرگودھا سے بہن شگفتہ خان ٹوفی کا سوال ہے۔

○ ”رائٹرز خوابوں کی دنیا میں رہنے والے ہوتے ہیں، آپ کا شمار کس میں ہوتا ہے؟“

☆ ”میں بھی خوابوں کی دنیا میں رہنا پسند کرتا ہوں، کیونکہ میرے خوابوں کی دنیا بہت خوب صورت ہے، جہاں سب کچھ میری پسند اور مرضی کے عین مطابق ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ جو خواب ہوتے ہیں یہ ہمارا سرمایہ ہوتے ہیں۔“

یہ سوال ہمیں جوہر آباد سے بہن ذکیہ ابراہیم نے ارسال کیا، پوچھتی ہیں۔

○ ”کھانے پینے میں کیا پسند کرتے ہیں؟“

☆ ”کھانے پینے میں کوئی نخرہ نہیں، مچھلی، دال چاول، ناریل پانی بہت پسند ہے۔“

ان کا دوسرا سوال۔

○ ”آپ کا پسندیدہ کلر کون سا ہے؟“

☆ ”بلیک۔“

ذکیہ کا آپ سے تیسرا سوال ہے۔

○ ”آٹو گراف بک میں کیا لکھتے ہیں؟“

☆ ” With best wishes فصیح باری خان۔“

فصیح ہمارے پاس یہ سوال ہے سعدیہ ساجد اعوان کا حافظ آباد سے اور یہ ہی سوال ڈھایاں بازار بہاول نگر سے ہمیں پیاری بہن پروین افضل شاہین نے ارسال کیا ہے، پوچھتی ہیں۔

○ ”زندگی میں کوئی ایسی چیز جو آپ کبھی بھی کھونا نہیں چاہتے؟“

☆ ”میرے والدین، میرے دوست۔“

ان ہی کا آپ سے دوسرا سوال ہے۔

○ آپ نے اتنے ممالک کا وزٹ کیا، کون سی جگہ دل کے قریب لگی؟“

☆ ”اسکاٹ لینڈ۔“

حفصہ سعید گجرات سے پوچھتی ہیں اور یہ ہی ہمارے پاس آج کا آخری سوال بھی ہے۔

○ ”شوبز کی فیلڈ نئے آنے والوں کے لیے مشکل ہے آپ کی کیا رائے ہے؟“

☆ ”ایسا بالکل نہیں ہے۔ میں نے خود بھی ایک سال نجی ٹی وی کے لیے کام کیا ہے اور میرے خیال سے سات آٹھ لوگوں کو میں نے Discover بھی کیا ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ اس سلسلے میں چونکہ میں نے خود مشکل اٹھائی ہے تو مجھے دوسروں کی مشکلات کا بھی احساس ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ مجھے ہر اچھے شخص کی پہچان ہے۔ نہیں بعض اوقات ہم سے کسی کو پہچاننے میں غلطی ہو جاتی ہے۔ جیسے آپ کسی رائٹر کی ایک کہانی کو شائع نہیں کرتے، مگر وہی رائٹر کسی دوسری جگہ سے بہت شہرت حاصل کر لیتی ہے تو آپ کو لگتا ہے کہ اس کے اندر ٹیلنٹ تھا، مگر آپ پہچان نہیں پائے تو یہاں بھی ایسا ہی ہے۔“

بہت شکریہ فصیح بہت اچھی گفتگو رہی آپ سے اور اسی کے ساتھ ہم نے انٹرویو کا اختتام کیا۔

☆ ☆

مجھ سے ملیے

نادیہ امین

○ تاریخ پیدائش/اسٹار؟
☆ "23 مئی/جوزا۔"
○ "خدا سے تعلق؟"
☆ "خدا سے تعلق مجھے ہر گناہ سے دور رکھتا ہے صرف یہ خوف کہ اگر کوئی نہیں دیکھ رہا اور اللہ دیکھ رہا ہے یہی مجھے محتاط کیے رکھتا ہے ہر لمحہ اللہ کی ذات سے بخشش کی طلب مجھے اللہ کے اور زیادہ قریب کر دیتی ہے۔"
○ "فرصت کا وقت گزارنے کا پسندیدہ طریقہ؟"
☆ "دوستوں کے ساتھ وقت گزارنا۔"
○ کون سی چیز خوش گوار تاثر قائم کرتی ہے؟
☆ "جب اپنے شہر کوہاٹ جانے کی خوشخبری سنتی ہوں تب موڈ خود بخود خوشگوار ہوتا ہے۔"
○ "وہ چیز جو موڈ خراب کر دے؟"
☆ "بچوں کا ہر وقت رونا میرے موڈ کو بہت خراب کرتا ہے جب ان کا موڈ اچھا ہو تو میرا بھی اچھا ہوتا ہے۔"
○ "مشکل ترین لمحہ؟"
☆ "بیٹی کی پیدائش کے موقع پر گھر والوں میں سے کسی کا ساتھ نہ ہونا' ان دنوں کو آج بھی یاد کرتی ہوں تو بے ساختہ رونا آجاتا ہے بعد میں اگرچہ سب آ گئے تھے پر ڈلیوری کے موقع پر صرف دوستیں ہی ساتھ تھیں میرے' آج بھی میں ان کی بے حد مشکور ہوں جنہوں نے مجھے گھر والوں کی کمی محسوس نہیں ہونے دی میری بیٹی اب تین مہینے کی ہے، جس سے وہ سب بہت پیار کرتی ہیں۔"
○ "بہترین تعریف، جو وصول کی؟"
☆ "تمہارے بال ہیں یا ریشم کے لچھے۔"
○ "وقت ضائع کرنے کا بہترین طریقہ؟"
☆ "بہت زیادہ سونا۔ وقت ضائع کرنے کا بہترین طریقہ۔"
○ "زندگی کا خوفناک واقعہ؟"
☆ "ایسا کوئی واقعہ پیش نہیں آیا۔ اللہ نہ کرے کہ کبھی آئے۔"
○ "بہترین تحفہ میری نظر میں؟"
☆ "اچھی بات میرے لیے ایک بہترین تحفہ ہے۔"
○ "ایسی تاریخی شخصیت جس سے ملنا چاہوں؟"
☆ "قائداعظم سے ملنا چاہوں گی تاکہ ان کی شخصیت کا خود تجزیہ کروں اور پھر ان جیسی بڑی قائد بنوں۔" (ارے یہ کیا آپ لوگ ہنسنے لگے لطیفہ نہیں ہے بھئی۔)
○ "پسندیدہ ساتھی؟"
☆ "ایک تو حامد صاحب جو ہمارے وہ ہیں اور ایک میری بہترین دوست و کزن نگہت اشرف اور کوثر اشتیاق۔"
○ "پسندیدہ ہستی؟"
☆ "میرا بھائی اسحاق جس نے ہمیں باپ سے بڑھ کر محبت دی۔"
○ "پسندیدہ پروفیشن؟"
☆ "لیکچرار شپ۔"
○ بہترین کاوش؟
☆ "اگر میری پوچھ رہی ہیں تو ابھی تک کوئی نہیں اور اگر کسی اور بہترین کاوش کے بارے میں پوچھ رہی ہیں تو عشق کا عین۔"
○ "پسندیدہ ملکیت؟"

☆ "شوہر بچے' اپنا گھر پسندیدہ ملکیت ہے میری۔"
○ "زندگی کی خواہش؟"
☆ "کہ زیادہ لکھوں اچھا لکھوں اور بہت نام کماؤں۔"
○ "پریشان کن لمحہ؟"
☆ "جب میں ہسپتال میں تھی۔"
○ "جب موڈ ہو تو کیا کرتی ہوں؟"
☆ "کسی دوست کے گھر چلی جاتی ہوں۔"
○ "کوئی ایسا فرد جس کے سامنے کھڑی نہ رہ سکوں؟"
☆ "اپنی ماں اور اپنی ساس۔"
○ "فیشن کب مسئلہ بنتا ہے؟"
☆ "جب میری امی مجھے ٹوکتی ہیں۔ تم دن بدن لاپروا ہوتی جا رہی ہو۔ اپنا خیال رکھا کرو۔"
○ "انسان کا دل کب ٹوٹتا ہے؟"
☆ "جب انسان کے وہم و گمان میں بھی کوئی بات نہ ہو اور دوسرا اسے اپنا رنگ دے کر ہر ایک کے سامنے بیان کرے۔"
○ "کیا چیز جذباتی کر دیتی ہے؟"
☆ "جب چھوٹے بچوں پر جنسی تشدد کیا جائے تو یہ دیکھ کر بہت جذباتی ہو جاتی ہوں دل کرتا ہے ایسے انسانوں کا اپنے ہاتھوں سے خون کروں۔"
○ "زندگی کا یادگار دن؟"
☆ "جب اپنا گھر بنایا تھا اور وہاں شفٹ ہوئے تھے وہ دن کبھی بھول نہیں سکتی۔ اب بھی جب کوہاٹ جاتی ہوں اپنے گھر ایک چکر ضرور لگاتی ہوں۔"
○ "موسیقی میرے نزدیک؟"
☆ "بس ٹھیک ہے کچھ خاص نہیں۔"
○ "پسندیدہ گانا؟"
☆ "تیرے لیے جھوموں دیوانہ بن کے تیرے لیے۔" یہ گانا اس لیے بھی پسند ہے کہ میری دونوں بیٹیوں اجالا اور سحر کو بہت پسند ہے۔
○ "پسندیدہ فقرہ؟"
☆ "تم نے تو کمال کیا ہے۔"
○ "پسندیدہ کردار؟"
☆ "باری کا کردار" (دل دیا دہلیز)
○ "سب سے زیادہ عزیز اور قیمتی اثاثہ؟"
☆ "والدین' شوہر' بچے۔"
○ "اچھا اور خوب صورت موسم؟"
☆ "موسم سرما کے اوائل مہینے۔"
○ "ناقابل فراموش واقعہ؟"
☆ "ایک قریبی رشتہ دار کی خودکشی کا واقعہ۔"
○ "پہلی کاوش شائع ہونے پر تاثرات؟"
☆ "خوشی کے مارے پاگل ہونے کا اندیشہ تھا۔ وہ دن تو میں کبھی بھلا نہ پاؤں گی۔ جب جون کی صبح آٹھ بجے میں نے کرن میں اپنا پہلا ناول دیکھا تھا۔ اس دن خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا اپنی بھابھیوں' بھائیوں' بھتیجے' بھتیجیوں غرض سب کو دکھایا تھا اور سب نے اس خوشی میں میرا ساتھ دیا تھا میری کزن نگہت گاؤں سے فوراً شہر ہمارے گھر پہنچی تھی اور مجھے داد دی تھی۔"
○ "وہ رات جو کبھی نہ بھولے گی؟"
☆ "ہسپتال میں گزری دو راتیں۔"
○ "میرا خواب؟"
☆ "بہترین مصنفہ کا اعزاز۔"
○ "پسندیدہ مزاح؟"
☆ "ڈاکٹر یونس بٹ۔"
○ "حسد محسوس کرتی ہوں؟"
☆ "حسد کرنے والوں سے۔"
○ "خوشبو پسند ہے تو کیوں؟"
☆ "مجھے خوشبوؤں سے کوئی خاص شغف نہیں۔"
○ "پسندیدہ خوشبو؟"
☆ "خوشبو نہیں لگاتی۔" اتنی مذہبی نہیں ہوں پر اس معاملے میں ہوں۔
○ آخری کتاب جو میں نے پڑھی ہو؟
☆ "عشق کا عین۔"
○ پسندیدہ جگہ؟

بقیہ صفحہ 260 پر

نبیلہ عزیز

دو دل
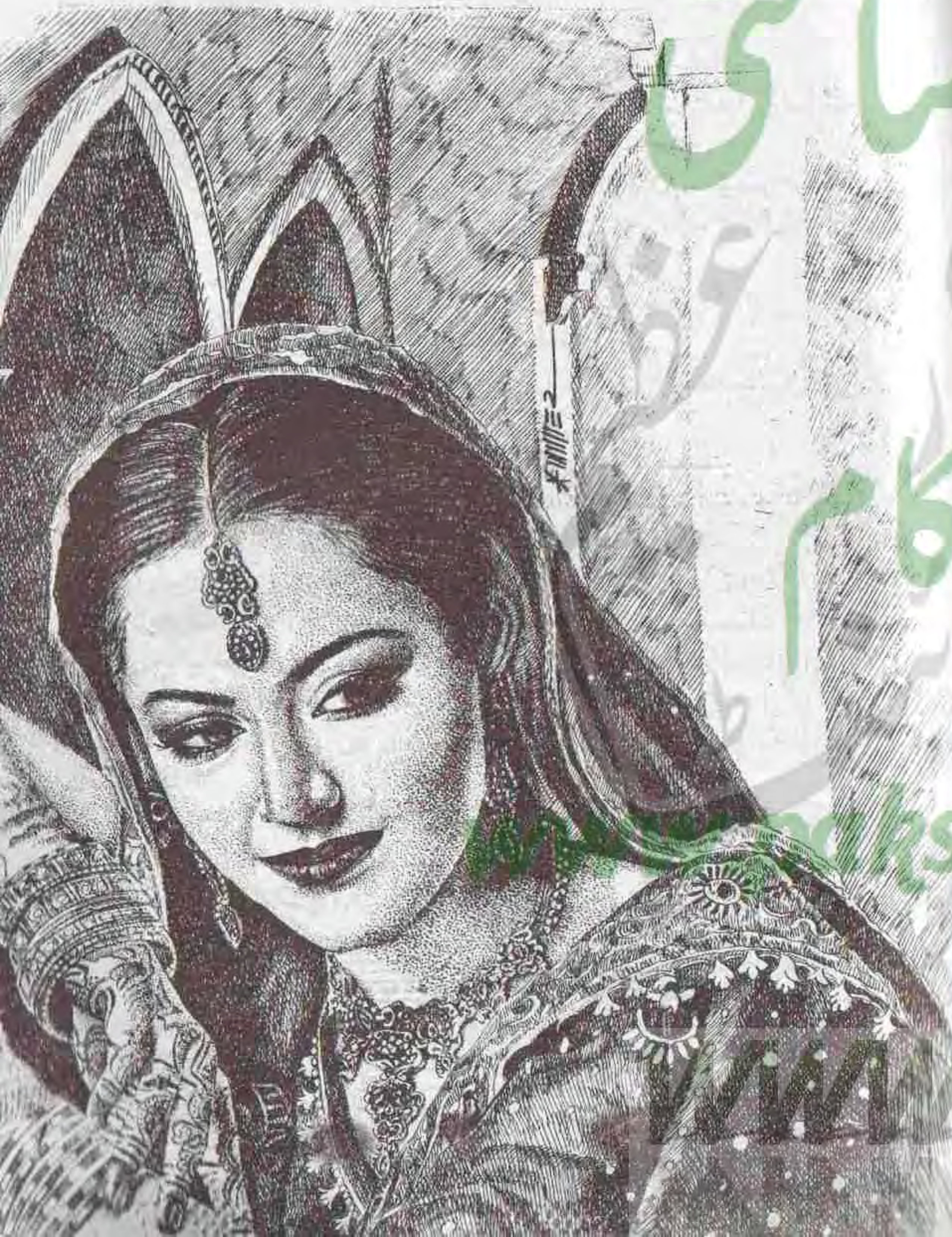
بڑی حویلی کے تمام مکین وقار آفندی سے بڑی عقیدت اور محبت رکھتے ہیں اور علیزے تو اپنے بابا کی شخصیت سے بہت ہی متاثر ہے۔

مدحیہ اور نبیل حیات دو ہی بہن بھائی ہیں' مدحیہ انتہائی بگڑی ہوئی اور خود سر لڑکی ہے' وہ انگلینڈ کی رنگینیوں میں مکمل طور پہ رنگ چکی ہے' جس کے پیش نظر فائزہ بیگم' نبیل کو پاکستان شفٹ ہونے کا مشورہ دیتی ہیں' لیکن مدحیہ پاکستان جانے سے انکار کر دیتی ہے' جس پہ نبیل اور فائزہ بیگم بے حد پریشان ہیں۔

زری کو اپنے بھائی عبداللہ کے دوست سے محبت ہے' مگر وہ کسی کو بھی اس راز میں شامل نہیں کرنا چاہتی اور یہ جذبہ اندر ہی اندر پنپ رہا ہے۔

عدیل کافی عرصہ سے نوکری کی تلاش میں ہے' مگر ہر روز مایوسی اور ناکامی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا' بے بسی اور مجبوری سے تنگ آ کر خودکشی کرنے کا سوچتا ہے' لیکن ایسے میں ایک روز اسے ڈھابے میں چائے پیتے ہوئے باؤ امتیاز مل جاتا ہے' جو اسے کام کی آفر کرتا ہے' جس پر عدیل کافی خوش ہوتا ہے' اسی خوشی میں وہ کام کی بابت پوچھنا بھول جاتا ہے۔

منصور حسین ایک غریب اور میٹرک پاس آدمی ہے' وہ مبارک خان کے توسط سے بڑی حویلی میں وقار آفندی سے نوکری مانگنے آتا ہے' وقار آفندی کوئی بھی جگہ خالی نہ ہونے کے باعث اسے دوبارہ آنے کا کہہ کر واپس بھیج دیتے ہیں اور وہ مایوسی سے واپس لوٹ جاتا ہے۔

دل آور شاہ کا شمار ملک کے بہترین اور منجھے ہوئے وکیلوں میں ہوتا ہے' وہ اپنے قول و فعل کا بہت پکا آدمی ہے' اس نے کبھی ہارنا نہیں سیکھا' اس کی ماں بتول شاہ کو اپنے بیٹے کی قابلیت اور ذہانت پہ بہت بھروسہ ہے اور اس کا یقین وہ دوسروں کو بھی دیتی ہیں۔

۱۶

سولہویں قسط

"تم ہمیں دھمکی دے رہے ہو ہمیں..... ؟ ملک اسد اللہ کو؟" ان کی بلند اور گرجدار آواز در و دیوار ہلا دینے کی پوری صلاحیت رکھتی تھی لیکن اس وقت تو ان کی آواز نے در و دیوار کے ساتھ ساتھ زری اور نگارش کو بھی دہلا کے رکھ دیا تھا' کیونکہ ان کی خونخوار آنکھوں میں حقیقتاً" خون اترا ہوا تھا وہ تو جیسے ان تینوں کو اپنی آنکھوں سے ہی نگل جانے کے درپے ہو رہے تھے اور ان کا پہلا ہدف عبداللہ ہی تھا۔

"ہمارے درمیان ایسی تو کوئی بات ہی نہیں ہوئی جس پہ میں آپ کو دھمکی دوں گا۔" عبداللہ نے کندھے اچکاتے ہوئے لاپروائی سے کہا۔

"بات نہیں ہوئی لیکن تم نے بات کا اشارہ ضرور دیا ہے۔" وہ غصے سے چبا کر بولے تھے۔

"اوہ! تو آپ اشارہ بھی سمجھتے ہیں؟" اس نے حیرانی کا اظہار کیا جس پہ ملک اسد اللہ اور بھی بھڑک اٹھے۔

"تم کہنا کیا چاہتے ہو..... ؟" ان کا مزاج برہم اور تیور خاصے خطرناک ہو رہے تھے۔

"آپ خود سمجھ دار ہیں' میرا اشارہ سمجھ چکے ہیں کہ میں کیا کہنا چاہتا ہوں بالکل ایسے جیسے میں آپ کا اشارہ سمجھ چکا ہوں' کیونکہ میں بھی آپ کا ہی بھائی ہوں' سمجھ داری ورثے میں ملی ہے۔" عبداللہ کا اطمینان اور سکون برقرار تھا۔

"لیکن تمہاری سمجھ داری کا وقت ختم ہو چکا ہے' اب ہماری باری ہے' اب وہی ہو گا جو ہماری سمجھ داری کہے گی۔" انہوں نے دائیں ہاتھ سے اپنی سمت اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"اچھا! تو پھر کیا کہتی ہے آپ کی سمجھ داری؟ کیا ہونا چاہیے؟" وہ بھنویں سکیڑتے ہوئے انہیں سوالیہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

"بتائیں تمہیں کہ ہماری سمجھ داری کیا کہہ رہی ہے..... ؟" وہ سختی سے پوچھ رہے تھے۔

"جی حضور! میں ہمہ تن گوش ہوں۔" عبداللہ نے فوراً" اثبات میں سر ہلایا۔

"تم دونوں اندر جاؤ۔" انہوں نے زری اور نگارش کو بیڈ روم میں جانے کا اشارہ کیا۔

"نہیں! یہ دونوں کہیں نہیں جائیں گی' یہیں رہیں گی' یہ دونوں پڑھی لکھی اور سمجھ دار لڑکیاں ہیں' چھوٹی بچیاں نہیں ہیں کہ ان سے کوئی بڑی بات چھپائی جائے' آپ نے جو بات کہنی ہے صاف صاف کہیے' ہم سب سن رہے ہیں۔" عبداللہ نے ان دونوں کو جانے سے روک دیا تھا حالانکہ زری وہاں سے اٹھ جانا چاہتی تھی اس کی جان سولی پہ لٹکی ہوئی تھی وہ ایسی سنگین سچویشن فیس نہیں کر سکتی تھی اس کی حالت غیر ہو رہی تھی لیکن نگارش وہاں سے اٹھنے کے لیے تیار نہیں تھی وہ ان دونوں بھائیوں کی جنگ لائیو دیکھنا چاہتی تھی کیونکہ معاملہ بہت نازک اور گمبھیر ہو چکا تھا۔

"تم سب سن نہیں رہے بلکہ یہ کہو کہ تم سب بے حیا ہو گئے ہو' بے غیرت ہو گئے ہو تم۔" وہ عبداللہ کی سمت دیکھتے ہوئے غضب ناک انداز میں دھاڑے تھے۔

"خبردار بھائی صاحب! بہت ہو گئی عزت اور غیرت کی تکرار..... میں آپ کو مزید اپنی انسلٹ کرنے کی اجازت نہیں دے سکتا' میں اگر بے غیرت ہوں تو آپ کہاں کے غیرت مند ہیں..... ؟ کیا ملک حق نواز کے ہاتھ میں اپنی بہن کا ہاتھ تھما دینا غیرت کہلاتا ہے آپ کی نظر میں' وہ ملک حق نواز جو سات سال پہلے آپ کی ہمشیرہ شہرین بی بی کا ہاتھ آپ کی کوشش کے باوجود دھتکار چکا ہے' ٹھکرا چکا ہے آپ کی بہن کو اور آپ اب اسی ملک حق نواز کے ہاتھ میں اپنی دوسری بہن کا ہاتھ تھمانا چاہتے ہیں..... ؟ کیا یہی غیرت مندی کا ثبوت ہے..... کیا میں بھی آپ جیسا غیرت مند بن جاؤں؟ نام نہاد غیرت مند' جس نے اپنی جاگیر اور اپنی پارٹی بڑھانے کے لیے اپنی بہنوں کی زندگیاں برباد کرنے کا ٹھیکہ لے رکھا ہے..... ؟

اگر آپ کو اپنی بہنوں سے کوئی ذاتی پرخاش تھی تو آپ کو چاہیے تھا کہ آپ انہیں زہر دے کر مار دیتے کم از کم وہ ایسی ذلت کی زندگی جینے سے تو بچ جاتیں۔" اب کی بار عبداللہ نے جواب دیا تو انہی کے سے انداز میں' وہ سیر کو سوا سیر ثابت ہوا تھا۔

"جس کی قسمت' جس کا مقدر جہاں لکھا ہو گا وہیں شادی ہو گی نا؟ اس میں ہمارا کیا قصور ہے..... ؟ ہر انسان کا نصیب تو پہلے سے لکھا جا چکا ہے۔" ملک اسد اللہ نے جیسے دامن جھاڑا تھا اور سارا الزام ان کی قسمت اور ان کے نصیب کے ذمے ڈال دیا تھا۔

"ہونہہ! اگر ہر انسان کا نصیب اس کا مقدر پہلے سے لکھا جا چکا ہے تو پھر آپ کو اتنا تردد کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ سب کچھ مقدر پہ چھوڑ دیں' جو جس کا مقدر ہو گا اسے مل جائے گا....." عبداللہ نے انہیں لاجواب کر ڈالا تھا لیکن وہ پھر بھی ہار ماننے والے نہیں تھے۔

"لیکن زرین ملک کا نصیب ملک حق نواز کے ساتھ لکھا جا چکا ہے اور اس نصیب کو جڑنے سے کوئی نہیں روک سکتا' نہ تم' نہ کوئی اور۔" انہوں نے اک قہر بھری نظر عبداللہ پہ اور دوسری زری پہ ڈالی تھی وہ ساکت و صامت سی بیٹھی تھی' ملک حق نواز کا نام اس کے کانوں میں پگھلے ہوئے سیسے کی مانند اترا تھا' شہرین کو ٹھکرانے والے کے ساتھ زرین کو جوڑا جا رہا تھا' یہ رشتہ تھا یا عمر بھر کا پھندا..... ؟

"ملک حق نواز ایک بار مرے اور دوبارہ پیدا ہونے کے بعد ہر گناہ سے پاک صاف ہو کر بھی سامنے آئے تو میں تب بھی اپنی بہن کا نصیب اس کے ساتھ جڑنے نہیں دوں گا' آپ چاہے جتنے مرضی جتن کر لیں' زری کی شادی ملک حق نواز کے ساتھ ہرگز نہیں ہو گی' چاہے اس کے لیے آپ مجھے گولی مار دیں۔" عبداللہ نے دو ٹوک کہتے ہوئے انہیں اپنا فیصلہ سنا دیا تھا اور ملک اسد اللہ اپنی جگہ سے اٹھ کر عبداللہ کے سامنے آ کھڑے ہوئے تھے۔

"ضد اور انا کا مسئلہ آ جائے تو گولی مارنا ہمارے لیے مشکل بھی نہیں ہے ملک عبداللہ صاحب' سامنے چاہے تم جیسا جوان گھبرو بھائی ہو' چاہے زرین ملک جیسی جوان بہن ہو' ہماری گولی بس نشانہ دیکھتی ہے' رشتہ یا تعلق نہیں دیکھتی۔" انہوں نے عبداللہ کے کندھے پہ ہاتھ رکھ کے دبایا تھا۔

"اور آپ کو یہ بھی پتا ہو گا کہ گولی سے ڈرنے والے جراثیم ہم میں بھی نہیں ہیں' اگر آپ حق بات کو ضد اور انا کا مسئلہ بنا رہے ہیں تو ایسے ہی سہی۔" اس نے کندھے اچکائے تھے۔

"اسے پاکستان بھیجو' سارے فیصلے خود بخود ہو جائیں گے۔"

"اسے پاکستان بھیجوں گا نہیں' اسے پاکستان لے کر جاؤں گا' خود اپنے ساتھ۔" عبداللہ نے اپنی طرف اشارہ کیا اور ملک اسد اللہ چونک اٹھے تھے وہ خود پاکستان جانے کا کہہ رہا تھا تو گویا وہ واقعی اس مسئلے میں پوری طرح ٹانگ اڑانا چاہتا تھا۔

"تم پاکستان جاؤ گے؟"

"جی! آپ کو کوئی اعتراض ہے؟"

"تم حویلی میں قدم بھی نہیں رکھ سکتے۔"

"تو آپ سے کس نے کہا کہ میں حویلی میں قدم رکھوں گا؟" عبداللہ کا انداز ان سے بھی زیادہ روکھا اور نپا تلا سا تھا۔ وہ اس کی بات پہ ایک بار پھر چونکے تھے۔

"کیا مطلب ہے تمہارا؟"

"میرا مطلب کیا ہو سکتا ہے بھائی صاحب' مطلب تو سارے آپ کے ہوتے ہیں' آپ لوگوں نے ہی تو شرط رکھی ہے کہ میں اپنی بیوی کو طلاق دوں گا تو تبھی حویلی میں قدم رکھ سکوں گا' اب یہ تو ہو نہیں سکتا کہ میں اپنی بیوی

کو طلاق دوں اور یہ بھی نہیں ہو سکتا کہ میں حویلی میں قدم رکھ سکوں، لیکن اس بات پہ تو پابندی نہیں ہے نا کہ میں پاکستان میں بھی قدم نہیں رکھ سکتا، اتنا بڑا پاکستان آخر کس کام آئے گا؟ پاکستان میں دل آور شاہ اور نبیل حیات کے اپنے گھر ہو سکتے ہیں تو ملک عبداللہ کا اپنا گھر بھی ہو سکتا ہے اور اس گھر میں ملک عبداللہ کی بہن ساری زندگی بھی رہنا چاہے تو با آسانی رہ سکتی ہے، اپنی بہن کا بوجھ اٹھا سکتا ہوں میں، اللہ کے کرم سے۔ بہت دم ہے بازوؤں میں، کمزور یا لاغر نہیں ہوں۔" عبداللہ نے انہیں اپنے ارادوں سے آگاہ کیا تھا..... اور وہ تپ گئے تھے۔

"تم غلط کر رہے ہو ملک عبداللہ، اپنوں سے ٹکر لینے میں ہمیشہ نقصان ہوتا ہے۔"

"یہی تو میں کہہ رہا ہوں آپ سے کہ اپنے سے ٹکر نہ ہی لیں تو اچھا ہے، ورنہ نقصان ہی ہو گا۔" وہ بھی ان کی باتوں کے گھیرے میں آنے والا نہیں تھا۔

"ہم یہاں زرین کو لینے کے لیے آئے ہیں اور اپنے ساتھ لے کر ہی جائیں گے، تم چاہے کچھ بھی کر لو۔" انہوں نے دانت پیس کے کہا اور اپنا رخ زری کی سمت موڑ لیا تھا۔

"اور تم بھی کان کھول کر سن لو، آج تمہارا پہلا پیپر تھا، اسی لیے ہم آج تمہیں یہی بتانے آئے ہیں کہ ہم تمہارے آخری پیپر کا انتظار کر رہے ہیں، ختم کرو یہ پڑھائی کا بکھیڑا اور واپس پاکستان چلو، ورنہ کیا ہو گا تم سوچ بھی نہیں سکتیں۔" وہ کہہ کر پلٹے اور ڈرائنگ روم سے نکل گئے تھے عبداللہ چاہنے کے باوجود انہیں روک نہیں سکا تھا اور زری ان کی دھمکی پہ خاک کا ڈھیر ہو گئی تھی اس کا جسم سوکھے پتے کی طرح لرز رہا تھا نگارش الگ پریشان تھی اور عبداللہ ڈرائنگ روم کے بیچوں بیچ کھڑا گہری سوچ کا شکار تھا، اسے اپنے سامنے ایک کھلی جنگ نظر آ رہی تھی اور ضد اور انا کی اس جنگ میں کیا نفع تھا کیا نقصان؟ یہ تو کوئی نہیں جانتا تھا۔

☼ ☼ ☼

"بھائی..... کیا دیکھ رہے ہیں آپ.....؟" جودت نے سامنے ونڈ اسکرین پہ نظریں جمائے ڈرائیو کرتے آذر سے سوال کیا تھا۔

"کیا مطلب.....؟" آذر نے ذرا کی ذرا گردن موڑ کر جودت کو دیکھا جو اس کے برابر ہی فرنٹ سیٹ پہ بیٹھا ہوا تھا

"مطلب کہ منصور حسین ڈرائیونگ میں کمال کی مہارت رکھتا ہے، اس کی ڈرائیونگ دیکھ رہے ہیں آپ.....؟ گاڑی روڈ پہ نہیں پانی پہ پھسلتی ہوئی محسوس ہو رہی ہے، لگتا ہے، بہت ماہر ہے اس چیز میں؟" جودت پچھلے تین گھنٹے سے اس فرنٹ سیٹ پہ بیٹھا یہی اک چیز نوٹ کر رہا تھا اور آخر سراہے بغیر رہ نہیں سکا تھا۔

"ہوں! میں بھی یہی دیکھ رہا تھا، واقعی بہت مہارت ہے اسے، اور اس کی مہارت نظر بھی آ رہی ہے، جس رش سے گاڑی نکالنا ہمارے لیے بھی مشکل ہو جاتا ہے، وہ وہاں سے بھی آسانی سے نکل جاتا ہے، اس نے ایک بار بھی گاڑی کے ٹائروں کو بے ربط نہیں ہونے دیا، بالکل برابر جا رہے ہیں۔" آذر نے بھی اس کی تعریف کرتے ہوئے بخل سے کام نہیں لیا تھا بلکہ کھل کر سراہا تھا..... ان دونوں بھائیوں کی نظریں سامنے روڈ پہ پھسلتی علیزے کی گاڑی پہ ہی تھیں، جو کبھی کبھی تیز رفتاری کی وجہ سے ان کی آنکھوں سے اوجھل بھی ہو جاتی تھی۔

"آخر ڈرائیور کس کا ہے؟ مہارت تو ہو گی.....؟ ڈیڈ نے بھی تو چن کے ڈرائیور رکھا ہو گا اسے۔" جودت مسکرا کے کہہ رہا تھا۔

"بھائی.....!" حرمت نے آذر کو پکارا۔

"جی؟"

"کیوں.....؟"

"وہ کومل کو بھوک لگی ہے، کچھ کھانا چاہتی ہے۔" حرمت نے آہستگی سے بتایا۔

"کومل کو بھوک لگی ہے.....؟ تمہیں کیسے پتا؟ ان کی گاڑی تو پیچھے آ رہی ہے.....؟" آذر نا سمجھی سے پوچھ رہا تھا۔

"اس نے میرے نمبر پہ میسج کیا ہے۔" حرمت نے کومل کے بتانے کا ذریعہ بتایا۔

"اوہ اچھا....." آذر نے سمجھتے ہوئے سر ہلایا تھا۔

"کومل آپا غصے کی بہت تیز اور بھوک کی بہت پکی ہیں، اس لیے جلدی انتظام کر لیجیے بھائی جی۔" حرمت نے ہنستے ہوئے چھیڑا تھا لیکن آذر اس کی ذو معنی بات کی گہرائی تک نہیں جا سکا تھا بلکہ اس کا انداز بہت سرسری سا تھا۔

"اب تو اسلام آباد پہنچ کر ہی کچھ ہو گا، یہاں نزدیک تو کوئی ریسٹورنٹ نہیں ہے۔" آذر نے نفی میں گردن ہلائی۔

"اسلام آباد پہنچنے میں کتنا ٹائم ہے۔" حرمت نے کومل کا دوسرا میسج پڑھ کے آذر سے پوچھا تھا۔

"بس تھوڑا ٹائم ہی رہ گیا ہے۔" آذر نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا اور اسے تسلی دی تھی۔

"بھوک تو مجھے بھی لگ رہی ہے اور اسلام آباد کے سیور سے کھانا کھانے کا موڈ ہو رہا ہے۔" جودت نے انگڑائی لیتے ہوئے سستی سے کہا۔

"سیور کا کھانا نہیں بریانی مشہور ہے اور بریانی بھی ہر قسم کی۔" آذر نے اس کی بات کی تصحیح کی تھی۔

"جی ہاں! میں بھی بریانی کھانے کا ہی کہہ رہا تھا وہاں کی بریانی ہی تو مشہور ہے۔" جودت بھی جانتا تھا کیونکہ اپنے دوستوں کے ساتھ وہ پہلے بھی کئی بار اس طرف آیا تھا اور ہمیشہ وہ لوگ سیور پہ ضرور جاتے تھے۔

"چلو پھر آج سیور پہ ہی سہی۔" آذر بھی وہیں جانے پہ آمادہ تھا اور گاڑی کی اسپیڈ بڑھا دی تھی اور ساتھ ہی موبائل اٹھا کر منصور حسین کو بھی سیور پہ جانے کی اطلاع دی تھی تاکہ وہ اسی سائیڈ پہ ٹرن لے، اس نے سعادت مندی سے اوکے کہتے ہوئے فون بند کر دیا تھا۔

☼ ☼ ☼

سیور سے اپنی پسند کی بریانی کھانے کے بعد ان لوگوں نے بیکرز کا رخ کیا تھا جو سیور سے زیادہ دور نہیں تھا وہاں کی کولڈ کافی آذر کو بہت پسند تھی وہ جب بھی کسی کام کے سلسلے میں اسلام آباد آتا تھا بیکرز سے کافی پیے بغیر نہیں جاتا تھا وہ چاروں گاڑیاں پارکنگ میں پارک کرنے کے بعد گاڑیوں سے اتر آئے تھے البتہ لڑکیاں گاڑیوں میں ہی بیٹھی ہوئی تھیں۔ آذر نے پارکنگ میں پھرتے ویٹرز کو آرڈر لینے کے لیے گاڑیوں کی سمت اشارہ کیا ویٹرز مینو بک ہاتھ میں لیے الرٹ کھڑے تھے اشارہ ملتے ہی سر خم کر دیا اور فوراً ہی گاڑیوں کی سمت بڑھ گئے، البتہ آذر خود علیزے کی گاڑی کی سمت آ گیا۔ منور حسین نے آذر کو دیکھتے ہی علیزے کی سائیڈ کا شیشہ فولڈ کر دیا تھا۔

"کافی پیو گی....." اس نے کھڑکی میں جھکتے ہوئے علیزے سے پوچھا۔

"آپ کو پتا ہے میں کافی نہیں پی سکتی، اتنی کڑواہٹ مجھ سے برداشت نہیں ہوتی۔" اس نے منہ بنایا تھا۔

"کولڈ کافی ہے یار....." آذر مسکراتے ہوئے اسے کافی پینے پہ آمادہ کر رہا تھا۔

"ہے تو کافی نا.....؟" وہ کافی پینے کو تیار نہیں تھی۔

"یار! بہت بزدل ہو تم کافی پینے سے بھی ڈرتی ہو، ایک بار ٹرائی کر کے تو دیکھو۔" وہ اسے اکسا رہا تھا۔

"اوکے! لے آئیں۔" بالآخر وہ مان گئی تھی۔
"منصور حسین! تم کیا لو گے؟"
"ضرورت نہیں ہے صاحب جی! ابھی تو کھانا کھایا ہے۔" اس نے انکار کر دیا تھا۔
"اوکے۔" آذر پلٹ کر اندر چلا گیا احمد، حماد، جودت، دانیال اور زین پانچوں اس کے پہنچنے تک اپنا آرڈر تیار کروا چکے تھے۔
"ایک کپ علیزے کے لیے بھی۔" دانیال کے ہاتھ سے اپنا کپ تھامتے ہوئے آذر نے دانیال کو ایک اور کپ تیار کروانے کا کہا۔
"علیزے اور کافی....؟ دو متضاد چیزیں ہیں یار؟" دانیال کو حیرانی ہوئی۔
"آئی نو یار! بٹ میں نے کہا ہے تو وہ ضرور پیے گی۔" آذر کافی کے بڑے سے کپ میں اسٹرا اور اسپون انسرٹ کرتے ہوئے مسکرا کے بولا۔
"اوہ! تو وہ تمہارے کہنے پہ کافی پی رہی ہے....؟" دانیال نے آذر کے چہرے کو بغور دیکھتے ہوئے کافی ذومعنی لہجے میں پوچھا تھا۔
"کیوں نہیں پینی چاہیے؟" الٹا آذر نے اس سے پوچھ لیا تھا۔
"ارے نہیں نہیں یار! پینی چاہیے ضرور پینی چاہیے، لیکن یار اتنا ضرور یاد رکھنا کہ ابھی آدھا سفر باقی ہے، کوئی مسئلہ نہ کھڑا ہو جائے۔" دانیال بھی اپنے آئس شیک سے لطف اندوز ہوتے ہوئے کہہ رہا تھا۔
"ڈونٹ وری یار! میں نے سوچا وہ پہلی بار ہمارے ساتھ آئی ہے، کھائے پیئے انجوائے کرے، صرف گھومنا پھرنا ہی تو ایڈونچر نہیں ہے، اس کے لیے تو کافی پینا بھی ایڈونچر ہی ہو گا۔" آذر علیزے کو اس ٹرپ کے تمام رنگ قریب سے دکھانا اور انجوائے کروانا چاہتا تھا اور اس کے لیے ضروری تھا کہ اسے اپنے ساتھ ہر کام میں شامل کیا جانا چاہیے زبردستی اور اصرار کر کے ہی سہی۔
"لیجیے، میم! آپ کی کافی۔" آذر نے علیزے کی سائیڈ پہ کھڑکی میں جھکتے ہوئے کہا تھا۔
"تھینکس۔" علیزے نے مسکراتے ہوئے کپ تھام لیا تھا۔
"اوکے انجوائے کرو۔" آذر تمام آرڈرز کا بل پے کرنے کے لیے واپس پلٹ گیا تھا۔
لیکن جیسے ہی علیزے نے اسٹرا کے ذریعے کولڈ کافی اپنے حلق سے نیچے اتاری تھی اس کے چہرے کے زاویے بگڑ گئے تھے اسے یوں لگا جیسے اس نے زہر پی لیا ہو اسے، بہت زور کی ابکائی آئی تھی وہ اک جھٹکے سے گاڑی کا دروازہ کھول کے نیچے اتر آئی اس نے منہ میں بھرا ہوا مشروب نیچے اگل دیا تھا اور کڑواہٹ کی وجہ سے اس کے منہ کا ذائقہ بھی خراب ہو گیا اور اسے ابکائی آنے لگی تھی اس کی زور زور سے ابکائی کی آواز پہ اندر کی سمت بڑھتا آذر یکدم کرنٹ کھا کے پیچھے کی طرف پلٹا تھا۔
"علیزے۔" وہ اسے پارکنگ کے فٹ پاتھ کے قریب جھکی ابکائی کرتی ہوئی نظر آئی تھی اور وہ اسے دیکھ کر گھبرا گیا تھا۔
"اوہ مائی گاڈ! یہ میں نے کیا کر دیا؟" وہ اپنے آپ کو سرزنش کرتے ہوئے لپک کے اس کے قریب آیا تھا اتنے میں رجو بھی گاڑی سے نکل کر علیزے کو تھام چکی تھی۔
"کیا ہوا علیزے؟ تم ٹھیک تو ہو؟" آذر نے اس کا دوسرا بازو تھام لیا تھا۔
"وہ.... وہ کافی اتنی کڑوی۔" علیزے کو اپنی زبان، اپنا منہ بے حد کڑوا محسوس ہو رہا تھا۔
"رجو! گاڑی سے پانی کی بوتل لے کر آؤ۔" آذر نے رجو کو اشارہ کیا۔

"جی صاحب....." رجو لپک کے گاڑی کے اندر گھس گئی اور فوراً پانی کی بوتل نکال لائی تھی۔
"یہ لو۔" آذر نے ڈھکن کھول کر بوتل اس کی سمت بڑھا دی اور علیزے نے کلی کرنے کے بعد پانی پیا تھا لیکن اس کے منہ کا ذائقہ پھر بھی بہتر نہیں ہوا تھا۔
"کیا ہوا ہے اسے؟" اتنے میں دانیال اور جودت وغیرہ بھی وہیں آ گئے تھے..... وہ علیزے کی سمت متفکر سی نظروں سے دیکھ رہے تھے آذر نے ایک ہاتھ میں منرل واٹر کی بوتل تھام رکھی تھی اور دوسرے ہاتھ سے اپنی جیب سے رومال نکال کے اس کی سمت بڑھا رہا تھا..... نیچے فرش پہ کولڈ کافی کا کپ اوندھا پڑا تھا جس کی وجہ سے فرش گندا ہو رہا تھا عجیب سی سچویشن تھی یہاں لیکن دانیال بغیر بتائے ہی جان چکا تھا کہ یہاں کیا ہوا ہے۔
"میں نے کہا تھا نا آذر صاحب! ابھی آدھا سفر باقی ہے....؟" دانیال نے اسے متوجہ کرتے ہوئے چوٹ کی تھی اور کافی چھیڑنے والے انداز میں اسے دیکھا تھا۔
"یہ باتیں بعد میں کرنا پہلے اس کے لیے جوس لے کر آؤ۔" آذر نے دانیال کو گھور کے دیکھا تھا اور دانیال مسکرا دیا..... وہ کندھے اچکا کر پلٹ کے اندر چلا گیا تھا۔
"کیا ہوا ہے علیزے کو.....؟" عائشہ آفندی ان کو علیزے کی گاڑی کے قریب کھڑے دیکھ کر اپنی گاڑی سے اتر آئی تھیں۔
"کچھ نہیں ہوا پھوپھو، ٹھیک ہے یہ۔" آذر خود ہی سب کو تسلیاں دے رہا تھا کیونکہ غلطی اس سے ہوئی تھی اس لیے ہینڈل بھی اسی نے کرنی تھی اور علیزے، آذر کے چہرے کے گھبرائے ہوئے تاثرات دیکھ کر اس کی پریشانی سمجھ گئی تھی اس لیے اسے اس گھبراہٹ اور پریشانی سے نکالنے کے لیے اسے اپنا آپ کنٹرول کرنا پڑا تھا۔
"لیکن کچھ تو ہوا ہے نا.....؟" عائشہ آفندی بھی پریشان ہو چکی تھیں۔
"اٹس اوکے پھوپھو! میں بالکل ٹھیک ہوں، بس یہ تھوڑی سی کافی پی ہے تو اچھی نہیں لگی، اس لیے آذر بھائی نے اب جوس منگوایا ہے۔" علیزے نے انہیں مطمئن کرنے کے لیے خود انہیں تسلی دی تھی۔
"لیجیے جناب، جوس حاضر ہے۔" دانیال جوس لے کر بہت جلدی واپس آیا تھا۔
"تھینک یو....." علیزے نے مسکراتے ہوئے کہا اور جوس کا مگ تھام لیا تھا۔
"اسی طرح مسکراتی رہا کرو یار، تمہاری ذرا سی تکلیف ہماری جان نکال دیتی ہے۔" دانیال بھی جواباً مسکرا کے بولا تھا۔
"میں بہت کوشش کرتی ہوں کہ آپ لوگوں کی جان نہ نکالوں، مگر پھر بھی....." وہ جملہ ادھورا چھوڑتے ہوئے دلچسپی اور شرارت سے ہنس پڑی تھی۔
"مگر پھر بھی نکال ہی دیتی ہو۔" دانیال اس کا ادھورا جملہ مکمل کرتے ہوئے یکدم قہقہہ لگا کے ہنسا تھا جس پہ علیزے، عائشہ آفندی، آذر اور جودت بھی اپنی مسکراہٹ روک نہیں پائے تھے۔
"آپ لوگ گاڑی میں بیٹھیں میں تب تک بل کلیئر کروا کے آتا ہوں۔" آذر کہہ کے وہاں سے چلا گیا اور گاڑیوں سے نکلی ہوئی عوام دوبارہ اپنی اپنی جگہ سنبھال چکی تھی لیکن اپنی گاڑی کی طرف بڑھتی ہوئی علیزے کو دیکھ کر جودت کے دل میں نہ جانے کیا سمائی کہ وہ اس سے لفٹ مانگ بیٹھا تھا۔
"کیا میں بھی مرسیڈیز کا مزا لے سکتا ہوں؟" وہ شرارت سے کہتے ہوئے علیزے سے پوچھ رہا تھا۔
"ارے کیوں نہیں جودت بھائی، آپ ہمیں جوائن کر سکتے ہیں۔" علیزے خوش ہو کر بولی تھی اسے اپنے سارے کزنز سے محبت تھی کیونکہ سب کزنز کو اس سے جو محبت تھی اتنا چاہتے تھے اسے.....! منصور حسین نے گاڑی کی لیفٹ سائیڈ کی طرف جھکتے ہوئے فرنٹ ڈور کھول دیا تھا۔

"آہا! اس میں بیٹھنے کا تو مزا ہی کچھ اور ہے۔" جودت نے کھل کے اظہار کیا تھا۔
"گاڑی نکالو منصور حسین۔" آذر نے اندر سے آتے ہی ان لوگوں کو نکلنے کا سگنل دیا تھا اور منصور حسین نے گاڑی کے شیشے چڑھاتے ہوئے گاڑی اسٹارٹ کرلی تھی۔
"اب کہاں چلنا ہے صاحب.....؟" منصور حسین نے گاڑی روڈ پہ ڈالنے سے پہلے جودت سے پوچھا تھا۔
"مجھ سے نہیں' اپنی میڈم سے پوچھو' میں تو اس گاڑی میں مہمان ہوں۔" جودت نے لاپروائی سے کہتے ہوئے کندھے اچکائے تھے اور منصور حسین کی نظروں کا اور سوال کا رخ علیزے کی طرف ہو گیا تھا اس نے بیک ویو مرر سے علیزے کی سمت دیکھا تھا۔
"اب کہاں جانا ہے میڈم.....؟"
"مجھے کیا پتا کہ کہاں جانا ہے.....؟ میں کون سا یہاں آتی جاتی رہتی ہوں.....؟ آپ نے پوچھنا ہے تو آذر بھائی سے پوچھیں۔" اس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے لاعلمی ظاہر کی تھی۔
"چلیے جناب! اب آذر بھائی سے پوچھیے....." جودت نے منصور حسین کو شرارت سے اشارہ کیا تھا اور منصور حسین کی مجبوری تھی اس کو پوچھنا ہی پڑا۔ وہ اپنی گاڑی سے اتر کے آذر کی گاڑی کے پاس آگیا تھا۔
"کس طرف جانا ہے صاحب.....؟" وہ ان کے اگلے پڑاؤ کا پوچھ رہا تھا۔
"یہاں سے شاہ فیصل مسجد قریب ہے پہلے وہاں چلتے ہیں پھر بعد میں لوک ورثہ' شکر پڑیاں' لیک ویو پارک اور چھتر پارک کی طرف نکلتے ہیں۔" آذر نے بالترتیب سب جگہوں کے نام گنوائے تھے کہ ان سب جگہوں پہ جانا ہے۔
"آپ نے سب پکنک اسپاٹ ایک ہی دن میں دیکھنے ہیں؟" منصور حسین کو حیرت ہوئی تھی۔
"بالکل! کیونکہ ہم نے یہ پکنک اسپاٹ صرف دیکھنے ہیں یہاں ڈیرا ڈال کے نہیں بیٹھنا' مری کے لیے بھی نکلنا ہے۔" آذر نے منصور حسین کی بات مذاق میں اڑائی تھی۔
"ٹھیک ہے صاحب! جیسے آپ کی مرضی' لیکن ایسا ممکن نہیں ہے' آپ کو ایک ایک جگہ پہ ہی اتنا ٹائم لگ جائے گا کہ آپ یہیں ٹھہرنے پہ مجبور ہو جائیں گے۔"
"ہم یہاں نہیں ٹھہر سکتے' ہم نے یہاں کوئی بکنگ نہیں کروائی' اس لیے ہمیں اپنے بنگلے پہ پہنچنا ہے' رات وہیں ٹھہرنے کا انتظام ہے' سمجھے تم.....؟" آذر نے اسے وجہ بتائی۔
"جی صاحب! یہ بھی بہتر ہے....." منصور حسین سر ہلا کے واپس آگیا تھا اور پھر ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی تھی۔

"تھوڑی دیر پہلے راستے میں آذر بھائی کو میں بھی یہی سمجھا رہا تھا کہ شام ہو جائے گی لیکن وہ کہتے ہیں کہ بے شک شام ہو جائے ہم نے یہ رات مری میں ہی بسر کرنی ہے' جیسے وہاں ان کے لیے کوئی دلہن بیٹھی انتظار کر رہی ہو....."
جودت مذاق کے موڈ میں تھا۔
"اچھا! تو یہ بات تھی.....؟ مجھے تو پتا ہی نہیں تھا؟" منصور حسین نے پہلی بار مذاق میں کسی کا ساتھ دیا تھا۔
"جودت بھائی! میں بتاؤں گی آذر بھائی کو کہ آپ ان کا مذاق اڑا رہے ہیں۔" علیزے نے دھمکی دی۔
"بتانا' ضرور بتانا لیکن مری پہنچ کر....." جودت نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا تھا اور منصور حسین اپنی مسکراہٹ روک نہیں پایا تھا۔
"جودت بھائی! وہ ہم سے بڑے ہیں۔"
"ہاہاہا! وہ صرف تم سے بڑے ہیں۔ تمہیں ہی بچوں کی طرح ٹریٹ کرتے ہیں..... تم آذر بھائی کی اور ڈیڈ کی "کاکی" ہو۔" جودت کہتے ہوئے خوب ہنس رہا تھا۔

"آپ اب میرا مذاق اڑا رہے ہیں؟" علیزے نے اسے خفگی بھری نظروں سے دیکھا۔
"میں ایسی گستاخی کا سوچ بھی نہیں سکتا' توبہ توبہ' تم تو اتنی پیاری ہو کہ تمہارے گیت گانے کو دل چاہتا ہے۔" وہ جھوم کے بولا۔
"گیت! ارے ہاں جودت بھائی آپ کا گٹار کہاں ہے؟ آپ ساتھ نہیں لائے.....؟" علیزے کو اچانک اس کے گٹار کا خیال آیا تھا۔
"لایا ہوں یار' سب کچھ لایا ہوں' لیکن مری چل کے....." جودت نے پھر شرارت سے کہا تھا اور ہنستے ہوئے سیدھا ہو کر بیٹھ گیا تھا منصور حسین بھی چوکنا اور ہوشیار ہو کے بیٹھ چکا تھا کیونکہ شاہ فیصل مسجد کی طرف جانے والے روڈ پہ پولیس گاڑیوں کی چیکنگ کے بعد آگے جانے کی پرمیشن دے رہی تھی' سیکیورٹی کافی ٹائیٹ تھی اور منصور حسین کی گاڑی میں اسلحہ تھا لیکن منصور حسین کے لیے یہ ڈھارس ہی کافی تھی کہ گاڑی میں رجو اور علیزے بی بی بھی ہیں کیونکہ لیڈیز کی موجودگی میں گاڑی کی چیکنگ الاؤ نہیں تھی۔
"علیزے بی بی آپ اور رجو کھڑکی کے ساتھ ہو کر بیٹھیں۔" منصور حسین نے ذرا سی گردن ترچھی کر کے پیچھے کی طرف دیکھا تھا۔
"کیوں.....؟" کیوں کا سوال اٹھانے والا جودت تھا۔
"اس طرح گاڑی کی چیکنگ نہیں ہوگی۔"
"تو اس میں ہمیں ڈرنے کی کیا ضرورت ہے؟ گاڑی کی چیکنگ ہو یا نہ ہو' ہم کون سا اسلحہ یا غیر قانونی سامان لے کر جا رہے ہیں؟" جودت نے لاپروائی سے کہا۔
"وہ تو ٹھیک ہے صاحب لیکن خوامخواہ یہ لوگ ہمارا ٹائم برباد کریں گے" منصور حسین نے سر جھٹکا۔
اتنے میں ایک پولیس کانسٹیبل قریب آچکا تھا لیکن گاڑی میں رجو اور علیزے کو دیکھ کر گاڑی کو پاس کا سگنل دے دیا تھا اور اس کے پیچھے باقی تین گاڑیوں کے ساتھ بھی ایسا ہی کیا تھا منصور حسین کو جس چیز کا ڈر تھا وہ اس سے بچ گیا تھا آخر وقار آفندی نے اسے تاکید کر کے بھیجا تھا کہ کسی کو پتا نہیں چلنا چاہیے کہ وہ اسلحے سے لوڈڈ ہے اور اس نے ایسا ہی کیا تھا.....
"لو جی جناب! پہنچ گئے ہم شاہ فیصل مسجد۔" جودت نے مسجد کی پارکنگ میں پہنچتے ہی نعرہ لگایا تھا اور رفتہ رفتہ سبھی اپنی گاڑیوں سے اتر آئے تھے۔
"واؤ....." جودت نے ایک لڑکی کو پاس سے گزرتے دیکھ کر بے ساختہ اظہار کیا تھا۔
"واؤ نہیں کہتے جودت بھائی' سبحان اللہ کہتے ہیں۔" علیزے نے معصومیت سے اسے ٹوکا۔
"کسے دیکھ کر؟" وہ شرارت سے بولا۔
"مسجد کو دیکھ کر۔" جودت اس کے جواب پہ قہقہہ لگا کے ہنسا تھا۔
"تمہیں کس نے کہا کہ میں نے مسجد کو دیکھ کے واؤ کہا ہے.....؟"
"تو پھر.....؟" علیزے ہونق سی اسے دیکھ رہی تھی۔
"میرے واؤ کا مرکز وہ ہے' بلیک جینز اور ریڈ ٹاپ والی۔" جودت نے اشارہ کیا تھا اور علیزے اس لڑکی کو دیکھ کر سٹپٹا گئی تھی اس کی پنڈلیاں اور بازو برہنہ تھے اس کا لباس بے حد چست تھا وہ اپنی کسی دوست سے تصویریں بنوا رہی تھی اور وہاں موجود لڑکوں کا اسی کی طرف دھیان تھا۔
"جودت! تم یہاں کھڑے کیا دیکھ رہے ہو؟" آذر نے قریب آتے ہی خفگی سے پوچھا۔
"جو سبھی دیکھ رہے ہیں۔" اس نے کندھے اچکائے۔

"جووت۔" آزر نے سختی سے پکارا تھا جس پہ جووت گھبرا کے متوجہ ہوا۔

"جی چلیے! میں تو مذاق کر رہا ہوں۔" وہ سر جھٹکتے ہوئے آگے بڑھ گیا اور علیزے انوشہ اور حرمت وغیرہ کے گروپ میں شامل ہو گئی تھی ان سب لڑکیوں نے سر پہ ڈوپٹے اوڑھ لیے تھے 'علیزے تو اندر آ کر حیران و پریشان رہ گئی جگہ جگہ لڑکے لڑکیوں کے گروپ کھڑے تھے ہنس رہے تھے 'قہقہے لگا رہے تھے 'کچھ تصویریں بنوا رہے تھے یوں لگ رہا تھا جیسے وہاں موجود لوگ مسجد میں نہیں کسی پارک میں کھڑے ہوں 'بے ادبی کا تو کسی کو خیال ہی نہیں رہا تھا لڑکیاں ننگے سر گھوم پھر رہی تھیں 'لڑکے شرارتیں کر رہے تھے انہوں نے مسجد کے چکنے فرش کو ریمپ سمجھ رکھا تھا اور ان کی یہی سمجھ تو ملک میں تباہی کا باعث تھی علیزے کو سوچ کر ہی جھرجھری سی آ گئی تھی۔

"لوگوں نے اللہ کے گھر کو پکنک اسپاٹ بنا رکھا تھا 'جہاں لوگوں کو زیارت کرنے کے لیے آنا چاہیے تھا وہاں لوگ تفریح اور سیر کے لیے آ رہے تھے آزر بھائی واپس چلیں......؟" علیزے مزید وہاں کا ماحول برداشت نہیں کر سکی تھی۔

"واپس......؟" آزر کے ساتھ ساتھ باقی سب کو بھی حیرت ہوئی تھی۔

"جی! یہاں بہت رش ہے میرا دل گھبرا رہا ہے۔" علیزے کو واقعی یہاں آ کر الجھن سی ہوئی تھی۔

"تو تم ایسا کرو کہ تم جا کر اپنی گاڑی میں بیٹھو اتنے میں ہم مسجد گھوم پھر کے دیکھ لیں......" کومل کسی کے بھی بولنے سے پہلے خود بول پڑی تھی۔

"لیکن آپ لوگ یہاں کیا......"

"ہم لوگ یہاں اتنی دور سے مسجد دیکھنے کے لیے آئے ہیں اور دیکھ کر ہی جائیں گے 'تمہاری طبیعت فریش نہیں ہے اس لیے تم جا کر تھوڑی دیر آرام کرو 'موڈ فریش ہو جائے گا۔" کومل نے بڑی اپنائیت سے اسے وہاں سے ہٹانا چاہا تھا اور علیزے تو تھی ہی سادہ طبیعت 'فوراً" مان گئی تھی اور رجو کے ساتھ واپس پارکنگ میں آ گئی لیکن وہاں کا منظر دیکھ کر اس کا دماغ گھوم گیا ۔

"ڈرائیور......" وہ غصے سے اور زور سے پکاری تھی منصور حسین اپنی بے دھیانی میں گاڑی میں بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا جب علیزے کی آواز پہ بری طرح چونک گیا تھا۔

"عون نے تمہیں گاڑی میں اسموکنگ کرنے سے منع کیا تھا لیکن تم پھر بھی باز نہیں آئے......؟" علیزے نے آگے بڑھ کے اس کے دائیں ہاتھ کی انگلیوں میں دبا ہوا سگریٹ جھپٹا اور دور سڑک پہ پھینک دیا تھا جبکہ منصور حسین شبنم کے پیکر میں بھڑکتے ہوئے شعلے کو دیکھ کر حیران رہ گیا تھا کتنی جرأت 'کتنے غصے سے اس نے اس کے ہاتھ سے سگریٹ چھین کر دور اچھال دیا تھا حیرت کی بات تھی وہ ایسی لگتی تو نہیں تھی جیسی لگ رہی تھی۔

"معافی چاہتا ہوں بی بی جی! یاد نہیں رہا میں ابھی ایئر فریشنر آن کرتا ہوں۔"

"شٹ اپ! غلطی کر کے معافی مانگنے والے لوگ مجھے قطعی اچھے نہیں لگتے۔" علیزے کا مسجد میں موجود پبلک کا غصہ منصور حسین پہ نکل گیا تھا۔

"میں نے غلطی جان بوجھ کے نہیں کی بی بی جی۔" منصور حسین کا سر جھکا ہوا تھا۔

"کی تو ہے نا......؟" وہ غصے سے بھری ہوئی تھی اور زندگی میں شاید پہلی بار اس نے کسی پہ غصہ کیا تھا وہ بھی منصور حسین پہ۔

"اسی لیے تو معذرت بھی کر رہا ہوں......" منصور حسین ایئر فریشنر آن کر کے گاڑی سے باہر نکل آیا تھا۔

"رجو! اسے کہو کہ اپنی زبان بند رکھے 'مجھے اس وقت کچھ اچھا نہیں لگ رہا۔" علیزے چڑچڑی ہو رہی تھی اور منصور حسین اس کے نرم و ملائم نقوش پہ غصے کی چھاپ دیکھ کے رہ گیا تھا۔

☆ ☆ ☆

وہ جب سے واپس گھر آئی تھی مسلسل اپنے بیڈ روم میں بند تھی۔ اس نے بیڈ روم سے باہر نکلنے کی اور کسی سے بات کرنے کی ہرگز کوشش نہیں کی تھی ممتاز حیات کی موجودگی کی وجہ سے اسے سب پہ ہی غصہ تھا اور مسئلہ یہ تھا کہ یہ غصہ اس کے اندر ہی دبا ہوا تھا' غبار کی طرح باہر نہیں نکلا تھا' شاید باہر نکل آتا تو شدت ذرا کم ہو جاتی لیکن فی الحال تو غصہ نکالنے کا کوئی راستہ ہی نہیں تھا۔

اپنے کمرے میں چکراتے ہوئے وہ اچھی خاصی تھک چکی تھی اور اب تو اسے بھوک کا بھی احساس ہونے لگا تھا رات کے ایک بجے کا وقت تھا کوئی ملازم یا ملازمہ اسے بیڈ روم میں کھانا لا کر نہیں دے سکتے تھے اس لیے اگر کھانا کھانا ہی تھا تو خود جا کر..... وہ وال کلاک کی سمت دیکھتی ہوئی چپل پہن کر باہر نکل آئی تھی باہر پورے گھر میں سناٹا چھایا ہوا تھا گھر کی تمام فینسی لائٹس کی بجائے نائٹ بلب جل رہے تھے جن کی ملگجی سی روشنی میں وہ خاموشی سے چلتی ہوئی سیڑھیوں کی سمت بڑھ رہی تھی جب اچانک اس کے قدم تھم گئے تھے دائیں سائیڈ والے بیڈ روم کی لائٹ جل رہی تھی اور لائٹ جلنے کا مطلب تھا کہ اندر بیٹھا فرد بھی جل رہا ہے..... مدحیہ چاہتے ہوئے بھی اپنے قدم سیڑھیوں کی سمت نہیں بڑھا سکی تھی بلکہ وہ اس بیڈ روم کی طرف آ گئی جہاں لائٹ بھی جل رہی تھی اور لائٹ جلانے والا بھی۔

اس نے ہاتھ کی مدد سے دروازے پہ ذرا سا دباؤ ڈالا تھا اور دروازہ اس کے ہلکے سے دباؤ سے کھلتا چلا گیا تھا وہ بے آواز قدموں سے چلتی ہوئی اندر آ گئی تھی کمرے میں سگریٹ کے دھوئیں سے حبس محسوس ہو رہا تھا مدحیہ نے ہاتھ سے نادیدہ دھوئیں کو رفع کرنے کی کوشش کی تھی اور دھیمے قدموں سے چلتی کھڑکی کے پاس آ گئی' کھڑکی کے پردے ہٹا کر کھڑکی کے دونوں پٹ کھول دیے تھے تازہ اور خنک ہوا کا اک تیز جھونکا اندر آیا تھا اور وہ اس جھونکے کی تازگی کو محسوس کرتی ہوئی پلٹ کر نبیل کے سامنے آ کھڑی ہوئی جو مسلسل راکنگ چیئر پہ جھول رہا تھا اور آس پاس کی ہر چیز سے بے نیاز اور لاتعلق نظر آ رہا تھا.....

"بھائی! ایم سوری....." مدحیہ ڈائریکٹ اس کی سمت دیکھتے ہوئے کہہ رہی تھی..... لیکن نبیل نے کوئی نوٹس نہیں لیا تھا۔

"بھائی میں آپ سے مخاطب ہوں۔" مدحیہ نے ذرا اونچی آواز میں کہا اور نبیل کی راکنگ چیئر تھم گئی تھی..... اور پھر پانچ سیکنڈ کے توقف سے اس نے انگلیوں میں دبا ہوا سگریٹ ایش ٹرے میں مسل دیا تھا۔

"کیا بات ہے؟ کیوں آئی ہو؟" اس کی آواز بے حد بوجھل اور بھاری ہو رہی تھی لہجہ بے گانگی لیے ہوئے تھا۔

"آپ سے سوری کہنے آئی ہوں۔"

"کس لیے.....؟" اسے حیرانی ہوئی۔

"آپ میری وجہ سے ہرٹ ہوئے ہیں۔"

"ہونہہ..... یہ کوئی پہلی بار تو نہیں ہوا' عادی ہو چکا ہوں۔" نبیل تلخی اور استہزائیہ انداز سے کہتا ہوا چیئر سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

"میں ایسا کرنا نہیں چاہتی لیکن ہو جاتا ہے' میری برداشت ختم ہو جاتی ہے' میں خود پہ کنٹرول نہیں کر پاتی۔" مدحیہ جھنجھلا کے کہہ رہی تھی۔

"تم نہیں جان سکتیں مدحیہ' تمہاری اک برداشت ختم ہو جانے سے ہمارا کیا کیا ختم ہو جاتا ہے' عزت' غیرت' غرور اور ہماری انا' سب کچھ ختم ہو کے رہ جاتا ہے' نبیل حیات کسی قابل نہیں رہتا' اپنے آپ سے ہی نظریں

نہیں ملا پاتا' بے غیرت بن جاتا ہے' صرف..... صرف تمہاری برداشت کی وجہ سے....." نبیل کا لہجہ بہت بکھرا ہوا لگ رہا تھا۔

"میں اس معاملے میں بہت بے بس ہوں بھائی' ایم رئیلی سوری۔" مدحیہ نے کہتے ہوئے سر جھکا لیا تھا اور سر جھکانے کی وجہ سے اس کی آنکھوں میں ٹھہرے ہوئے آنسو چھلک گئے تھے وہ راکنگ چیئر کے سامنے رکھی چھوٹی سی کرسٹل ٹیبل کے پاس کھڑی تھی اس کے آنسو قالین پہ نہیں ٹیبل پہ گرے تھے اور سگریٹ کا پیکٹ اٹھاتا ہوا نبیل یکدم چونک گیا تھا۔

مدحیہ رو رہی تھی.....؟ ناقابل یقین بات تھی..... حیرت کا مقام تھا۔

"مدحیہ! کیا بات ہے.....؟ تم رو کیوں رہی ہو.....؟" نبیل سگریٹ کا پیکٹ وہیں چھوڑ کے فوراً اس کے سامنے آ گیا تھا۔

"میں بہت بری ہوں بھائی' بہت بری' میں نے آپ کو پریشان کر رکھا ہے لیکن..... لیکن میں کیا کروں؟ ہر بار کچھ نہ کچھ ایسا ہو جاتا ہے کہ....." مدحیہ کہتے کہتے بھی شدت سے روئی تھی اور نبیل نے اسے بے ساختہ اپنے بازو میں گھیرتے ہوئے کندھے سے لگا لیا تھا۔

"ڈونٹ وری! کچھ نہیں ہوتا' تم بیٹھو یہاں....." نبیل نے اس کا سر تھپکتے ہوئے کہا اور اسے صوفے پہ بٹھایا ..... لیکن وہ متواتر رو رہی تھی۔

"دیکھو مدحیہ! اس طرح جذباتی ہونے سے کچھ نہیں ہوتا' کچھ کرنے کے لیے دماغ کو ٹھنڈا اور دل کو وسیع رکھنا پڑتا ہے' صبر' ہمت اور برداشت سے کام لینا پڑتا ہے' تمہارے دل و دماغ میں جو کچھ ہے وہ تم مجھ سے شیئر بھی تو کر سکتی ہو.....؟ اور کچھ نہ سہی تو تمہارے دل کا بوجھ ہی ہلکا ہو جائے گا' پلیز مدحیہ' ٹرائی ٹو انڈر اسٹینڈ' اپنے اندر کا غبار نکالو' دل کا بوجھ کم کرو' اپنے آپ کو نکالو اس فرسٹریشن سے' پلیز۔" نبیل نے اس کے دونوں ہاتھ تھام کے انہیں سہلایا تھا اور اس کا سر تھپکا تھا۔

لیکن مدحیہ کچھ بھی بتانے کی یا پھر شیئر کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھی وہ ہچکیوں سے رو رہی تھی اس کے اندر کا غم و غصہ آنسوؤں کے رستے باہر نکل رہا تھا اور پھر نبیل نے کچھ سوچتے ہوئے اسے اپنے کندھے سے لگا کر رونے دیا تاکہ وہ جتنا چاہتی کھل کے رو لیتی جس کے بعد اس کے دل و دماغ کا بوجھ کچھ ہلکا ہو جاتا' لیکن نبیل یہ نہیں جانتا تھا کہ اس کے دل و دماغ کا بوجھ صرف رو لینے سے کم ہونے والا نہیں ہے' اگر ایسا ہوتا تو وہ اب تک نہ جانے کتنی بار رو چکی ہوتی۔

"مدحیہ! یہ لو پانی پیو۔" نبیل نے گلاس میں پانی انڈیل کر گلاس اس کی سمت بڑھا دیا تھا اور مدحیہ نے دو گھونٹ پانی پینے کے بعد گلاس واپس ٹیبل پہ رکھ دیا تھا۔

"اب بتاؤ کیا مسئلہ ہے.....؟ ایسی کیا چیز ہے جو تمہیں بے چین اور بے کل رکھتی ہے.....؟" نبیل کافی تحمل اور سکون سے پوچھ رہا تھا.....

"بھائی.....! آپ جانتے ہیں ناکہ بابا کا کردار کیسا ہے.....؟" مدحیہ کا پوچھتے ہوئے سر جھکا ہوا تھا..... اور یہ ایک ایسا سوال تھا جس پہ نبیل فوری طور پہ ہاں یا نا میں جواب نہیں دے سکتا تھا کیونکہ دونوں صورتوں میں اسے مدحیہ سے نظر چرانی پڑتی۔

"بتائیے نا بھائی....." وہ بصد اصرار پوچھ رہی تھی۔

"ہوں.....!" اس نے محض ہوں کہنے پہ اکتفا کیا تھا۔

"اور آپ کو یہ بھی یاد ہو گا کہ میری ایک دوست تھی لومیری تھامسن.....؟" مدحیہ کے دوسرے سوال پہ نبیل

"ہوں" کہنے کے بھی قابل نہیں رہا تھا کیونکہ اسے مدحیہ کی اگلی بات خود بخود ہی سمجھ آ گئی تھی۔

"لومیری، میری دوست تھی، میری کلاس فیلو تھی، میری ہم عمر تھی، ہم لوگ اپنی ہالیڈیز منانے کے لیے انگلینڈ سے کینیڈا گئے تھے، وہاں..... وہاں..... لومیری کے....." مدحیہ کہتے ہوئے ایک بار پھر پھوٹ پھوٹ کے رو پڑی تھی اور نبیل کی رنگت سفید لٹھے کی مانند ہو گئی اس کی سماعتوں میں سائیں سائیں کی آواز گونج رہی تھی اپنے باپ کا نام نہاد مجسمہ دل کے بت خانے میں ایسا زور سے گرا کہ پاش پاش ہو گیا تھا اور مدحیہ کے دل و دماغ کی اذیت نبیل کے جسم و جاں میں سرائیت کر گئی تھی، بے شک مدحیہ کی بات ابھی ادھوری تھی لیکن اس کے مفہوم اور معنی بہت مکمل تھے اور اس بار تو وہ مدحیہ کو بھی تسلی نہیں دے سکا تھا..... وہ روتی ہوئی وہاں سے اٹھ کر چلی گئی تھی اور نبیل مٹی کے ڈھیر کی طرح بیٹھا رہ گیا تھا دل پہ بوجھ سا آگرا تھا۔

☼ ☼ ☼

شاہ فیصل مسجد دیکھنے کے بعد ان لوگوں نے لوک ورثہ کا رخ کیا تھا جہاں اپنے کلچر کا ہر رنگ ہر تاثر دیکھنے کے لیے موجود تھا اپنی ثقافت کا منہ بولتا ثبوت "مخصوصا" وہ جگہ جہاں ایک عورت کنویں کے قریب جھکی کنویں سے پانی بھر رہی تھی، لڑکیاں اس منظر کو دیکھ کر بہت ایکسائیٹڈ ہوئی تھیں، بے شک وہاں تمام چیزیں آرٹی فیشل تھیں لیکن ان کا تاثر بہت نیچرل تھا، وہاں کی بیل گاڑی، گھوڑا تانگہ، اونٹ کے اسٹیچو اور میوزیم کے اندر ہر چیز ان لوگوں کے شوق اور اشتیاق کو ابھارنے کے لیے کافی تھیں اور جودت نے ان کو ہر چیز کے متعلق بتا بتا کر ان کے شوق کو اور بھی ہوا دے رکھی تھی ان کو ساری جگہیں گھومنے پھرنے کے بعد لوک ورثہ ہی پسند آیا تھا۔

لوک ورثہ ایک ایسی جگہ تھی جہاں علیزے نے بھی بہت انجوائے کیا تھا وہ بھی سب کے ساتھ گھومنے پھرنے اور تصویریں بنوانے میں شامل رہی تھی اور پھر شکر پڑیاں سے واپسی پہ ــــ شام گہری ہو چکی تھی سبھی یہ رات اسلام آباد میں ہی رکنا چاہتے تھے لیکن آذر یہاں رکنے کے لیے تیار نہیں تھا وہ مری پہنچنا چاہتا تھا اس لیے اس نے منصور حسین کو گاڑی مری روڈ کی طرف موڑنے کا سگنل دیا تھا اور اس نے سر ہلاتے ہوئے حکم کی تعمیل کی تھی۔

"یار منصور حسین! میں تو بور ہو گیا ہوں کوئی گانا ہی سنا دو۔" جودت نے بوریت کا اظہار کرتے ہوئے کیبنٹ میں رکھی سی ڈیز الٹ پلٹ کر دیکھی تھیں۔

"مجھے گانا سننا آتا ہے صاحب، سنانا نہیں۔" منصور حسین کی نظریں سامنے ونڈ اسکرین پہ جمی ہوئی تھیں، بات وہ جودت سے کر رہا تھا لیکن ذہن علیزے کے دوپہر والے غصے کی طرف تھا جو اس نے منصور حسین پہ انڈیلا تھا، وہ ابھی تک حیران تھا کہ علیزے بی بی نے اس پہ اتنا غصہ کیا ہے۔ اسے ڈانٹا ہے.....؟ حیرت تھی۔

"یار! ایک تو تم بھی نا بہت نپے تلے سے آدمی ہو، کھرا کھرا جواب دیتے ہو، بندے کی ہاں میں ہاں نہیں ملاتے۔" جودت نے منہ بنا کے کہا تھا۔

"منافقت سے کام نہیں لیتا صاحب۔" منصور حسین نے اسپیڈ کم رکھتے ہوئے کہا اور ساتھ والی گاڑی کو راستہ دیا تھا۔

"کیا اپنی بیوی کے ساتھ بھی ایسے ہی پیش آتے ہو روکھے پھیکے سے۔" جودت کو حیرت ہو رہی تھی۔

"بیوی نہیں ہے....." اس نے نفی میں جواب دیا۔

"ارے! کیوں نہیں ہے؟؟"

"شادی نہیں ہوئی ابھی"

"اوہ اچھا..... ! لیکن یار اب تک شادی ہو جانی چاہیے تھی تمہاری، یہی تو عمر ہوتی ہے شادی کرنے کی، انٹینشن،

میں لے تو ہو گے؟"

"میں بھی یہی سوچ رہا تھا لیکن....." منصور حسین کچھ کہتے کہتے چپ ہو گیا تھا۔

"لیکن کیا یار؟ کوئی محبت وحبت کا چکر ہے کیا؟" جودت منصور حسین میں پوری طرح سے دلچسپی لے رہا تھا۔

"محبت؟" منصور حسین نے محبت کے نورانی لفظ کو زیر لب دہرایا تھا اور دل کو یوں لگا جیسے کسی نے ہلکے سے دبایا ہو، اپنی نرم و نازک ہتھیلی میں اور پھر دوسرے ہی پل اس نرم و نازک ہتھیلی سے آزاد کر دیا ہو۔

منصور حسین نے اپنے دل کو ٹھہرانے کے لیے دائیں بائیں دیکھا اور گہری سانس کھینچی تھی لیکن دوبارہ ونڈ اسکرین کی سمت دیکھنے سے پہلے اس کی نظریں بیک ویو مرر پہ جا ٹھہری تھیں علیزے کی گولڈن براؤن آنکھوں کا سحر بیک ویو مرر کو اپنے حصار میں لیے ہوئے تھا یوں لگ رہا تھا جیسے وہ بھی جودت اور اس کی باتیں دلچسپی سے سن رہی ہو اور اسے بھی اس کے جواب کا انتظار ہو۔

منصور حسین نے گاڑی کی اندرونی مدھم اور ملگجی سی لائٹ بجھا دی تھی تاکہ اسے پیچھے کا کوئی بھی منظر دکھائی نہ دے، جس کی وجہ سے پھر اس پہ کوئی فرد جرم عائد ہوتی۔

"ارے یار! لائٹ کیوں بجھا رہے ہو، مجھے میری بات کا جواب دو۔" جودت نے پھر لائٹ جلانی چاہی تھی۔

"رہنے دیں صاحب! پیچھے رجو سو رہی ہے اس کی نیند خراب ہو گی۔" اس نے جودت کو لائٹ جلانے سے منع کیا تھا۔

"اوکے! نہیں جلاتا، لیکن تم جواب تو دو، تم محبت کرتے نا کسی سے۔" جودت جاننے کے لیے بہت بے چین ہو رہا تھا۔

"آپ کو کیا لگتا ہے.....؟"

"مجھے لگتا ہے کہ کرتے ہو۔"

"ہونہہ! جو لگتا ہے وہ ہوتا نہیں ہے۔" منصور حسین نے سر جھٹکا۔

"نہیں منصور حسین، جو ہوتا ہے وہی لگتا ہے۔"

"تو پھر ٹھیک ہے آپ کو جو لگتا ہے آپ وہی سمجھ لیں۔"

"میرے سمجھنے کی کیا ضرورت ہے بھلا.....؟ تمہیں محبت ہے اور بس ہے۔" جودت نے منصور حسین پہ محبت کی مہر لگا دی تھی اور منصور حسین نا چاہتے ہوئے بھی ہلکے سے مسکرا دیا تھا اور اسے لائٹ بجھانے کا یہ بھی ایک فائدہ ہوا کہ جودت اس کی مسکراہٹ نہیں دیکھ سکا تھا۔

"بھائی! مری اور کتنا دور ہے.....؟" علیزے کا صبر جواب دے چکا تھا وہ گاڑی میں بیٹھے بیٹھے تھک چکی تھی۔

"ڈونٹ وری! آدھے گھنٹے کا سفر رہ گیا ہے۔" جودت نے اسے تسلی دی اور میوزک پلیئر آن کر دیا تھا۔

☼ ☼ ☼

وہ تقریباً "پندرہ بیس منٹ شاور کے نیچے کھڑے رہنے کے بعد نہا کر فریش ہوا تو تولیے سے بال رگڑتا ہوا باتھ روم سے نکل آیا تھا اس کی پہلی نظر بیڈ کی سائیڈ ٹیبل کی سمت اٹھی تھی جہاں دودھ کا گلاس اور چائے کا کپ ڈھانپ کے رکھے گئے تھے گویا اس کے نہانے کے دوران ملازم آکر رکھ گیا تھا..... اس نے آگے بڑھ کے چائے کے کپ پہ رکھا ڈھکن ہٹایا اور چائے کی بھاپ بے تابی سے اوپر کی طرف اٹھی تھی وہ کپ اٹھا کر اپنے روم کی کھڑکی میں آن کھڑا ہوا تھا۔

اوائل نومبر کے دن تھے سردی اپنے پر رفتہ رفتہ پوری کائنات پہ پھیلا رہی تھی ماحول میں خنک ہوا مور کی طرح پنکھ پھیلا کے ناچ رہی تھی اور اس کے ناچ کا سرور ہر ذی روح کی رگ رگ میں اتر رہا تھا، بالکل ایسے جیسے دل اور

شاہ کی رگوں میں اتر رہا تھا وہ رات کے اس پہر نہا کر ۔۔۔ شرٹ پہنے بغیر کندھوں پہ تولیہ ڈالے کھڑکی سے ٹیک لگائے کھڑا چائے سے لطف اندوز ہو رہا تھا اور اس لطف اور سرور کے موسم میں تصور جاناں کا بج جانا بھی اک لاشعوری عمل تھا لیکن اس عمل میں بھی کوئی مداخلت کر بیٹھا تھا اس کے سیل پہ وائبریشن ہونے لگی تھی۔ اس نے اپنی پینٹ کی جیب سے سیل نکال کے دیکھا نمبر انجانا تھا۔۔۔۔ چند سیکنڈ وہ دیکھتا رہا پھر بالآخر کال اٹینڈ کر ہی لی تھی۔

"السلام علیکم۔۔۔!" اس کی آواز اور لہجہ کافی سنجیدہ سے تھے۔

"وعلیکم السلام! آپ کون بات کر رہے ہیں۔۔۔؟" دوسری طرف سے کافی گھبرائی ہوئی سی نسوانی آواز سنائی دی تھی۔

"دل آور شاہ اسپیکنگ۔" اس نے اس نسوانی آواز کو یقین دلایا تھا۔

"مم میں۔۔۔ مومنہ بی بی بات کر رہی ہوں سر۔" جواباً اس نے بھی اپنا تعارف کروایا تھا اور دل آور چند ثانیے کے لیے خاموش ہو گیا تھا لیکن اس خاموشی میں اس کا پہلا خیال صرف اس طرف گیا تھا کہ وہ رات کے اس پہر فون کیوں کر رہی تھی۔

"جی کہیے بی بی! آپ نے رات کے اس پہر فون کیوں کیا ہے؟ آپ ٹھیک تو ہیں نا۔۔۔؟" دل آور کو حقیقتاً تشویش ہوئی تھی۔

"سر۔۔۔! اس وقت تک تو ٹھیک ہوں لیکن آئندہ کے لیے کوئی بھروسہ نہیں ہے' اس خبیث کو پتا چل گیا ہے کہ میں اس پہ کیس کر رہی ہوں اس لیے اس نے اپنے بندوں کو میرے پیچھے لگا دیا ہے' میں تین دن سے چھپتی پھر رہی ہوں اب تو مجھے کوئی بھی اپنے گھر میں داخل بھی نہیں ہونے دیتا' وہ کسی بھی وقت مجھے قتل کروا سکتا ہے' لیکن سر میں آپ کے سامنے ہاتھ جوڑ کے درخواست کرتی ہوں' میں مر بھی جاؤں تو اسے اس کے انجام تک ضرور پہنچایئے گا۔" مومنہ بی بی روہانسے لہجے میں کہتے ہوئے رو پڑی تھی اس کی آواز ہانپی ہوئی تھی اور لہجہ دھیما اور دبا دبا سا لگ رہا تھا یوں لگ رہا تھا جیسے وہ چوری اور چھپ کے فون کر رہی ہو۔

"یہ کیسی باتیں کر رہی ہیں آپ۔۔۔؟ کچھ نہیں ہو گا آپ کو' آپ حوصلہ رکھیں۔"

"نہیں سر۔۔۔! ایسا ممکن نہیں ہے' اس کے بندے کتوں کی طرح میری بو سونگھتے پھر رہے ہیں انہیں جہاں بھی میری خبر مل گئی مجھے گولی مار دیں گے۔" وہ روتے ہوئے بمشکل اپنی بات مکمل کر پا رہی تھی اور دل آور کے ذہن نے ہمیشہ کی طرح فوری کام کیا تھا۔

"میں کہہ رہا ہوں نا کہ کچھ نہیں ہو گا آپ کو' آپ بس اتنا بتا دیں کہ آپ اس وقت کہاں ہیں۔۔۔؟" اس نے کچھ سوچتے ہوئے استفسار کیا تھا۔

"مم۔۔۔۔ میں؟" وہ بتاتے ہوئے ذرا ہچکچا گئی تھی۔

"مومنہ بی بی! مصیبت اور مشکل کے وقت اللہ کے بعد آدمی کو اپنے ڈاکٹر اور اپنے وکیل پہ بھروسہ رکھنا ہی پڑتا ہے' وہ سب بتانا پڑتا ہے' جو ہم نے باقی سب سے چھپا رکھا ہوتا ہے' کیونکہ اس کے بغیر کوئی چارہ ہی نہیں رہتا' بیماری بتائے بغیر ڈاکٹرز زندگی اور موت کی جنگ نہیں لڑ سکتا' اور راز بتائے بغیر وکیل انصاف اور ہار جیت کی جنگ نہیں لڑ سکتا' اب یہ آپ پہ ڈیپینڈ کرتا ہے کہ آپ نے کیا کرنا ہے۔۔۔۔ اپنی زندگی بچانی ہے یا پھر اس خبیث کے ہاتھوں قتل ہونا ہے۔۔۔۔" دل آور کا لہجہ سنجیدگی کے ساتھ ساتھ سخت ہو گیا تھا۔۔۔۔ اور مومنہ بی بی اس کی بات سن کر لاجواب اور شرمندہ ہو گئی تھی۔

"سر! میں۔۔۔ میں اس وقت اوکاڑہ میں ہوں' یہاں میری ایک سہیلی رہتی ہے اس کی یہاں شادی ہوئی ہے لیکن اب۔۔۔ اب تو دو روز سے اس کے سسرال والے بھی باتیں کرنے لگے ہیں اور مجھے ڈر ہے کہ یہ لوگ میری خبر

میرے گاؤں ہی نہ پہنچا دیں۔"

"نہیں نہیں ایسا نہیں ہو گا' آپ اطمینان رکھیں' صبح ہونے سے پہلے پہلے آپ محفوظ ہاتھوں میں پہنچ جائیں گی۔" دل آور نے تسلی دلائی۔

"لیکن سر۔۔۔!"

"آپ باقی باتیں کسی اور وقت کے لیے رہنے دیں' فی الحال مجھے اس جگہ کا ایڈریس لکھوا دیں جہاں آپ رہ رہی ہیں' آپ کو تھوڑی دیر تک پک کر لیا جائے گا۔" دل آور کی تسلی اور حوصلے پہ مومنہ بی بی بے یقین سی ہو گئی تھی اسے یقین نہ آیا کہ اتنا بڑا وکیل اس کے کیس میں اس حد تک انوالو ہو رہا ہے۔ وہ بھی بغیر کسی فیس اور معاوضے کے۔۔۔۔؟

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں سر۔۔۔۔؟"

"دیکھیے بی بی! میں نے آپ سے کہا کہ اس وقت کوئی اور سوال جواب مت کریں۔" دل آور نے خفگی سے اسے ٹوک دیا تھا اور مومنہ بی بی نے جلدی جلدی اسے ایڈریس لکھوا دیا تھا۔

"معافی چاہتی ہوں سر' تھوڑی دیر کے لیے دل میں بدگمانی آ گئی تھی کہ کہیں وہ آپ تک نہ پہنچ جائے۔" وہ ندامت اور شرمساری سے کہہ رہی تھی۔

"ہونہہ۔۔۔۔! وہ مجھ تک نہیں پہنچے گا بلکہ میں اس تک پہنچوں گا اور معافی مانگنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے' اپنی زندگی ہر ایک کو عزیز ہوتی ہے ہر انسان اپنی زندگی محفوظ ہی رکھنا چاہتا ہے' آپ کی جگہ کوئی بھی ہوتا تو یقیناً ایسا ہی سوچتا۔۔۔۔ اینی وے آپ فون بند کریں تھوڑی دیر تک آپ کو کال آ جائے گی کہ آپ کو کون پک کرنے آ رہا ہے۔۔۔۔؟"

"آپ کا شکریہ سر! بہت شکریہ۔" مومنہ بی بی نے فون بند کر دیا تھا اور دل آور نے گہری سانس کھینچتے ہوئے اپنے ہاتھ میں پکڑے سرد چائے کے کپ کو دیکھا تھا۔

بھاپ اڑاتی چائے برف ہو چکی تھی اور برف تو اس کا جسم بھی ہو چکا تھا لیکن بچت یہ تھی کہ اس کے جسم میں دوڑتا لہو بہت گرم تھا جو باہر کی سردی ذرا کم ہی محسوس ہونے دیتا تھا۔۔۔۔ اس وقت بھی وہ سردی سے بے نیاز چائے کا کپ ٹیبل پہ رکھ کے پلٹا' کھڑکی بند کی' اپنی شرٹ پہنی' تولیہ صوفے پہ پھینکا' بال برش کیے اور پھر اس دوران سوچتے ہوئے کسی حتمی فیصلے پہ پہنچ کر اپنا سیل فون دوبارہ اٹھا لیا تھا حالانکہ نمبر ڈائل کرتے ہوئے اسے پتا تھا کہ وہ کسی کو نیند سے ڈسٹرب کر رہا ہے' لیکن اس کے بغیر کوئی حل بھی تو نہیں تھا۔

"ہیلو! انسپکٹر شہناز اسپیکنگ۔" دوسری طرف سے نیند سے بوجھل آواز سنائی دی تھی اس نے یقیناً اس کا نمبر نہیں دیکھا تھا۔

"السلام علیکم! دل آور شاہ بات کر رہا ہوں۔" دل آور نے کافی ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا تھا۔

"ارے شاہ جی آپ اس وقت؟" انسپکٹر شہناز کی نیند جیسے ہوا ہو گئی تھی یوں لگا جیسے وہ بستر سے اٹھ کے بیٹھ گئی ہو۔

"شرمندہ ہوں آپ کو نیند سے ڈسٹرب کر دیا۔" دل آور کا لہجہ معذرت خواہانہ ہو رہا تھا۔

"ارے! نہیں نہیں شاہ جی ایسی کوئی بات نہیں ہے' آپ سو بسم اللہ کر کے ڈسٹرب کرو' ہم غریبوں کے تو ماتھے پہ شکن تک نہیں آئے گی۔" انسپکٹر شہناز کی خوشی اس کے لب و لہجے سے ہی محسوس ہو رہی تھی۔

"آپ کہاں ہیں اس وقت؟" دل آور کو سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ اسے گہری نیند سے جگا کر لاہور سے اوکاڑہ جانے کے لیے کیسے کہے؟

"ایسی کیا بات ہو گئی آخر..... آج میرے شاہ جی کچھ پریشان لگتے ہیں؟" انسپکٹر شہناز اس کی سنجیدگی سے اس کی پریشانی بھانپ چکی تھی۔

"وہ دراصل میں نے آپ کو کسی کام کے لیے فون کیا تھا۔" دل آور نے بات شروع کی۔

"جانتی ہوں شاہ جی! آپ نے کسی کام کے لیے ہی فون کیا ہے ورنہ ہمارے ایسے نصیب کہاں کہ آپ کو ہماری یاد آئے۔ ہمارا فون کھڑکایا ہے تو آپ کی مجبوری۔ خیر اللہ بھلا کرے اس مجبوری کا جس نے آپ کو فون کرنے پہ مجبور تو کیا۔" انسپکٹر شہناز نے شکر ادا کیا تھا۔

"آپ جانتی ہیں انسپکٹر شہناز میرا پروفیشن مجھے کسی کو یاد کرنے کے لیے بھی ٹائم نہیں دیتا میرے دوستوں کو مجھ سے شکوے ہونے لگتے ہیں۔"

"جانے دیجیے شاہ جی آپ بہانہ کرتے ہوئے اور صفائی دیتے ہوئے اچھے نہیں لگتے۔"

"حالانکہ میرا کام ہی یہی ہے....." وہ ہلکے سے مسکرایا تھا۔

"ارے کون کہتا ہے کہ آپ صفائی دیتے ہیں..... میں نے تو ہمیشہ آپ کو جج کے سامنے شعلے اگلتے ہوئے اور گرجتے برستے ہوئے ہی سنا ہے۔" اس نے حیرانی سے کہا تھا۔

"بس کورٹ کی حد تک....." دل آور نے نارمل سے انداز میں کہا۔

"ہرگز نہیں! آپ کورٹ سے باہر بھی ویسے ہیں' روکھے پھیکے اور سڑیل سے..... مجال ہے جو کبھی آنکھ بھر کے یہ بھی دیکھا ہو کہ پولیس ڈیپارٹمنٹ میں ایک خوب صورت اور حسین و جمیل لڑکی بھی کام کرتی ہے' جو آتے جاتے ہوئے بڑی آس سے دیکھتی ہے کہ شاید دل آور شاہ اسے لائن ہی مار دے۔" انسپکٹر شہناز جل کے بولی تھی اور دل آور کا فلک شگاف قہقہہ بہت دور تک گونجا تھا۔

"لائن تو مار ہی دوں لیکن میڈم آزاد پنچھی ہوں' حوالات سے ڈرتا ہوں' آپ لوگ اندر کرتے ہوئے دیر نہیں لگاتے۔" وہ دلچسپی سے بولا تھا۔

"شاہ جی! آپ ایک بار لائن تو مارو' آپ کو اپنے دل کے اندر کروں گی' حوالات کے اندر نہیں۔ حوالات کے اندر کرنے کے لیے اور جو ہیں۔" انسپکٹر شہناز نے اسے آفر کی تھی۔

"سوری میڈم! قید آخر قید ہی ہوتی ہے چاہے دل کی ہو یا حوالات کی' میرا تو دم گھٹتا ہے' میں تو کسی کے دل میں بھی نہیں رہ سکتا۔" دل آور نے ہنستے ہوئے کہا تھا۔

"اچھا.....! کسی کے دل میں رہ نہیں سکتے' لیکن کسی کو دل میں رکھ تو سکتے ہو نا؟"

"یہ کام بھی کافی مشکل ہے....." وہ شرارت سے بولا تھا اور انسپکٹر شہناز اس کی چالاکی پہ مسکرا اٹھی تھی۔

"آپ بندہ گھما دیتے ہو' بات گھمانا کون سا مشکل کام ہے.....؟"

"بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ' میں نے اس وقت آپ کو گھمانے کے لیے ہی فون کیا ہے۔"

"او کے! فرمایئے پھر.....؟" وہ پوری طرح سے متوجہ تھی۔

"آپ کو اس وقت اوکاڑہ جانا ہو گا۔"

"اوکاڑہ.....؟ اس وقت.....؟" اسے اچنبھا ہوا تھا۔

"جی! میں نے کسی عام سی خوب صورت اور حسین و جمیل لڑکی کو فون نہیں کیا بلکہ ایک لیڈی پولیس آفیسر کو فون کیا ہے' جس کے لیے "اس وقت" اور "اُس وقت" کوئی معنی نہیں رکھتے' یہ کسی کی موت اور زندگی کا سوال ہے' آپ کا پہنچنا ضروری ہے۔" دل آور نے زور دے کر کہا تھا۔

"لیکن شاہ جی.....؟"

"آپ جا رہی ہیں یا نہیں.....؟" وہ دو ٹوک پوچھ رہا تھا۔

"ہوں! جا رہی ہوں....." اس نے اثبات میں جواب دیا۔

"ٹھیک ہے آپ نکلنے کی تیاری کریں میں تھوڑی دیر بعد دوبارہ کال کرتا ہوں۔" اس نے کہہ کے فون بند کر دیا اور مومنہ بی بی کو بتا دیا کہ انسپکٹر شہناز اسے لینے کے لیے آ رہی ہے۔

کل رات مری پہنچتے ہی انہیں تھکن کے مارے کچھ ہوش نہیں رہا تھا کہ وہ کہاں ہیں اور کہاں نہیں؟ نیند اور دن بھر کی تھکن کی وجہ سے انہیں کھانا کھانا بھی یاد نہیں رہا تھا بس انہیں بستر کی طلب تھی اور جیسے ہی انہیں بیڈ روم نظر آئے' وہ دیوانہ وار لپکے تھے البتہ آذر نے اپنی نگرانی میں سب کا سامان نکلوا کے ان کے کمروں میں بھجوایا تھا' گیٹ بند کروایا تب اپنے بیڈ روم میں گیا تھا' سب سے پہلے بستر پہ ڈھیر ہونے والی علیزے ہی تھی' عائشہ آفندی اسے دیکھنے کے لیے آئیں تو وہ سو رہی تھی' اس لیے انہوں نے رجو کو بھی اس کے کمرے میں بھیج دیا تھا اور منصور حسین کو بھی کمرے میں جا کر آرام کرنے کے لیے کہا تھا ہر طرف سے مطمئن ہونے کے بعد وہ خود بھی اپنے کمرے میں آ گئی تھیں۔

وہ لوگ تقریباً" رات کے بارہ بجے سوئے تھے اور اس وقت صبح کے بارہ بجے کا وقت ہو رہا تھا لیکن ابھی تک ان میں سے کوئی ایک بھی بے دار نہیں ہوا تھا کیونکہ باہر صبح سے بارش اور برف باری ہو رہی تھی اور پہلی نظر دیکھنے پہ یہی احساس ہو رہا تھا کہ ابھی رات ہے ماحول میں پھیلا ملگجا سا اندھیرا اور غبار شام کا سا سماں پیدا کر رہے تھے۔

"منصور حسین! چائے پیو گے؟" رجو کچن کی طرف جا رہی تھی جب مین ڈور کے بیچوں بیچ کھڑے منصور حسین کو دیکھ کر ٹھہر گئی تھی۔

"ہاں بنا دو۔" منصور حسین دھیمے لہجے میں بولا۔

رجو سر ہلاتی ہوئی فوراً" پلٹ گئی پھر وہ چائے لے کر آئی تو اس کے پاس ہی بیٹھ گئی — اور خود ہی ادھر ادھر کی بے تکی باتوں میں اس کا سر کھانے لگی۔

"رجو.....! رجو.....!" علیزے رجو کو پکارتی ہوئی اپنے بیڈ روم سے برآمد ہوئی تھی۔

"جی علیزے بی بی....." رجو منصور حسین کو وہیں چھوڑ کے بھاگی بھاگی آئی تھی۔

"اتنا ٹائم ہو گیا تم نے مجھے جگایا کیوں نہیں.....؟" علیزے اپنے ارد گرد شال لپیٹتے ہوئے کافی سستی سے بولی تھی۔

"جو جاگے تھے بی بی جی ایسا موسم دیکھ کر وہ بھی سو گئے اس لیے میں آپ کو بھلا کیا جگاتی....."

"وہ سامنے کون بیٹھا ہے؟"

"منصور حسین....." رجو نے مسکرا کے بتایا۔

"منصور حسین؟" علیزے نے دوبارہ دیکھا کیونکہ منصور حسین نے اپنے ارد گرد چادر لپیٹ رکھی تھی اور دائیں ہاتھ میں پکڑے کپ سے چائے پی رہا تھا کوریڈور کی سمت اس کی پشت تھی اس لیے دور سے پہچاننا مشکل ہو رہا تھا۔ "ناشتا بناؤں آپ کے لیے.....؟"

"ہوں! بناؤ....." وہ اسے کہہ کے برف باری دیکھنے کے شوق میں خود بھی باہر نکل آئی تھی۔

"سلام بی بی....." منصور حسین اسے دیکھ کر کھڑا ہو گیا تھا۔

"والسلام..... تم یہاں کیوں بیٹھے ہو؟ اندر جاؤ۔" اس نے اسے وہاں سے جانے کا اشارہ دیا تھا۔

"جی بہتر....." وہ سر جھکا کے پلٹ گیا تھا۔ اور علیزے خود وہاں بڑے سے ستون کے پاس کھڑی ہو کر برف باری دیکھنے لگی تھی۔ اس کے چہرے پہ ایسے قدرتی منظر کو دیکھتے ہوئے خوشی اور اشتیاق کے رنگ بکھرے ہوئے تھے۔

"گڈ مارننگ بے بی..." دانیال بھی اس کے قریب ہی آن کھڑا ہوا تھا۔
"سیم ٹو یو بھائی۔" وہ اسے دیکھ کر خوش دلی سے مسکرائی تھی۔
"رات کیسی گزری...؟"
"کچھ پتا نہیں..."
"کیا مطلب؟"
"مطلب کہ نیند نے کچھ خبر نہیں ہونے دی، میں تو فوراً ہی سو گئی تھی۔"
"ایسی کوئی بات نہیں جناب ہم بھی فوراً ہی سو گئے تھے البتہ کچھ خوابوں نے بہت ستائے رکھا تھا۔ بات کرتے کرتے دانیال کا ٹریک بدل گیا تھا' علیزے چونک کر دیکھا وہ قریب آتی حرمت کو دیکھ کر کہہ رہا تھا حالانکہ اس کا انداز کافی غیر محسوس قسم کا تھا۔ لیکن حرمت محسوس کر چکی تھی اور اس کے چہرے پہ شرم کا گلابی عکس لہرا رہا تھا۔
"کس کے خوابوں نے...؟" علیزے نے جان بوجھ کے چھیڑا تھا۔
"بتا دیا تو خفا ہو گی۔"
"اور نہ بتایا تو میں خفا ہو جاؤں گی۔"
"ارے میری جان! تمہارا کیا ہے چھوٹی سی چڑیا ہو' جب چاہے پکڑ کر منا لو۔" دانیال نے علیزے کے کندھے پہ بازو پھیلاتے ہوئے کہا تھا۔
"حرمت آپی! دانیال بھائی آپ کو چڑیا کہہ رہے ہیں' کہتے ہیں جب چاہے پکڑ لو۔" علیزے نے شرارت سے کہا تھا اور دانیال گھبرا گیا تھا۔
"علیزے! میں نے ایسا کب کہا؟"
"ابھی ابھی کہا تو ہے۔"
"یار! میں نے تو تمہیں کہا ہے۔" وہ جھنجلا گیا تھا۔
"میں جانتی ہوں آپ نے مجھے کہا ہے۔" علیزے سرگوشی سے بولی تھی اور حرمت اس کی یہ بلند سرگوشی سنتے ہوئے یکدم کھلکھلا کے ہنسی تھی دانیال نے علیزے سے نظر بچا کے حرمت کی ہنسی کو اپنی نظروں میں سمیٹا تھا۔
"اوہ تو تم شرارتی ہو گئی ہو؟"
"بس کل سے ہو گئی ہوں ورنہ پرسوں تک تو ٹھیک تھی۔" علیزے کا موڈ کافی خوش گوار ہو رہا تھا اور اس کے موڈ کی یہ خوش گواریت پورا دن یونہی طاری رہی تھی' رفتہ رفتہ سب نیند سے بے دار ہو چکے تھے اور ایسا شان دار موسم دیکھ کر باہر نکلنے کے لیے مچل گئے تھے عائشہ آفندی نے کافی روکا لیکن ان سب کا کہنا تھا کہ وہ یہاں گھومنے پھرنے اور انجوائے کرنے کے لیے آئے ہیں اندر بیٹھنے کے لیے نہیں۔ البتہ عائشہ آفندی نے کہیں بھی جانے سے انکار کر دیا تھا ایک تو وہ کل سے تھکی ہوئی تھیں اور دوسرے باہر بہت زیادہ ٹھنڈ تھی۔ طبیعت خرابی کی وجہ سے وہ اتنی ٹھنڈ بھی برداشت نہیں کر سکتی تھیں اس لیے اپنی ٹیبلٹ لے کر کمرے میں آ کے لیٹ گئی تھیں اور ان لوگوں کا چار گاڑیوں پہ مشتمل قافلہ ایک بار پھر روانگی کے عمل میں تھا۔ آج حرمت اور رحت نے کومل کو اپنی گاڑی میں کھینچ لیا تھا اور اسے فرنٹ سیٹ پہ آذر کے برابر بیٹھنے کا موقع فراہم کیا تھا کیونکہ جودت آج پھر علیزے کی گاڑی میں منصور حسین کے ساتھ انجوائے کر رہا تھا۔
وہ جب اپنے بنگلے سے نکلے تھے تب دن کے تین بجے کا ٹائم تھا اور تین بجے کا ٹائم کب شام آٹھ بجے میں تبدیل

ہو گیا تھا ان لوگوں کو احساس ہی نہ ہوا۔ احساس تو اس وقت ہوا جب جودت نے ان لوگوں کو فلم دیکھنے کا آئیڈیا دیا تھا۔
"تو سے بارہ کا شو یار۔" جودت نے احمد اور زین کے کندھے پہ ہاتھ مار کے کہا۔
"لیکن لڑکیاں..." احمد جز بز سا ہو گیا۔
"فلم اچھی ہوئی تو دیکھ لیں گے نہ ہوئی تو واپس چلیں گے۔" اس نے شانے اچکائے۔
"یہ ٹھیک ہے چلو..." زین ان سے پہلے آگے بڑھ گیا تھا لیکن آذر فلم دیکھنے کے لیے تیار نہیں تھا مگر سب لڑکے لڑکیوں کو تیار دیکھ کر وہ زیادہ دیر انکار نہیں کر سکا تھا مگر علیزے تھکی ہوئی تھی اس نے واپس بنگلے پہ جانے کا ارادہ کر لیا تھا۔
"لیکن علیزے تم..." آذر کو خفگی ہوئی۔
"آئی ایم سوری بھائی! میں کل سے بھی تھکی ہوئی ہوں مسلسل تین گھنٹے بیٹھنے کی ہمت نہیں ہے' میں آرام کرنا چاہتی ہوں' سونا چاہتی ہوں' بہت نیند آ رہی ہے۔" علیزے کو فلم دیکھنے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی اس لیے بہتر تھا کہ وہ گھر جا کر آرام کر لیتی اس کے چہرے پہ بھی تھکن کے آثار تھے آذر اسے مزید اصرار کر کے زبردستی نہیں روک سکا تھا۔
"اوکے جاؤ تم آرام کرو۔" آذر نے اس کا رخسار تھپک کے کہا اور وہ مسکراتی ہوئی پلٹ آئی تھی رجو اور منصور حسین گاڑی میں اس کا انتظار کر رہے تھے۔ اس کے بیٹھتے ہی منصور حسین نے گاڑی اسٹارٹ کر دی ابھی وہ راستے میں ہی تھے جب اس کے نمبر پہ آذر کی کال آ گئی تھی۔
"ہمارے آنے تک تم سونا مت' علیزے اکیلی ہے' خیال رکھنا اس کا' پھپھو تو کھانا کھا کر سو گئی ہیں میں نے ابھی کال کی ہے انہیں مگر وہ ریسیو نہیں کر رہیں۔" آذر نے اسے تاکید کی تھی۔
"جی صاحب جیسے آپ کا حکم' آپ کہو تو ساری رات نہیں سوؤں گا۔" منصور حسین نے تابعداری سے کہا۔
"گڈ... بعد میں ملتے ہیں۔" آذر نے کہہ کے فون بند کر دیا اور اتنے میں منصور حسین نے بنگلے کے سامنے بریک لگائے تھے چوکیدار نے گیٹ کھول دیا تھا وہ ایک جھٹکے سے گاڑی اندر لے آیا۔
"میں آپ کے لیے دودھ لے کر آتی ہوں بی بی جی۔" رجو گاڑی سے اترتے ہی کچن کی طرف بڑھی تھی۔
"نہیں رہنے دو' میں سونے جا رہی ہوں۔" علیزے شال سنبھالتی ہوئی اپنے کمرے کی سمت آ گئی اور رجو اپنے کمرے کی سمت چلی گئی۔ جبکہ منصور حسین وہیں کھڑا رہ گیا تھا کیونکہ اسے جاگنے کا حکم ملا تھا اور اس نے اس حکم کی تعمیل کرنی تھی وہ اسی ستون کے پاس کھڑا سگریٹ پھونکنے لگا۔ باہر کی سردی اور اندر کی سوچ دونوں اپنے عروج پہ تھیں وہ کہیں سے کہیں پہنچا ہوا تھا۔
"منصور حسین! تم سوئے نہیں ابھی تک؟" رجو نہ جانے کہاں سے نمودار ہو گئی تھی۔
"نہیں! آذر صاحب نے جاگنے کے لیے کہا ہے۔"
"اوہ اچھا! پہرہ دے رہے ہو؟"
"ہوں..." "میں بھی دوں؟" رجو شرارت سے بولی۔
"نہیں! تم جاؤ جا کر سو جاؤ۔" اس نے اسے اپنے ساتھ جاگنے سے منع کر دیا تھا۔
"لیکن..."
"میں نے کہا نا جا کر سو جاؤ۔" منصور حسین نے سختی سے منع کیا تو وہ فوراً پلٹ کر چلی گئی۔ اور وہ خود بھی اپنے کمرے کی طرف آ گیا تھا موبائل کو چارجنگ پہ لگا کر وہ دوبارہ گرم چادر اوڑھے باہر آ کر ٹہلنے لگا۔
(باقی آئندہ شمارے میں ملاحظہ کریں)

شازیہ جمال ناز

محبت تم سے ہی آخری سانس تک

گھر کے اندر قدم رکھتے ہی اسے کسی غیر معمولی پن کا احساس ہوا۔ ڈرائنگ روم سے آنے والی باتوں کی ہلکی ہلکی آوازیں مہمانوں کی موجودگی کا پتا دے رہی تھیں۔ وہ جلدی سے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ گل ابھی تک بے سدھ پڑی ہوئی تھی۔ بارش میں بھیگنے کی وجہ سے اس کا فلو بگڑ گیا تھا اس لیے آج اس نے کالج سے بھی چھٹی کی تھی۔ چینج کرنے کے بعد گل کی پیشانی پر ہاتھ کر رکھ ٹمپریچر چیک کیا اور قدرے مطمئن سی ہو کر باہر نکل آئی۔ کچن میں صبا آپا بری طرح مصروف تھیں۔

"کیا بات ہے آپا کہیں آپ کی ساس صاحبہ شادی کی تاریخ طے کرنے تو نہیں آ گئیں؟" پتیلیوں کے ڈھکن اٹھا اٹھا کر چیک کرتے ہوئے اس نے صبا کو شرارت سے چھیڑا۔

"خان پور سے تمہارے تایا ابا اور ان کی بیگم آئی ہیں اور کافی دیر سے تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔" صبا نے بریانی کو دم لگاتے ہوئے انکشاف کیا تو وہ پوری کی پوری ان کی طرف گھوم گئی۔

"تایا ابا؟" کباب اس کے حلق میں پھنس گیا۔ لیکن صبا اب سلاد کی طرف متوجہ ہو گئی تھی۔ بلا ارادہ اس کے قدم ڈرائنگ روم کی طرف اٹھ گئے۔ سامنے والے صوفے پر براجمان اجنبی شخصیات کو دیکھ کر وہ دروازے پر ہی رک گئی۔

"ضحیٰ میری جان۔" تایا ابا کی اس پر نظر پڑی تو خود آگے بڑھ کر اسے گلے سے لگا لیا۔ تائی اماں نے اس کی پیشانی پر بوسہ دیا اور اپنے پہلو میں بٹھا دیا۔

"اپنے مرحوم بھائی کی اکلوتی نشانی کو کلیجے سے لگانے کا ارمان برسوں سے دل میں پل رہا تھا۔ دل پہ پہرے بٹھاتے بٹھاتے تھک گئے۔ لیکن بھابھی جان کی لاتعلقی اور بے گانگی کے باوجود اب مزید رہا نہیں گیا۔" تایا ابا رندھی آواز میں بولے تو اس نے شکایتی نگاہوں سے اماں کی طرف دیکھا۔ جو سپاٹ چہرہ لیے تائی اماں کے ہاتھوں میں دبے اس کے ہاتھ کو دیکھ رہی تھیں۔ سیرت مامی نے کھانا لگنے کی اطلاع دی تو سب ڈائننگ روم کی طرف چل پڑے۔ کھانا کھانے کے بعد وہ ضحیٰ کو ڈھیر سارا پیار کرتے ہوئے رخصت ہو گئے۔

☼ ☼ ☼

"اماں! تایا ابا اتنے سالوں بعد مجھ سے ملنے آئے آپ کو اچھا نہیں لگا؟" تکیے پر غلاف چڑھاتی اماں نے چونک کر اسے دیکھا۔

"ایسی کوئی بات نہیں۔" کہہ کر دوبارہ اپنے کام میں مصروف ہو گئیں۔

"پلیز اماں! غلط مت بولیے۔ آپ کا چہرہ آپ کی ناگواری کا چیخ چیخ کر اعلان کر رہا ہے۔" اماں کو اس کے الفاظ سے زیادہ انداز سے تکلیف ہوئی۔

"کیوں کر رہی ہیں آپ ایسا؟ کیوں اس حویلی سے جڑا رشتہ توڑ دینا چاہتی ہیں؟" وہ ان کے ہاتھ سے تکیہ جھپٹ کر بدتمیزی سے بولی۔

"ضحیٰ! تمہارے پاپا کے اس دنیا سے چلے جانے کے بعد اس حویلی میں ہمارے لیے کچھ نہیں بچا۔" اس کے غصے سے سرخ پڑتے چہرے پر نظر ڈال کر وہ بے بسی سے گویا ہوئیں۔

"کیوں اماں کتنی ایسی عورتیں ہیں جو خاوند کی وفات کے بعد اپنے بچوں کے ساتھ اپنے سسرال میں رہتی ہیں؟ آپ خود تو اپنے سگوں کے درمیان آ گئیں پھر مجھے کیوں میرے اپنوں سے دور رکھا؟" وہ اپنی ماں سے بدگماں تھی۔

"یہ بھی تو تمہارے ماموں کا گھر ہے بیٹا۔" وہ رسانیت سے بولیں۔

"ہاں! لیکن یہ "میرا" گھر نہیں ہے میں اپنے باپ کے گھر مکمل استحقاق کے ساتھ رہنا چاہتی تھی۔" وہ خود ترسی کی کیفیت میں مبتلا تھی۔

"تم حویلی جانا چاہتی ہو؟" انہوں نے شکست خوردگی سے تھکے تھکے لہجے میں پوچھا۔

"ہاں اور میں جاؤں گی بھی ضرور۔" وہ بدلحاظی سے کہتی اٹھ کھڑی ہوئی اور تیزی سے باہر نکل گئی۔

"ضحیٰ! یہاں کیوں بیٹھی ہو؟" اپنے کمرے کی طرف جاتا شاہ میر اسے اس وقت سیڑھیوں پر گھٹنوں میں سر دیے بیٹھا دیکھ کر ٹھٹک گیا۔

"کیوں کیا میں اپنی مرضی سے کہیں بیٹھ بھی نہیں سکتی؟ یا پھر "آپ کے گھر" میں کہیں بھی بیٹھنے سے پہلے مجھے باقاعدہ آپ سے اجازت لینی چاہیے؟" وہ بدتمیزی سے کہتی اوپر سیڑھیاں چڑھ گئی۔

"پھر دماغ خراب ہو گیا ہے اس کا۔" شاہ میر ناگواری سے سر جھٹک کر رہ گیا۔

"کیا میں نے ضحیٰ کو حویلی والوں سے دور رکھ کر کوئی غلطی کر دی؟" کمرے میں حبس ایک دم ہی بڑھ گیا تھا انہوں نے اٹھ کر کھڑکی کھول دی۔

"لیکن وہ نا سمجھ ہے کچھ نہیں جانتی۔" اضطراری انداز میں ہاتھوں کی انگلیاں مروڑنے لگیں "میری بیٹی مجھ سے بدگمان ہو رہی ہے۔" ممتا کرلانے لگی۔

حویلی میں پانچ برس گزارنے کے بعد اتنا تو وہ بھی جانتی تھیں کہ اتنے سالوں بعد وہ محض یتیم بھتیجی کی محبت میں نہیں دوڑے چلے آئے تھے۔ بلکہ اصل مقصد یقیناً کچھ اور تھا۔ کیونکہ حویلی میں ان کی ذات کو گزند پہنچانے اور سازشوں کا نشانہ بنانے میں ان کے جیٹھ سکندر خان اپنی بیوی اور دوسرے بہن بھائیوں

کے ساتھ برابر کے شریک رہے تھے۔ انہوں نے سختی سے اپنی آنکھیں میچ لیں۔ گزرے ہوئے پل شدت سے یاد آرہے تھے۔

جہاں زیب صاحب کے دو بیٹے اور ایک بیٹی تھی۔ ان کی رفیقہ حیات شادی کے دس سال بعد انہیں داغ مفارقت دے کر ملک عدم سدھار گئیں۔ جہاں زیب صاحب نے اپنے کم عمر بن ماں کے بچوں کی بہترین تعلیم و تربیت میں کوئی دقیقہ فرو گزاشت نہ چھوڑا۔ دونوں بیٹوں کی مناسب عمر میں شادیاں کرکے اپنے فرائض سے سبکدوش ہوئے۔ ان کی بہوؤں سیرت اور سطوت دونوں بہنوں نے سارے گھر کو سلیقے سے سنبھال لیا۔ اپنی لاڈلی بیٹی شائستہ کی شادی انہوں نے اپنی دوست کے بیٹے محمد خان سے نہایت دھوم دھام سے کی۔ شائستہ بیاہ کر قریبی گاؤں خان پور چلی گئی۔ اور اپنی شوہر کے ساتھ خوشگوار ازواجی زندگی بسر کررہی تھی۔ لیکن محمد خان کی حویلی میں اس کی خوشیوں کی مدت بہت مختصر ثابت ہوئی۔ شادی کے محض پانچ سال بعد بیوگی کی چادر اوڑھ کر اپنی تین سالہ بیٹی ضحیٰ خان کو لے کر دوبارہ والد کی دہلیز پر آبیٹھیں۔ جہاں زیب صاحب اپنی لاڈلی بیٹی کا غم نہ سہار سکے۔ اور ایک سال کے اندر دل کا شدید دورہ پڑنے سے وفات پا گئے اشتیاق جہاں زیب کی ایک بیٹی صبا اور ایک بیٹا شاہ میر تھا۔ جبکہ مشتاق جہاں زیب کی ایک ہی بیٹی گل مہرین تھی جو تقریباً" ضحیٰ کی ہی ہم عمر تھی۔ دونوں بھائیوں نے بیوہ بہن اور بھانجی کو اپنی شفقت بھری تحویل میں لے لیا۔ محمد خان کی وفات کے بعد ان کا حویلی والوں سے رابطہ ٹوٹ گیا۔ اور وہاں سے کسی نے پلٹ کر ان کی خبر نہ لی۔ البتہ ان کے سسر حشمت خان صاحب انہیں دوسری شادی کی اجازت دے کر زندگی نئے سرے سے شروع کرنے پر اصرار کرتے رہے جو انہیں کسی طور منظور نہیں تھا۔ وقت کے تھال میں ماہ و سال کے سکے گرتے چلے گئے اب اتنے سالوں بعد سکندر خان کی آمد انہیں کسی خاص مقصد کا پیش خیمہ لگی۔

* * *

"گل! تمہارا اسیل فون کہاں ہے؟" ضحیٰ نے اندر داخل ہوتے ہوئے رسالے میں گم گل سے پوچھا۔

"دراز میں پڑا ہے۔" گل نے کوفت سے جواب دیا۔

"کیوں؟"

"یار! ایک رانگ نمبر تنگ کررہا ہے اس لیے میں نے آف کرکے رکھ دیا ہے خود ہی جان چھوڑ دے گا۔" گل بے زار تھی۔ ضحیٰ نے اسے گھورتے ہوئے سیل نکالا اور ابھی آن کیا ہی تھا کہ بپ ہونے لگی۔ گل نے بے چارگی سے پہلے سیل کو دیکھا اور پھر ضحیٰ کو جو کال اوکے کرکے موبائل کان سے لگا چکی تھی۔

"ہیلو؟" اس نے انتہائی سرد لہجے میں ہیلو کہا۔

"السلام علیکم! شکر ہے آپ نے کال اٹینڈ تو کی ہم تو آپ کی آواز سننے کے لیے ترس......"

"کیوں کیا دنیا میں مردوں کا کال پڑ گیا ہے، جو آپ لڑکیوں کی آواز سننے کے لیے ترستے پھر رہے ہیں۔؟" اس نے اجنبی کی بات کاٹتے ہوئے درشتگی سے کہا۔

"جی ی ی؟" مقابل کو شاید اس قدر عزت افزائی کی توقع نہیں تھی جب ہی بوکھلا گیا۔

"جی ہاں! کیا آپ پسند کریں گے کہ آپ کے گھر کی لڑکیاں آپ کی غیر موجودگی میں کسی "آپ" جیسے اجنبی سے موبائل پر بات چیت کریں؟ یا پھر آپ ان لڑکیوں کو موبائل جیسی سہولت سے محروم کرنا چاہتے ہیں جن کے والدین نے ان پر بھروسہ کرتے ہوئے انہیں موبائل استعمال کرنے کی اجازت دے رکھی ہے؟"

اس کے سرد و سپاٹ لہجے نے مقابل کی سٹی گم کردی۔ جب ہی فوراً" سے پیشتر خود ہی رابطہ منقطع کردیا۔ گل جو دم بخود سی اسے اجنبی کے لتے لیتے دیکھ رہی تھی۔ ایک جھٹکے سے اٹھی اور اسے گلے لگالیا۔

"ارے واہ! تم تو بہت بہادر ہو۔" گل کے توصیفی انداز پر اس نے بے نیازی سے کندھے اچکادیئے۔

* * *

آج موسم صبح سے ہی ابر آلود تھا ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کے نرم سبک جھونکوں نے موسم کو اچھا خاصا خوشگوار

بنادیا تھا۔ تینوں خواتین نے رشتہ داروں سے ملنے ملانے کا پروگرام بنالیا کہ آج قدرے فراغت نصیب ہوئی تھی۔ صبا کے سر میں درد تھا وہ ٹیبلٹ لے کر اپنے روم میں آرام کررہی تھی۔ اور ان دونوں کی موج مستیاں عروج پر تھیں۔ کچن میں حشر بپا کرنے کے بعد گل تو ڈائجسٹ لے کر کارپٹ پر نیم دراز ہوگئی۔ جبکہ ضحیٰ صوفے پر آڑی ترچھی لیٹی حسب عادت پاؤں جھلاتے ہوئے آنکھیں موندے سی ڈی پلیئر پر راحت فتح علی خان کا "سریلی اکھیوں والے" سے لطف اندوز ہورہی تھی۔

"صبا کہاں ہے؟" شاہ میر کی آواز پر دونوں ہڑبڑا کر سیدھی ہو بیٹھیں۔ "ان کے سر میں درد ہے آرام کررہی ہیں۔" ضحیٰ نے دوپٹہ درست کرتے ہوئے جواب دیا۔

"اوکے دو کپ چائے بنا کر اندر بیٹھک میں بھجوادو۔" اس بے موقع کے شاہی حکم پر دونوں تلملا کر رہ گئیں۔ چار و نا چار کچن کی طرف رخ کیا جیسے تیسے چائے تیار کی اور پروین کے ہاتھ اندر بھجوادی۔

عصر کی نماز پڑھنے کے بعد اماں لوگوں سے رشتہ داروں کا حال احوال سن رہی تھیں کہ شاہ میر غصے سے دھپ دھپ کرتا عین سر پر پہنچ گیا۔

"تم دونوں میں سے چائے کس نے بنائی تھی؟" کڑے تیوروں سے استفسار کیا۔

"دونوں نے۔" سر جھکا کر اقبال جرم کیا گیا۔

"شرم آنی چاہیے تم دونوں کو ڈھنگ کی چائے تک بنانا نہیں آتی "قد" دیکھا ہے اپنا؟" یہ طعنہ یقیناً" اسے ہی دیا گیا تھا۔ تڑپ کر سر اٹھایا۔

"شام کی چائے بنانے کی ڈیوٹی آئندہ سے تم دونوں کی ہوگی خبردار جو ٹال مٹول سے کام لیا تو۔" ماتھے پر بکھرے شہد رنگ بالوں کو بے نیازی سے جھٹکتا اپنی تمام تر وجاہت سمیت ضحیٰ کو وہ زہر لگا۔ اپنی ہائیٹ کی وجہ سے تو وہ پہلے ہی اچھی خاصی کونشس تھی۔ حالانکہ کالج میں اکثر لڑکیاں اس کی دراز قد کی دیوانی تھیں۔ اس کے کزن تو یہاں تک کہہ دیتے۔

"ضحیٰ! تمہارے ساتھ چلتے ہوئے ہم خواہ مخواہ میں کمپلیکس کا شکار ہونے لگتے ہیں۔" لیکن شاہ میر کا طعنہ اس کے دل میں کھب گیا۔

* * *

تایا ابا کا فون سننے کے بعد وہ اپنے اور گل کے مشترکہ کمرے میں آئی تو گل کی دبی دبی سسکیوں نے اسے چونکا دیا۔ گل کی روئی روئی سرخ آنکھیں دیکھ کر ضحیٰ کا دل دھک سے رہ گیا۔

"ضحو ئی! وہ مرگیا۔" اس سے لپٹ کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رودی۔

"کون مرگیا؟ کس کی بات کررہی ہو؟" اس نے غم سے بے حال ہوتی گل کی پشت سہلاتے ہوئے بمشکل پوچھا۔

"معیز حیدر۔" گل نے ہچکیوں کے درمیان اپنے فیورٹ ناول کے موسٹ فیورٹ ہیرو کا نام بتایا۔ جس کے غائبانہ عشق میں وہ گوڈے گوڈے ڈوبی ہوئی تھی۔ ضحیٰ پہلے تو نا سمجھی سے اسے دیکھتی رہی اور جب اصل بات سمجھ میں آئی تو تاسف سے سر ہلا کر رہ گئی۔ گندمی رنگت اور سیاہ گھنگھریالے بالوں والی گل مہرین کو دنیا میں صرف دو کاموں سے دلچسپی تھی۔ ایک تو ڈائجسٹ پڑھنا اور دوسرا موقع بے موقع افسانوی سچویشن کری ایٹ کرکے خود کو "ہیروئن" ثابت کرنا۔ اور اکثر اس کے دونوں شوق اسے اچھے خاصے مہنگے پڑتے تھے۔ ضحیٰ جانتی تھی کہ اب وہ کم از کم دو ہفتوں تک تو "معیز حیدر" کا سوگ منائے گی۔

* * *

ضحیٰ اور گل کی مشترکہ دوست اور کلاس فیلو شمائلہ نے اپنی منگنی کی خوشی میں اپنی دوستوں کو گھر میں پارٹی دی۔ تو یہ دونوں مشتاق ماموں کے سر ہوگئیں کہ پارٹی کے لیے شاپنگ کرنی ہے۔ مشتاق صاحب کے کہنے پر شاہ میر انہیں بازار لے آیا ڈریس اور شوز لینے کے بعد ضحیٰ اپنے سوٹ کی میچنگ چوڑیاں سلیکٹ کرنے لگی۔ سیلز بوائے نے پروفیشنل لہجے میں کہا۔

"مس! اپنا ہاتھ دکھائیں۔" ضحیٰ جو اپنا ہاتھ لڑکے کی طرف بڑھانے والی تھی شاہ میر کے سرد لہجے پر ٹھٹک گئی۔

"کیوں؟"

"جناب چوڑی کا ناپ لینا ہے۔" سیلز بوائے نے قدرے گھبرا کر وضاحت کی۔

"ضحیٰ! اپنی ایک چوڑی اتارو۔" شاہ میر نے لڑکے کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے ضحیٰ سے کہا تو اس نے چپ چاپ چوڑی اتار کر شاہ میر کی طرف بڑھادی۔

"یہی سائز ہے۔" شاہ میر نے چوڑی کاؤنٹر پر رکھتے ہوئے سیلز بوائے کو جتا کر کہا تو وہ فوراً" مطلوبہ چوڑیاں پیک کرنے لگا۔ ضحیٰ حیرت سے شاہ میر کو تکنے لگی جو اب گل کی طرف متوجہ ہو چکا تھا۔

☼ ☼ ☼

گل نے صحن میں پانی کا چھڑکاؤ کر کے چارپائیاں بچھادی تھیں۔ اماں، سیرت اور سطوت ماں رات کے کھانے کے لیے سبزی بنا رہی تھیں اور ساتھ ساتھ باتیں بھی کرتی جا رہی تھیں۔ موضوع گفتگو صبا کی شادی تھا۔

"ضحیٰ! تمہارے تایا کا فون ہے۔" صبا آپا کے کہنے پر وہ فون اسٹینڈ کی طرف بڑھ گئی۔ تایا نے اس کے لیے چیزیں بھجوائی تھیں ان کی بابت پوچھنے کے بعد اس حویلی آنے پر اصرار کیا کیونکہ اس کے دادا ابا اس سے ملنا چاہتے تھے۔ امتحانات سے فراغت پانے کے بعد حویلی آنے کی یقین دہانی کرتے ہوئے اس نے فون رکھ دیا۔

اشتیاق صاحب ان دونوں صبا کی شادی کے بارے میں سنجیدگی سے سوچ رہے تھے۔ لیکن اس کی سسرال والے مسلسل ٹال مٹول سے کام لے رہے تھے۔ اس لیے سطوت نے انہیں کھانے پر مدعو کرنے کا فیصلہ کیا تاکہ اس موضوع پر کھل کر بات چیت کر سکیں۔ شبانہ بیگم (صبا کی ساس) کے اچانک آنے والے معذرتی فون نے گھر کے در و دیوار کو ہلا کر رکھ دیا۔

ارسلان اپنی کلاس فیلو زوباریہ میں انٹرسٹڈ تھا۔ لیکن شبانہ بیگم نے بیٹے کی پسند کردہ لڑکی کو دیکھے بغیر ریجیکٹ کر دیا اور اپنی پسند کی بہو لانے کا فیصلہ سنا دیا کافی تلاش بسیار کے بعد انہیں اپنا گوہر مقصود صبا کی صورت میں مل گیا تو بیٹے کی خفگی کی پروا نہ کرتے ہوئے صبا کو منگنی کی انگوٹھی پہنا کر ہی دم لیا اور اپنے فیصلے پر شاداں و فرحاں شادی کی تیاریوں میں مگن ہو گئیں۔ دھچکہ تو اس وقت انہیں لگا جب ارسلان نے شادی سے صاف انکار کر دیا کہ شادی تو وہ صرف زوباریہ سے ہی کرے گا شبانہ بیگم اپنی مرضی سے بھلے اس کی دس منگنیاں کرتی پھریں۔ اس موقع پر آ کر شبانہ بیگم کو اپنی فاش غلطی کا احساس ہوا۔ مارے خفت و شرمندگی کے ان کا براہ راست سامنا کرنے کی ہمت تو خود میں پیدا نہ کر سکیں لہٰذا فون پر ہی سارے حالات ان کے گوش گزار کر دیے۔ سطوت بیگم تو جواباً" انہیں برا بھلا تک نہیں کہہ سکیں۔ خاموشی سے ریسیور کریڈل پر رکھا اور دونوں ہاتھوں میں سر تھام کے بیٹھ گئیں۔

☼ ☼ ☼

گھر کی فضا بہت کثیف اور بوجھل ہو گئی تھی۔ اداسی و پژمردگی نے چاروں اور اپنے پنجے گاڑ دیے۔ کم گو سی صبا سارا دن خاموشی سے کاموں میں جتی رہتی اسے دیکھ کر سطوت بیگم کو اپنے آنسوؤں پہ بند باندھنا مشکل ہو جاتا۔ ایسے میں سیرت اور شائستہ کی تسلیاں بھی انہیں پرسکون کرنے میں ناکام ثابت ہو جاتیں گل نے ڈائجسٹ کے لیے گیٹ کے چکر لگانا چھوڑ دیے۔ اشتیاق اور مشتاق صاحب کی سنجیدگی اور تفکر بڑھ گیا۔ ایسے میں ایک شاہ میر ہی تھا جو سب کی دلجوئی کرتا کہ اگر خدانخواستہ شادی کے بعد ایسی صورتحال درپیش ہوتی تو وہ لوگ بھلا کیا کر لیتے۔

شام ڈھلے پنچھی اپنے آشیانوں کو لوٹ رہے تھے۔ شاہ خاور اپنا سفر مکمل کر کے مغرب کی گود میں سر رکھ کر سو گیا۔ وہ امرود کے تنے سے ٹیک لگائے کلائی میں پڑی

کلائی چوڑیوں سے کھیل رہی تھی۔ تاریکی بڑھ گئی تو وہ ہاتھ جھاڑ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ چوڑیوں کی جلترنگ سن کر بھوری چڑیا سہم کر پتوں میں چھپ گئی۔ یاسیت بھری اس اداس شام میں اس نے "خان پور" جانے کا فیصلہ کر لیا۔ شاہ میر کی شرٹ پر بٹن لگاتی اماں کا دل لمحہ بھر کو دھڑکنا بھول گیا۔

"شاہ میر تمہیں چھوڑ آئے گا۔" دانتوں سے دھاگہ توڑتے ہوئے انہوں نے اپنے ہاتھوں کی لرزاہٹ پر قابو پانے کی سعی کی۔ شرٹ لینے کے لیے اندر آتا شاہ میر دروازے پر ہی ٹھٹک کر رک گیا۔ اس نے حویلی فون کر دیا تھا۔ تایا ابا اس کے حویلی آنے کا سن کر بہت خوش ہوئے۔

☼ ☼ ☼

گل کو پتا چلا تو وہ چیخ اٹھی۔ "ضوئی! میں تمہارے بغیر بور ہو جاؤں گی یار۔" ضحیٰ کو پیکنگ کرتے دیکھ کر وہ بے چارگی سے گویا ہوئی۔

"تو تم بھی میرے ساتھ چلو۔" ضحیٰ نے کاٹن کا سوٹ تہ کرتے ہوئے کہا۔

"میں بھلا اتنے دن تمہارے باپ کے گھر کیا کروں گی؟" وہ چڑ گئی۔

"جو اتنے سالوں سے میں تمہارے "باپ" کے گھر کر رہی تھی۔" بیگ کی زپ بند کرتے ہوئے وہ سکون سے بولی۔

"میرا یہ مطلب نہیں تھا تم فرسٹ ٹائم اپنے رشتہ داروں سے ملنے جا رہی ہو میں بھلا وہاں کیا کروں گی؟" گل نے گڑبڑا کر وضاحت کی۔

سب سے ملنے کے بعد وہ اماں کے کمرے میں چلی آئی جو دروازے کی طرف پشت کیے اضطراری انداز میں بیڈ کی بے شکن چادر کو درست کر رہی تھیں۔

"اماں!" ضحیٰ کے پکارنے پر وہ ایک دم پلٹیں اور اسے زور سے گلے لگا لیا۔

"اپنا خیال رکھنا ضحیٰ! تم میری زندگی ہو اور زندگی کے بغیر صرف مرا جا سکتا ہے۔" اماں کے آنسو چھلکتے ہوئے اس کی اپنی پلکیں بھیگ گئیں۔

"جہانگیر تمہیں لینے آیا ہے۔" شاہ میر کے سپاٹ لہجے پر اس نے استفہامیہ نگاہوں سے دیکھا۔

"جہانگیر سکندر تمہارا تایا زاد۔" اتنا کہہ کر وہ سائیڈ سے نکلتا چلا گیا۔ ضحیٰ اس کے الفاظ و انداز پر حیران ہوتی گاڑی کی طرف بڑھ گئی فرنٹ سیٹ پر بیٹھتے ہی جہانگیر نے دروازہ بند کیا اور گاڑی اسٹارٹ کر دی۔

☼ ☼ ☼

براؤن کاٹن کے شلوار قمیص میں ملبوس چادر کندھے پر ڈالے وہ اسے روایتی جاگیردار لگا۔ سفر کی طوالت اور اس کی مسلسل خاموشی سے اکتا کر جہانگیر نے اس سے ہلکی پھلکی باتیں شروع کر دیں۔ جس کے جواب دینے میں اس نے نہایت اختصار سے کام لیا۔ اور جان بوجھ کر اسے نظر انداز کرتے ہوئے ونڈو سے باہر بھاگتے دوڑتے مناظر پر نگاہیں جما دیں۔ جہانگیر نے ایک بھرپور نظر اس کے بے نیاز انداز پر ڈالی اور ڈرائیونگ کی طرف متوجہ ہو گیا گاڑی ایک جھٹکے سے عالی شاہ حویلی کے سامنے رکی تو وہ چونک کر سیدھی ہو گئی۔ حویلی کے اندر پہلا قدم رکھتے ہی وہ عجیب احساسات سے دوچار ہو گئی یہ حویلی اس کے باپ کی تھی۔ اس حویلی میں اس کی ماں دلہن بن کر آئی تھی۔ اسی حویلی میں وہ پیدا ہوئی تھی اور اسی حویلی میں اس کے نوجوان باپ کا جنازہ اٹھا تھا۔ اس کے اندر کہیں آنسو گرنے لگے۔ سب سے پہلے سکندر تایا اس کے استقبال کو آگے بڑھے اور اسے بازوؤں کے گھیرے میں لے کر اندرونی حصے کی طرف بڑھ گئے۔ وہ پلکیں جھپک جھپک کر پہلی بار ان اجنبی لوگوں کو دیکھ رہی تھی جو اس کے بہت اپنے تھے سب سے آخر میں اس کی ملاقات اپنے دادا حشمت خان سے ہوئی۔ ان کی شفیق بانہوں میں سماتے ہی اسے ٹوٹ کے رونا آیا۔ دادا ابا کی بوڑھی آنکھوں سے آنسو ٹوٹ ٹوٹ کر اس کے بالوں میں جذب ہونے لگے۔

☼ ☼ ☼

اگلا سارا دن اس نے دادا ابا کے ساتھ ان کے کمرے میں گزار دیا۔ وہ اسے اس کے باپ کی بچپن کی شرارتیں اور جوانی کے قصے سناتے ہوئے آبدیدہ ہو گئے۔ اسے بتایا کہ کتنے دھوم دھام سے انہوں نے اپنے سب سے لاڈلے اور فرمانبردار بیٹے کی شادی کی تھی۔ شائستہ ان کی پسندیدہ بہو تھی۔ اور جب وہ پیدا ہوئی تو اس کے باپ اور دادا نے پورے سات دن جشن منایا تھا۔

ہر چند کہ اس حویلی کے دیگر لوگوں کو ایک "لڑکی" کی پیدائش پر اس قدر خوشی و مسرت کا اظہار خاصا ناگوار گزرا تھا۔

ضحیٰ کو یوں لگا جیسے اس کے وجود کا نامکمل حصہ مکمل ہو گیا ہو۔ اس تشنگی اور کسک کو تو ماموؤں کی شفقت اور مامیوں کی بے لوث محبتیں بھی ختم نہ کر سکی تھیں۔ اس نے پر سکون ہو کر دادا ابا کے سینے پر سر رکھ کر آنکھیں موند لیں۔

☼ ☼ ☼

صبح ناشتا اس نے سب کے ساتھ مل کر کیا۔ اپنی طرف عجیب نظروں سے گھورتی روبینہ پھپھو اور ان کی بیٹی عظمیٰ کے علاوہ باقی سب اسے اچھے لگے۔

"چلو ضحیٰ! تمہیں حویلی دکھا آئیں۔" منجھلے چچا کی مائدہ اور عمدہ کے کہنے پر وہ چائے کا خالی کپ رکھ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ بلند ستونوں، اونچی چھتوں اور بڑے بڑے دالانوں والی یہ وسیع رقبے پر پھیلی یہ پرشکوہ حویلی قدیم و جدید امتزاج کا مکمل نمونہ تھی۔

"کیا خیال ہے ضحیٰ! تمہیں گاؤں کی سیر کروائیں؟" دھڑ دھڑ سیڑھیاں اترتا جہانگیر اس کے عین سامنے جم کر بے تکلفی سے گویا ہوا۔ ضحیٰ کو اس کا یوں بے باکی سے دیکھنا سخت برا لگا۔

"جی نہیں شکریہ! اگر میرا موڈ ہوا تو میں خود دادا ابا سے کہہ دوں گی۔" وہ ناگواری سے کہتی آگے بڑھ گئی۔

"یہ تمہارے پاپا کا بیڈ روم ہے۔" مائدہ نے کوریڈور سے گزرتے ہوئے ایک کمرے کی طرف اشارہ کیا تو وہ بے اختیار اس کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

"تم لوگ پلیز مائنڈ مت کرنا میں اکیلے میں اپنے پاپا کا روم دیکھنا چاہوں گی۔" اس نے لکڑی کا بھاری منقش دروازہ کھولتے ہوئے مڑ کر کہا تو وہ اثبات میں مسکرائی سر ہلا کر اوپر سیڑھیاں چڑھ گئیں۔ وہ خواب کی سی کیفیت میں ایک ایک چیز کو چھو کر دیکھنے لگی۔

"کاش پاپا آپ اتنی جلدی نہ جاتے۔" سائیڈ ٹیبل پر رکھی پاپا کی تصویر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اس کے آنسو ٹپ ٹپ گر کے تصویر پر گرنے لگے۔ دادا ابا نے آہستہ سے اس کا سر تھپتھپایا تو اس نے چونک کر بھیگی پلکیں اٹھائیں۔ وہ ان کی آمد سے بے خبر تھی۔

☼ ☼ ☼

دوپہر کا کھانا کھا کر وہ لیٹی تو کافی دیر بعد اس کی آنکھ بارش کے شور سے کھلی۔ اس نے اٹھ کر کھڑکی کے دونوں پٹ کھول دیئے بارش کے قطرے اس کے چہرہ کو بھگو گئے۔ سرسبز لان میں گلاب کے پھولوں کے پاس رقص کرتے مور کو وہ مبہوت ہو کر دیکھتی رہی اس موسم میں اسے گل شدت سے یاد آئی اور اسے یاد کرتے ہی اس کے پنکھڑیوں جیسے گلابی لب مسکرا اٹھے۔ اچانک اس کی نظر برآمدے میں کھڑے جہانگیر پر پڑی جو بڑی فرصت سے اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ اس کے مسکراتے لب سمٹ گئے۔ اور ناگواری سے کھڑکی چھوڑ کر پیچھے ہٹ گئی۔

شام کے وقت مائدہ اسے نیچے لے گئی جہاں صحن میں سب چوڑیاں بیچنے والی "چوہڑی" سے چوڑیاں پہن رہی تھیں۔ تائی اماں نے اسے بھی اپنے ساتھ چوڑیاں پہنانے کے لیے بٹھا لیا۔

"ضحیٰ! تم یہ والی چوڑیاں پہن لو۔" اچانک جہانگیر نے ٹوکرے سے اورنج کلر والی چوڑیاں اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"آخر مسئلہ کیا ہے اس کے ساتھ؟" اس کی صبیح پیشانی پر بل پڑ گئے۔

"مجھے یہ کلر پسند نہیں۔" جہانگیر کے بڑھے ہوئے ہاتھ کو نظر انداز کرتے ہوئے اس نے نخوت سے جواب دیا اور لاشعوری طور پر ہلکے نیلے کلر کی نازک چوڑیاں اٹھا لیں۔ یہ شاہ میر کا فیورٹ کلر تھا۔ جہانگیر نے تختی سے لب بھینچ لیے۔ اورنج کاٹن کا سوٹ پہنے عظمیٰ نے ضحیٰ کو بڑی سلگتی ہوئی نظروں سے دیکھا۔

☼ ☼ ☼

دادا ابا آج کسی ضروری کام کے سلسلے میں باہر گئے ہوئے تھے۔ وہ شاور لینے کے بعد بالوں میں برش کر رہی تھی کہ گل کا فون آ گیا۔

"منگنی مبارک ہو۔" گل حسب عادت بغیر سلام دعا کے شروع ہو گئی "کس بات کی مبارک؟" اس نے حیرانی سے استفسار کیا۔

"گینز بک آف ورلڈ ریکارڈ میں تمہارا نام دنیا کی سب سے بے وفا لڑکی کے طور پر آیا ہے۔" گل کے جلے کٹے لہجے پر وہ ہنس پڑی۔

سیرت مامی کی خالہ خورشید نے اپنے اکلوتے بیٹے کے لیے صبا آپا کا رشتہ مانگا تو سب گھر والوں نے سوچ بچار کرنے کے بعد انہیں "ہاں" کر دی خورشید خالہ جٹ منگنی اور پٹ بیاہ کے چکر میں تھیں۔ گل بہت ایکسائیٹڈ ہو رہی تھی۔ لیکن ضحیٰ کے بغیر اسے بالکل مزا نہیں آ رہا تھا۔ اس لیے "فوراً" سے پیشتر اسے واپس آنے کا حکم دیا۔ گل سے بات کرنے کے بعد اس کا موڈ بہت خوشگوار ہو گیا۔

اسے بھوک کا احساس ہوا تو کچھ کھانے کے لیے کچن کی طرف چل پڑی ایک کمرے کے سامنے سے گزرتے ہوئے اپنا نام سن کر ٹھٹک کر رک گئی۔

"عظمیٰ! تم جیلس نہیں ہو تیں یہ سب دیکھ کر؟" یہ آواز یقیناً "چھوٹے چچا کی ریحانہ کی تھی۔

"جیلسی تو ہوتی ہے میری جان! پر کیا ہے نا کہ "سب کچھ" پانے کے لیے "کچھ نہ کچھ" تو کھونا ہی پڑتا ہے۔ ویسے بھی اس ڈرامے کا ڈراپ سین ہونے والا ہے تائی اماں نے تو صاف کہا ہے کہ شادی کے اگلے روز ہی ضحیٰ صاحبہ کو طلاق نامہ پکڑا کر حویلی سے چلتا کر دیں گی۔" عظمیٰ کی مکروہ ہنسی اس کے اندر چھید کرنے لگی۔

"ویسے یار! ضحیٰ ہے بہت خوبصورت اگر جہانگیر بھائی نے اسے طلاق دینے سے انکار کر دیا تو...؟" اس کی آنکھوں میں مرچیں سی چبھنے لگیں۔

"ناممکن! جہانگیر سکندر خوبصورتی کا دلدادہ ضرور ہے مگر اسے صرف دولت سے پیار ہے۔ اس کی ساری زمینیں اپنے نام کروانے کے بعد میری اماں اسے یہاں ٹکنے تھوڑی دیں گی یہ بھی اپنی والدہ ماجدہ کی طرح خود ہی بھاگ جائے گی۔ بس دادا ابا کو پتا نہیں چلنا چاہیے ورنہ وہ ضرور مشکل کھڑی کر دیں گے۔" کسی نے اس کی پیشانی پر کھینچ کر پتھر مارا۔

"اماں کی مصلحت آمیز خاموشی کے پیچھے یہ بھیانک حقیقتیں پوشیدہ تھیں وہ مجھے اسی دکھ سے بچانا چاہتی تھیں۔ اور میں ان کی چپ سے بدگماں ہو کر کیا کچھ اخذ کرتی رہی۔ مجھے معاف کر دیں اماں۔"

وہ اپنی ذات کی بکھری کرچیوں پر چل کر زخم زخم وجود لیے وہاں سے پلٹ گئی۔

☼ ☼ ☼

سنو تم لوٹ آونا!
جہاں تم ہو وہ دنیا کب تمہاری ہے
کہ سورج ڈھل گیا ہے
اور حسین شام اتری ہے
وہ دیکھو چاند نکلا ہے، ستارے جگمگائے ہیں
ہماری منتظر آنکھیں، دعائیں مانگتی آنکھیں
تمہیں ہی سوچتی آنکھیں
تمہیں ہی ڈھونڈتی آنکھیں
تمہارا عکس پھر شاید
میری پلکوں پہ اترا ہے
یہ دل جب بھی دھڑکتا ہے
تمہارا نام لیتا ہے
کہ بارش جب بھی ہوتی ہے
تمہیں ہی یاد کرتی ہے
خوشی کوئی جو آئے تو
تمہارے بن ادھوری ہے

سنو تم لوٹ آؤ نا!
اس نے موبائل کان سے لگایا تو شاہ میر کا جذبوں سے گندھا لہجہ اس کے کانوں میں امرت گھولنے لگا۔ اس کے جلتے بلکتے دل پر نرم ٹھنڈی ٹھنڈی پھوار برسنے لگی۔
"اتنی دیر کر دی شاہ میر...؟" شکوہ اس کے لبوں پر ہی دم توڑ گیا۔ کچھ لوگ گلابوں کی طرح ہوتے ہیں جن کی آواز سنتے ہی ارد گرد خوشبو پھیل جاتی ہے۔ اس کی نم آنکھوں میں چاہتوں کے کئی دیپ جل اٹھے۔

☼ ☼ ☼

دادا ابا کے ساتھ ادھیڑ عمر اجنبی کو اندر آتے دیکھ کر وہ کھڑی ہو گئی۔
"فاروقی صاحب! یہ میری پوتی ہے ضحیٰ خان۔" دادا ابا نے اسے اپنے ساتھ بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔
وہ خاموشی سے ان کے ساتھ صوفے پر بیٹھ گئی۔
"یہ آپ کی جائیداد کے کاغذات ہیں بیٹا! ان پیپرز پر سائن کر دیں۔" فاروقی صاحب کے کہنے پر اس نے دادا ابا کی طرف دیکھا۔ انہوں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اثبات میں سر ہلا دیا۔ وہ سر جھکا کر مطلوبہ پیپرز پر سائن کرنے لگی۔
"اپنے باپ کی جائیداد پر صرف تمہارا حق ہے بیٹا! میرے لاکھ سمجھانے کے باوجود بھی تمہاری ماں آسانی سے اس حق سے دستبردار ہو گئی لیکن میں روزِ قیامت اپنے بیٹے کے سامنے سرخرو ہونا چاہتا ہوں ان کاغذات کو سنبھال کر رکھنا۔" فاروقی صاحب کو رخصت کرنے کے بعد دادا ابا نے اسے شفقت سے اپنے ساتھ لپٹاتے ہوئے کہا کھڑکی سے جھانکتے روشن چاند کو تکتے ہوئے اس نے واپسی کا فیصلہ کیا شاہ میر کے نمبر پر میسج سینڈ کر کے طمانیت سے آنکھیں موند لیں۔

☼ ☼ ☼

سنا ہے یاد کرتے ہو
کہ جب بھی شام ڈھلتی ہے
ہجر میں جان جلتی ہے
تم اپنی رات کا اکثر سکون
برباد کرتے ہو
سنا ہے یاد کرتے ہو!
جب پنچھی لوٹ آتے ہیں
غموں کے گیت گاتے ہیں
"سنو تم لوٹ آؤ نا!"
یہی فریاد کرتے ہو...
سنا ہے یاد کرتے ہو
ستارے جب فلک پہ جگمگاتے ہیں
وہ بیتے ہوئے پل خوب رلاتے ہیں
تم اس دم اپنی آنکھوں میں
مجھے آباد کرتے ہو
سنا ہے یاد کرتے ہو
مجھے تم یاد کرتے ہو!!
"شاہ میر مجھے یہاں سے لے جاؤ۔" اس کا پیغام پڑھ کر شاہ میر کھل کر مسکرا دیا۔

☼ ☼ ☼

وہ بڑے کمرے میں داخل ہوئی تو سب اسے بیگ کے ساتھ تیار دیکھ کر چونک گئے۔
"ضحیٰ بیٹا! کہاں کی تیاری ہے؟" تائی اماں نے چہرے پر زبردستی مسکراہٹ سجاتے ہوئے پوچھا۔
"اپنے گھر! شکریہ آپ سب نے میرا بہت خیال رکھا۔ شاہ میر مجھے لینے آتا ہی ہو گا۔" سب کے فق ہوتے چہروں پر افسردگی بھری نگاہ ڈالتے ہوئے اس نے سکون سے کہا اور قدم باہر کی طرف بڑھا دیئے۔
شاہ میر کی گاڑی کا مخصوص ہارن سن کر وہ حویلی پر الوداعی نظر ڈالتی تیزی سے باہر نکل آئی۔ اسے اپنے پیاروں سے ملنے کی جلدی تھی جن کی محبتیں وہ حق سمجھ کر وصول کرتے آئی تھی لیکن اب انہیں ساری محبتیں سود سمیت لوٹانے کی خواہش مند تھی۔

☼ ☼

نایاب جیلانی

او رے پیا

چھٹی قسط 6

مکمل ناول

"اتنے لالچی لوگ تھے' اللہ کا شکر ہے' بروقت پتا چل گیا ہے۔" خالہ کی آواز میں تشکر کی نمی بھی جھلک رہی تھی۔ حریم بے دم سی بیٹھتی چلی گئی۔

"تم غم نہ کھاؤ۔ اللہ کے ہر کام میں مصلحت ہوتی ہے۔" وہ اسے دلاسا دینے کی ناکام کوشش کر رہی تھیں۔

"ہم نے اپنی طرف سے جواب دے دیا' بوا نے تو بہت بے عزتی بھی کی ہے' کہنے لگے' حانی کے نام کوٹھی لگوا دیں۔ اگلے مرحلے بعد میں طے کیے جائیں گے۔ ایسے کمینے اور لالچی لوگ' بس کوئی نیکی کام آ گئی ہے' جو جلد ہی ان کی اصلیت کھل گئی۔"

"آپ نے اچھا کیا' جو بات آگے نہیں بڑھائی۔ نہ جانے بعد میں کیسے کیسے مطالبے سامنے آنے لگتے۔" حریم گہری سانس خارج کرتی آہستگی سے بولی۔

"تم سناؤ' راحت بہن کی طبیعت کیسی ہے؟"

"ماہیر کا ابھی کوئی فون نہیں آیا۔" اس نے افسردگی سے بتایا۔

"اللہ صحت کاملہ سے نوازے' تم پریشان مت ہونا' میں صبح تک چکر لگاؤں گی۔" خالہ نے الوداعی کلمات کہنے کے بعد فون رکھ دیا تھا۔

"بھابھی! تم آ گئیں۔" موبی نہ جانے کس وقت اس کے قریب آ کر بیٹھ گیا تھا۔

"تم ابھی تک سوئے نہیں۔" وہ چونک کر موبی کی طرف دیکھنے لگی تھی۔

"نیند نہیں آ رہی' امی نہ جانے کب آئیں گی' میرا دل گھبرا رہا ہے بھابھی۔" موبی بہت ہراساں تھا۔

"ابھی کچھ دیر تک آ جائیں گے۔" وہ اسے دلاسا دینے کے لیے الفاظ سوچ رہی تھی۔

"امی مریں گی تو نہیں۔" موبی نے خوف زدہ انداز میں پوچھا۔

"اللہ نہ کرے' بس تم دعا کرو' ماہیر ابھی امی کو لے کر آ جائیں گے۔"

"بھابھی! تم۔۔۔ تم بہت اچھی ہو۔" موبی نے اٹک اٹک کر اسے دیکھتے ہوئے کہا تھا۔ حریم ابھی کچھ حیران سی اس تعریفی جملے پر غور کر رہی تھی۔ جب موبی نے اس کا ہاتھ پکڑا اور مخصوص اسٹائل میں چوم کر مسکرانے لگا۔

"ہمیں چھوڑ کر تو نہیں جاؤ گی۔"

"نہیں۔" حریم نے حیران ہونا چھوڑ کر ہولے سے مسکرا کر کہا۔

"آپ کو ایک بات بتاؤں بھابھی۔" وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر نرمی سے بولا۔

"بتاؤ۔" حریم کا دھیان چندپل کے لیے حانی کے مسئلے سے ہٹ گیا تھا۔

"امی اور میں تم سے بہت محبت کرتے ہیں۔"

"اچھا۔" اب کے حریم کو سچ مچ جھٹکا لگا تھا۔ موبی کبھی سچ مچ تحیر میں مبتلا کر دیتا تھا۔

"مجھے تمہاری محبت پر یقین ہے۔" حریم مسکرا

دی۔

"اور امی کی محبت پر یقین ہلکا ہے۔" وہ بغیر مسکرائے کہہ رہا تھا۔

"ایسا کیوں بھابھی! امی زبان کی کڑوی ہیں، مگر دل کی بری نہیں۔ ان کا دل بہت نرم ہے اور تمہارے لیے بہت نرم ہے۔"

"ہر بچہ اپنی ماں کے بارے میں حساس ہوتا ہے۔" حریم نے بے دلی سے کہا۔

"ابھی کچھ دن پہلے تم اپنی امی کو خود غرض کہہ رہے تھے غالباً۔"

"ہاں۔۔۔ انہوں نے مکان بکوا کر غلط کیا ہے، مگر ان کی محبت پر شک تو نہیں کیا جاسکتا۔" کبھی کبھی وہ ایسے ہی حریم کو حیران کردیتا تھا۔

"امی تم سے محبت کرتی ہیں بھابھی! کبھی آزما کے دیکھ لینا۔"

"نہ جانے کیسی محبت ہے یہ، ہر وقت کی چخ چخ اور ذہنی اذیت میں لپٹی محبت۔" اس نے تنفر سے سوچا۔

"بھابھی! کیا سوچ رہی ہو؟" موبی نے اس کا کندھا ہلایا۔

"موبی! تم پڑھتے کیوں نہیں؟" وہ کئی دفعہ سوچتی تھی کہ موبی کو پڑھائی کی طرف ضرور مائل کرلے گی۔ موبی کے ذہن کو مصروف رکھنے کے لیے کتاب سے اچھی کوئی اور دوسری چیز نہیں ہوسکتی تھی۔

"میں نہیں پڑھ سکتا۔" موبی بے زاری سے بولا۔

"میں پڑھ لکھ کر افسر تو نہیں لگ جاؤں گا۔ اگر افسر ہو بھی گیا تو اس سے بھی فرق نہیں پڑنے والا۔" موبی کا انداز سخت کٹیلا تھا۔

"کیوں فرق نہیں پڑے گا۔" حریم کا نرم لہجہ مخصوص حلاوت لیے ہوئے تھا۔

"کیا تمہارا دل نہیں چاہتا اپنے بھائی جیسی زندگی گزارنے کے لیے، کیا تم ماہیر جیسا بننا نہیں چاہتے، ایک نارمل زندگی نہیں جینا چاہتے۔"

"میں ماہیر بھائی جیسا کبھی نہیں ہوسکتا، نہ بن سکتا ہوں، نہ ماہیر جیسا بننے کی خواہش دل میں پال سکتا ہوں۔" موبی نے اذیت سے اپنے لب کچل دیے تھے۔

"مگر کیوں؟ تم میں لگن اور جذبہ کیوں نہیں موبی! تم صحت مند ہو، ذہنی طور پر بیمار نہیں، تمہاری سوچ بیمار نہیں، تم ایک اچھی اور بہتر زندگی کے لیے کوشش کرو، میں چاہتی ہوں تم پڑھو، کچھ بن کر دکھاؤ، میں تمہارا ساتھ دوں گی، تمہیں منزل تک پہنچاؤں گی۔"

"منزل؟" موبی کو گویا جھٹکا لگا۔

"کیسی منزل؟ کون سی منزل؟"

"تمہیں آگے تک لے جاؤں گی، تم اپنے پیروں پر کھڑے ہوجاؤ گے، کسی بھی باعزت پیشے سے منسلک ہوجاؤ گے۔ اور اس کے بعد تمہاری شادی کروں گی۔" وہ بالکل اسے ایک بچے کی طرح ٹریٹ کررہی تھی۔ مگر سامنے بیٹھا یہ ساڑھے سولہ، سترہ سالہ لڑکا "بچہ" نہیں تھا۔ بہروپیا تھا۔ خود پر ہر رنگ کے خول چڑھالیتا تھا۔

یہ فن پیدائشی تھا، اس کی فطرت میں شامل ہوگیا تھا۔ کبھی چار سال کا بچہ بن جاتا، کبھی ایب نارمل نظر آنے لگتا۔ کبھی یوں محسوس ہوتا اس سے زیادہ کوئی ہوشیار ہو ہی نہیں سکتا۔ کبھی اپنی ذات میں درویش اور ملنگ دکھنے لگتا۔ کبھی پچھلی صدی کی باتیں کرنے لگتا، کبھی نئی صدی کے انکشافات کرتا۔ وہ سچ مچ ایک معمہ تھا۔ اور اس معمے کو کم از کم حریم سمجھ نہیں سکتی تھی۔ وہ الجبرے کا ایک پیچیدہ سوال تھا۔ ایک پراسرار کتاب تھا، بے حد عجیب سے خواب دیکھنے والا بے حد عجیب لڑکا۔ وہ غلط یا جھوٹے خواب نہیں دیکھتا تھا۔ اس کے خواب ہمیشہ سچے ہوتے تھے اور سچ بن کر سامنے بھی آجاتے۔

"میری کوئی منزل نہیں، میں منزل کے پیچھے بھاگ نہیں سکتا، میں جس کنویں میں ہمیشہ سے ہوں، کبھی اس کنویں سے باہر نہیں آسکتا۔" حریم نے دیکھا وہ رو رہا تھا۔

"باہر آنے کی کوشش بھی نہیں کرسکتا، کیوں کروں؟ کس لیے کروں؟" وہ اٹھا تھا اور پھر بھاگتے ہوئے اپنے کمرے میں بند ہوگیا۔ حریم جانتی تھی یہ

دروازہ اب صبح سے پہلے نہیں کھل سکے گا۔ وہ بھی بے دلی سے اٹھ کر کچن کی طرف بڑھ گئی۔

☆ ☆ ☆

"ہنی! تم یہاں۔" زر جان کچھ پل کے لیے تو ششدر رہ گیا۔ وہ سامنے صوفے پر بیٹھی تھی۔ زر جان کو دیکھ کر کھڑی ہوگئی۔

"میں یہاں نہیں آسکتی۔"

"کیوں نہیں۔ مگر اس طرح سے، اطلاع دیے بغیر۔" وہ اپنی حیرت پر قابو پاچکا تھا۔

"آپ تو مجھ سے بغیر ملے ہی واپس چلے جاتے نا۔" ہنی نے پورے وثوق سے کہا تھا۔ ہمیشہ ایسے ہی تو ہوتا تھا۔ لاکھ چاہنے کے باوجود وہ ہنی سے ملے بغیر چلا جاتا تھا۔ نہ جانے کیوں؟ یہ فرار کس لیے۔

"اب کوئی بہانہ سوچنے کی ضرورت نہیں، میں جانتی ہوں، آپ کل کی فلائٹ سے مسقط جارہے ہیں۔ اور آج کے شیڈول میں آپ کے بے شمار کام ہیں۔ ان میں ہنی سے ملاقات کہیں بھی نہیں۔"

"ایکچوئیلی! یہاں آنے کے بعد وقت دگنی رفتار سے بھاگنے لگتا ہے۔" زر جان کو سچ مچ کوئی ٹھوس جواز نہیں مل سکا تھا۔

"مجھے ہمیشہ غیر سمجھتے ہیں آپ، حالانکہ میں آپ سے بہت محبت کرتی ہوں، صرف آپ سے۔" ہنی کی آنکھوں میں ہی نہیں لہجے میں بھی سچائی واضح تھی۔

"تم پاکستان کب جاؤ گی؟" زر جان نے موضوع ہی بدل دیا تھا۔ ہنی کے شکووں کا اس کے پاس کوئی جواب تھا بھی نہیں۔

"پتا نہیں؟" اس کی آنکھیں جھلملا گئیں۔

"یہ کالے پانی کی طویل سزا ہے، جس کا اختتام کب ہوگا، کچھ خبر نہیں۔"

"میں سمجھا نہیں، ایجوکیشن کا سلسلہ کب کا اختتام پذیر ہوگیا ہے۔ یہاں کا بزنس وائنڈ اپ کرو اور واپس چلو، مما کو بھی ریسٹ دو، اپنا کاروبار سلطنت سنبھالو۔" زر جان نے نرمی سے کہا تھا۔ وہ نرمی جو اس کے لب و لہجے کا خاصہ تھی۔ ہزاروں میں اسے ممتاز کرتی تھی۔

"جانا میرے اختیار میں کہاں ہیں؟" ہنی محض سوچ کر رہ گئی۔

"آپ نے کچھ فیوچر پلاننگ کی ہے زر جان!" اب وہ مسکراتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔

"کیسی پلاننگ؟"

"گھر نہیں بسانا۔" وہ اسے چھیڑ رہی تھی۔

"ابھی سوچا نہیں۔"

"تو کب سوچیں گے۔"

"جب کوئی اس جیسی مل گئی۔" وہ اپنے دھیان میں کہا تھا۔

"کیا وہ بہت خاص لڑکی تھی زر جان! جس کی خاطر آپ نے خود کو تنہا کرلیا ہے۔" ہنی کی آنکھوں میں حسرتیں کروٹیں لینے لگیں۔

"کتنے بانصیب ہوتے ہیں وہ لوگ جنہیں بغیر حیلے کے کوئی چاہے اور بے انتہا چاہے۔"

"ہاں۔" زر جان نے اک طویل سانس کھینچا۔

"وہ خاص ہی نہیں، منفرد بھی ہے۔"

"مگر وہ آپ سے محبت تو نہیں کرتی۔" ہنی نے حقیقت کے چہرے سے نقاب کھینچا۔

"میں نے سنا ہے کہ اس لڑکی کی شادی ہو چکی ہے اور آپ اس کی شادی میں پیش پیش تھے۔"

"وہ تو میرا فرض تھا۔" زرجان زیر لب بڑبڑایا۔

"کیا آپ اس لڑکی کی زندگی میں ہونے والے کسی حادثے کا انتظار کر رہے ہیں۔"

"ہنی!" زرجان کے جسم میں گردش کرتا لہو یک دم ابل پڑا۔

"تم نے ایسی بات منہ سے نکالی بھی کیسے؟"

"میں نے کچھ غلط تو نہیں کیا۔" ہنی نے اپنی بات پر زور دے کر کہا۔

"کیا خبر' آپ کی یہ دیوانی محبت رنگ لے آئے۔ کیا خبر' اس کا شوہر مر جائے' وہ بیوہ ہو جائے' یا اسے طلاق ہو جائے یا پھر۔"

"ہنی۔" زرجان کی شریانوں میں خون گویا منجمد ہو گیا۔

"میرے سامنے تمہارے علاوہ کوئی اور ہوتا تو خدا کی قسم آج میرے ہاتھ سے بچ نہیں پاتا۔" وہ ضبط کے کڑے امتحان سے گزرا تھا گویا۔

"آپ کی محبت میری سمجھ سے بالاتر ہے۔" ہنی خود بھی زرجان کی خون رنگ آنکھوں کو دیکھ کر شاکڈ رہ گئی تھی۔

"محبت کی معراج تم نہیں سمجھو گی ہنی! میرا تو روم روم اس کی سلامتی کی دعا کرتا ہے۔ وہ آباد رہے' شاد رہے' اور جس کا مقدر اللہ نے اسے بنا دیا ہے' اس پر کبھی آنچ تک نہ آئے۔ اس کا سہاگ سدا سلامت رہے۔" زرجان نے بہت دیر بعد سنجیدگی سے کہا تھا۔ وہ خود پر قابو پا چکا تھا۔ اور یہ اس کی سب سے نمایاں خوبی تھی کہ وہ غصے کو خود پر حاوی نہیں ہونے دیتا تھا۔

"میرا پوائنٹ آف ویو آپ سے مختلف ہے۔" ہنی کے لہجے میں بھی بلا کی سنجیدگی تھی۔

"میں محبت اور جنگ میں سب جائز سمجھنے والوں میں سے ہوں۔"

"جس کا یہ نظریہ ہے' وہ خود بھی ٹوٹلی غلط ہے۔" زرجان اب کے مسکرا دیا۔

"آپ جیسے قناعت پسند کہہ سکتے ہیں۔" ہنی مسکرا نہیں سکی تھی۔

"مگر میں اسے بزدلی سمجھتی ہوں۔ جو دل اور جان کے اتنا قریب ہو جائے' جس کے بغیر روشنی بھی گھٹا ٹوپ اندھیرے کی مانند لگے۔ جو انسانوں میں زندگی کی خوشبو بن کر رچ بس جائے' اسے چھین کر حاصل کر لیتے ہیں۔"

"چاہے وہ ہماری زندگی میں شامل ہو کر خوشی کا مفہوم بھول جائے۔" زرجان کے لہجے میں ہلکی سی چبھن تھی۔

"تو بھول جائے۔ ہم اپنے طرز کی خوشیاں اس کی جھولی میں ڈال کر اسے اپنا گرویدہ بنا لیں گے۔" وہ اپنے سابقہ لہجے میں بولی۔

"کسی کے دل پر اختیار حاصل کرنا آسان نہیں ہوتا۔ محبت ایک الہامی جذبہ ہے۔ جو خداوند کریم کی طرف سے دلوں میں خود بخود موجزن ہو جاتا ہے۔"

"اختیار زبردستی بھی حاصل کر لیتے ہیں۔" وہ ضدی لہجے میں گویا ہوئی۔

"زبردستی کرنے سے حقیقی خوشی نہیں ملتی۔ خوشی کھو جاتی ہے۔ گم ہو جاتی ہے۔" اس کا انداز کھویا کھویا سا تھا۔

"تو کیا ہوا؟" ہنی نے سر جھٹکا۔

"خوشی کو ڈھونڈنا مشکل نہیں۔ محبوب کو حاصل کرنا ناممکن نہیں۔ جذبہ ہونا چاہیے۔ جنون ہونا چاہیے۔ لگن زندہ رہے۔ عشق باقی ہو۔"

"محبت کو جنون کے ترازو میں مت تولو۔" زرجان مسکرا دیا۔

"میں سوچ رہا تھا۔ ہنی گزشتہ سالوں میں تنہا رہتے ہوئے خود مختاری کی زندگی جیتے ہوئے کچھ بدل چکی ہو گی۔ میچورٹی آ چکی ہو گی مگر یہاں تو سب کچھ پہلے جیسا ہے۔"

"اگر ہنی کا دل اور سوچ بدل جائے تو ہنی زندہ کیسے رہے زرجان۔" اب کے ہنی بھی مسکرا دی۔

"کچھ کھاؤ گی۔" زرجان کو اچانک آداب میزبانی یاد

آئے۔

"کیا کھلانا چاہتے ہیں۔" وہ بھی اعصاب شکن گفتگو کے حصار سے گویا نکل آئی۔

"جو تم چاہو۔" زرجان کھڑا ہو گیا۔

"تو پھر لنچ کرتے ہیں۔" ہنی بھی زرجان کی پیروی میں اٹھ گئی۔

"کہاں؟" وہ کچن کی طرف جاتے جاتے رکا تھا۔

"کہیں باہر۔ آپ کا کیا خیال ہے۔؟" ہنی اپنا شولڈر بیگ کھول کر چیک کر رہی تھی۔

"نیک خیال ہے۔"

"تو پھر چلیں"

"چلتے ہیں۔ میں ابھی چینج کر کے آیا۔ تم دو منٹ رکو۔ بلکہ گاڑی میں بیٹھو۔"

"میں یہیں ویٹ کر لیتی ہوں۔" وہ کرسٹل کا شو پیس ہاتھ لیے باریک بینی سے اس کا جائزہ لیتے ہوتے ہوئے بولی تھی۔ یہ شو پیس کب سے اس کی نظروں کے حصار میں تھا۔

زرجان دو منٹ کی بجائے دس منٹ بعد آیا تھا اور وہ ابھی تک شو پیس کو دیکھ رہی تھی۔

"پسند آ گیا ہے۔؟" اس نے چابیاں اور سیل فون اٹھاتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں۔" وہ بغیر مڑے بولی۔

"لے جاؤ۔"

"اجازت کی مجھے ضرورت نہیں۔" وہ زپ کھول کر شو پیس کو بیگ میں رکھ رہی تھی۔

"اور اگر میں منع کر دوں۔" زرجان نے جان بوجھ کر اسے چھیڑتے ہوئے کہا۔

"تو شوق سے کریں۔" اس نے ناک چڑھا کر کہا تھا پھر مزے سے بولی۔

"میں اسے چرا بھی سکتی تھی۔ آپ کو خبر بھی نہ ہوتی۔"

"تم کبھی بھی نہیں بدلو گی ہنی۔" اس نے تاسف سے ہنی کو دیکھا۔

"ہاں۔ میں ایسی رہوں گی ہمیشہ۔" اس نے کافی

مغرور انداز میں کہا تھا۔

"اگر وقت نے تمہیں بدل دیا۔؟" وہ اپنے گلاسز بالوں میں اٹکا رہا تھا۔

"میں وقت کو بدل دوں گی مگر خود کو نہیں۔ ہنی جو ہے۔ جیسی ہے اسی طرح رہے گی۔"

"اتنے بڑے بول منہ سے نہیں نکالتے ہنی۔" وہ بے اختیار اسے ٹوک گیا۔

"کبھی کبھی وقت اور لمحے ہمارے منہ سے نکلے الفاظ پکڑ لیتے ہیں۔ جکڑ لیتے ہیں۔"

"آپ ہماری سوسائٹی میں قطعاً" ان فٹ تھے زر جان! آپ کس دیس سے یہاں آنکلے ہیں۔" ہنی فرنٹ سیٹ کا ڈور کھول کر بیٹھتے ہوئے متاسفانہ انداز میں بولی۔

"مجھے خود تمہاری یہ سوسائٹی ذرہ بھر نہیں بھاتی۔" وہ ہلکے پھلکے لہجے میں کہتے ہوئے دھیمے سے مسکرایا۔

"میں نے سنا ہے۔ زمان اور ذیشان بھائی اپنا بزنس وائنڈ اپ کر رہے ہیں۔" اسے اچانک خیال آیا تو پوچھ بیٹھی۔

"تم نے ٹھیک سنا ہے۔" زر جان پھیکے سے انداز میں بولا۔

"مگر کیوں۔؟" وہ الجھی۔

"یہ ان کا پرسنل میٹر ہے۔"

"پھر بھی۔ اچھی بھلی سیٹل لائف تھی۔ سب کچھ سمیٹنا کیا آسان ہے۔" وہ میوزک سسٹم کو چھیڑ رہی تھی۔

"ان کے "ان لاز" کے لیے بہت آسان ہے۔ انہی کی سپورٹ بلکہ اکسانے پر ابراڈ سیٹل ہو رہے ہیں دونوں۔" زر جان نے ایک ریسٹورنٹ کی پارکنگ میں گاڑی روکی۔

"ہم کتنے سال بعد ایک ساتھ لنچ کر رہے ہیں زر جان۔" کانچ کی دیواروں کو دیکھتے اور کانچ جیسے چکنے فرش پر چلتے ہوئے وہ کھوئے کھوئے لہجے میں بولی۔

"شاید سات یا آٹھ سال بعد۔" زر جان نے مینو کارڈ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"آپ نے کبھی سوچا ہے زر جان۔" وہ گلاس ٹیبل پر ناخن سے لکیریں کھینچتے ہوئے کہنے لگی۔

"کیا؟" زر جان اس کی کیفیت کو اچھی طرح سے سمجھ رہا تھا۔

"ہمارے درمیان کتنی دوریاں ہیں۔" یاسیت نے آن کی آن میں اس پر اپنا سایہ کر دیا تھا۔ وہ کس قدر حساس ہو رہی تھی۔ ایسی تو وہ کبھی نہیں رہی تھی۔

"ان دوریوں اور فاصلوں کو کم کرنے کی کب کوشش کی گئی ہے۔"

"ہم لوگ ایک الگ الگ مدار میں گردش کرتے رہے ہیں ہمیشہ سے، کبھی اس مدار سے نکل کر کسی اور طرف دیکھنے کی کوشش ہی نہیں کی۔ کبھی ضرورت ہی محسوس نہیں کی۔" وہ بے خیالی میں اپنا سابقہ شغل جاری رکھے ہوئے کہہ رہی تھی۔

"کیا لاؤں تمہارے لیے۔" زر جان مینو کارڈ کو ٹیبل پر رکھ کے کھڑا ہو گیا تھا۔

"اٹالین فوڈ میں کچھ بھی۔" اس نے لائم جوس کے گلاس کو اٹھاتے ہوئے کہا تھا۔

"اوکے، تم ویٹ کرو۔ میں ابھی آتا ہوں۔" زر جان بوفے ٹیبلز کی طرف بڑھ گیا۔ جب وہ دو درمیانی سائز کی ٹرے اٹھائے واپس آیا تو ہنی کسی سے فون پر بات کر رہی تھی۔ اور اس کے منہ سے ادا ہونے والے الفاظ نے لمحہ بھر کے لیے زر جان کو ٹھٹکا کر رکھ دیا۔

"ایک سونے کا پنجرا خرید کر اس میں کھلا چھوڑ دینے کے بعد کسی کو آزاد اور خود مختار کہا جائے تو اس سے بڑا جوک کوئی نہیں ہو گا۔" اس کے لہجے میں سوکھی لکڑی جیسی چرچراہٹ تھی۔ اور زر جان بغیر پوچھے ہی جانتا تھا کہ دوسری طرف کون ہے۔

☼ ☼ ☼

"پہلی دفعہ حریم آپی کے سسرال جا رہا ہوں۔ سمجھ میں نہیں آ رہا کہ کیا پہنوں۔" محسن سخت ٹینشن کا شکار تھا۔ سفری بیگ میں سے تقریباً" سارے کپڑے

نکال کر بیڈ پر پھیلا رکھے تھے۔ دوپٹہ استری کرتے ہوئے حانی نے اور بالوں میں برش کرتی مہک نے محسن کو دیکھا اور ان دونوں کی ہنسی چھوٹ گئی۔

"تم اپنی سسرال نہیں۔ آپی کی سسرال جا رہے ہو۔ اتنا بننے سنورنے کی ضرورت نہیں۔" محب نے جل کر ٹکڑا لگایا۔

"جل ککڑے۔ مت جلا کر میری خوبروئی سے۔ میں تو نہ بھی سنوروں، بنوں تب بھی آدھی یونی ورسٹی کی لڑکیاں مجھے دیکھ دیکھ کر آہیں بھرتی ہیں۔"

"آدھی کیوں؟ پوری یونی ورسٹی کی لڑکیاں کیوں نہیں۔" حانی نے مسکراہٹ روک کر پوچھا۔

"باقی لڑکیاں ذہنی طور پر تندرست ہوں گی اس لیے۔" مہک بالوں کے ساتھ الجھ رہی تھی تاہم سارا دھیان بجیلے بھائیوں کی بے تکی گفتگو کی طرف تھا۔

"اتنی عالمانہ گفتگو میں ٹانگ اڑانے کی ضرورت نہیں۔ اپنے خشکی سے بھرے بالوں پر نظر کرم کرو۔" محسن نے بڑے حساس موضوع کو چھیڑ دیا تھا۔ مہک تو جل ہی اٹھی۔

"اور اپنے ان بالوں کے جنگل کے بارے میں کیا خیال ہے۔"

"میرے خوبصورت، گھنگھریالے، کرلی کرلی سے بالوں کے متعلق تم جیسے حاسد ہی ایسے کمنٹس پاس کر سکتے ہیں۔"

"چچ چچ۔ ایسی خوش فہمی۔" مہک نے بھرپور طنزیہ انداز میں کہا۔

"آپی نے میرے بالوں کی پچھلے دنوں خوب تعریف کی تھی۔" وہ ایک شرٹ منتخب کر چکا تھا۔ اب خوشامدانہ نظروں سے حانی کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"محترم، تم حریم آپی کو کس خوشی میں آپی کہتے ہو۔ پورے ساڑھے چار ماہ چھوٹی ہیں وہ تم سے۔ توبہ، اتنا بھی عمر چور نہیں بنتے محسن۔" مہک نے اسے آڑے ہاتھوں لیا تھا۔

"بچپن میں جتنے جوتے مجھے حریم آپی سے بطور یادگار کھانے کو ملے ہیں نا۔ یہ شکر کرو، میں انہیں "آپا جلالی" کہنے سے پرہیز کرتا ہوں۔ ساری دنیا کے لیے اتنی نرم خو، اور میرے لیے سلطان راہی۔ آپی تو انہیں چڑانے کے لیے کہتا ہوں مگر مجال ہے، جو وہ خاتون ذرا بھی چڑتی ہوں۔ یہ تمہارے اور حانی جیسی ایج کانشس لڑکیاں ہوتی ہیں۔ تھری اسٹینڈرڈ کے بچوں تک کو آنٹی کہنے کی اجازت نہیں دیتیں۔" محسن نے بھی ان دونوں کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھا تھا۔

"آپی کے "جوتوں" کی وجہ سے تم نے میٹرک کلیئر کیا تھا۔ تین سال سے اٹکے ہوئے تھے۔" محب نے بھی اس کے اکیڈمک ریکارڈ پر چوٹ کرتے ہوئے اسے شرم دلانی چاہی۔

"اور اب میں دوسرا ماسٹرز کر رہا ہوں۔ اور ان شاء اللہ پیٹرک بھی کروں گا۔ حاسدوں کا منہ کالا ہو۔" محسن نے شرمندہ ہونا کہاں سیکھا تھا۔

"بوٹیوں (نقل) کی مہربانی سے پاسنگ مارکس تو مل ہی جاتے تھے۔" محب نے طنز کا تیر مارا۔

"اپنے جیسا سبھی کو مت سمجھو۔ خیر تمہارا بھی قصور نہیں۔ برے آدمی کو ہر کوئی اپنے جیسا برا ہی دکھتا ہے۔" محسن نے گویا کان پر سے مکھی اڑائی۔

"ہاں، تو میں بتا رہا تھا۔ محترم خوبرو صاحب کی قابلیت کے بارے میں۔ تو جناب دو سال انہوں نے فرسٹ ائر میں اور دو ہی سال تھرڈ ایئر میں بھی جان لگائے۔ پروفیسرز نے ہاتھ باندھ کر انہیں دھکا لگایا تھا گویا انہی رحمدل پروفیسرز کی مہربانیوں کے طفیل دوسرے ماسٹرز میں اٹک گئے ہیں۔" محب نے گویا قصہ سنا کر ہاتھ جھاڑے۔

"پیاری حانی! میری شرٹ پریس کر دو۔" وہ خوشامدانہ مسکراہٹ سجا کر اٹھا۔

"تم اتنا اہتمام کس خوشی میں کر رہے ہو۔" حانی ہنستے ہوئے شرٹ پکڑ کر پریس کرنے لگی تھی۔

"بے کار ہے۔ آپی کی اکلوتی نند بیاہی جا چکی ہے۔" مہک نے اس کی معلومات میں اضافہ کیا۔

"کیا وہ خوبصورت تھی؟"

"بہت۔" حانی نے اس کے تجسس کو ہوا دی۔

"اچھا۔" محسن مایوس سا ہوا۔
"پھر تو چانس مارا گیا۔"
"بچو! جلدی ___ کرو۔ زر جان نے گاڑی بھجوادی ہے۔ دس منٹ میں باہر آجاؤ۔" خالہ نے کمرے میں جھانک کر آواز لگائی تھی۔ محسن کو سابقہ حلیے میں دیکھ کر ناراضی سے گویا ہوئیں۔
"تم نہیں جارہے؟"
"کیوں؟ جاؤں گا میں۔ ضرور جاؤں گا۔" وہ اچھل کر استری اسٹینڈ کی طرف بڑھ گیا۔ شرٹ حانی کے ہاتھ سے جھپٹی اور یہ جا وہ جا۔
"احسان فراموش۔" حانی نے دانت پیسے۔
کچھ دیر بعد وہ سب ٹھنس ٹھنسا کر حریم کے گھر جارہے تھے۔ راحت بیگم گھر آگئی تھیں۔ اور صبح ہی حریم نے فون کیا تھا تاکہ یہ سب راحت بیگم کی عیادت کے لیے شام سے پہلے ہی آجائیں۔ رات کو راحت بیگم کی احوال پرسی کے لیے ان کے جاننے والے اور ماہیر کے دوست وغیرہ آجاتے تھے۔ اور حریم کی خواہش تھی کہ پہلی مرتبہ چونکہ خالہ اور بچوں نے آنا تھا۔ سو وہ فرصت سے نا صرف ان کے پاس بیٹھتی بلکہ مدارات میں بھی کچھ کسر نہ چھوڑتی۔
اسلام آباد میں قیام کے دنوں میں جس طرح بچوں اور خالہ نے اس کا خیال رکھا تھا جو محبت، خلوص اور توجہ سے اسے نوازا تھا۔ وہ بھلائے جانے والا تو ہرگز نہیں تھا۔
راحت بیگم اس کی بے چینی کو اچھی طرح سے سمجھ رہی تھیں۔ گھڑی کی طرف بار بار اٹھتی ان نظروں میں کروٹیں لیتا انتظار ان کی نظروں سے مخفی نہیں رہ سکا تھا۔
اور ان لوگوں کو دیکھ کر اس کی آنکھیں ستاروں کی طرح سے چمکنے لگی تھیں۔
راحت بیگم نے مہمانوں کو دیکھ کر چہرے پر خوب تکلیف کے تاثرات پرنٹ کرلیے تھے۔ حالانکہ ماہیر نے اسے بتایا تھا کہ امی کی ہڈی فریکچر ہونے سے بچ گئی ہے۔ البتہ ڈاکٹرز نے احتیاط "کئی قسم کے ٹیسٹ لیے تھے۔ ایکسرے وغیرہ کروانے کے چکر میں ہسپتال میں رکنا پڑا تھا۔ فکر اور پریشانی کی کوئی بات نہیں تھی۔ امی چل پھر سکتی تھیں۔ کسی سہارے کی ضرورت نہیں تھی مگر گھر آنے کے بعد انہوں نے حسب معمول حریم کو ہو کھلانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔
حریم کے لیے یہ ہفتہ کسی عذاب سے کم نہیں تھا۔ بغیر کسی تکلیف کے انہوں نے اس کا ناک میں دم کر رکھا تھا۔ کبھی گھٹنے میں درد کی ٹیسیں اٹھنے لگتیں، کبھی پاؤں میں، کبھی بلڈ پریشر شوٹ کرجاتا۔ اور کبھی امی صاحبہ کو ایک سو تین بخار ہوجاتا۔
آج صبح بھی انہوں نے دوبارہ سے ہمیشہ والا سین کری ایٹ کرلیا تھا۔ اپنے کمرے کے کھلے دروازے سے وہ حریم کو ماہیر کے ارد گرد دیکھ چکی تھیں۔ حریم ماہیر کو ناشتا دے رہی تھی۔ اور نہ جانے کتنے دن بعد ماہیر کو بھی اسے فرصت سے دیکھنے کا خیال آیا تھا۔ اور اس کے لبوں پر بھولی بسری سی مسکراہٹ چمک اٹھی تھی۔ دراصل امی کو بھی اس مسکراہٹ کا "راز" جاننے کی بے چینی تھی تبھی تو ماہیر کو اٹھتا دیکھنے کے فوراً" بعد ہی انہوں نے حریم کو پکارنا شروع کردیا تھا۔ حریم ناشتے کی ٹرے اٹھائے ابھی کرسی پر بیٹھی تھی جب امی کی آواز اس کے کانوں میں اتری۔
"حریم! بات سننا۔"
"جی۔" اس نے مری سی آواز میں جواب دیا تھا۔ خیال یہی تھا کہ بیٹھ کر اطمینان سے ناشتا کرے گی۔ ابھی کچھ دیر پہلے ماہیر اسے کھانے پینے کے متعلق ہی لیکچر دے رہا تھا۔ اس نے بے بسی کے عالم میں ہاف فرائی انڈے اور چھوٹے سے پراٹھے کی طرف دیکھا تھا۔ امی سے مذاکرات کا دورانیہ کس قدر طویل ہوسکتا ہے۔ یہ تو حریم جانتی ہی تھی۔ اور ناشتے کا جو حشر ہونا تھا۔ اس سے بھی وہ بخوبی آگاہ تھی۔
"ٹھنڈی چائے اور بدمزا ناشتے کا بھلا کیا لطف آئے گا؟" وہ سوچتے ہوئے اٹھنے ہی لگی تھی جب ماہیر کو امی کے کمرے کی طرف جاتا دیکھ کر رک گئی۔

"کچھ چاہیے آپ کو؟" وہ دروازے میں کھڑے ہو کر شرٹ کے بٹن بند کرتا پوچھ رہا تھا۔
"ہاں۔"
"مجھے بتائیے، میں لے آتا ہوں۔" دو تین قدم چل کر بیڈ کے قریب پہنچ گیا۔ راحت بیگم بیڈ پر نیم دراز تھیں۔ اٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے قدرے ناگواری سے بولیں۔
"تمہیں دفتر سے دیر نہیں ہورہی۔"
"کوئی بات نہیں۔ دس منٹ لیٹ بھی پہنچ گیا تو کوئی حرج نہیں۔ آپ کو کس چیز کی ضرورت ہے۔؟" وہ انہیں سہارا دے کر بٹھا رہا تھا۔
"تم جاؤ۔ حریم ہے نا۔" انہوں نے بچوں کی طرح ٹھنک کر کہا۔
"حریم ناشتا کررہی ہے۔" ماہیر نے گویا انہیں اطلاع دینے کی کوشش کی تھی۔
"جانتی ہوں میں۔" انہوں نے خفا خفا سے انداز میں کہا۔
"مجھے عینک اور اخبار چاہیے مگر تمہارے ہاتھ سے نہیں۔" ساتھ وارننگ بھی دی گئی تھی۔
"مگر امی!" وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا تھا۔ امی سے بحث بے کار تھی۔ وہ اپنی ماں کی ضدی طبیعت سے اچھی طرح سے واقف تھا۔ ابھی وہ پلٹ کر حریم کو آواز دینا چاہ رہا تھا جب وہ اس کی اوٹ سے نکل کر سامنے آگئی۔ ہاتھ میں اخبار اور عینک کو پکڑ رکھا تھا۔
"آج کا اخبار ہے؟" وہ اخبار بینی کی ہرگز شوقین نہیں تھیں۔ مگر حریم کو زچ کرنے کے لیے آج کل وہ خبروں میں خاصی دلچسپی لے رہی تھیں۔ کیونکہ اخبار پڑھ کر امی کو سنانا بھی حریم کی ذمہ داری تھی۔
"تم جاؤ نا۔ کیوں کھڑی ہو؟ ناشتا کرلو۔" وہ ٹائی کی ناٹ لگا رہا تھا مگر سارا دھیان سر جھکائے کھڑی حریم کی طرف تھا۔
"مجھے اخبار پڑھ کر کون سنائے گا۔" امی کو غصہ آگیا۔ ماہیر کا حریم کے لیے فکرانہیں کہاں بھاسکتا تھا۔
"میں کس لیے ہوں۔ جاؤ۔ حریم! تم ناشتا کرو۔ اپنی ڈائٹ کا بالکل خیال نہیں رکھتیں۔" وہ اسے باہر جانے کا اشارہ کررہا تھا۔ حریم کا روم روم مشکور ہوگیا تھا۔
"خود اپنا خیال نہیں رکھے گی۔ کھائے پیے گی نہیں تو یہ کاروبار زندگی کیسے نکالے گی۔ میری ہڈیوں میں تو دم نہیں۔" امی نے کہا۔
"یہ آپ کا خیال رکھے گی۔ اور اس کا خیال رکھنے کے لیے میں جو ہوں۔" وہ جان بوجھ کر اونچی آواز میں بولا تاکہ برآمدے میں موجود حریم کے کانوں تک اس کی آواز پہنچ جائے۔
"جورو کے غلام۔ میرے جیسے ہوتے ہیں نا امی۔" وہ اخبار کی سرخیوں پر نظر دوڑاتا شرارتاً" امی کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔
"ہوں۔" امی کسی سوچ میں گم تھیں۔ ماہیر نے گلا کھنکار کر مسکراتے ہوئے سر جھکالیا۔
"ماہیر!" کچھ دیر بعد امی کی سنجیدہ سی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔
"حریم کا خیال رکھا کرو۔ خود پر توجہ نہیں دیتی۔ اپنا خیال نہیں رکھتی۔ پہلے بھی ہم اتنی بڑی خوشی سے محروم ہوگئے تھے۔ میرا پوتا، جسے میں دیکھ بھی نہ سکی۔ پیار بھی نہ کرسکی۔ سینے سے نہ لگا سکی۔ بغیر مسکرائے دنیا سے چلا گیا تھا۔ اب کے ایسا نہیں ہونا چاہیے۔ مجھے تیرا بچہ چاہیے۔ جیتا جاگتا ہنستا مسکراتا ہر لحاظ سے صحت مند چاہے وہ خوبصورت نہ ہو مگر وہ تندرست ہو، مکمل ہو سارے وہم اور خدشے اسے دیکھ کر میرے دل سے دور ہوجائیں۔" وہ گھٹی گھٹی آواز میں رونے لگی تھیں۔
"ان شاء اللہ ایسا ہی ہوگا۔ آپ دعا کیا کریں امی! آپ کو نہیں لگتا۔ آپ کی دعاؤں کی ضرورت ہے ہمیں، مجھے اور حریم کو۔"
"میرا دل تم دونوں کے لیے دعا کرتا ہے۔" ان کے لبوں نے اعتراف کیا تھا۔
"تم دونوں میرا اثاثہ ہو ماہیر! تم اور حریم۔" افسوس کہ حریم تک ان کا یہ محبت بھرا فکر مندانہ انداز پہنچ نہیں پایا تھا۔

"اور میں؟" موبی نہ جانے کب دروازے میں آکھڑا ہوا۔ مسکراتا، کھلکھلاتا ہوا۔

"تم میرے دل کا ناسور ہو۔" وہ پھپک پھپک کر رو دیں۔

"آپ کو مجھ سے پیار نہیں، کسی کو بھی نہیں، مجھے کیوں پیدا کیا گیا ہے۔ مجھے کیوں تخلیق کیا گیا ہے۔" وہ ٹھنکتا ہوا ماہیر کے قریب آگیا۔

"سویرے سویرے میرا دماغ نہ چاٹ۔ پہلے ہی سر میں پٹاخے چھوٹ رہے ہیں۔" راحت بیگم کو اور بھی شدت سے رونا آگیا۔

"اپنے کمرے میں جاؤ۔" ماہیر صورت حال کو سمجھتے ہوئے موبی کو پچکارنے لگا تھا۔ موبی شدید غصے کے عالم میں تھا۔ اس کی سنہری رنگت دہک رہی تھی۔ بہت زیادہ غصے کی وجہ سے اس کے ہونٹ پھڑپھڑا رہے تھے اور زبان کے پیچھے سے مخصوص رال بہنے لگی تھی۔

"بھائی۔" موبی نے گویا ماہیر کی بات ان سنی کر دی تھی۔ وہ اپنا چہرہ ماہیر کے بازو سے رگڑ رہا تھا۔

"میں آپ جیسا کیوں نہیں۔ میرے پاس آپ جتنا علم نہیں، فہم نہیں۔ مگر آپ تو کہتے ہیں۔ علم ڈگریوں کا محتاج نہیں۔ غیب عالم تو پورے کا پورا عالم ہے۔ مگر یہ دنیا تسلیم کیوں نہیں کرتی۔"

"پیچھے ہٹ، بھائی کے کپڑے خراب کر رہا ہے۔" راحت بیگم جلبلا کر اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔ اس وقت انہیں لمحہ بھر کے لیے بھول چکا تھا کہ وہ پاؤں فریکچر نہ ہونے کے باوجود خود کو بیمار شو کرتے ہوئے مریضہ بنی ہوئی ہیں۔ ایسی مریضہ جو خود سے اٹھ سکتی ہے نہ بیٹھ سکتی ہے۔ مگر اس وقت نا صرف وہ اپنے قدموں پر کھڑی تھیں بلکہ چار قدم کے فاصلے کو پاٹ کر موبی کے سر تک پہنچ چکی تھیں۔ موبی کے بال ان کی مٹھی میں تھے۔

"کیوں باہر نکلا ہے؟" ان کا ازلی اشتعال عود آیا۔ وہ اس کے سر کو جھٹکے دے رہی تھیں۔

"زہر لا دیں مجھے ماہیر بھائی! نہیں جینا میں نے اس گندی دنیا میں۔ نفرت ہے مجھے لوگوں سے۔ نفرت ہے مجھے اس دنیا سے۔ گندی دنیا، گندی زندگی۔"

"یا اللہ خیر۔" حریم نے دہل کر کچن کی چوکھٹ تھام لی۔ آج بڑے دنوں بعد موبی اپنے رنگ میں واپس آیا تھا۔

"آؤ، میرے ساتھ۔" ماہیر نرمی سے، تحمل سے موبی کو سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ شاید وہ موبی کے مزاج سے اچھی طرح سے واقف تھا اور وہ جانتا تھا کہ موبی کو کس طرح سے ہینڈل کرنا ہے۔ اگر وہ غصہ دکھاتا تو عین ممکن تھا کہ موبی اپنی "اصلیت" پر آجاتا۔

"نہیں جانا۔ اس قید خانہ میں نہیں جانا۔" وہ نفی میں سر ہلاتا ہوا چلاتا آیا۔

"ہر گھر میں میرے لیے ایک قبر تیار کروا لیتے ہیں۔ دم گھٹتا ہے میرا ان قبروں میں۔ میرے اندر سانس لیتی زندگی مرجھا چکی ہے۔ چلا جاؤں گا۔ بہت جلد چلا جاؤں گا۔ آپ سب کی دنیا سے دور۔ اور جب جاؤں گا تو آپ کی نسل کو "دعا" دے کر جاؤں گا۔ ایسی "دعا" کبھی کسی نے نہ دی ہو گی۔" موبی پر ایک وجد کی کیفیت طاری ہو رہی تھی۔ وہ ماہیر کے قدموں میں گر رہا تھا۔

"آپ کی آنے والی نسل میں کوئی غیب عالم نہ ہو۔ آج سے پہلے ایسی "دعا" کسی نے نہیں دی۔ یہ "دعا" خاص آپ کے لیے۔ حریم بھابھی کے لیے اور میری پیاری ماں کے لیے۔"

"موبی!" راحت بیگم کا کلیجہ گویا شق ہو گیا۔ وہ تڑپ کر موبی کے قریب آگئی تھیں۔

"میرا بچہ! میرا لعل، چل اٹھ۔ تجھے کمرے میں لے کر جاؤں۔ دیکھو بھائی پریشان ہو رہا ہے۔ اس نے دفتر بھی جانا ہے۔ اٹھو، میرا بچہ۔" وہ دونوں ہاتھوں سے موبی کا چہرہ صاف کر رہی تھیں۔

"موبی! اٹھو، شاباش۔" ماہیر اس کے گال تھپتھپا رہا تھا۔

"بھائی پریشان ہے۔ پریشان ہونا ہماری قسمت میں لکھا ہے۔ قسمت کا لکھا کوئی مٹا نہیں سکتا، موبی بس

دعا کرے گا۔ اپنے بھائی کے لیے، حریم بھابھی کے لیے۔ پر کیا کروں، کوئی خوشی میں ان لوگوں کو دے نہیں سکتا۔" وہ آنکھیں کھولے کھوئی کھوئی نظروں سے کبھی ماں کو اور کبھی ماہیر کو دیکھ رہا تھا۔

"امی، جس خوشی کی آپ منتظر ہیں۔ وہ آپ کو نہیں ملے گی۔" اس کے لہجے میں برسوں کی تھکن اتر آئی تھی۔ وہ گویا کسی اور ہی جہاں میں محو پرواز تھا۔ سفر کر رہا تھا اور اس سفر نے اسے تھکا ڈالا تھا۔

"کیسی خوشی؟" راحت بیگم اور ماہیر دونوں چونک گئے تھے۔

"جو حریم بھابھی کے توسط سے آپ کو ملے گی۔" اب وہ اپنا سر فرش پر پٹخ رہا تھا۔ آہستہ آہستہ اس کی آنکھیں نیند سے بوجھل ہو رہی تھیں۔ ماہیر نے موبی کو اٹھا کر بیڈ پر لٹایا۔ جبکہ راحت بیگم موبی کے گال تھپتھپا کر گویا اسے نیند میں گم ہونے سے روک رہی تھیں۔

"امی! اسے سونے دیں۔" ماہیر انہیں منع کر رہا تھا۔

"نیند میری آنکھ سے دور ہے اور میں رونے کی آوازیں سن رہا ہوں۔" وہ عالم مدہوشی میں تھا۔ اور اس کے ہونٹ کپکپا رہے تھے۔ منہ سے بہتی رال خشک ہو چکی تھی۔ اور اس کے چہرے پر زردیوں کا عکس نمایاں تھا۔ کچن کا کواڑ تھامے حریم نے موبی کے چہرے کی طرف دیکھا تھا اور اس کا دل گویا دھک سے رہ گیا۔

"کس کے رونے کی آواز۔" راحت بیگم کا دل وسوسوں کی زد میں لپٹا بری طرح سے کانپ رہا تھا۔

"ایک بچے کو سینے سے لگا کر بین کرتی عورت کے رونے کی آواز۔" موبی پر اونگھ طاری ہو گئی تھی۔ اور راحت بیگم کے ساتھ ساتھ حریم کے دل کی سرزمین پر بھی زلزلہ آگیا تھا۔ اور اس وسوسے نے ان دونوں کے دلوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ اگرچہ راحت بیگم موبی کو دیوانہ اور پاگل کہہ کر اس کے لہجے اور باتوں کے اثر کو زائل کرنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ مگر بہر حال ایک خوف کنڈلی مارے ان کے دل میں بھی اپنی جگہ بنا چکا تھا۔

☆ ☆ ☆

اس صبح کی بدمزگی کے پیش نظر انہوں نے سختی کے ساتھ منع کر دیا تھا کہ موبی کسی مہمان کے سامنے نہیں آئے گا بلکہ کمرے سے باہر نکلنے پر بھی پابندی لگا دی تھی۔

اور آج جب خالہ اور حانی لوگ آئے تھے تب بھی موبی باہر نہیں نکلا۔ اور نہ ہی راحت بیگم چاہتی تھیں کہ موبی کا ذکر خیر چھیڑا جائے۔ مگر خالہ نے غیر دانستہ جب تیسری مرتبہ موبی کا پوچھا تو راحت بیگم گویا بل کھا کر رہ گئی تھیں۔

"اس کی طبیعت ٹھیک نہیں سو رہا ہے۔" بہت سوچ و بچار کے بعد انہوں نے جواز ڈھونڈ ہی لیا تھا خالہ کو کون سا کرید نے کی عادت تھی۔ مگر بات سے بات نکلتی چلی گئی۔ خالہ اب خرابی طبیعت کی "وجہ" معلوم کر رہی تھیں۔

"موسمی بخار ہے۔" انہوں نے گویا جان چھڑوانے کی کوشش کی تھی۔ اور ادھر خالہ دو تین مشورے دے کر زمیلہ کے بارے میں پوچھنے لگی تھیں۔

"زمیلہ نہیں آئی؟"

"گھر گرہستی والی ہے۔ بھرا پرا کنبہ ہے، بھلا کیسے آسکتی ہے۔"

"یہ تو آپ نے ٹھیک کہا۔ کنبہ اگر مختصر بھی ہو تو تب بھی گھر سے نکلنا کہاں ممکن ہے۔" خالہ کی نظریں حریم کے مرجھائے مرجھائے سراپے پر تھیں۔ اگرچہ اس نے خود کو بشاش ظاہر کرنے کی بھرپور کوشش کی تھی مگر پھر بھی ستارہ سی آنکھوں میں ناچتی اداسی نے بھید کھول دیے تھے۔ گالوں کے گلال کھلے کھلے نہیں تھے۔ شگفتگی اور چمک شنگرفی لبوں سے دور تھی۔

"حانی کی بات کہاں تک پہنچی۔" راحت بیگم نے گفتگو کو نیا رخ دے ہی دیا۔ محسن اور حانی بھی کچھ چونک کر راحت بیگم کی طرف دیکھنے لگے تھے۔

"ابھی تو کچھ عرصہ کے لیے پروگرام ملتوی کر دیا

ہے۔" خالہ نے سلیقے سے بات بنائی۔

"بھلا کیوں؟" انہوں نے ناک پر انگلی رکھ کر حیرت سے کہا اور ادھر خالہ سوچ میں پڑ گئی تھیں کہ اس کا بھلا کیا جواب دیں۔ حریم نے انہیں اس مشکل سے نکال دیا تھا۔ وہ چائے کی ٹرے اٹھائے باورچی خانے سے باہر آرہی تھی۔

"لالچی لوگ تھے۔ کہنے لگے، حانی کے نام کوٹھی لگوادیں۔ ہم نے منع کردیا ہے۔"

"ہائے۔ ایسی کمینگی۔" راحت بیگم نے حیرانی کا اظہار کیا تھا۔

"اچھا کیا۔" ایسی پھول سی بچی، کون سا عمر نکلی جارہی ہے اس کی۔ سوچ سمجھ کر کرنا۔"

"آپ سے مشورہ لینے کے بعد کوئی قدم اٹھائیں گے۔" محسن نے بہت ہی مدبرانہ انداز میں کہتے ہوئے مداخلت کی تھی۔ راحت بیگم کچھ دیر نثار ہوتی نظروں سے محسن کی طرف دیکھتی رہیں۔ ان کی نظروں میں خاصی پسندیدگی تھی۔ کچھ دیر مزید سوچا تھا۔ پھر خالہ کے کان کے قریب جھک آئیں۔

"ایک بات کہوں برا مت مانیے گا۔" راحت بیگم کے تمہیدی انداز نے ہی حریم کو ٹھٹکا دیا تھا۔ ٹھٹک تو حانی بھی گئی تھی اور بری طرح سے محسن بھی چونکا تھا۔

"جی کہیے۔" خالہ نے حلاوت سے کہا۔

"آپ کے علاوہ ان بچیوں کا درد کوئی اور محسوس نہیں کرسکتا۔ گھر کی بات ہے۔ حانی کو آپ کیوں نہیں اپنی بیٹی بنالیتیں۔ آپ کا بیٹا ماشاء اللہ سے حانی کے ساتھ سجے گا۔" انہوں نے تو اطمینان سے اپنی بات کہہ دی تھی۔ مگر حریم کے ہاتھ سے چائے کا کپ چھلک گیا تھا۔ ادھر محسن کو شدید قسم کا اچھو لگ گیا۔ حانی جو ابھی بڑی ہی بے تکلفی سے محسن کے ساتھ راز و نیاز کررہی تھی۔ ایک دم اچھل کر دور ہٹ گئی۔ جبکہ خالہ، مہک اور محب کے انداز یکسر مختلف تھے۔ خالہ کے چہرے پر حیرت نما خوشی تھی اور وہ سوچ رہی تھیں کہ ایسا خیال انہیں پہلے کیوں نہیں آیا۔ حانی بیک وقت شرم، خجالت اور اس انہونی سی بات کے زیر اثر ہونق سی بنی بیٹھی تھی۔ حریم کا سکتہ محسن کے کھانسنے کی آواز سن کر ٹوٹ گیا تھا۔ ادھر محب اور مہک معنی خیز نظروں کا تبادلہ کررہے تھے۔ ان سب کے ذہنوں میں پکتی کھچڑی کے برعکس راحت بیگم، خالہ کا ہاتھ نرمی سے دباتے ہوئے مزید مشوروں سے نواز رہی تھیں۔

"جانے سے پہلے کوئی انگوٹھی۔ چھلا پہنا جانا۔ نیک شگون میں دیر کیسی؟"

"ہائے منگنی۔" محسن نے دل پر ہاتھ رکھ کر دہائی دی۔

"اور وہ بھی تم سے پوچھے بغیر۔" حانی بھی قدرے سنبھل گئی تھی۔

"کیا تم رضامند ہو؟" محسن نے مصنوعی اچنبھے سے آنکھیں پھیلائیں۔

"بے شرم، خاموش رہو۔" حانی نے بسکٹ دانت کے نیچے دبا کر بری طرح سے پیسا۔

"بتاؤ نا حانی!" بڑوں کو ایک سنجیدہ مسئلے کی طرف متوجہ دیکھ کر محسن لسوڑے کی طرح حانی سے چپکنے کی کوشش میں تھا۔ وہ اس کے اور قریب کھسکا تو حانی اٹھ کرون سیٹر صوفہ کی طرف چلی گئی۔ محب اور مہک نے کھی کھی کا عملی مظاہرہ کرکے محسن کو اس کی اوقات دلانے کی کوشش کی تھی۔ ادھر حریم بھی بڑی نرم نرم سی نظروں سے محسن کو دیکھے جارہی تھی۔ وہ عام سے نقوش اور سانولی رنگت کا بالکل عام سا نوجوان تھا۔ قدرے دبلا پتلا، لمبا قد، آنکھوں میں شوخیاں، مزاج میں بانکپن، وہ "تقریباً" حریم کا ہم عمر تھا مگر مزاج میں قطعاً" سنجیدگی نہیں تھی۔ بہت ہنس مکھ طبیعت تھی اس کی۔ اگر ان دونوں کا موازنہ کیا جاتا تو حانی بلاشبہ بہت من موہنے نقوش رکھنے والی سادہ سی لڑکی تھی۔

دودھ جیسی رنگت اور سیاہ آنکھوں میں شرارت سی بھری نظر آتی تھی۔ ان دونوں بہنوں کو اللہ نے حسین صورت سے ہی نہیں، حسن سیرت سے بھی نواز رکھا تھا۔ حانی کے بال کمر سے کچھ اوپر تھے۔ قد بھی مناسب تھا اگر پیر میں یہ ذرا سا نقص نہ ہوتا تو بلاشبہ جسمانی لحاظ سے وہ حسن کے تمام پیمانوں پر پورا اتر سکتی

تھی۔ آج وہ آئی بھی وہیل چیئر اور بیساکھی کے بغیر تھی۔ اور بغیر بیساکھی کے چلنے میں اسے دشواری تو ہرگز نہیں ہوتی تھی تاہم پاؤں اچھا خاصا مڑ جاتا تھا جس کی وجہ سے چال میں لنگڑاہٹ کا واضح پتا چلتا تھا۔ اکثر لوگوں کی موجودگی میں حانی زیادہ چلنے پھرنے سے پرہیز ہی کرتی تھی۔

یہ اس وقت کی بات ہے۔ جب حانی چھت سے گری تھی۔ بابا دفتری کام کے سلسلے میں شہر سے باہر تھے۔ تب بوا اور حریم ہی حانی کو محلے کے ڈاکٹر کے پاس لے کر گئی تھیں۔ جب ابتدائی طبی امداد سے حانی کو کچھ افاقہ نہ ہوا تو پھر اسے بوا ہڈی جوڑ ایک نامی گرامی حکیم صاحب کے پاس لے گئی تھیں۔ حکیم صاحب کی دوائی نے فوری اثر دکھایا تھا۔ حانی کا درد فورا" ہی ٹھیک ہوگیا تھا۔ تاہم ناقص علاج نے ہمیشہ کے لیے حانی کے پیر میں نقص چھوڑ دیا۔ چونکہ ٹخنہ اپنی جگہ سے کھسک گیا تھا۔ اور ہڈی کے ساتھ ساتھ پیر کی کچھ وینز بھی ڈیمیج ہوئی تھیں۔ اور حکیم صاحب ٹخنہ تو اپنی جگہ پر لا چکے تھے مگر مزید تشخیص نہیں کرپائے تھے۔

اگرچہ بابا کے آنے کے فورا" بعد حانی کا علاج معالجہ شروع ہوگیا تھا مگر کوئی امید افزا خبر نہیں مل سکی تھی۔ اکثر ڈاکٹرز کا خیال تھا کہ گھٹنے اور ٹانگ کی وینز میں کھنچاؤ آگیا ہے۔ اسی وجہ سے وہ ایڑھی اٹھا کر چلتی ہے۔ جس کی وجہ سے چال میں لنگڑاہٹ نمایاں ہوجاتی ہے۔ بہر حال جو بھی تھا۔ چاند کے ایک کونے کو گرہن لگ چکا تھا۔ اور یہ گرہن چاند کی حقیقی خوبصورتی کو دیکھنے والے کی نظر کے مطابق واضح کرتا تھا۔ چھپا دیتا تھا، نظر انداز کردیتا تھا۔

نہ جانے ان گھڑیوں یا اس لمحے میں کچھ ایسا سحر تھا تبھی تو دو سادہ سی شریر نظروں نے گرہن لگے چاند کی چمک سے طلب کرلی تھی اور یہ طلب کب سے انگڑائیاں لے کر جاگ رہی تھی۔ اس کی وضاحت ضروری تو نہیں تھی کیونکہ بعض سچائیاں خود بخود عیاں ہوجاتی ہیں۔ کچھ کہنے اور بولنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ بس آنکھیں سارے "راز" اگل دیتی ہیں۔

اور محسن ایاز کی آنکھوں نے بھی سارے [illegible] کھول دیے تھے۔

خالہ نے جاتے سمے حریم کی پیشانی چومتے ہوئے مژدہ جاں فزا سنا دیا تھا یوں کہ حریم کا انگ انگ اب رحیم کا شکر گزار ہوگیا۔

"بھائی صاحب سے بات کرلوں۔ پھر چھوٹی سی رسم کرلیں گے۔ یہ نالائق بھی آخری سال کے پرچے دے کر فارغ ہوجائے۔ شادی دو سال بعد ٹھیک ہے نا۔"

"ہمیں منظور ہے۔ جیسے آپ کی مرضی، یہ فیصلے باہمی رضامندی سے طے پائیں تو بہتر ہے آپ بیٹے سے علیحدگی میں بھی پوچھ لیں ویسے کچھ پوچھنے کی ضرورت تو نہیں۔ اللہ خوشیاں سلامت رکھے۔" راحت بیگم نے دعائیہ انداز میں سنجیدگی سے کہا تھا۔ اور حریم گم صم سی سامنے کھڑی اس عورت کو دیکھ رہی تھی۔ جس کے بھی نہ جانے کتنے ہی رنگ تھے اور ہر رنگ ہی بہت گہرا تھا۔ کبھی عیار اور مکار لگتی تھی۔ کبھی معصوم اور مظلوم لگتی، کبھی جھگڑالو اور فسادن دکھتی۔ اور کبھی رحمت کے بادل کی طرح سے بے لوث برسنے لگتی۔

سامنے کھڑی یہ عورت بھلا کیا تھی؟

حریم ماہیر عالم آج تک اس عورت کو سمجھ نہیں پائی تھی۔ مگر آج اس عورت نے حریم ماہیر عالم کو بغیر دام کے خرید لیا تھا۔

☼ ☼ ☼

آسمان کی سیاہ چادر پر بدلیوں کا بسیرا تھا۔ ستارے اور چاند بدلیوں کی چادر اوڑھے خاموشی سے سو رہے تھے۔ گھور تاریک رات نے پورے عالم کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ درختوں کے گھنے جھنڈ میں گھونسلوں میں منہ چھپائے پرندے کبھی کبھی خاموشی کا سینہ چاک کیے کوئی سریلا گیت سنانے لگتے تھے۔ دور کہیں گیدڑوں کے دہائیاں دینے کی آواز بھی آرہی تھی۔ چھوٹے سے صحن میں لگے پودے بھی اداس اور

غمگین تھے۔ ہر شے پر گویا شب تاریک کا سایہ تھا۔ حتیٰ کہ پہلو میں دھڑکتا دل بھی خاموش تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ شب تاریک نے اپنا پنکھ اس دل پر بھی چپکے سے مار دیا ہے۔ تبھی تو دل کے ایوانوں میں ذرہ بھر روشنی نہیں تھی۔ گھٹا ٹوپ اندھیرا تھا۔ یوں کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیتا۔ منزل اور راستہ دیکھنا تو دور کی بات اس تاریکی میں اپنا عکس بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

اور یہ دل کے ایوان میں کیسی شب ہجر اتر آئی تھی۔

"تو کیا عفیفا مختار خالی ہاتھ اور خالی دل رہے گی.... عمر بھر۔" یہ سوال بدلیوں سے سجے آسمان سے نہیں تھا۔ وہ تو بائیں پہلو میں دھڑکتے اس دل سے پوچھ رہی تھی۔ جواب بھی خاموش تھا۔

آج اسے شدت کے ساتھ کسی ہم راز کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ کوئی سکھی' کوئی سہیلی۔ جس سے دل کا بوجھ کہہ سن کر ہلکا کر لیا جاتا۔ جو اس کے زخم خوردہ دل پر ہمدردی کے پھاہے رکھتی۔ کوئی تسلی بھرے لفظ بولتی۔ کوئی دلاسوں سے لپٹی کہانی سناتی۔ کچھ ایسی کہاوتیں بیان کرتی کہ دل خوا مخواہ خوش گمان ہو جاتا۔ امید کی گمشدہ کرن چمکنے لگتی۔ اور صدیوں سے تنہا یہ دل بھی کچھ دیر کے لیے ہی سہی "شاد" تو ہو جاتا۔

اور آج اسے نہ جانے کیوں زوباریہ درانی کی یاد بھی بری طرح سے ستا رہی تھی۔ وہ اس کی واحد سہیلی تھی۔ جب دوستی کا رشتہ ٹوٹ گیا تو فیفا نے زوباریہ کے صفحے کو بہت خاموشی سے ایک رات کتاب زیست سے پھاڑ کر الگ کر دیا تھا۔

ماہیر اور زوباریہ کی بعد اس نے "دوستی" کے رشتے کو کسی اور کے ساتھ جوڑنے کی کوشش نہیں کی۔ دل بری طرح سے "دوستی" اور "دوستوں" سے اچاٹ ہو گیا تھا۔

مگر آج پھر اسے ایک دوست کی شدت سے طلب محسوس ہو رہی تھی۔ حالانکہ وہ کبھی بھی زوباریہ درانی کو یاد نہیں کرنا چاہتی تھی۔ مگر اس کی "یاد" بھی بغاوت کرتے ان آنسوؤں کی طرح تھی جنہیں وہ اپنی ماں سے بھی چھپائے اب تھکنے لگی تھی۔ اور اس تھکن نے فیفا کے انگ انگ میں مستقل بسیرا کر رکھا تھا۔

"فیفا! یہاں کیوں کھڑی ہو۔" نفیسہ بیگم نہ جانے کب اس کے پیچھے آ کھڑی ہوئی تھیں۔

"آپ ابھی تک سوئی نہیں۔" فیفا نے گڑبڑا کر چہرہ موڑ لیا تاکہ امی کی نظر اس کے بھیگے رخساروں پر نہ پڑے۔

"سہیل کا فون آ رہا تھا۔ میری نیند فون کی بیل سن کر ہی ٹوٹی ہے۔" امی نے کھوجنے والی نظروں سے اس کے چہرے کا بغور جائزہ لیا۔

"سہیل کا فون۔" فیفا کا دل گویا اتھاہ گہرائیوں میں ڈوبنے لگا۔

"کیا کہتے ہیں؟" اس نے بمشکل خود پر ضبط کے پہرے بٹھا کر پوچھا تھا۔

"تم سے بات کرنا تھی اس نے۔ پھر خود ہی بند کر دیا۔ شاید کوئی کام یاد آ گیا ہو گا۔" وہ سادگی سے بتا رہی تھیں۔

"ہونہہ۔ کام۔" فیفا نے بری طرح سے نچلے لب کو دانتوں تلے دبا لیا تھا۔

"چلو' اندر آؤ۔" وہ ناراضی سی گویا ہوئیں۔

"آپ جا کر سوئیں' میں آ جاتی ہوں۔" وہ بے بسی سے بولی تھی۔

"کیا بات ہے فیفا!" نفیسہ بیگم ٹھٹک گئی تھیں۔ فیفا کی بھرائی آواز نے انہیں سخت پریشان کر دیا تھا۔

"فیفا! کوئی پریشانی ہے؟ کیوں خود سے الجھ رہی ہو؟ مجھے بتاؤ بیٹا۔" وہ اس کا ہاتھ تھامے راہداری سے ہوتی ہوئی کمرے میں آ گئیں۔ اور وہ میکانکی انداز میں ماں کے ساتھ گھسٹتی جا رہی تھی۔

"یہاں بیٹھو۔" وہ اس بیڈ پر بٹھا کر خود بھی قریب بیٹھ گئی تھیں۔

"اب بتاؤ۔ کون سی بات تمہیں پریشان کر رہی ہے۔" ماں کی جہاندیدہ نظروں سے کچھ چھپانا ممکن کہاں تھا مگر اس کی حتی المقدور کوشش ہوتی تھی کہ ماں کو کم از کم اپنی وجہ سے کبھی بھی پریشان نہ کرے مگر ساری پریشانیاں اس کی ذات سے بندھی خود بخود امی کی طرف لپکنے لگتی تھیں۔ اس نے کچھ دیر سوچنے کے بعد امی کو سب کچھ بتا دینے کا فیصلہ کر لیا۔

"سہیل نے میرا ویزہ بھجوا دیا ہے۔ مگر آپ کے ویزے پر اعتراضات لگ رہے ہیں۔ پیپرز نامکمل ہیں۔ پھر سے واپس آ گئے۔ وہی پھر سے ایمبیسی کے چکر۔ میرا دماغ گھوم رہا ہے۔"

"تو اس میں پریشانی کی کیا بات ہے۔ تم چلی جاؤ' میں بعد میں آ جاؤں گی۔" انہوں نے نرمی سے ہلکے پھلکے انداز میں کہا۔

"میں آپ کو لیے بغیر ہرگز نہیں جاؤں گی۔" اس کا فیصلہ اٹل تھا۔

"مگر اس میں حرج ہی کیا ہے۔ تمہارے ساتھ جاؤں یا بعد میں۔ بات تو ایک ہی ہے۔" نفیسہ بیگم کو اس کی الجھن کی وجہ سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔

"بات ایک نہیں ہے۔" فیفا نے بے بسی سے لب کھولے۔

"ابھی تو میں ادھر ہوں۔ کچھ کوشش اور بھاگ دوڑ سہیل کر ہی لیں گے۔ اگر چلی گئی تو ٹھنڈے ہو کر بیٹھ جائیں گے۔ نہ جانے پھر کتنا وقت لگ جائے۔ میں آپ کے لیے ادھر تڑپتی رہوں گی فکرمند رہوں گی۔"

"تمہاری ضد بے جا ہے۔" نفیسہ بیگم نے خفگی سے کہا۔

"یہ بتاؤ۔ سہیل نے کیا بات کی ہے؟"

"وہ کہتے ہیں ٹکٹ کنفرم کروا لو۔" فیفا نے پریشانی کی اصل بات بتا دی۔

"تو ٹھیک ہی کہہ رہا ہے۔ تم بھی خوا مخواہ ضد کر رہی ہو۔ جب اس نے ویزہ بھیج دیا ہے پاسپورٹ بن چکا ہے۔ پھر دیر کیوں کرتی ہو بیٹی۔" وہ اسے سمجھا رہی تھیں۔

"مرد کا کوئی بھروسہ نہیں ہوتا کہ کب بدل جائے۔ عزت کے ساتھ اپنے شوہر کے پاس جاؤ۔ بار بار انکار کرو گی تو سہیل کو بھی ضد آ جائے گی۔ اور یہ تو بچے کی محبت ہے۔ جو جاتے ہی تمہارے ویزے کے ساتھ ساتھ میرے لیے بھی کوشش کر رہا ہے۔"

"محبت ہونہہ۔" فیفا کا حلق تک کڑوا ہو گیا۔

"نہ جانے یہ کیسی محبت ہے۔ مجھے تو یہ شادی نرا ڈھکوسلا لگتی ہے۔"

"فیفا! کیا سوچنے لگی ہو۔" انہوں نے اس کا کندھا نرمی سے ہلایا۔

"بیٹی! رشتے کی نزاکت کو سمجھتے ہیں۔"

"کون سا رشتہ۔؟ کیسی نزاکتیں۔" وہ گویا تھک سی گئی۔ اب بھلا ماں کو کیا بتاتی کہ ابھی تک اس کے اور سہیل کے درمیان صرف کاغذ کا تعلق تھا۔ اور یہ "تعلق" کتنا مضبوط تھا یہ تو فیفا خود بھی نہیں جانتی تھی۔ اور اسے تو اپنی اور سہیل کی شادی ڈرامے کا ایک سین لگتا تھا۔ پل جھپکنے میں بدل جانے والا۔

شادی سے دو دن پہلے سہیل پاکستان آیا تھا۔ اور شادی سے اگلے دن ڈیڑھ بجے کی فلائٹ سے واپس عمان چلا گیا۔ اور اس آنے اور جانے کے درمیانی عرصہ میں چار پانچ گھنٹوں پر مشتمل رات بچتی تھی۔ اور ان چار پانچ گھنٹوں میں صرف سات منٹ کے لیے وہ عفیفا کے پاس آیا تھا۔ صرف یہ بتانے کے لیے کہ اسے ایمرجنسی میں اسلام آباد ایمبیسی جانا ہے۔ کچھ کاغذات پر اعتراضات لگ رہے تھے۔ یا کچھ اور مسئلہ درپیش تھا۔ عفیفا تو بس ہونق بنی سہیل کی پھرتیاں دیکھ رہی تھی۔ جو کہ بریف کیس میں اپنا سامان رکھے موبائل اٹھائے اس کی طرف دیکھے بغیر باہر نکل گیا تھا۔

اور یہ تھی عفیفا مختار کی شب عروس۔ نہ جانے کیوں' اول روز سے ہی فیفا کے دل میں وسوسہ کھٹک رہا تھا۔ وہ اپنے ان خدشات کو کوئی نام نہیں دینا چاہتی تھی۔ مگر یہ بے نام سے خدشے بھی اس کا قرار لوٹ کر لے گئے تھے۔

وہ تفکرات اور اپنے ان خدشات کو کسی سے شیئر بھی نہیں کر سکتی تھی۔ کوئی بھی تو ایسا ہمراز نہیں تھا۔ جس سے دل کا بوجھ بانٹ کر وہ شانت ہو جاتی۔

کبھی دل کرتا ماہیر سے بات کرے مگر اب بھلا فائدہ

بھی کیا تھا۔ جو ہونا تھا وہ تو ہو چکا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کی ماں کا یہ فیصلہ کبھی بھی غلط ثابت ہو مگر دل نہ جانے کیوں مطمئن نہیں تھا۔ حالانکہ سہیل نے خود ہی امی کو ساتھ لے جانے کی بات کی تھی۔ اور اب جبکہ وہ ذہنی طور پر تیار ہو چکی تھی۔ امی کو بھی مشکل سے ہی سہی، رضامند کر ہی لیا تھا۔ اب سہیل کا آئیں بائیں کرنا فیفا کو بری طرح سے الجھا رہا تھا۔ اور یہ الجھن، سلجھنے کی بجائے مزید الجھ رہی تھی۔ کیونکہ اس سے اگلے ہی روز سہیل کی دوبارہ کال آگئی تھی۔ اور وہ کہہ رہا تھا کہ ابھی فیفا کو بھی آنے کی ضرورت نہیں۔ وہ اپنے کام کے سلسلے میں دوبئی میں کچھ عرصہ کے لیے مقیم ہے۔ فیفا کو تنہا رہنے میں پرابلم ہوگی۔ اور اس نے ہمیشہ کی طرح پاکستان آنے کا وعدہ بھی کیا تھا۔ اور اس کی سادہ لوح ماں داماد کے وعدے اور ٹیلی فونک گفتگو سے ہی مطمئن ہو جاتی تھی۔

مگر اب تو اردگرد کے لوگ بھی سوال کرنے لگے تھے۔ جن میں سرفہرست راحت بیگم تھیں۔ فیفا اور نفیسہ بیگم عصر سے کچھ پہلے راحت بیگم کی عیادت کرنے کے لیے آئی تھیں۔ راحت بیگم نند کو دیکھ کر طنز کے تمام ہتھیاروں سے لیس ہو گئیں۔

"مل گئی فرصت، میری احوال پرسی کے لیے، تم نے تو غیروں کو بھی مات دے دی نفیسہ۔"

"آپ نے کون سا اطلاع دی ہے، اتنا نہیں ہو سکا، ایک فون ہی کر دیتیں، ماہیر سے مجھے شکوہ نہیں، بچے کے ہزاروں کام ہوتے ہیں۔ تاہم آپ تو تمام دن فارغ ہوتی ہیں۔ کسی کے ہاتھ پیغام ہی بھجوا دینا تھا۔" نفیسہ بیگم نے ان کی ناراضی کے جواب میں خاصا تفصیلا" جواب دے کر ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی تھی۔

"تمہارے سامنے ہوں، دیکھ لو، میری حالت، نچڑ کے رہ گئی ہوں، پیر تو ٹھیک ہے، مگر کمزوری کی وجہ سے چکر آتے ہیں، چلنا مشکل ہے۔" انہوں نے کمال درجے کی نقاہت لہجے میں بھرلی۔

"صحت تو آپ کی قابل رشک ہے ممانی جان! اللہ نظربد سے بچائے۔" فیفا نے بغور ان کا جائزہ لے کر گفتگو میں شمولیت اختیار کی۔

"ماشاء اللہ۔" انہوں نے دل ہی دل میں کہا تھا۔

"تم بھی قندھاری انار کی طرح لال ہو رہی ہو۔"

"جوابی تعریف کرنا ضروری نہیں تھا ممانی جان! مگر اب آپ نے کر ہی دی ہے تو اس تعریف کو قبول کر لیتی ہوں۔ تاہم ایک بات واضح کر دوں میرا رنگ بچپن سے ہی سرخ و سفید ہے۔"

"تو اور کیا۔ زمیلہ اور تمہیں، ماہیر آٹے کی بوری کہا کرتا تھا۔ بچپن میں تم دونوں بہت موٹی ہوا کرتی تھیں۔" راحت بیگم کا موڈ خوش گوار ہو گیا تھا۔ نند سے جس قدر روایتی تعلقات تھے ان کی بیٹی سے خصوصی انسیت بھی تھی۔ تب ہی تو فیفا کی ہر بات ہنسی خوشی حلق سے نیچے اتار لیتی تھیں۔

"حریم کہاں ہے؟" نفیسہ اور فیفا نے یک زبان پوچھا۔

"نہا رہی ہے، گرمی بھی تو دیکھو، کیسی غضب کی ہے۔"

"تو اور کیا، اس کی حالت میں تو یہ موسم پوری شدت سے محسوس ہوتا ہے۔" نفیسہ بیگم نے تائیدی انداز میں سرہلایا۔

"تمہارا ویزا ابھی تک نہیں لگا۔" راحت بیگم کا انداز خود بخود پھر سے تیکھا ہو گیا تھا۔

"چھ مہینے ہونے کو آئے ہیں، یہ آنا کانی کیوں ہو رہی ہے؟" وہ گویا خود کلامی کر رہی تھیں۔

"میری وجہ سے معاملہ اٹک گیا ہے۔" نفیسہ نے ٹھنڈی آہ بھری۔

"بیٹی کو تنہا اتنی دور مت بھیجنا نفیسہ" وہ انہیں تنبیہا" کہہ رہی تھیں۔

"تم نے بھی جلد بازی سے کام لیا ہے، ایسے لڑکے کے ساتھ بچی کو نتھی کر دیا ہے جس کے آگے پیچھے کوئی بھی نہیں۔ بھرے پرے خاندانوں کے فائدے بھی بے شمار ہوتے ہیں۔ کم از کم فراڈ ہونے سے بچت ہو جاتی ہے۔" وہ سچ ہی تو کہہ رہی تھیں۔ فیفا بے خیالی میں ماں کا چہرہ تکنے لگی۔

"بالکل بھی بچی کو باہر نہ بھیجنا، جب تک سہیل کے بارے میں معلومات نہ لے لو۔"

"کیا مطلب؟" نفیسہ بیگم پریشان ہو اٹھی تھیں۔ "کیسی معلومات؟"

"ارے، جس روز نکاح کر کے گیا ہے پلٹ کر اس نے راہ نہیں دیکھی۔ ایویں تو نہیں بچی کو چلتا کرنا، سو طرح کے فراڈ ہو جاتے ہیں۔ اب ہمیں کیا پتا کہ یہ سہیل مسقط میں کیا کرتا پھر رہا ہے۔" انہوں نے ہاتھ نچا کر وضاحت کی تھی۔

"ایسی کوئی بات نہیں بھابھی بیگم! ساری معلومات اکٹھی کر کے ہی ہاں کہی تھی۔ سہیل میں ایسی ویسی کوئی بات نہیں۔" نفیسہ بیگم مطمئن تھیں۔

"بہرحال، سمجھانا میرا فرض تھا، آگے تمہاری مرضی۔" انہوں نے گویا ہاتھ جھاڑے۔

"میں تو کہتی ہوں، ایک دفعہ پھر سے چھان پھٹک کر لو، بیرون ملک میں فراڈ ہونا معمولی بات ہے، اب ہمیں کیا خبر وہ ادھر کیا کرتا ہے، کیسے رہتا ہے؟ تم بھی تو سنی سنائی پر مطمئن ہو کر بیٹھی ہو نا۔"

"یہ تو آپ نے ٹھیک کہا ہے، مگر اب بھلا ہو بھی کیا سکتا ہے۔" حسب معمول نفیسہ بوکھلا گئی تھیں۔

"کیوں نہیں ہو سکتا۔" وہ چمک کر بولیں۔

"ایسے ہی تو اپنی پھول سی بچی کو پردیس نہیں بھیج دیں۔"

"تو پھر کیا کرنا ہوگا۔" وہ ہونق پن سے انہیں دیکھنے لگیں۔

"سہیل خود آئے، کچھ دن ادھر رہے، پھر فیفا کو ساتھ لے کر جائے۔" انہوں نے اطمینان سے کہا تھا۔ ان کی بات میں وزن بھی تھا۔ نفیسہ بیگم سوچ و بچار میں گم ہو گئی تھیں۔

فیفا اٹھ کر ماہیر اور حریم کے مشترکہ کمرے میں آگئی۔ جب سے وہ لوگ یہاں شفٹ ہوئے تھے فیفا اور نفیسہ بیگم ادھر کا چکر نہیں لگا سکی تھیں۔

فیفا کچھ دیر کمرے کے وسط میں کھڑی رہی، پھر کچھ سوچ کر صوفے کی طرف بڑھ گئی۔ کمرے سے ملحقہ واش روم سے پانی گرنے کی آواز آرہی تھی، فیفا طائرانہ نظروں سے اردگرد کا جائزہ لے رہی تھی۔ کمرہ اگرچہ بہت بڑا نہیں تھا، تاہم حریم کا سلیقہ اور قرینہ فرنیچر کی ترتیب میں نمایاں تھا۔ ان دونوں کی شادی کی تصویریں سامنے دیوار پر لگی تھیں۔ ماہیر کے کئی ایک کلوزاپ تھے۔ ان میں کچھ تو یونیورسٹی کے زمانہ کے تھے۔ فیفا سوچ رہی تھی کہ اگر حریم نے یہ تصویریں دیکھ رکھی تھیں تو پھر یقینا" زوباریہ کی بھی کوئی نہ کوئی تصویر ضرور دیکھی ہوگی۔ اگر اس کی کریدنے یا جرح کرنے والی عادت ہوتی تو بہانے بہانے سے کسی سے بھی کچھ نہ کچھ ضرور پوچھ لیتی۔

"ارے فیفا! تم کب آئی ہو؟" وہ بالوں میں تولیہ لپیٹے باہر نکلی تو صوفے پر بیٹھی فیفا کو دیکھ کر اسے خوش گوار حیرت نے گھیر لیا۔

"ابھی کچھ دیر پہلے امی بھی آئی ہیں۔" فیفا سوچوں کے گرداب سے باہر نکل آئی تھی۔ حریم کے والہانہ اور پرجوش استقبال نے فیفا کے دل میں موجود حریم کی تکریم کو کچھ اور بڑھا دیا تھا۔

"اور سناؤ، کب جا رہی ہو عمان!" وہ اس کے مقابل ہی صوفے پر بیٹھ گئی تھی۔

"ابھی فی الحال پروگرام ملتوی ہو گیا ہے۔" فیفا نے بے دلی سے بتایا۔

"مگر کیوں؟ میرے خیال میں تم لوگوں کی تمام تیاری مکمل تھی۔" حریم سچ مچ حیران ہوئی۔ اس نے تو یہ ہی سنا تھا کہ فیفا اور پھوپھو عنقریب مسقط چلی جائیں گی، خود فیفا نے بھی اسے یہ ہی بتایا تھا۔

"امی کے کچھ کاغذات پر اعتراض لگا ہے، اور میں امی کو یہاں تنہا چھوڑ کر نہیں جاؤں گی۔"

"لیکن اس میں حرج کیا ہے، پھوپھو تنہا کیوں ہونے لگیں، ہم ہیں نا، پھوپھو ہمارے پاس رہیں گی، تم کم از کم پھوپھو کی وجہ سے اپنا ارادہ مت بدلو۔" حریم نے سادہ سے انداز میں خلوص سے کہا۔

فیفا نہ جانے کون سی سوچوں کے گرداب میں چکر لگانے لگی تھی۔ حریم کو وہ اس لمحے حد درجہ فکرمند اور

الجھی الجھی دکھائی دی۔ "یقیناً" اس کی پریشانی کی کوئی اور بھی وجہ ضرور تھی۔ حریم کچھ دیر تک کشمکش و پیچ کا شکار رہی تھی۔ نہ جانے اس کا کچھ پوچھنا مناسب تھا بھی یا نہیں۔ اسے ہمیشہ اگلے بندے کے برہم مزاج سے خوف آتا تھا اور ہمیشہ اس کی یہ ہی کوشش رہی تھی کہ وہ کوئی ایسی بات نہ کہے' جو مقابل کے موڈ کو بگاڑ بخش دے۔

"فیفا! تم کچھ اپ سیٹ دکھائی دے رہی ہو؟" اس نے مناسب الفاظ کے چناؤ کے لیے کچھ وقت لیا تھا۔ اب فیفا سے اس کی ایسی بھی بے تکلفی نہیں تھی کہ منہ پھاڑ کر کچھ بھی کہہ دیتی۔

"میں کچھ نہیں' بہت زیادہ اپ سیٹ ہوں۔" حریم کو اندازہ نہیں تھا کہ فیفا یوں آسانی سے اس پر ظاہر ہوجائے گی۔ اور حریم تو یہ بھی نہیں جانتی تھی کہ فیفا اس پر ظاہر ہونے کے لیے ہی تو آج یہاں آئی تھی۔ وہ خود سے الجھ الجھ کر تھک چکی تھی اور اپنی الجھن کو سلجھانے کے لیے اسے کسی کا مشورہ درکار تھا اور بہت سوچنے کے بعد فیفا کو حریم کے علاوہ کوئی بھی ایسا مخلص دکھائی نہیں دیا تھا جس سے وہ اپنی ذاتی زندگی کی حقیقتوں اور سچائیوں کے متعلق کچھ بات کر سکتی۔

"خیریت تو ہے؟" حریم کی آنکھوں میں تفکر چھلکنے لگا۔

"حریم! مجھے لگتا ہے میری کشتی بھنور میں پھنس کر رہ گئی ہے' میں عجیب سی کشمکش کا شکار ہوں۔" فیفا کے لب و لہجے میں بے بسی نمایاں تھی۔

"ہوا کیا ہے؟" حریم نے نرمی سے اس کے ہاتھوں پر اپنے ہاتھ رکھے تھے۔

وہ فیفا کے ہاتھوں کی کپکپاہٹ سے اس کی ذہنی ابتری کا اندازہ بخوبی لگا سکتی تھی۔ اور اس کا دل عجیب سے وہموں میں پڑنے لگا تھا۔ اور وہ سوچ رہی تھی کہ فیفا جیسی مضبوط اعصاب کی لڑکی بھلا کسی معمولی بات سے کیونکر اپ سیٹ ہوگی اور نہ ہی فیفا اتنی کم ہمت تھی کہ اپنے مسائل دوسروں سے شیئر کرنے لگتی۔ بات یقیناً' کچھ نازک اور حساس قسم کی تھی' تب ہی حریم کے چہرے پر سنجیدگی کا عکس گہرا ہونے لگا تھا اور وہ بہت توجہ سے فیفا کی باتیں سننے لگی تھی۔

☼ ☼ ☼

"چھوٹے صاحب! آپ کو بیگم صاحبہ بلا رہی ہیں۔" دروازے پر ہلکی سی دستک کی آواز سنائی دی تھی۔ اور پھر گھریلو ملازمہ شانو نے دروازے کی جھری میں سے سر نکال کر اسے مطلع کیا۔

"شانو!" زرجان نے مندی مندی آنکھیں کھول کر شانو کو آواز دی۔ وہ جو دروازہ بند کرکے پلٹنے لگی تھی پھر سے سر اندر گھسا کر بولی۔

"جی صاحب۔"

"مما سے کہو' میں سو رہا ہوں' اور ہاں اب دروازہ ناک مت کرنا' میں خود نیچے آجاؤں گا' پندرہ منٹ بعد چائے بھجوا دینا۔" وہ پھر سے سر تکیے پر رکھتے ہوئے آنکھیں موندے موندے بولا۔

"جی بہتر۔" شانو نے تابعداری سے سر ہلا کر دروازہ بے آواز بند کر دیا تھا۔

"مما اس وقت گھر پہ ہیں؟" اس کی نیند تو اچاٹ ہو ہی چکی تھی۔ اور وہ ہولے ہولے کنپٹیاں دباتا سوچ رہا تھا۔ وہ بہت کم نیند لیتا تھا۔ شاید اسی لیے اس کی آنکھوں میں سرخیوں نے بسیرا کر رکھا تھا۔

رات کو وہ ڈھائی بجے کی فلائٹ سے واپس آیا تھا۔ سو اسی لیے مما سے ملاقات نہیں ہو سکی تھی۔ بقیہ رات وہ اپنے ساتھ لائی کچھ فائلوں کو اسٹڈی کرتا رہا اور کام ایک ایسی مصروفیت تھی جو زرجان کو لمحے' منٹ' سیکنڈ سب بھلا دیتی تھی۔ کام کے دوران اسے کچھ یاد نہیں رہتا تھا اور کچھ پل کے لیے خود کو بھولنا بھی بہت اچھی فرار کی ایک قسم تھی۔ اور آج کل تو وہ ہر کسی سے فرار چاہتا تھا۔ حتیٰ کہ تنہائی بھی اسے چبھن دینے لگی تھی اور وہ تنہائی کے ساتھ بھی وقت بتانے سے گریزاں تھا۔ کبھی کبھی خود سے بھی ملاقات اذیت سے دوچار کر دیتی ہے اور جس کا ساتھ ہمیشہ تنہائی اور اپنے آپ سے ہو اس کے وقت کی رفتار اور

ابتری سے شکوے بجا تھے اور یہ وقت جو سب سے بڑا منصف تھا' کسی کی قید میں بھی کہاں آتا تھا' بلکہ جس کو چاہتا خود میں مقید کر لیتا تھا۔

اور زرجان عباس بھلا کیا تھا' وقت کا قیدی؟ نارنجی شام کا اسیر؟ لاکھوں ستاروں کے محبوب اکلوتے چاند کا تمنائی؟ سیاہ رات جیسے کشکول میں محبت کے چند سکے مانگنے والا بھکاری؟ محبت کے گوشوارے لکھنے والا کوئی قلمکار؟ چمکتے آگ اگلتے ریت پر چلنے والا کوئی صحرائی؟ نگر نگر گھومنے والا مسافر؟ قافلے کی قطار سے بچھڑ جانے والا پردیسی؟

اور حریم جمال کے دل کی چوکھٹوں پر سر ٹکرانے والا ایسا سلطان جس کی راجدھانی اور سلطنت کے قرب و جوار کی عورتیں خود کو طشتری میں سجائے پیش کرتی تھیں اور وہ ان پر ایک نگاہ غلط کا بھی روادار نہ تھا۔

تو پھر محترمہ فلک ناز کیوں نا ایسے بیٹے پر فخر کرتیں جو پارسائی کا دعوے دار تو نہیں تھا' مگر پارسا ضرور تھا۔

زرجان صبح کاذب سے لے کر اب تک سوتا رہا تھا۔ سو نیند تو پوری ہو چکی تھی' مگر سر بھاری بھاری سا تھا۔ ٹھنڈے پانی سے شاور لینے کے بعد وہ خاصا فریش ہو گیا تھا۔ ڈریسنگ کے سامنے کھڑے ہو کر پرفیوم اسپرے کرنے کے بعد وہ بال بنانے لگا تھا' جب دروازہ بڑے نفیس انداز میں ناک کیا گیا تھا۔ دستک دینے والے کے اسٹائل سے ہی زرجان کو پتا چل گیا تھا کہ دروازے کے دوسری طرف کون ہے۔

"زرجان! اٹھ گئے ہو؟" مما کمرے میں داخل ہو رہی تھیں' ان کے ہاتھ میں چائے کے دو مگ تھے۔ خلاف معمول وہ بہت گھریلو اور سادہ سے حلیے میں دکھائی دے رہی تھیں۔

"میں جاگ چکا ہوں۔" زرجان نے مسکرا کر کہا۔

"کیا واقعی؟" انہوں نے سینٹرل ٹیبل پر مگ رکھے۔

"تم نیند سے جاگ چکے ہو؟" وہ بات کو کسی اور پیرائے میں لے گئی تھیں۔

"لگتا تو کچھ یہ ہی ہے۔" وہ معنی خیزی سے بولا۔

"تو میں تیاری کروں؟" انہیں خوش گوار حیرت نے گھیر لیا۔ چائے کے مگ سے ان کی توجہ لمحہ بھر کے لیے ہٹ گئی تھی۔

"کیسی تیاری؟" وہ اچنبھے سے کندھے اچکا کر انہیں دیکھنے لگا۔

"تمہاری شادی کی۔" وہ نرم نرم نظروں سے بیٹے کے تاثرات جانچ رہی تھیں۔

"شادی؟" وہ حیران ہوا۔

"تو کیا غلط کہا۔" انہوں نے صوفے کی گداز پشت سے ٹیک لگا کر زرجان کی طرف دیکھا۔

"مگر میں شادی کی بات تو نہیں کر رہا۔"

"لیکن میں تو تمہاری شادی کی بات کر رہی ہوں۔" وہ دھیمے انداز سے بول کر ہلکا سا مسکرائیں۔

"کیا تمہیں ساتھی کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔"

"ایک پارٹنر تو ہے۔" زرجان کچھ غیر سنجیدہ تھا۔ اور اتنا تو وہ جان چکا تھا کہ مما اسے گھیر گھار کر پھر سے اپنے پسندیدہ ٹاپک کی طرف لانے کی تیاری کر کے ہی آئی تھیں۔

"کون؟"

"تنہائی اور خاموشی۔" وہ پھر سے مسکرایا۔

"زرجان! میں سیریس ہوں بیٹا۔" انہوں نے خفا سے انداز میں کہا۔ آج وہ پہلے سے کچھ بدلی بدلی دکھائی دے رہی تھیں۔ اور زرجان ان کے اس بدلاؤ کی وجہ جاننا چاہتا تھا۔

"جی مما! کہیے۔" وہ مصنوعی سنجیدگی سے بولا۔

"آپ میری شادی کی بات کر رہی تھیں۔"

"تم اس موضوع پر بولنا پسند کرو گے؟" ان کا لہجہ کچھ چبھتا ہوا تھا۔

"کیوں نہیں۔" اس نے کھلے دل سے گویا اجازت دی۔

"اچھا..." وہ بے حد حیران ہوئیں۔ آج تو زرجان بھی انہیں حیران کرنے پر تلا ہوا تھا۔

"لگتا ہے اس دفعہ کا تمہارا ٹور شان دار رہا ہے۔" ایک دم ہی میڈم فلک ناز کا چہرہ جگمگانے لگا۔

"کوئی پسند تو نہیں کرلی؟" وہ اسے چھیڑ رہی تھیں۔

"یہ کام اب آپ پر چھوڑ دیا ہے، میں نے جسے پسند کرنا تھا کرلیا۔ وہ کسی اور کے نصیب میں لکھی تھی۔ اب بار بار ایک ہی کام دہرانا میرے بس کا روگ نہیں۔" اس نے صاف جھنڈی دکھا کر سارا بوجھ ماں کے کندھوں پر لاد دیا تھا اور اس بوجھ کی شدت صرف میڈم فلک ناز ہی جان سکتی تھیں۔

"تم اسے بھول نہیں سکتے؟" غیر دانستہ انہوں نے وہ ذکر خود بخود چھیڑ دیا تھا' جس پر بولنا انہیں کبھی بھی پسند نہیں رہا تھا۔

"بھول سکتا ہوں' کیا بھول جاؤں؟" وہ معصومیت سے کہہ رہا تھا۔

"اتنی محبت تھی تمہیں' حریم جمال سے زرجان۔" وہ اس کے لہجے کے چٹختے کانچ بخوبی محسوس کر سکتی تھیں۔ اور ان کا دل گویا چکی میں پس کر رہ گیا تھا۔ وہ جانتی تھیں کہ زرجان نارسائی کے کرب سے گزرا ہے۔ اگر مسکراہٹیں اور خوشیاں بازار میں بکتیں تو وہ اپنے بچوں کو اپنی تمام دولت بھی دے کر لا دیتیں۔ سامنے بیٹھی اس عورت کا دل بھی تو ایک ماں کا دل تھا اور ماں چاہے جس طبقے کی بھی ہو' ہوتی تو ماں ہی ہے' اولاد کی خوشیوں پر خوش اور غموں پر تڑپ اٹھنے والی۔

"حریم جمال سے محبت کے کتابچے کو تو نہ ہی کھولیں۔" زرجان نے پھر سے مسکرانے کی کوشش کی تھی۔ مگر وہ اس کوشش میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔

"اگر اس کا باپ مان جاتا یا پھر میں ہی سلیقے سے بات کرلیتی۔ نہ جانے غلطی کس کی تھی' مگر نقصان تو صرف تمہارا ہوا ہے نا۔" وہ بری طرح سے ٹوٹ کر رہ گئی تھیں۔ زرجان حقیقی مسرتوں سے دور تھا اور میڈم فلک ناز گویا سب کچھ ہونے کے باوجود بھی بے بس تھیں۔ ان کے غرور اور طنطنے نے زرجان کی واحد خوشی اس سے چھین لی تھی۔ یہ احساس انہیں کچوکے لگانے کے لیے کافی تھا اور وہ بہت دفعہ ضمیر کے کواڑوں میں جھانک کر خود اذیتی کا شکار ہوتی رہتی تھیں۔

مگر ان کا بھی قصور بھلا کتنا تھا؟ انکار تو حریم کے باپ نے کیا تھا' وہ تو کسی اور سے منسوب تھی اور زرجان بے خبری میں ہی کسی اور کے آنگن میں اترنے والے چاند کی طلب کرنے کا گناہ کر بیٹھا تھا۔ حالانکہ ان کا بیٹا ایسا تو نہیں تھا۔ پرائی امانتوں کی طرف نظر کرنے والا۔ دل میں جگہ دینا تو دور کی بات تھی۔ مگر یہ دل کے سلسلے بھی عجیب ہوتے ہیں۔ اور اس دو انچ کے گوشت پوست کے لوتھڑے پر اختیار بھی کہاں ہوتا ہے اور یہ ہی دل نہ جانے کس کس مقام پر ذلیل کرواتا ہے۔

"ہم کوئی اور بات نہیں کر سکتے۔" زرجان کی آنکھوں میں ہلکی سی ناگواری در آئی۔ اس موضوع پر بولنا اسے کبھی بھی پسند نہیں رہا تھا۔

"حریم جمال کے علاوہ کوئی اور نیا کتابچہ کھولنا چاہو گے۔" وہ بڑی آس بھری نظروں سے اسے دیکھ رہی تھیں۔ آنکھوں میں التجا لیے بھلا یہ کایا پلٹ کیسے ہوئی؟ میڈم فلک ناز ایسی حلاوت کا مظاہرہ کریں۔ بات تو اچنبھے کی تھی۔ مگر یہ جو وقت ہے نا' بڑے بڑے سورماؤں کے بل نکال دیتا ہے۔ زرجان کو بات کی تہ میں اترنے میں کچھ پل ہی لگے تھے۔ وہ گویا سب کچھ سمجھ چکا تھا۔ ماں کی شخصیت میں در آنے والی اس تبدیلی کا اصل راز اس کے بڑے دونوں بھائیوں کا ابراڈ سیٹل ہونا اور بزنس کو الگ کرلینا ہی ہو سکتا تھا۔

بظاہر دنیا دکھاوے کو اور سوسائٹی میں سب اچھا دکھانے' اپنا امیج اور ساکھ برقرار رکھنے کے لیے وہ خود کو مضبوط ظاہر کرتی تھیں۔ مگر درحقیقت اس اسٹیج پر بیٹوں کا بزنس الگ کرنے کا پلان انہیں اندر سے توڑ چکا تھا۔ دنیاوی لحاظ سے بھی انہیں کافی خسارے کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ اثاثوں کی تقسیم نے زرجان کی بیک کو بھی دھچکا لگایا تھا۔ مگر وہ تو ازل سے لاپروا اور درویش تھا۔ اسے اس چیز پر کوئی افسوس یا دکھ نہیں تھا۔ تاہم سرکل میں اور کاروباری لحاظ سے اچانک ملنے والا یہ نقصان میڈم فلک ناز کو غیر دانستہ ایک موقع فراہم کر گیا تھا۔

بغیر ٹھوکر سنبھل جانا۔ غلطیوں کو نہ دہرانا۔ اب وہ مزید کوئی غلطی افورڈ نہیں کر سکتی تھیں۔ کبھی کبھی سمجھنے اور سنبھلنے کے لیے صرف ایک لمحہ درکار ہوتا ہے۔ جس کو بھی خوش قسمتی سے یہ لمحہ میسر آجاتا ہے وہ خود کو بانصیب لوگوں کی فہرست میں شمار کرے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔

اور میڈم فلک ناز اس لمحے کو اپنے ہاتھ میں کر چکی تھیں۔ مزید ہر قسم کے نقصان سے بچنے کے لیے اور اپنے بچے کھچے سرمائے کی حفاظت کے لیے وہ اگلا لائحہ عمل تیار کرنا چاہتی تھیں۔ زرجان اور ہنی ان کے لیے کیا تھے؟ آتی جاتی سانسوں کی ضمانت' زندگی کے لیے بہترین زاد راہ' یا پھر ایسا اثاثہ جس کا کوئی نعم البدل نہیں تھا اور وہ اپنے اس سرمائے کو کسی جنون کے ہاتھوں تباہ نہیں کر سکتی تھیں۔ وہ چاہتی تھیں کہ زرجان اور ہنی ایک متوازن اور نارمل زندگی گزاریں۔ زندگی کی ہر خوشی کو دل سے محسوس کریں۔ اور وقت کی بے رحمی نے جو ہجر ان دونوں کے نصیب میں لکھ دیا تھا اس ہجر کے سحر اور زہر سے ان کے بچے آزاد ہو جائیں۔ ایک ماں ہونے کے ناتے یہ خواہش بے جا تو نہیں تھی۔

"مما! کہاں کھو گئی ہیں؟" زرجان کی آواز انہیں سوچوں کے بھنور سے کھینچ لائی۔ وہ گڑبڑا کر زرجان کو دیکھنے لگی تھیں۔ اس بات سے قطعاً" بے خبر کہ زرجان ان کے چہرے کے تمام تر تاثرات کو ازبر کر رہا تھا اور چہرے پڑھنا زرجان عباس کے لیے کبھی بھی مشکل نہیں رہا تھا۔ وہ تو گفتگو کے انداز سے ہی مقابل کے دل میں اتر کر سب کچھ جان لینے کے فن سے آشنا تھا۔

"تم نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا زرجان۔" وہ ایک مرتبہ پھر موضوع کی طرف پلٹی تھیں۔

"آپ کی خوشی کے لیے ایک کی بجائے کئی کتابچے بھی کھول سکتا ہوں۔" وہ بڑے ہی سنجیدہ لہجے میں غیر سنجیدگی سے کہہ رہا تھا۔

"اگر اس جیسی کوئی مل گئی تو مجھے بتا دینا۔" انہوں نے کہے دل نے خوشی کے گھنگرو باندھ لیے تھے۔

"اگر اس جیسی نہ ملی تو؟" وہ سوالیہ نظروں سے ماں کے پرجوش چہرے کو دیکھ رہا تھا۔

"پھر جسے میں پسند کروں گی' اسے اپنا لینا' وہ حریم نہیں ہوگی' مگر حریم جیسی ضرور ہوگی۔" انہوں نے گویا زرجان سے ہی نہیں خود سے بھی ایک عہد کیا۔

"آپ کی خوشی میرے لیے بہت اہم ہے مما! مگر مجھے ابھی کچھ اور وقت چاہیے۔"

"تھینک یو سوچ میری جان! تم نے مجھے ایک بوجھ سے آزاد کروا دیا ہے۔ میں بری سمجھ رہی ہوں خود کو اس گناہ سے جو میں نے تمہارے دل کی پروا نہ کرتے ہوئے غیر دانستہ کیا تھا۔" ان کی آنکھیں جھلملانے لگی تھیں۔

"خود کو الزام دینے سے کیا حاصل... یہ فیصلے تو تقدیر کے ہیں۔" وہ ہمیشہ کی طرح صابر اور شاکر تھا اور صبر کرنے والوں پر ہی آزمائش بھی اترتی ہے۔ کتابوں اور صحیفوں نے صابروں کے لیے انعام بھی تو بتایا تھا۔

"حریم... حریم' کیسی ہے؟" نہ جانے کیسے بے وجہ ہی ان کے لبوں سے الفاظ پھسل پڑے۔

"یا حیرت۔" اب کے زرجان کو سچ مچ گویا جھٹکا لگا۔

"مما اور حریم کا پوچھیں۔"

"اور وہ چھوٹی حانی کیسی ہے؟ اس کا پیر ٹھیک ہوا؟ کیا صورت بنائی ہے بنانے والے نے۔ خیر حسن تو اس خاندان میں وراثتی ہے۔" ان کا انداز ستائشی ہی نہیں' کچھ جتاتا ہوا بھی تھا۔

"حانی بھی ٹھیک ہے اور حریم بھی۔" وہ اس جھٹکے سے کچھ سنبھل کر بولا۔

"تمہیں ایک بات بتاؤں زرجان! ہیرے کی قدر ہمیشہ جوہری ہی جانتا ہے۔ جب بھی کبھی دل اپنی ماں سے بدگمان ہونے لگے تو یہ سمجھ کے درگزر کرنے کی کوشش کرنا کہ تمہاری ماں جوہر شناس نہیں تھی۔" وہ آنکھ میں چمکنے والے پانی کو زرجان کی نظروں سے چھپانے کی غرض سے اٹھ گئی تھیں۔

"لنچ کے لیے نیچے آجانا زرجان! میں کھانا لگواتی

ہوں۔" جاتے ہوئے انہوں نے کہا بھی تو صرف اتنا۔ شاید اس لیے کہ زرجان ان کے لہجے کی کپکپاہٹ سے کچھ جان نہ جائے کہ اس کی ماں جو خود کو آئرن لیڈی سمجھتی تھی۔ آج پسپائی اختیار کر چکی ہے اور اسے کسی اور نے نہیں اس کی اولاد نے اس مقام پر پسپا کر کے رکھ دیا تھا اور یہ اولاد ہی تو تھی، جس کی نادانیاں اور غلطیاں بڑے بڑے متکبروں کو ان کی اوقات یاد دلا دیتی تھیں۔

اور زرجان عباس اور ہنی کے لیے میڈم فلک ناز نے کس کس کی دہلیز کو نہیں چھوا تھا۔ یہ تو ان کا دل ہی جانتا تھا۔

مما کے چلے جانے کے بعد زرجان ـــــ بوجھل اور کثیف سانسوں کو خارج کرتا گلاس ونڈو میں آکھڑا ہوا تھا۔ سورج کی روشنی نے آنکھوں سے ناماتوسیت کی بنا پر چبھن سی آنکھوں میں بھر دی تھی۔ اور وہ آنکھیں چندھیا کر لان میں اتری دوپہر کو دیکھ رہا تھا۔ تب ہی اٹھکھیلیاں کرتی بولتی خاموشی نزاکت سے اس کے قریب چلی آئی۔

"زرجان! او' زرجان۔"

"ہوں۔" وہ چونکا۔

"کیا سوچ رہے ہو؟" خاموشی نے ایک ادا سے پوچھا۔

"کچھ نہیں۔" وہ متوجہ کہاں تھا۔

"ہم سے بھی پردہ؟" خاموشی نے معنی خیزی سے کہا۔

"تم سے چھپ کر کہاں جاؤں گا۔"

"تو پھر بول دو نا۔ جو تمہارے دل میں ہے۔" خاموشی نے نزاکت سے سر جھٹکا۔

"میرے دل میں کیا ہے؟" وہ حیران ہوا۔

"حریم جمال اور کون؟" اب کے حیران ہونے کی باری خاموشی کی تھی۔

"اس کی پاکیزگی پر حرف آئے گا۔ بار بار نہ جتایا کرو' وہ کسی اور کی ہے۔"

"مجھے تو تم بزدل لگتے ہو؟" خاموشی نے نخوت سے کہا۔

"بھلا وہ کیسے؟"

"محبت میں ہار تسلیم کرنے والا بزدل ہی کہلاتا ہے۔" خاموشی اسے اکسا رہی تھی۔

"تو سمجھ لو' میں بزدل ہی ہوں۔" وہ دھیرے دھیرے گلاس ونڈو کی چکنی سطح پر ہاتھ مار رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ہچکولے لیتا گہرا اضطراب خاموشی سے بھی پوشیدہ نہیں رہ سکا تھا۔

"تو تم نے تسلیم کر لیا۔" خاموشی کو گویا یقین نہیں آیا۔

"ہاں' کر بھی لیا اور مان بھی لیا۔"

"مگر کیوں؟" خاموشی بضد ہوئی۔

"تم بزدل اور کم ہمت تو نہ تھے اور نہ ہی تمہارے جذبوں میں کوئی کھوٹ تھا۔"

"میری محبت مجھے بغاوت پر نہیں اکسا سکتی۔"

"کیا حرج تھا اگر تم حریم کو کسی بھی طریقے سے اپنا لیتے۔ زور زبردستی سے' اٹھوا لیتے' اغوا کر لیتے' محبت تو سو راہیں نکال لیتی ہے' یہ کیسی محبت تھی تمہاری زرجان۔" خاموشی نے تاسف سے اپنا ماتھا پیٹا۔

"میں معاشرے کے مروجہ اصولوں سے بغاوت کیوں کرتا۔ مجھے اپنی محبت کی رسوائی منظور نہ تھی۔" اس کے لہجے سے سچ کی مہک پا کر خاموشی نے ناک بھوں چڑھالی۔

"نہ جانے تم کیسی باتیں کرتے ہو' اگر تمہاری جگہ کوئی اور ہوتا تو کبھی نامراد نہ رہتا۔"

"میں اپنے فیصلے پر مطمئن ہوں۔" اس نے گویا خاموشی کی کسی بات پر کان نہیں دھرا تھا۔

"کیسا فیصلہ؟" خاموشی ٹھٹکی۔

"پیچھے ہٹ جانے کا فیصلہ۔"

"میں سچ مچ مطمئن تھا۔"

"اچھا۔" خاموشی نے گویا طنز کیا۔

"اگر اتنے ہی مطمئن ہو تو پھر اپنا دل آباد کیوں نہیں کر لیتے؟ اس کی یادوں سے اپنے دل کے گھر کو خالی کیوں نہیں کرتے؟ تو پھر خود کو آباد کر لو نا زرجان!" خاموشی گویا چبا چبا کر کہہ رہی تھی۔

"اگر میں خود کو آباد کر لوں تو پھر تم کہاں جاؤ گی؟" وہ سادہ سے انداز میں پوچھ رہا تھا۔

"میں۔" خاموشی نے سوچنے کے لیے کچھ وقت لیا۔

"میں تمہارے ہی جیسے کسی اور زرجان کی تنہائی کو بانٹ لوں گی۔ میرا وجود تو تنہائیوں کے ساتھ ہی تشکیل پایا ہے۔ میرا اور تنہائی کا ازل کا ساتھ ہے۔ جہاں تنہائی ہوتی ہے' میں بھی اس کے ہمراہ ہوتی ہوں۔ شور اور ہنگامے ہمیں بھاتے نہیں۔ محفلوں میں ہمارا بھلا کیا کام۔ ہم تو تمہارے جیسوں کے اردگرد رہتے ہیں۔"

"تم میرے اردگرد ہی رہو۔ میری یہ ہی خواہش ہے۔" لان میں اتری دھوپ میں لحہ بہ لحہ شدت آرہی تھی۔ سنہری دھوپ زرجان عباس کی اس خواہش کو سن کر پسینہ پسینہ ہو گئی۔

"اور میری بھی یہ ہی خواہش ہے۔" خاموشی لرز کر بولی۔

"لیکن میری ہمراہی میں کوئی خوش نہیں رہتا۔" خاموشی اداس تھی۔

"مگر زرجان عباس تمہاری ہمراہی میں ہمیشہ خوش رہتا ہے۔"

"اچھا۔" خاموشی نے اداسی سے سر ہلایا۔ اب وہ اداسی کے کنگن چھنکاتی' زنجیریں لہراتی اس کے اردگرد رقص کر رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

بعض لوگ سالوں میں شمار کی جانے والی عمر میں' صدیوں جتنا سفر کر لیتے ہیں۔ اور خود کو کسی قدیم کتب خانے میں رکھی، بہت پرانی کتاب سمجھ کر خود کو بھی اسی کتاب کے پیلے پڑتے میلے اور بوسیدہ اوراق کا ایک حصہ سمجھنے لگتے ہیں۔ حالانکہ کسی بھی صاحب نظر کی نگاہ نے اس کتاب کی تحریر کو چھوا تک نہیں ہوتا۔

سالوں کی زنجیروں میں قید صدیوں میں جینا زندگی کی ابتری کی واضح نشانی ہے۔ رواں زندگی ... سلیقہ اور قرینہ بھول گئی تھی؟ کتاب زندگی کی ... کب الجھاؤ آنا شروع ہوئے تھے؟ جیتی جاگتی زندگی میں سکوت کیوں اتر آیا تھا؟ بھاگتے دوڑتے لمحوں نے کیونکر منٹوں اور گھنٹوں کا حساب کرنا شروع کر دیا تھا۔ وقت نے اپنی چال بدل کر کچھوے کی رفتار پکڑلی تھی۔ گھڑی کیوں رک رک کر اور ٹھہر ٹھہر کر چلتی تھی۔

وقت نے نخوت سے اپنے انداز بدلے تھے تو آتے جاتے موسم کیوں نا نظر بدلتے۔ بہار کب کی روانہ ہو چکی تھی۔ خزاں نے ڈیرے لگا رکھے تھے۔ بارشیں روٹھ کر نخرے کے ساتھ اور بڑی ہی منتوں کے بعد بوند بوند زمین کی طرف ٹپکاتی تھیں۔ بدلیاں بھی ادائیں دکھانے سے باز نہ آتیں۔ حتیٰ کہ چاند تک نہ جانے کیوں روٹھا روٹھا اور خاموش تھا۔ اور وہ شکوہ کرتی بھی تو کس سے؟ بہاروں سے' خزاؤں سے' بارشوں اور بادلوں سے یا پھر آسمان کی گود میں سمائے زرد' زرد سے چاند سے۔

حالانکہ کائنات کا نظام تو ہمیشہ کی طرح بڑی خوش اسلوبی سے چل رہا تھا اور رب رحیم جب تک چاہتا' اس نظام نے ایک قرینے سے ہی چلنا تھا۔ بدلاؤ تو کہیں نہیں آیا تھا۔ بس اس کے دل پر ہی مختلف کیفیات اثر انداز ہو رہی تھیں۔

"قیفا۔" وہ نہ جانے کب سے اسے آوازیں دے رہی تھیں۔

"جی!" سلائی مشین پر جھکے جھکے گویا وہ میلوں کا سفر طے کرنے چلی تھی۔ مگر حقیقت کی دنیا زیادہ تلخ اور تھکن زدہ کر دینے کا ہنر رکھتی تھی۔ سو اسے حواسوں میں لوٹنا ہی پڑا۔

"آپ نے کچھ کہا ہے امی۔"

"گھڑی گھڑی کہاں کھو جاتی ہو؟" وہ سبزی کاٹتے ہوئے گویا اس کے تمام تاثرات بھی ازبر کر رہی تھیں۔

"نہیں تو۔" قیفا بری طرح سے گڑبڑا گئی۔

"کوئی پریشانی ہے؟ کوئی الجھن ہے تو شیئر کر لو

بیٹا۔" فیفا نہ بھی بتاتی، اتنا تو نفیسہ بیگم جانتی تھیں کہ فیفا کسی پریشانی اور الجھن کا شکار ہے۔ اس پریشانی کا آغاز بھلا ہوا کب تھا؟ اس پہلو پر تو انہوں نے سوچنے کی کبھی زحمت گوارا نہیں کی تھی۔ پچھلے تین، چار ماہ سے فیفا کے انداز بدلے بدلے لگ رہے تھے۔ وہ حد سے زیادہ بے زار اور چڑچڑی ہو رہی تھی۔ نہ جانے کس سوچ کے بھنور میں الجھ کر رہ جاتی تھی کہ ارد گرد کی اسے خبر بھی نہ رہتی۔ آخر مسئلہ کیا تھا؟ پریشانی کیا تھی؟ یہ تفکرات کا جال؟ اداسی کی بکل میں لپٹا اس کا وجود۔ کیا وہ ڈیڑھ، دو ماہ کی بیاہتا دکھتی تھی؟ غمگین، آزردہ، رنجیدہ۔ لمحہ بھر کے لیے تو ان کا دل کانپ کانپ اٹھا تھا۔

"میں نے فیفا کی شادی کر کے کچھ غلط تو نہیں کر دیا؟ کچھ ایسا جو فیفا کے حق میں بہتر نہ ہو؟" اس سوچ کی لہر نے انہیں پور پور بھگو ڈالا تھا۔

"کیا وجہ ہو سکتی ہے؟" پچھلے ڈیڑھ، دو مہینوں کی صبحوں اور شاموں کی ایک فلم گویا ان کی آنکھوں کے سامنے چلنے لگی تھی۔ اور ان کے دل کا ایک وسوسہ پھن پھیلائے ان کے سامنے آگیا۔

زیادہ پرانی بات تو نہیں تھی جو انہیں سوچنے میں دقت ہوتی۔ صرف چار ماہ پہلے تو انہوں نے اپنے دل کی رضامندی کے ساتھ فیفا کا نکاح کیا تھا۔ اور نکاح سے پہلے فیفا کی رضامندی بھی لی تھی اور اس نے بھی فرماں بردار بیٹی کی طرح ماں کی پسند پر سر جھکا دیا تھا۔ باقی کے معاملات بہت تیزی سے سرانجام پائے تھے۔ کچھ وقت بھی محدود تھا۔ انہوں نے زیادہ جانچ پڑتال میں ٹائم ضائع کرنا ضروری نہیں سمجھا تھا۔ مگر ٹھٹک تو وہ اسی وقت گئی تھیں جب دن وقت کے تھال میں یکے بعد دیگرے گرتے جا رہے تھے، مگر سہیل کی آمد کا کوئی اتا پتا نہیں تھا۔ ملا کی دوڑ مسجد کی طرف ہی ہوتی ہے اور ان کی دوڑیں رفیقہ کے دفتر کی طرف لگنے لگی تھیں۔ رفیقہ کے ہر طرح کے اطمینان دلانے کے باوجود ان کا دل تھا کہ سوکھے پتے کی طرح کانپتا ہی جا رہا تھا۔ اور اس دل نے معمول کی رفتار تب پکڑی تھی جب متوقع داماد صاحب کی آمد کی خبر ان تک پہنچی۔

اور دل تو سہیل کو دیکھ کر ہی نہال ہو گیا تھا۔ صوم و صلوٰۃ کا پابند، چہرے پر داڑھی۔ ماتھے پر نماز کا نشان۔ دھیما دھیما بولنے والا۔ ایک دفعہ بھی نظر اٹھا کر اس نے دیکھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ دو، تین دن میں صرف تین مرتبہ ہی ملا تھا۔ جب بھی ملاقات ہوئی اس نے نظر جھکا کر بات کی تھی۔ وہ تو اندر تک مطمئن اور سرشار ہو گئی تھیں۔ جس طرح کی خوبیاں وہ اپنے داماد میں دیکھنا چاہتی تھیں۔ سہیل میں وہ سب خوبیاں بدرجہ اتم موجود تھیں۔ ان کا دل خوشیوں سے اگرچہ باگ ہو چکا تھا، مگر کچھ نہ کچھ تو ضرور ایسا تھا جو کبھی کبھار کھٹک کر رہ جاتا۔

جیسا کہ سہیل کی ولیمہ والے روز واپسی کے عمل نے صرف انہیں ہی نہیں، گھر میں دیگر مہمانوں تک کو باتیں بنانے کا موقع فراہم کر دیا۔

اگرچہ سہیل نے بہت خوش اسلوبی اور قرینے کے ساتھ اپنے ایمرجنسی میں چلے جانے کی وضاحت کر دی تھی۔ مگر لوگوں کی زبانیں بھلا کون پکڑتا؟

کبھی ان کے دل نے ماہیر کو داماد بنانے کی طلب بھی کی تھی۔ اس طلب اور خواہش میں شدت بھی بہت تھی، مگر جب اس کا نصیب کسی اور کے ساتھ بنا دیا گیا تو اس دل نے لمحہ بھر کے لیے بھی کبھی ذرہ بھر حسد محسوس نہیں کیا تھا۔ ان کے دل نے اور زبان نے ہمیشہ لاڈلے بھتیجے کے لیے دعا کی تھی۔ اس کی دائمی خوشیوں کے برقرار رہنے کی دعا۔

پہلے پہل فیفا کی ماہیر کے لیے پسندیدگی بھی ان کی نظروں کے سامنے تھی۔ تاہم یہ پسندیدگی کی مدت بہت مختصر رہی تھی۔ ساتھ رہنے، ایک ساتھ پڑھنے کے دوران انسیت تو ہو ہی جاتی ہے اور شاید محبت بھی۔ تاہم اتنا تو ان کا دل ضرور جانتا تھا کہ فیفا محبت کے اس الہامی جذبے سے قدرے محفوظ ہی رہی تھی۔

ماہیر اور فیفا کے دوستانہ تعلقات میں دراڑ زوباریہ کی وجہ سے پڑی تھی۔ جسے ماہیر اور فیفا کا ہنسنا بولنا بھی

گوارا نہیں تھا۔ یہ ہی وجہ تھی کہ فیفا خود بخود ماہیر سے دور ہٹتی چلی گئی۔

بھلا ایسی دوستی کا کیا فائدہ تھا جو زمانے کی نظر میں نامعتبر ٹھہرا دیتی۔ اور زوباریہ نے اس دوستی جیسے شفاف تعلق کو بھی داغ دار کرنے سے گریز نہیں کیا تھا۔ اور شاید فیفا اور زوباریہ کے درمیان اس آخری ملاقات کا اختتام بھی ماہیر کے نام پر ہی ہوا تھا۔

یونیورسٹی سے فراغت کے بعد عملی زندگی میں قدم رکھ کے بھی فیفا کے مزاج میں کوئی بدلاؤ نہیں پایا گیا تھا۔ ان کے خیال میں تھا کہ غیر دانستہ ہی سہی کیا خبر ماہیر کی شادی فیفا کے لیے جذباتی قسم کا دھچکا ثابت ہو، مگر ایسا کچھ بھی اس کے رویے سے ظاہر نہیں تھا۔

وہ ایک روٹین کے مطابق اپنے معمولات پر گہری نظر رکھے ہوئے تھی۔ کچھ بھی تو انوکھا یا حیران کن نہیں تھا۔ اس کی طبیعت میں پہلے بھی بہت چونچالی نہیں تھی۔ مگر اب تو وہ پہلے سے بھی زیادہ خاموش طبع اور سنجیدہ ہو رہی تھی۔ خاموش اور اداس۔ الجھی الجھی، فکرمند اور ان الجھنوں کا کوئی سرا تو تھا جو فیفا کی ہنگامی شادی سے جا ملتا تھا۔ شادی کے بعد فیفا کے بجھے بجھے انداز نے ٹھٹکا تو انہیں دیا ہی تھا، مگر وہ فیفا کی خاموشی کو سہیل کی واپسی کے ساتھ تعبیر کر کے مطمئن ہو چکی تھیں۔ لیکن ایسا ہرگز نہیں تھا۔ اتنا تو وہ جان ہی چکی تھیں۔ پھر کیا بات ہو سکتی تھی؟ یہ بات جاننا ناگزیر ہو گیا تھا۔ اور فیفا کی بے زاریت انہیں کچھ اور سوچنے پر بھی مجبور کر رہی تھی اور انہوں نے اپنی سوچ کو لفظوں کا پیراہن پہنا ہی دیا۔

"فیفا!" انہوں نے پھر سے سلائی مشین پر جھکی فیفا کو پکارا۔

"جی امی!" وہ کپڑے کی طرف متوجہ تھی۔

"فیفا! تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے۔" انہوں نے کچھ کھوجتی نظروں سے فیفا کو دیکھا۔

"ہاں، شاید موسم تبدیل ہو رہا ہے، اس وجہ سے بے زاریت طاری رہتی ہے۔" مشین کی گرر گرر کی وجہ سے ان کی سماعتوں تک فیفا کا جواب نہیں پہنچ پایا تھا۔

"کیا خیال ہے تمہارا، اگر ڈاکٹر کے ہاں ایک چکر لگا آئیں۔" وہ دبے دبے جوش کے عالم میں کہہ رہی تھیں۔

"ڈاکٹر مگر کیوں؟" فیفا نے حیرانی سے پوچھا۔

"کیا پتا کچھ ہو۔" ان کی آنکھیں ہی نہیں چہرے کا ہر نقش مسکرا رہا تھا۔ فیفا سر جھکائے مشین چلا رہی تھی۔ نہ اس نے ان کا لہجہ سمجھا تھا، نہ چہرہ پڑھا تھا۔ ورنہ ماں کی خوش فہمی پر ایک مسکراہٹ تو ضرور اچھال دیتی۔

"مجھے کیا ہونا ہے امی! بس خلا سا محسوس ہو رہا ہے۔ اسی وجہ سے سر بھی بھاری ہے۔ ابھی چائے بنائی ہوں۔ آپ بھی پی لیں۔" اب وہ مشین سے متعلقہ سامان سمیٹ رہی تھی۔ قینچی، دھاگے، کپڑے کے چھوٹے چھوٹے پیس۔

"تم چائے پی لو، پھر چلتے ہیں۔" وہ اپنا چائے کا کپ اٹھاتے ہوئے گویا کسی فیصلے پر پہنچ گئیں۔

"کہاں؟" فیفا نے از خود حیرت سے ماں کی طرف دیکھا۔

"ڈاکٹر کی طرف۔"

"میں نہیں جا رہی، کسی ڈاکٹر واکٹر کے پاس۔۔۔ ابھی چائے پی کر کمر سیدھی کروں گی۔" اس نے اپنا پروگرام ماں کے گوش گزار کر دیا تھا۔

"مگر۔۔۔ میری بات سمجھو نا۔" وہ زچ ہو اٹھیں۔

"سمجھ لوں گی مگر ابھی تو میں نے سونا ہے۔" بڑے بڑے سپ لے کر چائے ختم کرنے کے بعد وہ فوراً ہی اٹھ بھی گئی تھی۔ نفیسہ بیگم نے بے بسی سے فیفا کی پشت کو دیکھ کے چائے کا کپ اٹھا لیا۔

"چلو پھر سہی۔۔۔ مگر ڈاکٹر کو چیک کروانا ناگزیر ہے۔ کیا پتا خوش خبری ہو۔ خیر علامات تو یہ ہی لگ رہی ہیں۔" وہ مطمئن سی زیر لب بڑبڑا رہی تھیں۔

"اب تو سہیل بھاگتا ہوا پاکستان آئے گا۔ ماشاءاللہ خبر بھی تو بہت بڑی ہے۔" ان کی آنکھیں گویا کسی نومولود کو شرارت کرتا دیکھ کر مسکرانے لگی تھیں۔

☼ ☼ ☼

"میں اس کلموہی کو اپنے گھر میں قدم نہیں رکھنے دوں گی۔" ثریا خالہ کی جلالی آواز حریم کو کچن میں سنائی دے رہی تھی۔

"تو کیا رباب گھر آنا چاہتی ہے؟" راحت بیگم نے تکیے کے غلاف اتارتے ہوئے حیرت سے کہا۔

آج حریم کا ارادہ تکیے اور لحافوں کو دھوپ لگوانے کا تھا۔ موسم بدل رہا تھا، سو اس نے سوچا تھا کہ سرما کے بستر محفوظ کرلے۔ آج اس نے مشین بھی لگا رکھی تھی۔ مگر بھلا ہو اس لائٹ کا جس نے آنکھ مچولی کا کھیل صبح سے کھیلنا شروع کر رکھا تھا۔ راحت بیگم اس کی مصروفیت دیکھتے ہوئے اپنی بیماری اور بیڈ ریسٹ بھلائے لحافوں کو ادھیڑنے کے بعد تکیوں اور کشنز وغیرہ کے کورز اتارنے لگی تھیں۔ ان کی اس امدادی کارروائی نے حریم کا کافی بوجھ ہلکا کردیا تھا۔ اب وہ لائٹ آنے کے انتظار کے ساتھ ساتھ ثریا خالہ اور امی کے لیے چائے بنا رہی تھی۔

"تو اور کیا؟" ثریا خالہ جل بھن کر بولیں۔

"مگر میں بھی اس کا یہ خواب کبھی پورا نہیں ہونے دوں گی۔" ثریا خالہ کے ارادے تو خاصے خطرناک تھے۔

"اور بیگ صاحب کیا کہتے ہیں؟" راحت بیگم کی دلچسپی بھی قابل دید تھی۔ وہ کشن کا کور اتارنا بھول کر ثریا خالہ کی طرف متوجہ ہوچکی تھیں۔ حریم نے کچن کی کھڑکی میں سے باہر جھانکا تو اسے راحت بیگم کے چہرے پر پھیلا تجسس دیکھ کر ہنسی آگئی۔

"ان کی جرات ہے کچھ کر کے تو دکھائیں۔ میرے سامنے اونچی آواز میں بول نہیں سکتے۔ بڑے آئے بیٹے کی طرف داری کرنے والے۔" ثریا خالہ نے سینہ ٹھوک کر کہا۔

"میں نے بھی صاف وہاں کہہ دیا ہے۔"

"کیا؟" راحت بیگم کا تجسس چھپائے نہیں چھپ رہا تھا۔

"اگر وہ بپاڑن اس گھر میں آئی تو میں گھر چھوڑ کر چلی جاؤں گی۔"

"تم نے کہہ دیا۔" راحت بیگم کو گویا یقین نہیں آیا۔

"تو اور کیا۔" وہ فخریہ انداز میں بتا رہی تھیں۔

"میں بھلا کسی سے ڈرتی ہوں۔"

"تمہاری ضد کچھ بے جا نہیں۔" وہ بھی تو راحت بیگم تھیں۔ دل میں آئی بات محال ہے، جو دل کے اندر رکھ لیتیں۔ اگر مقابل کا موڈ بگڑتا ہے تو ان کی بلا سے۔ وہ صاف گو تھیں، بلکہ منہ پھٹ کہنا مناسب ہوگا۔ اور ثریا خالہ سے ان کے تعلقات بننے بگڑنے کی اصل وجہ بھی یہ ہی تھی کہ وہ دنیاداری کے ناتے بھی خوشامد کی قائل نہیں تھیں۔

"کیا مطلب؟" حریم کی توقع کے عین مطابق ثریا خالہ کو سخت برا لگا۔

"میری کون سی ضد بے جا ہے؟"

"یہ ہی کہ بہو کے مقام اور حیثیت کو تسلیم نہ کرنا۔" اپنی بات کہہ چکنے کے بعد اب وہ مطمئن ہوگئی تھیں۔ تب ہی تو پھر سے کشن کور اتارنے کے لیے تخت سے اٹھا لیا تھا۔

"ارے، کیسا مقام؟ کیسی حیثیت؟" ثریا خالہ چمک کر بولیں۔

"تمہارا بیٹا کسی؛ ـــــ چمارن سے شادی کرلیتا تو پھر میں دیکھتی، کیسے مقام اور حیثیت کے متعلق لیکچر دیے جاتے ہیں۔"

"اب جو ہونا تھا وہ تو ہوگیا۔ خوامخواہ لکیر پیٹنے سے فائدہ۔" انہوں نے بھی گویا کان پر سے مکھی اڑائی۔

"کسی چمارن کو تو رہنے ہی دو، اگر تمہارا ماہیر اس امیرزادی بھلا کیا نام تھا اس کا۔" وہ کچھ دیر کو شاید نام سوچنے کی غرض سے رک گئی تھیں اور ادھر حریم کا دل بھی یکبارگی رک رک کر چلنے لگا تھا۔ شوکیس میں سے کپ نکالتے اس کے ہاتھ کانپ کانپ گئے۔

"نہ جانے کیا بھلا سا نام تھا اس لڑکی کا۔ ہاں، یاد آیا زوباریہ۔" وہ تصدیق کی غرض سے راحت بیگم کا چہرہ

دیکھنے لگیں جو زوباریہ کے نام پر محض بل کھا کر رہ گئیں۔

"کرلیتا نا ماہیر، زوباریہ سے بیاہ، تو پھر میں دیکھتی تم کیسے چین سے بیٹھتی ہو۔"

"میرا ماہیر ایسا نہیں۔" ان سے کچھ بات نہیں بن پائی تھی۔ تب ہی کپڑوں کے میلے ڈھیر کو اٹھا کر بالکونی میں رکھنے کے لیے اٹھ کر چلی گئیں۔

"حریم! او حریم۔" ثریا خالہ سے دو گھڑی خاموش بیٹھنا بھی محال تھا۔ ایسی کڑک دار آواز میں پکارتی تھیں کہ دل بے چارا سہم سہم جاتا۔

"جی خالہ!" اسے بولنا ہی پڑا تھا۔

"چائے بنا رہی ہو کہ پائے۔۔۔ اگر تو پائے بنا رہی ہو تو پھر میں رات کا کھانا کھا کر ہی نیچے جاؤں گی۔" انہوں نے شاید طنز کیا تھا۔ اور طنزیہ گفتگو میں ان دونوں سہیلیوں کو پورا کمال حاصل تھا۔ وہ تحمل سے کپوں میں چائے چھان کر ڈالتی رہی۔ وہ ٹرے اٹھائے باہر آگئی۔

"راحت زوباریہ کے ذکر سے بڑا چڑتی ہے۔" انہوں نے گویا حریم کی معلومات میں اضافہ کیا۔

"اچھا۔" وہ ہولے سے مسکرادی تھی۔ اب بھلا وہ کہتی بھی کیا۔ اسی پل لائٹ آگئی تھی۔ حریم کو اٹھنا ہی پڑا۔

"امی! آج دوپہر کو کیا پکانا ہے؟" جاتے جاتے اس نے پلٹ کر راحت بیگم سے پوچھا۔

"پائے فریزر میں ہوں گے۔ وہ ہی بنالو۔ ثریا کے ٹیسٹ کو ذہن میں رکھ کر بنانا۔"

"جی اچھا۔" اس نے سرہلادیا۔

"ماشاءاللہ۔" ثریا خالہ اس فرماں برداری پر نہال ہوگئیں۔

"کاش میری بہو بھی ایسی ہوتی۔"

"بہو کو ساتھ رکھو گی تو اس کے گر کھلیں گے۔ کیا پتا وہ حریم جیسی ہو یا اس سے کچھ کم۔" وہ اپنی چائے کی پیالی اٹھا کر لبوں سے لگا چکی تھیں۔

"دفع دور۔" ثریا خالہ کے منہ میں گویا کڑوے بادام آگئے۔

"میں تو ایسی بے حیا لڑکی کو گھر میں گھسنے بھی نہ دوں۔ جس کو ذات برادری اور خاندان تک کا خیال نہ آیا۔ چھڑے چھانٹ سے نکاح پڑھوا کر بیٹھ گئی۔ یہ بھی نہ سوچا رشتوں کے بارے میں اس کا عاشق صادق ایسا بھی قلاش نہیں۔"

"غلطی تو بہرحال بچے نے کی ہی ہے۔ اس سچائی سے انکار نہیں۔ مگر اب خود کو کچھ نرم کر ہی لو۔" لگے ہاتھوں راحت بیگم نے مشورے سے انہیں نوازنا بھی ضروری سمجھا۔

"چھوڑو، اس قصے کو۔۔۔ یہ بتاؤ نفیسہ کی بیٹی کب عمان جا رہی ہے؟" ثریا خالہ نے بے زار ہو کر موضوع ہی بدل دیا۔

"خیر سے ویزا تو اس کا آگیا ہے۔ اب دیکھو کب تک جانے کا پروگرام بنتا ہے۔" فیفا کے لیے راحت بیگم کے دل میں خاصی گنجائش تھی۔

"تو کیا نفیسہ کا ویزا نہیں آیا؟" ثریا خالہ کے پاس بھی ہر رپورٹ موجود ہوتی تھی۔

"اس کے کاغذات میں کچھ ہیر پھیر ہوگیا ہے۔" وہ پلیٹ میں بچا آخری بسکٹ اٹھا کر ٹونگنے لگیں۔

"نفیسہ تو جانے کے لیے تیار نہیں تھی۔ بچی نے زبردستی منایا ہوگا۔" ان کے پاس سچ مچ معلومات کا خزانہ تھا۔ ویسے بھی اس عمر میں جب مصروفیت بھی کچھ خاص نہیں تھی۔ ادھر ادھر کی خبریں ہی دل بہلانے کا سامان کرتی تھیں۔ اب تو انہیں اپنی عزیز از جان سہیلی کا ساتھ بھی میسر آگیا تھا۔ سو ثریا خاتون کا وقت بہت اچھا گزرنے لگا تھا۔ کبھی وہ اوپر آجاتی تھیں، کبھی راحت بیگم نیچے چلی جاتیں۔

"ہاں، فیفا بضد ہے کہ ماں بھی ہمراہ جائے۔"

"ایک لحاظ سے ٹھیک ہی سوچا ہے اس نے۔ کہاں ماں، بیٹی جدائی کے سال بتائیں گی۔ نفیسہ کی کون سا بہت سی اولادیں ہیں۔ ایک بیٹی تو ہے، اگر وہ بھی پردیس چلی گئی تو نفیسہ کا حشر بھی میرے جیسا ہوگا۔" انہوں نے اعتراض کا کوئی بھی نقطہ اٹھانے کی بجائے تائیدی انداز میں سرہلایا۔

"تم بھی اپنی تنہائیاں بانٹ سکتی ہو؟" راحت بیگم پھر سے انہیں موضوع کی طرف لانا چاہتی تھیں۔

"بھلا کیسے؟" وہ بغیر سوچے سمجھے بولیں۔

"بہو اور پوتی کو لے آؤ۔ بچوں کی اپنی الگ ہی رونق ہوتی ہے۔ سچ کہہ رہی ہوں' آنگن مہک اٹھے گا تمہارا۔" راحت بیگم نے حسرت زدہ لہجے میں کہا۔ حریم جانتی تھی کہ انہیں بچوں سے خاص قسم کی انسیت ہے۔ اور حریم کو پتا تھا کہ اس پل راحت بیگم کو کچھ یاد آنے لگا ہو گا۔

"تمہیں کیوں میری بہو سے ہمدردی کا بخار چڑھ رہا ہے۔" ثریا خالہ نے تیکھے انداز میں پوچھا۔

"ہمدردی بہو سے نہیں' تمہاری پوتی سے ہے۔ بھلا اس معصوم بچی کا کیا قصور ہے؟ وہ کیوں محروم ہے' حقیقی رشتوں سے۔ ذرا دل کو وسیع کر کے سوچنا' میری بات تمہاری عقل میں سما ہی جائے گی۔"

"میں نہیں اس فضول موضوع پر بات کرنے والی۔" انہوں نے رکھائی سے کہا۔ حالانکہ بات کا آغاز بھی ثریا خالہ نے خود ہی کیا تھا۔ اور بہو اور پوتی کے حق میں کسی کو بھی بات کرتا دیکھ کر وہ اسی طرح رو نکھی ہو جاتی تھیں۔

"خیر' چھوڑو... یہ بتاؤ' رفیقہ کی عیادت کر آئی ہو؟" راحت بیگم کو بات پلٹنے میں بھی کمال حاصل تھا۔

"رفیقہ؟ بھلا کون؟" ثریا خالہ چونکیں۔

"وہ ہی میرج بیورو والی' بے چاری ایکسیڈنٹ میں بال بال بچی ہے۔"

"نہیں تو... مجھے تو پتا نہیں چلا' ورنہ احوال پرسی کر ہی آتی۔ کسی کی عیادت کرنے میں بڑا ہی ثواب ہے۔ کسی دن چلوں گی تمہارے ساتھ۔" ثریا خالہ نے جھٹ سے پروگرام ترتیب دے ڈالا۔

"کسی دن کیوں؟ آج ہی چلتے ہیں۔" راحت بیگم اپنے کپڑوں کی نادیدہ سلوٹیں ہاتھوں سے دور کر رہی تھیں۔

"ہاں تو ٹھیک ہے نا۔" انہوں نے کچھ سوچ کر تائیدی انداز میں سر ہلایا۔

اس پل باہر کی ہوا خوری کے لیے وہ بھی اپنی بیماری کو قطعاً" نظر انداز کر رہی تھیں۔ پیر درد اور کمر درد کا غم بھولا ہوا تھا۔ اور حریم کے لیے اس سے بڑا اچھا اور نیک شگون بھلا کیا ہو سکتا تھا؟

☼ ☼ ☼

راحت بیگم اور ثریا خالہ کے چلے جانے کے بعد حریم کے ہاتھوں میں مزید تیزی آگئی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ یہ تمام تر پھیلاوا اگر نہ سمیٹا اور وقت پر کھانا بھی نہ بن سکا تو امی حضور کو اخلاق کا چولا اتارتے دو پل کی دیر بھی نہیں لگنی تھی۔

سو وہ لپک جھپک کپڑے دھو رہی تھی۔ اگلے دو گھنٹے بجلی نے بھی ساتھ دے کر حریم کی ذات پر احسان عظیم کر ہی دیا تھا۔ گدے' تکیے اور کشن وغیرہ صحن میں رکھے تھے۔ وہ الگنی پر کپڑے پھیلا رہی تھی۔ اس کام سے فراغت کے بعد اس نے کچن کا رخ کیا۔ مگر اسی پل فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ ریسیور ہاتھ میں لیا تو دوسری طرف ماہیر کی آواز سنائی دی۔

"لگتا ہے میرے فون کا ہی انتظار ہو رہا تھا۔" چونکہ دوسری بیل پر ہی ریسیور اٹھا لیا گیا تھا' سو ماہیر نے بھی مذاقاً" کہہ ہی دیا۔

"اتنی فارغ بیٹھی ہوں نا' کوئی کام جو نہیں مجھے' فون کے سرہانے ہی تو بیٹھنا تھا میں نے۔" وہ خوامخواہ ہی جلی بیٹھی تھی۔ کپڑے دھونے اور صفائی ستھرائی کے چکر میں اس کی کمر بری طرح سے اکڑ کر رہ گئی تھی۔ اوپر سے سر بھی دکھنے لگا تھا۔ ماہیر کے عام سے لہجے میں کہنے والی معمولی سی بات نے اسے بلاوجہ تپا دیا۔

"واہ جی واہ... کیا انگارے چبا لیے ہیں؟" ماہیر سچ مچ حیران ہوا۔ حریم اور اتنی بے زاریت کا مظاہرہ کرے۔ اس کا حیران ہونا بجا تھا۔ ایسی کنڈیشن میں اگر دو گنا کام کرنا پڑے تو مزاج میں برہمی اترنا کچھ غیر معمولی تو نہیں۔

"یہ ہی سمجھ لیجیے۔"

"حریم!" ماہیر نے حیرت سے ریسیور کو گھورا۔

"صبح تو اچھی بھلی چھوڑ کر آیا تھا۔ اب کیا ہوا؟ یہ مزاج کا تلخ پن، یہ لہجے کی بے زاری۔" وہ تو گویا نظم ہی پڑھنے لگا۔

"آپ نے کیوں فون کیا ہے؟" اسے کچن میں بھاگنے کی بھی جلدی تھی۔

"تمہاری بے زار، بے زار آواز سننے کے لیے۔" یقیناً" ماہیر کا موڈ بھی بگڑ گیا تھا۔

"تو سن لی ہے۔" اس کی نظریں گھڑی کی آگے بڑھتی سوئیوں پر الجھی تھیں، اور ابھی تک پائے بھی فریزر سے نہیں نکالے تھے۔ وہ اپنے بھلکڑپن کو کوسنے لگی۔

"ابھی کچھ اور سننا باقی ہے۔" ماہیر نے شاید طنز کیا تھا اور وہ اس کا طنز ہرگز سمجھ نہیں پائی۔

"آفس میں بیٹھ کر باتیں کر لینا آسان ہے۔"

"اچھا۔" ماہیر نے پھر سے طنز کیا۔

"تو کیوں نا جگہ بدل لیتے ہیں اور جاب بھی۔"

"کیا مطلب؟" وہ بے صبرے پن سے بولی۔

"میں تمہاری جاب سنبھال لیتا ہوں اور تم میری ڈیوٹی پر آجانا۔" ماہیر نے جان بوجھ کر اسے چڑانے کے لیے کہا۔

"آپ کو کچھ کام ہے ماہیر!" وہ تحمل سے پوچھ رہی تھی۔

"تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے۔" ماہیر کچھ فکر مند ہو گیا۔

"کپڑوں کے ڈھیر دھونے اور صفائی ستھرائی کرنے کے بعد اب کھانا بنانے کھڑی ہوں۔ طبیعت تو میری فریش ہی ہوگی۔" وہ جتا تو ہرگز نہیں رہی تھی، مگر لہجے میں خود بخود روکھا پن آگیا۔

"او۔۔۔" ماہیر گویا سمجھ گیا۔ حالانکہ وہ کام سے گھبرانے والی تو نہیں تھی، مگر خرابی طبیعت کے باعث مزاج کا چڑچڑا پن کام کے بوجھ کی وجہ سے بڑھ رہا تھا۔

"تم رات کا کھانا مت بنانا۔ میں چکن کی کوئی ڈش لیتا آؤں گا۔ اور اب تم کچھ دیر آرام کر لو۔ طبیعت بہتر ہوئی تو کھانا بنانا۔ امی تو ویسے بھی پرہیزی کھانا کھا رہی ہیں۔ موتی کو کچھ ہلکا پھلکا دے دو۔" وہ جس فکر مندی کے عالم میں کہہ رہا تھا۔ حریم کو اپنے لہجے کی تلخی پر پشیمانی ہونے لگی۔

"میں کر لوں گی، آپ فکر مند نہ ہوں۔"

"اچھا۔۔۔" وہ کچھ سوچتا ہوا بولا۔

"تم یوں کرو، اسٹڈی ٹیبل کے دراز میں سے گرین ربن والی فائل نکال کر باہر رکھو۔ ابھی میں ایک آدمی کو بھیج رہا ہوں۔ فائل اسے دے دینا۔ اور تم کچھ جوس وغیرہ پی لو۔" وہ مزید اسے ہدایات دے کر فون رکھ چکا تھا۔ حریم نے سب سے پہلے فائل نکال کر میز پر رکھ لی تھی، پھر کچن کی طرف بھاگی بھاگی چلی آئی۔

بیس منٹ بعد گیٹ پر بیل ہوئی تھی۔ ظاہر ہے گھر میں تو کوئی بھی نہیں تھا۔ گیٹ حریم نے کھولنا تھا۔ اور وہ سوچ رہی تھی کہ ماہیر نے اتنی جلدی آدمی بھیج بھی دیا ہے۔ وہ فائل اٹھا کر سیڑھیاں اترتی نیچے آگئی۔

گیٹ تک پہنچ کر اس نے احتیاط" پوچھ لینا مناسب سمجھا تھا۔

"کون؟"

"اللہ کا بندہ۔" جواب توقع کے خلاف تھا۔ حریم کچھ حیران ہوئی۔

"آپ کو ماہیر صاحب نے بھیجا ہے۔" وہ فائل پر نظریں جمائے جمائے بولی۔

"جی نہیں۔" گویا چبا چبا کر کہا گیا تھا۔

"دروازہ کھولیے محترمہ۔؟"

"آپ کون ہیں؟" حریم کا دل یکبارگی خوف کے عالم میں دھڑک اٹھا۔

"جن، بھوت ہوں۔ چڑیل کا نذکر ہوں۔" وہ تو پہلے ہی سرتاپا جلا بیٹھا تھا۔ اس انوسٹی گیشن پر اور بھی جل بھن گیا۔

"کیا مطلب؟ کون ہو تم؟" حریم کو غصہ آگیا۔

"اس گھر کا مالک۔" شاید ناک چڑھا کر کہا گیا تھا۔

"دروازہ کھولیے ورنہ میں دیوار بھی پھلانگ سکتا ہوں۔"

"مالک۔" حریم نے چند پل کے لیے حیرت سے سوچا تھا۔ اور پھر گیٹ کا لاک کھول کر سامنے سے ہٹ گئی۔

سامنے ایک خوش شکل، خوش لباس نوجوان کھڑا تھا۔ ماتھے کی تیوریاں چڑھائے۔ آنکھوں میں ناگواری لیے۔ حریم کو سمجھنے میں چند پل لگے تھے۔

"تم بیگ انکل کے بیٹے شاہنواز ہو۔"

"نہیں، شاہنواز کا بھوت ہوں۔" وہ گویا چڑ کر رہ گیا۔

"مائی گاڈ! تو تم گھر آگئے ہو۔" حریم نے بڑی بے ساختگی کے عالم میں ثریا خالہ کی دھمکیوں کے زیر اثر کہہ دیا تھا مگر مقابل کو خاصا ناگوار گزرا۔

"جی میں گھر آچکا ہوں۔ کیونکہ یہ میرا گھر ہے۔" وہ بیگ کندھے سے لٹکائے آگے بڑھ گیا۔ حریم جو کندھے اچکاتے ہوئے گیٹ بند کرنے کے بعد واپس پلٹی تو اسے دوسری منزل کا داخلی دروازہ کھولتے دیکھ کر بری طرح سے بوکھلاہٹ کا شکار ہو گئی۔

"یہ تو اوپر جا رہا ہے۔ او نو۔" وہ بھی تیز تیز قدموں سے چلتی ہوئی بیرونی سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئی مگر اس کی "پھرتی" کے باوجود وہ دروازے کے اندر غروب ہو چکا تھا۔ ظاہر ہے، وہ اس بات سے قطعاً" ناواقف تھا کہ دوسری منزل گھر والوں نے کرائے پر دے رکھی ہے۔ جتنی تیزی سے وہ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آئی تھی سو سانسوں کو رواں کرنے کے لیے اسے کچھ پل کے لیے داخلی دروازے کے باہر کھڑا ہونا پڑا۔

جوں ہی وہ چھوٹے سے لاؤنج میں داخل ہوئی، وہ سامنے ہی بیگ فرش پر رکھے، خود صوفے پر حیران حیران سا بیٹھا دکھائی دیا۔

"خاتون! میں کسی غلط جگہ پر تو نہیں آگیا۔؟" اسے اندر داخل ہوتا دیکھ کر وہ فوراً" ہی اٹھ کر بیٹھ گیا اور اس کی حیران حیران نظریں ارد گرد کا جائزہ لینے میں مصروف عمل تھیں۔

"محترم! آپ واقعی ہی غلط جگہ پر دھرنا دیے بیٹھے ہیں۔"

"جی۔" شاہنواز نے جان بوجھ کر آنکھیں پھیلائیں۔

"کیا یہ بیگ صاحب کا گھر نہیں۔؟"

"یہ گھر بیگ صاحب کا ہی ہے مگر اوپر کا پورشن ہم نے کرائے پر لے رکھا ہے۔" حریم نے ناگواری سے وضاحت کی۔

صاف لگ رہا تھا۔ یہ محترم شاہنواز جان بوجھ کر انجان بننے کی ایکٹنگ کر رہے ہیں۔

"کتنے لوگ اس پورشن میں قیام پذیر ہیں۔"

"آپ کے لیے کچھ لاؤں؟ چائے یا ٹھنڈا؟" حریم نے جان بوجھ کر اس کے سوال کو نظر انداز کر دیا تھا۔ اب جبکہ وہ ان کے پورشن میں آ ہی چکا تھا اور سفر بھی شاید کافی طویل کر کے آیا تھا سو حریم کو آداب میزبانی نبھانے کا خیال آگیا۔

"نیکی کا ارادہ ہو تو پوچھتے نہیں۔ نیکی کرتے ہیں

اور دریا میں ڈال دیتے ہیں۔" اس نے بھی شائستگی سے جتادیا۔

"میں ابھی لاتی ہوں۔" وہ سر ہلا کر کچن کی طرف جانے لگی تھی۔

ایک تو آج جس قدر اسے کام سمیٹنے کی جلدی تھی اسی قدر دیر ہوتی جارہی تھی۔ پائے جوں کے توں فریزر میں رکھے تھے۔ اور گھڑی کی سوئیاں لمحہ بہ لمحہ آگے بڑھ رہی تھیں۔ اس نے بے بسی کے عالم میں لاؤنج میں موجود اس "آفت" کو دیکھا تھا۔ جس کا بے وقت کا نزول اسے بری طرح تپا گیا۔

اس سے پوچھنے میں وقت ضائع کرنے کی بجائے اس نے اسکوائش کے ساتھ ساتھ چائے بھی بنالی تھی۔ دو سینڈوچ بھی گرم کرلیے تھے۔ تین کباب بھی رکھ لیے وہ سجی سجائی ٹرے کو دیکھ کر متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔

"کیا سلیقہ ہے؟ کیا سمجھ داری ہے۔" وہ اسکوائش کے جگ اور چائے کو دیکھ کر کہہ رہا تھا۔ حریم کو مجبوراً" کچھ دیر تک تخت پر بیٹھنا پڑا۔ جب تک وہ چائے پی کر اٹھ نہ جاتا۔ کم از کم اتنی دیر تک بیٹھنا اس کی مجبوری تھی ایک تو وہ بیگ صاحب کا بیٹا تھا۔ دوسری بات یہ تھی کہ بے چارا سفر بھی کرکے آیا تھا۔ اور تیسرا زبردستی کا مہمان بھی بن گیا تھا۔ سو مہمان نوازی تو کرنا ہی تھی۔ اگرچہ ثریا خالہ کی ناراضی کا خدشہ بھی اسے لاحق تھا۔ اور وہ سوچ رہی تھی کہ نہ جانے ثریا خالہ کی واپسی کے بعد کیسا طوفان آئے گا۔

اس کی سوچوں کے برعکس دوسری طرف کا اطمینان قابل دید تھا۔ محترم اسکوائش کا پورا جگ خالی کرچکنے کے سینڈوچز اور چائے سے بھی بھرپور انصاف کررہے تھے۔

"آپ نے بتایا نہیں یہاں کتنے لوگوں کا قیام ہے؟"

"میری ساس، شوہر اور دیور کے علاوہ میں۔" وہ چبا چبا کر جتانے کے سے انداز میں بولی۔

"اچھا۔" شاہنواز کو زور سے اچھو لگ گیا۔

"تم شادی شدہ ہو۔"

"جی۔" حریم نے گویا دانت پیسے۔

"اف۔" شاہنواز نے کپ تپائی پر رکھ کے گویا اپنے بال نوچ لیے۔

"ہر خوبصورت لڑکی جو مجھ سے اتفاقاً" دانستہ یا غیر دانستہ ٹکراتی ہے۔ عموماً" شادی شدہ، منگنی شدہ، نکاح شدہ ہی کیوں ہوتی ہے۔؟"

"اس لیے کہ تم خود جو "شادی شدہ" ہو۔ حریم نے پھر سے جتایا۔

"میں۔" شاہنواز کی آنکھیں تحیر سے پھیل گئیں۔

"توبہ، کس قدر ڈرامہ باز آدمی ہے۔ حیران تو یوں ہورہا ہے گویا میں نے بڑی غیر متوقع قسم کی بات کردی ہے اور یہ مجھ سے گویا کچھ اور سننا چاہتا تھا۔" حریم کو ہنسی آگئی جسے چھپانے کی غرض سے اس نے قدرے سر جھکالیا۔

"آپ نے بجا فرمایا ہے۔" اس نے فوراً" تسلیم کرلیا۔

"ویسے آپ تک میری "لومیرج" کی پوری اسٹوری پہنچ چکی ہوگی۔" وہ پورے وثوق سے کہہ رہا تھا۔

"جی۔ اس لو اسٹوری پر تو فلم بھی بن سکتی ہے۔" حریم نے تپ کر کہا تھا۔

"کلسوڑے! اٹھ بھی جاؤ۔ میں نے پائے چڑھانے ہیں۔" وہ گویا زچ ہو کر رہ گئی۔

"تمہاری اماں کی لائیو تقاریر بھی بہت کمال کی ہوتی ہیں۔ ابھی یہاں ایک سین کری ایٹ ہونے والا ہے۔ آپ بھی شوٹنگ پر پہنچ جائیے گا۔" وہ یقیناً" ثریا خالہ سے "جنگ" کی پوری تیاری کرکے آیا تھا۔

"تمہاری خیر نہیں۔" حریم نے اسے ڈرانا چاہا۔

"جانتا ہوں میں۔" وہ کھل کر مسکرایا۔

"مگر ہم بھی کسی سے کم نہیں۔" اس نے اپنے کالر کھڑے کیے تھے۔ چائے وہ ختم کرچکا تھا۔ اب بیگ اٹھا کر اٹھ رہا تھا۔

"چائے پلانے کا شکریہ۔"

"تم نے اپنی بیوی کے بارے میں نہیں بتایا۔ ڈینگیں تو بڑی مار رہے تھے۔" وہ موضوع کی طرف اسے لے ہی آئی۔ رباب کے بارے میں وہ خاصی کھٹک رہی تھی۔

"میری ڈینگوں کی خبر کس نے آپ تک پہنچائی۔"

"ایسی باتیں ڈھکی چھپی نہیں رہتیں۔" حریم نے کلس کر جواب دیا۔

"اب چلے بھی جاؤ۔" وہ بری طرح سے چڑ گئی تھی۔

"بیوی کہاں سے لاؤں؟" شاہنواز کا منہ لٹک گیا۔

"کیوں؟ وہ رباب کہاں گئی ہے۔" اسے تجسس تو یقیناً" محسوس ہورہا تھا تاہم غیر ارادی طور پر یہ جاننے کی بے چینی بھی تھی کہ اس کی بیوی ساتھ کیوں نہیں آئی۔ ویسے "تجسس" عورت کی فطرت میں شامل ہوتا ہے۔ اور اس میں عورت کی کوئی شعوری کوشش کا عمل دخل نہیں ہوتا۔

"رباب مرچکی ہے۔" شاہنواز نے سر جھکا کر شاید بھرائی آواز میں کہا تھا۔

حریم اس کے چہرے پر پھیلے تاثرات تو نہیں دیکھ پائی تھی تاہم اس کے لہجے کا بوجھل پن اور لڑکھڑاہٹ حریم سے چھپی نہیں رہ سکی تھی۔ شاہنواز رکا نہیں تھا بلکہ لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے باہر نکلتا چلا گیا تھا اور نہ جانے کیوں حریم کو بے انتہا دکھ کے احساس نے گھیر لیا۔

وہ فطرتاً" بہت حساس تھی بہت نرم طبیعت کی مالک۔

"ایک اور محبت انجام پذیر ہوئی۔" دکھ کا احساس لمحہ بہ لمحہ گہرا ہورہا تھا۔ نہ جانے کیوں ہر محبت کرنے والے کے چہرے میں اسے اپنا چہرہ دکھائی دیتا تھا۔ اور نہ جانے کیوں ہر محبت کے نصیب میں "دکھ" لکھے ہوتے ہیں۔ اذیتوں کی عبارت کیوں رقم ہوتی ہے۔ آنسو کیوں چھپے ہوتے ہیں؟ ہر محبت کا انجام "ہجر" اور "جدائی" کیوں ہوتا ہے۔

محبت کے نصیب میں "وصل" کی گھڑیاں صرف نصیب والوں کو ہی ملتی ہیں۔ اور جنہوں نے وصل کی لذت کو اور لطف کو پالیا، وہ محبت کی چاشنی اور ٹھنڈک سے روح تک سرشار ہوگئے۔ محبت روح میں اتر جانے کا ہی تو نام ہے۔ اور محبت مرمر کے جیے چلے جانے کا ہی تو نام ہے۔

اور نہ جانے یہ "محبت" تھی کیا چیز؟ اور نہ جانے کتنے روپ بدل کر چلی آتی تھی۔ کبھی کبھی یہ محبت بہروپ کی چادر اوڑھ لیتی۔ ہر رنگ میں جلوہ گر ہونے لگتی تھی۔

کبھی چاند کی ٹھنڈک کی طرح نرمی بخشتی۔ کبھی سورج کا روپ دھا کر تپش اگلتی۔ کبھی "جنون" کی شکل میں نظر آتی۔

کبھی "خاموشی" کی بکل میں ہمیشہ کے لیے دبکی رہتی۔

کبھی محفلیں بخشتی کبھی تنہائیوں کے حوالے کردیتی۔

کبھی خوشی سے نوازتی کبھی آنسو دان کرجاتی۔

کبھی شکستہ دیوار بنادیتی اور کبھی ہمت، حوصلے، صبر اور شکر کے سبق پڑھاتی۔ محبت کے الجھے ریشم کو سمجھنا آسان کہاں تھا اور اگر محبت کا ریشم الجھنے لگتا تو سلجھانا بھی آسان کہاں تھا؟

☼ ☼ ☼

دوپہر کے ملاپ کا وقت تھا۔ دن پر رات غالب آرہی تھی۔ پرندے تک اپنے آشیانوں کی طرف جوق در جوق لوٹ رہے تھے۔ چڑیوں کے غول کے غول اپنی منزل کی طرف رواں دواں تھے۔ آسمان دھیرے دھیرے سیاہی مائل ہورہا تھا۔ سورج اپنی نارنجی کرنوں کو سمیٹے کب کا آسمان کی آغوش میں منہ دیے اونگھنے لگا تھا۔ سیاہ آسمان پر اکا دکا ستارے جھلک دکھانے کے بعد نرم نرم بگولوں جیسے بادلوں کی اوٹ

میں گھڑی گھڑی جا چھپتے تھے۔

پورا دن سورج تپتا رہا تھا مگر شام کے سائے بڑھنے کے ساتھ ہی فضا میں ٹھنڈک سی محسوس ہونے لگی تھی۔ اور یہ ٹھنڈک جسم کو خاصی لطافت بخش رہی تھی۔ حالانکہ سردی کا زور تو کب کا ٹوٹ چکا تھا مگر راتیں ابھی تک ٹھنڈی اور پرسکون تھیں۔ تبھی تو نیند بھی بہت ٹوٹ کر آتی تھی اور ویسے بھی حریم کی طبیعت ان دنوں کافی بوجھل تھی۔ ہر وقت آنکھوں میں نیند بھری رہتی تھی۔ جی چاہتا تھا کہ لمبی تان کر خوب جی بھر کر سوئے۔ کچھ اس کی نیند بھی پچھلے کئی دنوں سے امی کی "بیماری" کے باعث ادھوری تھی۔ سو طبیعت کا بوجھل پن حد سے سوا محسوس ہو رہا تھا۔

اور آج کا دن تو لمحہ بھر کے لیے بھی فرصت میسر نہیں آئی تھی۔ سونا تو دور کی بات کمر ٹکانے کا بھی وقت نہیں مل سکا تھا۔ اور اس وقت شاہنواز کے بارے میں سوچتے ہوئے عجیب سی پژمردگی نے اسے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ جوں ہی شاہنواز سیڑھیاں اترنے لگا۔ حریم بھی اس کے پیچھے باہر آگئی۔ الگنی پر ابھی تک کچھ اور کپڑے لٹک رہے تھے۔ وہ چادریں اتار رہی تھی جب اس نے شاہنواز کو گھر سے باہر جاتے دیکھا۔ وہ سیڑھیاں اتر کر سیدھا گیٹ کی طرف چلا گیا تھا۔

وہ مسلسل شاہنواز، ثریا خالہ اور رباب کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ اور انہی سوچوں کے زیر اثر وہ واپس لاؤنج میں آئی تو موبی کو اپنے کمرے کے دروازے کے پاس کھڑا دیکھ کر ٹھٹک گئی۔

"موبی! تم اٹھ گئے ہو۔ آج تو بڑا ہی سو لیا ہے۔" وہ مصروف سے انداز میں بولتی ہوئی کپڑے تخت پر رکھے ان کی تہ لگانے لگی۔

"کپڑوں کی تہ لگا لوں۔ پھر تمہیں کھانا دیتی ہوں آج تو لنچ بھی گول کر دیا ہے آپ نے جناب منیب عالم صاحب۔"

"تو آپ جگا لیتیں۔" موبی کا لہجہ ہلکی سی چبھن لیے ہوئے تھا۔ حریم کچھ کہے بغیر اپنے کام میں مصروف رہی۔

"اتنی گہری نیند میں تھے میں نے جگانا مناسب نہیں سمجھا۔"

"کیا پکایا ہے۔" آج سے پہلے موبی نے کھانے پینے کے بارے میں کبھی نہیں پوچھا تھا اور اگر پوچھ بھی لیتا تو ایسا روکھا سا لہجہ نہیں ہوتا تھا حریم کچھ چونکی ضرور تھی مگر پھر اس نے خود سے ہی خیال کر لیا کہ نیند سے اٹھنے کی وجہ سے موبی بے زار بے زار ہے۔

"پائے۔" اس نے کپڑے اٹھا کر استری اسٹینڈ پر رکھ دیے۔

"کھانا لاؤں؟"

"نہیں مجھے بھوک نہیں۔" وہ بے زاری سے بولا۔

"کچھ اور لا دوں؟ فروٹ وغیرہ۔"

"دل نہیں چاہ رہا بھابھی۔" وہ فرش پر نظر جمائے نہ جانے کس سوچ میں گم ہونے لگا۔ حریم نے کندھے اچکا کر استری کا پلگ بورڈ میں لگایا۔

"کھڑے کیوں ہو؟ بیٹھ جاؤ۔ یہاں آجاؤ میرے پاس۔"

"مجھے نہیں بیٹھنا۔" اس نے عجیب سے ضدی انداز میں ٹھنک کر کہا۔ حریم ــــــ اپنے کام میں مصروف ہو گئی تھی۔ اس کا ارادہ تھا کہ لائٹ جانے سے پہلے پہلے کشنز اور تکیوں کے کورز پریس کر لے۔

"طبیعت تو ٹھیک ہے۔"

"میری طبیعت کبھی بھی ٹھیک ہونے والی نہیں۔" وہ دروازے کے ڈیزائن کو ناخن سے کھرچ رہا تھا۔

"میں ٹھیک ہونا بھی نہیں چاہتا۔ کبھی کبھی دل کرتا ہے، دورے کی حالت میں میری کوئی شریان پھٹ جائے اور میں منیب عالم نہ رہوں۔ مٹی کی ڈھیری میں بدل جاؤں۔ میرا وجود، میرا نام تک میرے ساتھ ختم ہو جائے۔ پھر کوئی منیب عالم اس خاندان میں جنم نہ لے۔" وہ محض سوچ رہا تھا۔ آنکھوں کے سامنے بنتے بگڑتے عکس کو گویا نوچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ایک بدنما منظر کو ہٹانے کی "جہد" کر رہا تھا حالانکہ اس کی نظریں حریم کے وجود پر ٹکی تھیں۔

"وہ آدمی کون تھا بھابھی؟" عجیب نظروں والے اس لڑکے نے اپنی عمر سے بھی بڑا اور گہرا سوال پوچھ لیا۔ حریم کو گویا کرنٹ لگا۔ وہ کچھ چونک کر موبی کے چہرے کی طرف دیکھنے لگی تھی۔ اور یہ چہرہ، جس پر سوچ کی پرچھائیاں تھیں۔ تفکر کے سائے تھے۔ یہ چہرہ تو کسی عمر رسیدہ بوڑھے کا جھریوں زدہ چہرہ دکھائی دے رہا تھا۔ جس نے اپنی عمر زندگی کے تجربوں کی نذر کر دی تھی۔ اور تجربوں کی سلگتی بھٹی نے اس آدمی کو پکی اینٹ کی طرح کر دیا تھا، مضبوط اور پتھریلی ایسی اینٹ، جس کے "تجربے" سوچ اور فکر سے کئی نسلوں کی تعمیر کی جاتی

ـــــــ کئی عمارتوں کو بلندیاں بخشی جاتیں۔ کئی گھر تعمیر ہوتے، کئی درسگاہوں کا سنگ بنیاد رکھا جاتا۔

منیب عالم کا چہرہ ایک ایسے "باعلم" بوڑھے کا چہرہ دکھ رہا تھا جس نے گویا دین اور دنیا کا ہر علم اور ہر تجربہ کو گھول کر پی رکھا ہو۔ وقت کی بے رحمی اور عمر رواں کی بے وفائی نے اس بوڑھے کی یادداشت کو گویا کوئی نقصان نہیں پہنچایا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ اس عمر رسیدہ آدمی نے ہر صدی میں جینے کا لطف لے رکھا ہے اس کے باوجود وہ کیوں مایوس ہے؟ کیوں اداس ہے؟ کیوں شام غریباں اس کی آنکھوں میں اتر آئی ہے؟ کیوں اس کا دل امنگ سے خالی ہے؟ اور کیوں اس کی آنکھ وہ خواب اور وہ منظر دیکھتی ہے جو کوئی اور آنکھ دیکھنے کا تصور نہیں کر سکتی۔

اور اس بوڑھے کا دل "محبت" کے جذبے سے قطعاً خالی تھا کیونکہ اس نے محبت سے بھی کہیں آگے بہت آگے کا سفر کر رکھا تھا۔

محبت اور محبوب کے درمیان سفر کرتا وہ بوڑھا عمر عزیز کی آخری "سرحد" پر کھڑا تھا۔ جہاں سے ایک اور سفر کا آغاز ہونا تھا۔ دائمی اور ابدی سفر کا آغاز۔ ایک نہ اختتام پذیر ہونے والے سفر کا آغاز۔ جس کی ابتدا میں ہی عشق حاصل نے دیدار یار اور اس کے "قرب" کے لطف کو ہمیشہ کے لیے پا لینا تھا کبھی نہ کھونے کے لیے کبھی نہ گنوانے کے لیے۔

سامنے کھڑا بولتی نیلی سمندر جیسی آنکھوں والا اور یونان کے شہزادوں جیسے نقوش رکھنے والا یہ لڑکا عشق حاصل کی پہلی سیڑھی پر قدم رکھے کھڑا تھا۔ ابھی اس کے سفر کا آغاز تھا۔ ابھی اس نے بہت آگے نکلنا تھا۔ بہت دور منزل کھڑی تھی اور اس تک پہنچنے کے لیے طویل آبلہ پائی کا سفر بانہیں کھولے اسے پکار رہا تھا۔ اور منیب عالم نے کسی وجد کی گھڑی میں اپنے دھیان گیان میں گم اس "پکار" پر "لبیک" کہہ دیا تھا اور اس کی ہر دھڑکن اس ایک لفظ کا ورد کر رہی تھی۔ اس لفظ کی مٹھاس نے اسے دنیا کی لذت اور فانی اور مادی چیزوں کی "طلب" سے بہت دور کر دیا۔

حریم کے ذہن سے ایک سوچ بل کھاتی ہوئی تخلیق ہوئی تھی اور اس کے دل نے کہا تھا سامنے کھڑا یہ لڑکا غیر معمولی ذہن اور سوچ کے ساتھ تخلیق کیا گیا ہے۔ کچھ تو تھا اس میں خاص، منفرد اور سب سے جدا۔ کچھ تو تھا ایسا جو حریم کو نظر آتا بھی تھا اور نہیں بھی۔

"وہ آدمی کون تھا بھابھی۔" بولتی نیلی آنکھوں میں سوال شوریدہ لہروں کی طرح ٹکرا رہے تھے یا پھر حریم کو ہی ایسا محسوس ہو رہا تھا۔ اس کا دھیان استری اور کپڑوں سے ہٹ چکا تھا اور وہ دھڑکتے دل کے ساتھ منیب عالم کی طرف دیکھ رہی تھی۔

"موبی کو دورہ تو نہیں پڑنے والا۔ یا اللہ میں اسے کیسے سنبھالوں گی۔ امی بھی نہ جانے کس کس کی "عیادتیں" نبٹاتی پھر رہی ہیں۔ اور آج تو ماہیر بھی لیٹ آئیں گے۔" اس کے سینے میں ایک خوف کی پکڑ دھکڑ چل رہی تھی۔

"بھابھی! سوال مشکل ہے یا جواب؟" وہ دروازے کو کھرچتا، دھیرے دھیرے زمین پر ٹھوکے بھی مار رہا تھا گویا فرش کو بھی ناخنوں سے کھرچنے کا ارادہ رکھتا تھا۔

"کیا مطلب؟" حریم اس کی بدلتی حالت کے پیش نظر کپکپا کر رہ گئی تھی۔ حالانکہ نہ سوال مشکل تھا نہ جواب۔ اگر کچھ مشکل ترین مرحلہ تھا تو صرف اتنا کہ

نیلی آنکھوں کی گہرائی میں چھپے صدیوں کی سوچ رکھنے والے بوڑھے کی نظر میں چھپے ان راز اور بھید بھری خاموشی کو پڑھنا تھا۔

"وہ آدمی' بیگ انکل کا بیٹا شاہنواز ہے جس کے بارے میں ثریا خالہ اکثر۔۔۔" اس نے سوچنے میں مزید وقت ضائع نہیں کیا تھا مگر منیب نے سابقہ انداز میں ہی اس کی بات دھیرے سے کاٹ دی۔

"جانتا ہوں۔ سب جانتا ہوں۔"

"تو پھر یہ جاننا چاہ رہے ہو کہ وہ اوپر کیوں آیا تھا' اصل میں ہوا کچھ یوں۔۔۔" وہ اسے پوری روداد سے آگاہ کرنا چاہ رہی تھی جب ایک دفعہ پھر منیب نے اس کی بات کو نظرانداز کر دیا۔

"مجھے پتا ہے۔"

"تم جاگ رہے تھے؟" حریم حیران ہی تو رہ گئی۔

"اگر اٹھ چکے تھے تو باہر آجاتے۔" اس کا لہجہ خاصا کٹیلا ہو گیا۔

"میں سوتا کہاں ہوں۔ نیند ان آنکھوں میں بڑی دیر تک کبھی نہیں ٹھہری۔" اب وہ سر جھکائے کہہ رہا تھا۔ حریم کو غصہ آیا۔

وہ ابھی تک یہی سمجھ رہی تھی کہ موبی اس سے شاہنواز کے متعلق استفسار کر رہا ہے کہ وہ کون آدمی تھا۔ کیوں آیا تھا؟ وہ یہ ہرگز نہیں جانتی تھی موبی اس سے کچھ پوچھ نہیں رہا تھا بلکہ کچھ بتانا چاہ رہا تھا۔ کچھ ایسا جو حریم کو ٹھٹکا کر رکھ دیتا۔

منیب عالم' جسے حریم پہلی ملاقات میں ایک ایسا ایب نارمل بچہ سمجھی تھی۔ جو جستجو اور کھوج سے کوسوں دور تھا۔ جو خود سے نہانے یا کپڑے تبدیل کرنے کے بارے میں سوچ نہیں سکتا تھا۔ جسے بھوک کی طلب نہیں ستاتی تھی۔ جو کھانے پینے کی چیزوں کے نام تک بولنے میں ہچکچاتا تھا۔ جسے سامنے رکھی چیز کی طرف متوجہ کرنے میں بہت دقتوں کو سامنا کرنا پڑتا تھا۔ جسے یہ نہیں پتا تھا کہ "رشتے" کو کرتے کیا ہیں؟

کیا وہ ایب نارمل "لڑکا" حقیقی منیب عالم تھا یا سامنے کھڑا یہ "بوڑھا" منیب عالم ہے؟ وہ بہروپ تھا یا یہ بہروپ کی ایک قسم تھی۔ سچ کیا تھا؟ حقیقت کیا تھی؟ وہ انہی سوالوں کے درمیان الجھ رہی تھی۔ گردش کر رہی تھی۔ اور حریم کو اس "سچائی" کی کھوج تو لگانا ہی تھی کہ اس منیب عالم کو ایب نارمل بننے کا ڈھونگ رچانے کی کیا ضرورت تھی اس نے کیوں خود پر ایک دیوانے کا سا خول چڑھا رکھا تھا۔ حالانکہ نہ وہ مجنون تھا نہ پاگل نہ اس نے بچپن دیکھا تھا نہ لڑکپن' جوانی آئی اور گزر گئی۔ اور شاید جوانی آئی ہی نہیں تھی۔ وہ تو ایک ہی جست میں بڑھاپے کی منزل کو چھونے لگا تھا۔

اس کا ذہن تو کچھ عرصے پہلے والے موبی کو سوچ رہا تھا۔ جو بظاہر اسے زچ کرنے والے بچکانہ سوال کرتا تھا تاکہ حریم کہیں اس بوڑھے عمر رسیدہ موبی کو کھوج نہ لے۔ خود کو چھپانے کے لیے وہ ایک چھوٹے سے ذہن کا مالک منیب بن جاتا تھا مگر کیوں؟

"یہ شاہنواز بیگ ہے۔ انتہا کا جھوٹا آدمی۔" موبی نے کہنا شروع کیا تھا۔

"اگر شاہ بھائی کہے' اللہ ایک ہے تو بس وہ بات سچ ہے' باقی سب جھوٹ۔" موبی اب فرش کو کھوجنا ترک کر چکا تھا۔

"تم شاہنواز کو جانتے ہو۔" حریم کی مارے حیرت کے پوری آنکھیں کھل گئیں۔

"ہاں۔" وہ دھیرے دھیرے فرش پر بیٹھ رہا۔ اس کی آنکھیں نیند سے بوجھل ہو رہی تھیں۔ ہمیشہ کی طرح کچھ دیر بعد اس نے اطمینان سے سو جانا تھا دوسروں کو بے اطمینان کر کے۔

"اور کیا جانتے ہو؟" حریم کی آواز سرگوشی نما تھی۔

"شاہ بھائی جھوٹ بولتا ہے' بے تحاشا جھوٹ بولتا ہے مگر صرف ان لوگوں کے ساتھ جنہوں نے اسے تکلیف سے دوچار کیا ہے۔ انہیں اذیت دینے کے لیے یہ جھوٹ بولتا ہے۔"

وہ فرش پر بیٹھ چکا تھا۔ اس کا سر کندھے پر ڈھلک آیا تھا۔ اور یہ اس بات کی علامت تھی کہ موبی پر "نیند" طاری ہو رہی ہے۔

"تمہاری زندگی میں ایک ایسا موڑ آئے گا بھابھی! جب یہ جھوٹا آدمی تمہاری مدد کو آگے بڑھے گا۔ یہ تمہاری مدد کرے گا۔" وہ نیند کے عالم میں آخری مرتبہ بڑبڑایا تھا۔ اور حریم تک اس کی بڑبڑاہٹ بمشکل ہی پہنچی تھی۔ وہ ششدر سی فرش پر چت لیٹے موبی کو دیکھ رہی تھی۔ اور اس کے جسم میں گردش کرتا لہو تھم تھم جا رہا تھا۔

✵ ✵ ✵

"ماں صدقے جائے' نہ جانے کب دبے قدموں راحت بیگم لاؤنج میں داخل ہوئی تھیں۔ موبی کو فرش پر چت لیٹا دیکھا تو سینے پر دوہتڑ مار کر بے تاب سی آگے بڑھیں۔

"موبی! میرا بچہ' ادھر کیوں لیٹا ہے۔؟" وہ اس کا کندھا ہلائے جا رہی تھیں۔ مگر موبی کے باوجود میں ذرا بھی جنبش نہیں ہوئی۔

"اسے کیا ہوا ہے۔؟" وہ گم صم کھڑی حریم کی طرف متوجہ ہوئیں۔ حریم گویا نیند سے جاگی تھی۔ موبی کی باتوں کے زیر اثر کچھ پل کے لیے وہ اردگرد کے ماحول سے کٹ کر رہ گئی تھی۔ مگر راحت بیگم کی آواز سے ہوش کی دنیا میں لے آئی۔

"کہاں رہ گئی تھیں آپ؟"

"موبی کو پھر سے دورہ پڑا ہے۔" وہ اس کا سوال نظرانداز کر کے موبی کے گال تھپتھپا رہی تھیں۔

"جی۔" حریم بھاگ کر کچن سے پانی لے آئی تھی۔ امی کی آمد کے ساتھ ہی وہ مطمئن سی ہو گئی تھی۔ ابھی کچھ دیر پہلے اسے ٹھنڈے پسینے آرہے تھے کہ موبی کو تنہا کیسے ہینڈل کرے گی۔ سب سے بڑا مسئلہ تو موبی کو بیڈ پر لٹانے کا تھا۔ وہ دونوں خواتین بھی مل کر موبی کو بستر پر منتقل نہیں کر سکتی تھیں۔ صحت اور ڈیل ڈول کے لحاظ سے وہ کافی بلند قامت تھا۔

"یہ کمرے سے باہر کیوں نکلا ہے۔" راحت بیگم اس کے چہرے پر پانی کے چھینٹے پھینک رہی تھیں پھر انہوں نے موبی کی ناک دبائی۔ وہ دھیرے دھیرے پلکیں کھول رہا تھا۔ راحت بیگم بمشکل اٹھا کر اسے کمرے تک لائیں۔ حریم نے موبی کو سہارا دینا چاہا تو انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روک دیا۔

"تم رہنے دو۔" وہ اس کی کنڈیشن کے خیال سے کہہ رہی تھیں۔ کبھی کبھی ان کے احساس کرنے والے انداز حریم کو اندر تک خوشی سے ہمکنار کر دیتے تھے۔ حریم سر ہلا کر جھٹ پٹ کھانا گرم کر کے لے آئی۔ راحت بیگم بھی ہاتھ منہ دھو کر آگئی تھیں۔

"آنتیں تو مارے بھوک کے سکڑ کر رہ گئی ہیں۔" انہوں نے بے صبری سے ٹرے اپنی طرف کھسکائی۔

"موبی کو کیا ہوا ہے؟ اچھا بھلا چھوڑ کر گئی تھی۔" ان کے لہجے میں واضح اداسی بھر گئی۔

"موبی کو۔" حریم کچھ پل کے لیے سوچوں میں محو رہی۔ راحت بیگم اسے سوچ میں گم دیکھ کر حیرانی سے بولیں۔

"کیا سوچنے لگی ہو۔"

"آپ کو ایک بات بتانا تھی۔" وہ تمہیدی انداز میں گفتگو کا آغاز کرتی ہوئی بولی۔

"کیا؟" انہوں نے سرسری سا پوچھا۔

"بیگ انکل کا بیٹا شاہنواز آگیا ہے۔"

"کب؟" راحت بیگم کے ہاتھ میں پکڑا نوالہ پیالے میں گر گیا۔

"آپ کے گھر سے نکلنے کے کچھ دیر بعد۔" حریم نے مزید تفصیلات بھی ان کے گوش گزار کر دی تھیں۔ اس کی زبردستی کی مہمان نوازی کے بارے میں بھی بتا دیا۔

"اور اس کی بیوی' بچی؟" مارے تجسس اور حیرانی کے انہیں کھانا پینا سب بھول گیا۔

"آپ کو ایک بات بتاؤں امی۔" حریم کی آواز پر افسردگی کے رنگ غالب آگئے۔

"ہاں' ہاں۔ بول' رک کیوں گئی۔؟" انہوں نے بے تابی سے پوچھا۔

"اس کی بیوی رباب کی ڈیتھ ہو چکی ہے۔"

"کیا سچ؟" امی کو گویا دھچکا لگا۔

"کب ہوئی۔ شاہنواز نے تمہیں خود بتایا ہے۔"

"کب ہوئی' یہ نہیں پتا۔ البتہ رباب کے بارے میں پوچھا تھا میں نے۔ شاہنواز نے بتایا کہ وہ مرچکی ہے۔"

"چلو' ثریا کے کلیجے میں تو ٹھنڈ پڑ گئی۔" انہوں نے گویا ہاتھ جھاڑے۔

"ہائے' بے چاری کے نصیب۔"

"کس بے چاری کے۔" حریم کو قطعا" سمجھ نہیں آئی۔

"رباب کے۔" ان کا تاسف کسی طور کم نہیں ہو رہا تھا۔ ویسے بھی اس معاملے میں ان کی ہمدردیاں ثریا خالہ کے ساتھ ہرگز نہیں تھیں۔

"خواہ مخواہ ماش کی دال بنی ہوئی تھی۔ اس معصوم نے تو اتنا ہی جینا تھا۔ دل کو بڑا کرلیتی۔ عزت آبرو سے گھر لے آتی۔"

"شاہنواز بھی اگر خالہ کو اعتماد میں لے کر کوئی قدم اٹھاتا تو یہ زیادہ بہتر نہیں تھا۔" حریم نے یوں ہی بات بڑھانے کی غرض سے کہہ دیا۔ ویسے بھی اسے کچھ نہ کچھ تو کہنا ہی تھا۔ ورنہ راحت بیگم خوا مخواہ ناراض ہو جاتیں کہ بہو بیگم منہ میں گھنگھنیاں ڈال کر بیٹھ جاتی ہے۔ میں دیواروں سے باتیں کروں کیا۔ یا پھر کہیں گی ہمارے نصیب میں ایسی بے زبان گونگی بہو ہی لکھی تھی۔ جو نہ بولتی ہے نہ ہنستی ہے۔ انہوں نے اس کے مزاج کو کبھی سمجھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ وہ فطرتاً کم گو تھی۔ زیادہ بولنا اسے پسند نہیں تھا۔ وافر گفتگو سے وہ پرہیز کرتی تھی۔ اس کی طبیعت میں چونچالی نہیں تھی۔

"اس نے بھی اپنی مرضی کرلی تھی۔ بس ثریا کی ضد میں آکر یہ قدم اٹھالیا۔ چھپ چھپا کر نکاح کیا اور بعد میں گھر میں اطلاع کردی۔ ادھر تو سمجھو بھونچال آگیا تھا۔"

"ضد کیسی۔" حریم نے حیرانی سے پوچھا۔

"ثریا نے اپنی بھانجی سے شاہنواز کی بات ٹھہرادی تھی۔ بس شاہے کو اسی بات پر غصہ تھا۔ ساری زندگی بے چارے کو ظلم و ستم کا نشانہ بناتی رہی۔ اور جب وہ کچھ بن گیا۔ اپنے قدموں پر کھڑا ہو گیا تو رشتہ اپنوں میں کرنا چاہا۔ شاہے کی نوکری بہت اچھی تھی نا۔ ثریا نے سوچا' بھانجی عیش کرے گی۔ مگر شاہے نے بھی ثریا کے ارمان پورے نہیں ہونے دیئے۔" انہوں نے خاصا مفصل جواب دیا۔

"آپ کے لیے چائے لاؤں۔" وہ موضوع گفتگو بدلنے کی غرض سے بولی۔

"ہاں' بنادو۔ ذرا تیز ہونی چاہیے۔" انہوں نے کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا تھا اب تخت پر لیٹتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔ پھر اچانک کچھ یاد آیا تو بولیں۔

"زمیلہ کا فون تو نہیں آیا۔"

"نہیں۔" وہ کچن کی طرف جاتے ہوئے بولی۔

"پہلے مجھے نمبر ملا کردو۔ زمیلہ سے بات تو کرلوں۔ نہ جانے بچی کس حال میں ہے۔ اتنے دن ہوئے ہیں اس نے ادھر کا چکر بھی نہیں لگایا۔"

"جی اچھا ہے۔" وہ سنک میں گندے برتن رکھ کر پلٹ آئی۔ فون اسٹینڈ سے اٹھا کر تخت پر رکھا۔ نمبر پریس کیا۔ دوسری طرف کال ریسیو کرلی گئی تھی۔ حریم نے ریسیور راحت بیگم کو تھمادیا۔

"زمیلہ کہاں ہے؟" انہوں نے چھوٹتے ہی پوچھا۔

"خیر' تو ہے۔" دوسری طرف سے دادی ساس کی آواز سنائی دی۔ راحت بیگم نے کڑوے گھونٹ بھر کر ان کی بے سروپا باتوں کا جواب دیا تھا۔ بیس منٹ بعد زمیلہ کو فون پکڑایا گیا۔ ماں کی آواز سنتے ہی زمیلہ سسک اٹھی۔

"کس جہنم میں مجھے پھینک دیا ہے امی۔"

"کیا ہوا ہے۔ کچھ بتاؤ نا۔" راحت بیگم کے گویا ہاتھ پیر پھول گئے۔

"حریم! حریم۔" انہوں نے ریسیور کان سے ہٹا کر حریم کو آوازیں دینا شروع کردیں۔

"جی امی!" وہ برتن دھو رہی تھی ٹونٹی کھلی چھوڑ کر بھاگی آئی۔

"زمیلہ رو رہی ہے۔ ذرا دیکھو تو' میرا دل گھبرائے جارہا ہے۔ بلڈ پریشر چیک کرو۔" وہ سچ مچ ریسیو چھوڑے تخت پر ڈھے گئیں۔

حریم اس سچویشن کی عادی ہونے کے باوجود نئے سرے سے گھبرا گئی۔ پہلے امی کو پانی میں چینی گھول کر پلائی اور پھر ریسیور کو اٹھا کر کان سے لگایا جو کب کا بند ہوچکا تھا۔ آدھے گھنٹے بعد زمیلہ خود ہی آگئی تھی۔ دیور چھوڑ کر گیا تھا۔ امی نے اسے گلے لگا کر رونا شروع کردیا۔

"امی بس بھی کریں نا۔" زمیلہ نے تلملا کر کہا۔

"کبھی اگلے بندے کی بھی سن لیا کریں۔ اپنی مرضی کا نتیجہ اخذ کرکے فورا" ہاتھ پیر چھوڑ دیتی ہیں۔ ابھی آپ کی طبیعت خرابی کا بتا آئی ہوں۔ ورنہ اماں بی تو کبھی نہ آنے دیتیں۔"

"تم رو کیوں رہی تھیں؟" ان کی سوئی بس وہیں اٹک گئی۔ حالانکہ زمیلہ بہت ہشاش بشاش نظر آرہی تھی۔ لگ تو نہیں رہا تھا کہ خیر سے رو رہی ہے۔

"وہ تو ان کو دکھانے کے لیے۔" زمیلہ نے گویا اپنا ماتھا پیٹا۔ کچھ تو پہلے ہی زمیلہ گنوں سے مالا مال تھی اور کچھ بھرے پرے گھر میں رہنے کے بعد ساری سیاست سیکھ گئی تھی۔ اب ماں کے کان میں گھس کر نہ جانے کون سی رپورٹ پیش کررہی تھی۔ حریم نے کچن کی کھڑکی میں سے دیکھا اور بے اختیار جھلک دکھانے والی مسکراہٹ کو لبوں میں سمیٹ کر کچن کی لائٹ آف کرکے باہر آگئی۔

"آپ خیریت سے ہیں بھابھی۔" اسے بھابھی کی خیریت پوچھنے کا بھی خیال آہی گیا۔

"تمہارے سامنے ہوں۔" وہ خوشدلی سے بولی تھی۔ اگرچہ ان ماں بیٹی کو اپنے درمیان کوئی تیسرا وجود ہمیشہ کھٹکتا تھا۔ مگر زمیلہ کے چلے جانے کے بعد راحت بیگم کے مزاج میں بہت تبدیلی آگئی تھی۔ وہ حریم کو زیادہ سے زیادہ اپنے قریب رکھنا چاہتی تھیں۔ انہیں تنہائی سے بہت گھبراہٹ ہوتی تھی۔

"کھانا لاؤں؟ یا چائے؟"

"نہ کھانا' نہ چائے.... میں حلق تک فل ہوں۔"

وہ بات بہ بات کھلکھلا رہی تھی اور پھر نہ جانے کیوں ماں کو دور ہو کر پریشان کرنے کے درپے رہتی تھی۔ مگر اس وقت تو امی کا بلڈ پریشر بھی خود بخود نارمل ہو گیا تھا۔ نہ جانے کون سی خوش خبری زمیلہ نے ان تک پہنچادی تھی۔ وہ بڑی خوش دکھائی دے رہی تھیں۔ اور یہ کہاں ممکن تھا کہ زمیلہ کی راز بھری باتیں ان کے پیٹ میں زیادہ دیر تک ٹھہری رہیں۔ زمیلہ کے لاکھ سمجھانے پر بھی وہ حریم کو سب کچھ بتا کر ہی دم لیتی تھیں۔ حالانکہ پہلے ان کی یہ ہی کوشش ہوا کرتی تھی اور کم از کم اس گھر کی کوئی خبر حریم تک نہ پہنچ جائے۔

اس کی ایک وجہ شاید یہ بھی تھی کہ پہلے پہل انہیں زمیلہ کا ساتھ میسر تھا۔ اس کی شادی کے بعد وہ خود کو تنہا محسوس کرنے لگی تھیں۔ اور پھر اس تنہائی کو انہوں نے سوچ سمجھ کر بہت خوش اسلوبی کے ساتھ حریم کے ذریعے بانٹ لیا۔ انہوں نے گھاٹے کا سودا تو نہیں کیا تھا۔ اپنے دل کا بوجھ کڑواہٹ سب حریم سے کہہ سن کر خود، بہت شانت ہو جاتی تھیں۔

"ماہیر بھائی کب آئیں گے؟" زمیلہ گھڑی کی طرف دیکھ کر پوچھ رہی تھی۔

"ان کی آج کوئی میٹنگ ہے۔ دیر سے ہی گھر آئیں گے۔" حریم کچن سے فروٹ سے بھری ٹوکری اٹھا لائی تھی۔ اب نفاست سے سیب کاٹ کر پلیٹ میں رکھ رہی تھی۔

"موبی کی طبیعت کیسی ہے؟" یہ سوال ماں کی طرف دیکھ کر کیا جا رہا تھا۔ راحت بیگم نے ٹھنڈی آہ بھری۔

"ٹھیک ہے۔"

"تم اسے اک نظر دیکھ کر آؤ۔ بہت یاد کرتا ہے تمہیں اور فیفا کو۔" حریم نے پلیٹ راحت بیگم کے سامنے رکھ کر زمیلہ سے کہا۔

"اس وقت تو وہ سو چکا ہو گا۔" زمیلہ نے کاہلی سے کہا۔

"دودھ پی کر سوتا ہے۔" راحت بیگم نے سیب کی قاش اٹھاتے ہوئے جتلایا۔

"صبح دیکھ لوں گی۔" اس کی بے زاری عروج پر تھی۔

"کیوں؟" حریم کے ساتھ ساتھ راحت بیگم کو بھی برا لگا۔ ویسے بھی وہ موبی کے معاملے میں بہت حساس تھیں۔

"امی پلیز!" نہ جانے وہ ماں کو کیا سمجھانا چاہتی تھی یا جتانا چاہتی تھی۔ حریم کو محسوس ہوا تھا کہ زمیلہ اس کی موجودگی کے باعث کھل کر کچھ بھی کہنے سے گریزاں ہے۔

حریم دن بھر کی مشقت اور بھاگ دوڑ کی وجہ سے بہت تھک چکی تھی۔ سو جلد ہی معذرت کر کے اٹھ آئی۔ موبی کے لیے دودھ گرم کر کے اسے دینے کے بعد وہ اپنے کمرے کی طرف جا رہی تھی، جب اس نے زمیلہ کی دبی دبی آواز سنی۔

"امی! اس کنڈیشن میں موبی سے دور رہنا ہی مناسب ہے، بچے پر اثر بھی تو پڑ سکتا ہے، عجیب سا وہم سما گیا ہے میرے دل میں، اسی لیے کم کم آتی ہوں۔"

"زمیلہ!" راحت بیگم کا پورا وجود گویا منجمد ہو کر رہ گیا تھا۔ وہ جو یہ سمجھ رہی تھیں کہ زمیلہ کو سسرال والوں کی بے جا پابندیاں میکے آنے سے روکتی ہیں۔ اس کا سفاکانہ قسم کا جواز سن کر وہ گویا پتھر کا بت بن چکی تھیں۔

"موبی کو چھوت کی بیماری نہیں۔۔۔ جو تجھے اور تیرے بچے کو چمٹ جائے گی۔ جو اس گھر میں رہ رہی ہے۔ اسے کبھی کوئی وہم یا خوف نہیں ستایا۔ وہ بھی تو دوسرے جی سے ہے، تو نے میرا دل دکھایا ہے زمیلہ۔" وہ صدمے کے زیر اثر کافی بلند آواز میں کہہ رہی تھیں۔ حریم کے بڑھتے قدم زنجیر پا ہو گئے۔

"موبی کو چھوت کی بیماری نہیں، مگر یہ بیماری موروثی تو ہو سکتی ہے۔" زمیلہ اب روتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

"امی! دعا کیا کریں۔۔۔ اللہ ہمیں اس آزمائش سے بچا لے۔ ہماری ہر نسل نے موبی جیسا ایک فرد برداشت کیا ہے۔ اب یہ غم ہم سے جھیلا نہ جائے گا۔ ہمیں اب کسی موبی کی ضرورت نہیں، کبھی نہیں۔" وہ ماں کی گود میں سر رکھے سسک سسک کر رو رہی تھی۔

باقی آئندہ شمارے میں

سفینہ یاسمین

آتش درد

۳

تیسری اور آخری قسط

فرہاد اپنا سامنہ لے کر رہ گیا تھا اداس اور ملول خالد کے ڈیرے سے واپس آتے ہوئے وہ سوچ رہا تھا کہ آخر خالد نے انکار کیوں کیا اور پھر جلد ہی اس کے دماغ نے اس کا جواب بھی دے دیا۔

محبت اس کی تھی تو مصیبت کوئی اور مول کیوں لیتا۔ پچھلی مرتبہ بدقت تمام خالد نے بندوق پکڑے جانے سے بچائی تھی اور عبداللہ کو بھی پولیس سے جان چھڑوانے کے لیے اپنی اداکارانہ صلاحیتوں کے جوہر آزمانا پڑے تھے۔ ان حالات میں وہ دوبارہ کوئی خطرہ کیونکر مول لیتے۔ انہوں نے اس کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا تھا تو ٹھیک ہی کیا تھا وہ اس کی محبت کی اس داستان میں "بے گانی شادی میں عبداللہ دیوانہ" کا کردار ادا نہیں کر سکتے تھے۔

فرہاد پریشان تو ضرور ہوا تھا لیکن اسے غصہ نہیں آیا تھا۔ ہاں ہلکا سا افسوس ضرور ہوا تھا۔ آخر دوستی بھی تو کوئی چیز تھی؟ تعلق بھی تو کوئی اہمیت رکھتا ہے؟ بہرحال جو بھی تھا اسے تو پل صراط کا یہ سفر طے کرنا ہی تھا۔ یہ خار زار اس کا مقدر تھا اور وہ اس سے نگاہیں نہیں چرا سکتا تھا۔ سو اس نے اپنے دل کو تسلی دی اور واپس اپنی دکان پر چلا آیا۔

جیسے تیسے دن تو گزر ہی گیا لیکن رات جیسے اس نے کانٹوں کے بستر پر گزاری۔ طرح طرح کے واہمے، خدشات اور پریشان کن خیالات نے تمام رات اسے سونے نہیں دیا۔ بقول شاعر۔

رت جگا آج مجھے توڑ کر بچھڑا امجد
اوڑھ کر دھوپ کو یہ کیسی تھکن اٹھی ہے

طلوع آفتاب کے بعد فرہاد کی بالکل یہ ہی کیفیت تھی لیکن تمام اندیشوں، واہموں اور پریشانیوں کے باوجود اس نے مستقبل کی اچھی خاصی منصوبہ بندی بھی کر ڈالی تھی۔ جب سلمٰی نے اسے ناشتے کے لیے بے دار کیا۔ تو اس نے زبردستی بند کی ہوئی اپنی لال انگارہ آنکھیں کھول کر اس کی جانب دیکھا۔

"کیا بات ہے خیریت تو ہے آنکھیں کتنی سرخ ہو رہی ہیں طبیعت تو ٹھیک ہے نا آپ کی۔" سلمٰی نے پریشانی سے پوچھا۔

"ہاں طبیعت کچھ بوجھل سی ہے سر بھاری بھاری ہو رہا ہے شاید بخار ہے۔" فرہاد نے سلمٰی کو بہلاوا دیا۔ بخار تو اسے تھا لیکن یہ بخار جسمانی نہیں تھا یہ تو اس کا اندرونی بخار تھا جس نے آنکھوں سے جھلکتے ہوئے اس کا راز آشکار کر دیا تھا۔

"سر دبا دوں؟" سلمٰی نے محبت سے پوچھا۔

"نہیں بس رہنے دو خود بخود ٹھیک ہو جائے گا۔" فرہاد نے اکتائے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

"اچھا تو پھر جلدی سے اٹھ کر منہ ہاتھ دھو لیں میں ناشتا لگاتی ہوں ناشتے کے بعد دو ٹیبلٹ لے لیجیے گا۔" سلمٰی نے باورچی خانے کی طرف جاتے ہوئے کہا تو فرہاد ایک انگڑائی لیتے ہوئے اٹھا اور واش روم میں گھس گیا۔

جیسے تیسے ناشتا کرنے اور ٹیبلٹ زہر مار کرنے کے بعد وہ دکان کی طرف روانہ ہو گیا۔ سلمٰی اس کے کھنچے کھنچے انداز اور عدم توجہی سے سخت پریشان تھی لیکن اسے اس کا احساس ہی کب تھا وہ شاید کسی اور ہی جہان کی سیر کر رہا تھا اور ایک نئے ستارے کی تسخیر کے لیے اس کے تعاقب میں تھا۔

کیسے تسخیر کر لیے تو نے؟
یہ ستارے تو آسمان کے تھے

پورا دن اس نے ایک عجیب گومگو اور اضطراب کی کیفیت میں گزارا، دن گزرا شام ہوئی اور پھر رات بھی ہو گئی اس کی تمام کوششیں، کاوشیں اور محنت بے کار گئی تھی وہ گاڑی کا بندوبست کر سکا تھا نہ ہی اسلحے کا اور نہ ہی کسی ساتھی کا! لیکن وعدہ تو وفا کرنا ہی تھا۔ اس کے تصور کے پردوں پر ایک حسین عکس نمودار ہوا۔

موٹی موٹی آنکھیں غلافی پلکیں گھنے لمبے سیاہ بال اس نے شرما کر نظریں جھکائیں اور اس کا دل اچھل پچھل ہو کر رہ گیا اسے جانا ہی تھا سو وہ بغیر کسی سواری اور بغیر کسی سہارے کے نکل کھڑا ہوا۔

رات کے تقریباً دس بج چکے تھے اور وہ شہر سے باہر جانے والی سڑک پر قدم بقدم چلتا ہوا آگے ہی آگے بڑھتا چلا گیا اور پھر تقریباً بیس منٹ کی مسافت کے بعد وہ شہر کی پتھریلی اور پختہ سڑک کو چھوڑ کر ایک کچے راستے پر مڑ گیا۔ گھومتا لہراتا بل کھاتا ہوا یہ ٹیڑھا میڑھا سا راستہ اس کے گاؤں کی طرف جاتا تھا۔

ماحول پہ گہری تاریکی کا راج تھا ہر طرف ایک عجیب ہو کا عالم طاری تھا۔ دونوں اطراف بلند و بالا درخت سر اٹھائے کھڑے تھے۔ جو گہرے اندھیرے اور تاریکی میں کسی بھوت کی مانند دکھائی دے رہے تھے لیکن وہ اپنی ہی دھن میں مست چلتا چلا جا رہا تھا، پیدل بنا کسی سہارے کے اور کیوں نہ چلتا یہ جذبہ ہی ایسا تھا۔

یہ وہ جذبہ تھا جس نے رانجھا کو سالوں کی بھینسیں چرانے پر مجبور کر دیا تھا، یہ وہ جذبہ تھا جس نے مجنوں کو صحراؤں کی خاک چھاننے پر مجبور کر دیا تھا یہ وہ جذبہ تھا جس نے فرہاد کو پہاڑوں میں سے دودھ کی نہر کھود نکالنے پر مجبور کر دیا تھا۔ یہ وہ جذبہ تھا جس نے سوہنی کو کچے گھڑے پر دریا عبور کرنے کے لیے مجبور کر دیا تھا۔ عشق اور مجبوری دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ وہ سب اپنی اپنی مجبوری کا شکار رہے تھے اپنی محبت کی مجبوری...... دودھ کی نہر نکالنے والا بھی فرہاد تھا اور آج اس کچے رستہ پر پیدل چل کر جانے والا بھی فرہاد تھا۔ اس نے شیریں کے لیے دودھ کی نہر نکالی تھی۔ تو یہ شائستہ کے لیے پیدل چل رہا تھا۔ اگر وہ سب مجبور تھے تو فرہاد بھی مجبور تھا۔ اسے یہ سفر کرنا ہی تھا کیوں کہ وہ جانتا تھا۔

یہ عشق نہیں آساں بس اتنا سمجھ لیجیے
اک آگ کا دریا ہے اور ڈوب کے جانا ہے

سو وہ آتش دروں کا مارا اپنی ہی آگ میں جلتا چلتا جا رہا تھا۔ وقت تیزی سے سرکتا رہا اور فرہاد کے قدموں کے نیچے سے زمین...... پھر آخر کار اس کا یہ سفر تمام ہوا، وہ محبوب کے در تک آ پہنچا تھا منزل اس کے سامنے تھی! لیکن منزل کہاں تھی؟ یہ تو منزل کا استعارہ تھا! منزل کا ایک نشان تھا! اور یہ شائستہ کے گھر کا دروازہ تھا۔

شائستہ وہاں موجود نہیں تھی۔ اس نے بے قراری سے رسٹ واچ پر نظریں دوڑائیں گیارہ بج کر چالیس منٹ ہوئے تھے گویا وہ پیدل چل کر بھی مقررہ وقت سے بیس منٹ پہلے آن پہنچا تھا اور یہ اس کے جذبہ عشق کے صادق ہونے کی دلیل تھی وہ بے چینی سے ادھر ادھر ٹہلنے لگا اس کی نگاہیں بار بار شائستہ کے گھر کے بند دروازے سے ٹکرائیں اور پھر مایوس و نامراد واپس لوٹ آئیں۔ دروازہ مسلسل بند تھا اور وہ بار بار اضطراری انداز میں رسٹ واچ پر بھی نظریں دوڑا رہا تھا۔ وقت جیسے تھم سا گیا تھا اور گھڑی کی سوئیاں جیسے اپنی جگہ ساکن ہو گئی تھیں انتظار کا کرب اور اذیت وہ ہی محسوس کر سکتا ہے جس کا اس سے واسطہ پڑا ہو۔

اس وقت وہ اسی کرب اور اذیت سے ہمکنار تھا اور لمحہ لمحہ گن کر گزار رہا تھا آخر کار طویل انتظار کی یہ گھڑیاں مکمل ہوئیں اور اس کی نظروں کے سامنے جیسے ایک چاند سا طلوع ہو گیا تھا شائستہ اس کے سامنے تھی اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا ہینڈ بیگ تھا اور اس نے بڑی سی چادر اوڑھ رکھی تھی فرہاد نے بے قابو ہوتی ہوئی دھڑکنوں کو سنبھالا دیتے ہوئے اس کے قریب آنے کا انتظار کیا اور پھر اس نے اس کے قریب آ کر بے باکی سے اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔

"تمہاری بھیجی ہوئی دوا نے اپنا کام دکھا دیا۔ سب گہری نیند سو رہے ہیں اب ہمیں دیر نہیں کرنی چاہیے۔" اور فرہاد جو شائستہ کے ہاتھ کے لمس کو محسوس کرتے ہوئے بے خود سا ہوا جا رہا تھا چونک کر ہوش میں آ گیا۔

"ٹھیک ہے چلو لیکن شائستہ! آج میں کسی سواری کا انتظام نہیں کر سکا پیدل یہاں تک آیا ہوں اور پیدل ہی واپس جانا پڑے گا کیونکہ کسی سواری کا انتظام نہیں تھا اس لیے میں اپنا بیگ اور نقدی بھی نہیں لا سکا۔" فرہاد نے پریشان ہوتے ہوئے جواب دیا تو شائستہ لاپرواہی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولی۔

"اس کی تم فکر نہیں کرو۔ کل ہی بھینس کا سودا ہوا تھا، وہ ساری رقم اور کچھ زیورات بھی میں نے اس بیگ میں رکھ لیے ہیں۔" شائستہ نے بیگ کو تھپتھپایا۔

"وہ سب تو ٹھیک ہے لیکن بہرحال کپڑے تو مجھے گھر سے اٹھانا پڑیں گے کچھ رقم ہے وہ بھی لے لوں گا۔ کیا خبر کیا حالات پیش آئیں اور ہمیں کتنے دن باہر رہنا پڑے؟" فرہاد نے طویل سانس لیتے ہوئے کہا۔

"چلو ٹھیک ہے پہلے یہاں سے تو نکلو۔" شائستہ نے فرہاد کا بازو پکڑ کر کھینچتے ہوئے کہا پھر کچھ ہی دیر کے بعد وہ شانہ بشانہ گاؤں سے باہر جاتے ہوئے کچے راستے پر گامزن تھے شائستہ اس کے ساتھ تھی اور اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے پوری کائنات اس کے ساتھ محوِ سفر ہو' اس کا دل خوشی سے سرشار تھا اور قدم جیسے ہواؤں میں پڑ رہے تھے۔

رات کی تاریکی سناٹا' تنہائی اور دو پیار کرنے والے دل ایک ساتھ دھڑکتے ہوئے لمحہ لمحہ گاؤں کی فضا سے دور ہوتے چلے گئے جب ان کے قدموں نے پختہ سڑک کو چھوا تو فرہاد نے بے اختیار اردگرد نظریں دوڑائیں لیکن دور دور تک کوئی ذی روح دکھائی نہیں دیا اس نے اطمینان سے طویل سانس لی اور پھر دونوں شہر کی طرف بڑھتے چلے گئے۔

سفر اپنے اختتام کو پہنچا وہ شائستہ کے ساتھ بخیریت اپنے دروازے پر کھڑا تھا گھر کی تمام لائٹس آف تھیں اور ان کا گھر ہی کیا پورا محلہ گہری خاموشی میں ڈوبا ہوا تھا اس نے ایک نظر رسٹ واچ پر ڈالی رات کے دو بج رہے تھے پھر وہ شائستہ کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے بولا۔

"تم یہاں رکو میں کپڑوں کا بیگ اٹھا کر ابھی آتا ہوں۔" پھر اس نے حسبِ معمول دونوں ہاتھ اٹھا کر گیٹ کی اوپری سطح پر جمائے پھر اس نے دونوں ہاتھوں پر وزن ڈالتے ہوئے اپنے جسم کو اوپر اٹھایا ہی تھا۔ ٹھیک اسی لمحے دروازہ خود بخود کھلا اور اس میں سے ایک ہاتھ نمودار ہوا جس نے اس کے بالوں کو اپنی گرفت میں لے لیا اگلے ہی لمحے وہ جیسے گھسٹتا ہوا گھر کے اندر [illegible] "دھکٹ" کی آواز [illegible] منظر فرہاد کو نظر آیا [illegible]

"امی جان آپ......؟" اس نے شدت حیرت سے مغلوب ہو کر بے اختیار کہا امی جان کا ایک ہاتھ کولہے پر اور دوسرا ہاتھ ابھی تک بدستور اس کے بالوں میں تھا امی جان سے کچھ ہی فاصلے پر ازلان شاہ بھی موجود تھے اور اسے خشمگیں نظروں سے گھور رہے تھے ان کے عقب میں سلمیٰ بھی نظر آ رہی تھی جس کے بال بکھرے ہوئے تھے اور آنکھیں شاید رو رو کر بری طرح سوجی ہوئی تھیں۔

صرف ایک لمحے کا جائزہ ہی اسے تمام تر حالات سے آگاہ کر گیا تھا۔ ابھی وہ اس نامساعد صورت حال سے بچاؤ کا ذریعہ تلاش بھی نہیں کر پایا تھا کہ امی جان نے اس کے بالوں کو ایک جھٹکا دے کر اٹھایا اور پھر اسے ازلان شاہ کی طرف دھکیل دیا امی جان کا دوسرا ہدف بیرونی دروازے کے باہر کھڑی ہوئی شائستہ بنی کچھ ہی دیر کے بعد اس کے قریب ہی شائستہ بھی مجرموں کی طرح سر جھکائے کھڑی تھی گیٹ اندر سے بند کر دیا گیا تھا اور صورت حال خاصی گمبھیر نظر آ رہی تھی چند لمحوں کی خاموشی کے بعد ازلان شاہ کی پاٹ دار آواز بلند ہوئی۔

"شرم آتی ہے مجھے تمہیں اپنا بیٹا کہتے ہوئے' کیا میری تربیت کا یہی انعام ہے؟ ناک کٹوا دی تم نے میری۔" وہ گرج رہے تھے اور فرہاد خاموشی سے کھڑا ان کو سن رہا تھا یہ سب کچھ تو اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا جو ہوا تھا ٹھیک نہیں ہوا تھا' اس کا تو منصوبہ ہی کچھ اور تھا اس نے سوچا تھا کہ وہ چوروں کی طرح خاموشی سے گھر میں داخل ہو گا کپڑوں کا بیگ اور نقدی اٹھائے گا اور پھر وہ اور شائستہ لاہور کے لیے روانہ ہو جائیں گے لیکن یہاں سارا معاملہ چوپٹ ہو کر رہ گیا تھا' پتا نہیں کیسے امی جان کو خبر ہو گئی بلکہ ناصرف امی جان اس کے والد ازلان شاہ اور اس کی بیوی سلمیٰ سب کے سب جاگ رہے تھے اور انہوں نے اس کو رنگے ہاتھوں پکڑ بھی لیا تھا جو اس کی پلاننگ اور منصوبہ بندی کے خلاف تھا۔

حالات یک دم ہی ناموافق سمت اختیار کر گئے تھے

اور اسے ان حالات سے چھٹکارا حاصل کرنے کی کوئی راہ سجھائی نہیں دے رہی تھی وہ پریشان انداز میں خاموش کھڑا ازلان شاہ کی ڈانٹ ڈپٹ کو برداشت کرتا رہا ادھر امی جان شائستہ کے لتے لے رہی تھیں اور اسے کوسنے دیتے ہوئے بے نقط سنا رہی تھیں۔

"پتا نہیں کیسے پیدا ہو گئی سادات میں کلموہی۔ میرے بیٹے کا بسا بسایا گھر اجاڑ رہی ہے ڈائن کہیں کی' اتنی ہی آگ لگی تھی تو ماں باپ سے کہتی کہیں نہ کہیں تو شادی کر ہی دیتے؟"

یہاں فرہاد سے خاموش رہنا مشکل ہو گیا اپنی حد تک تو وہ سب کچھ سن سکتا تھا' برداشت کر سکتا تھا لیکن شائستہ کی یہ بے عزتی اسے قبول نہ تھی وہ بے اختیار کہہ اٹھا۔

"محبت کرتی ہے وہ مجھ سے امی جان اور یہ کوئی جرم نہیں آپ ہمارا راستہ مت روکیں۔"

"اور یہ نصیبوں جلی سلمیٰ؟ کیا یہ تم سے محبت نہیں کرتی اور تم خود بھی تو اس کی محبت کے دعوے دار تھے' کل تک تو اس کے لیے زہر کھانے کو بھی تیار تھے اب کہاں گئی وہ تمہاری محبت؟ اس کے بارے بھی سوچا اس کا کیا ہو گا؟" امی جان نے فرطِ غضب سے کپکپاتے ہوئے کہا تو فرہاد پھر گویا ہوا۔

"اسے کوئی تکلیف نہیں ہو گی یہ مجھ سے محبت کرتی ہے اور میں بھی اس سے محبت کرتا ہوں جانے انجانے میں زیادتی تو شائستہ کے ساتھ ہو گئی..... محروم تو وہ رہ گئی اور اب میں اسے اپنا کر اپنی تمام تر زیادتیوں اور اس کی تمام تر محرومیوں کا ازالہ کر رہا ہوں میں سلمیٰ کو چھوڑ نہیں رہا وہ پہلے بھی میری بیوی تھی اور اب بھی میری بیوی ہی رہے گی سوائے اس گھر میں ایک فرد کا اور اضافہ ہونے کے کوئی بڑی تبدیلی نہیں آئے گی اور پھر شریعت بھی تو اس کی اجازت دیتی ہے میں کوئی گناہ تو نہیں کر رہا نا؟"

"بند کرو اپنی یہ بکواس..... بڑے آئے شریعت کے ٹھیکیدار۔" ازلان شاہ غصے سے دھاڑ اٹھے۔

"صبح یہ اس لڑکی کو اس کے ورثا کو واپس کروں گا میں اور تم دفع ہو جاؤ اپنے کمرے میں دور ہو جاؤ میری نظروں سے ناخلف اولاد۔" ازلان شاہ کا پارہ آسمان کو چھو رہا تھا۔

"دیکھیں ابو جان سمجھنے کی کوشش کریں اس طرح یہ معاملہ مزید بگڑ جائے گا آپ پلیز ہمیں یہاں سے جانے دیں۔" فرہاد نے رو دینے والے انداز میں ازلان شاہ کی منت کی۔

"میں کہتا ہوں دور ہو جاؤ میری نظروں سے' ہمیں نے جو کہہ دیا سو کہہ دیا اور تم اس لڑکی کو لے کر اپنے کمرے میں چلو باقی ماندہ رات یہ ہماری نگرانی میں گزارے گی۔" ازلان شاہ نے امی جان کی طرف دیکھتے ہوئے سخت انداز میں کہا اور امی جان بڑی فرماں برداری سے ان کے حکم پر عمل پیرا ہو گئیں۔

فرہاد کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس صورت حال سے کیسے نبٹے بہرحال جو کچھ بھی تھا۔ ازلان شاہ اس گھر کے سربراہ تھے اور جس طرح ہر گھر کے کچھ ضابطے اور اصول ہوتے ہیں اسی طرح اس گھرانے میں بھی ازلان شاہ کے فیصلے کو ہمیشہ سے حتمی حیثیت حاصل تھی اور ان کے کیے ہوئے فیصلے پر دم مارنے کی جرات کسی میں نہ تھی وہ بے بسی سے پہلو بدل کر رہ گیا۔

ازلان شاہ اپنا حکم سنانے کے بعد اپنے کمرے میں جا چکے تھے ادھر امی جان بھی شائستہ کو بازو سے پکڑے ان کے پیچھے پیچھے کمرے میں جا چکی تھیں فرہاد نے دزدیدہ نظروں سے سلمیٰ کی طرف دیکھا اور پھر وہ بھی اپنے کمرے میں داخل ہو گیا وہ سخت بے چین تھا ادھر سلمیٰ کی حالت ایسی تھی کہ اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ اسے کیسے تسلی دے' سلمیٰ سے اس کی محبت کی شادی تھی لیکن موجودہ صورت حال نے شاید اس محبت کا گلا گھونٹ دیا تھا سلمیٰ بھی اس کے تعاقب میں کمرے میں آ چکی تھی اور اس کی آنکھیں جیسے ساون بھادوں بن کر رہ گئی تھیں اور بارش کی طرح برس رہی تھیں فرہاد نے پریشانی سے اس کی طرف دیکھا اور پھر اس کا بازو پکڑتے ہوئے بولا۔

"دیکھو سلمٰی میری مجبوری کو سمجھنے کی کوشش کرو...میں..."

"اب سمجھنے اور سمجھانے کو رہ ہی کیا گیا ہے میں کچھ سننا نہیں چاہتی۔" سلمٰی نے ایک جھٹکے سے بازو چھڑاتے ہوئے اس کی بات درمیان میں ہی کاٹتے ہوئے کہا۔

رات باقی رہ ہی کتنی گئی تھی فجر کی اذان تک وہ سلمٰی کو سمجھانے کی کوشش کرتا رہا لیکن اسے کوئی کامیابی حاصل نہ ہوئی سلمٰی زاروقطار روتی رہی اور فرہاد کے تمام الفاظ جیسے اس کے اشکوں کے ساتھ کہیں بہتے چلے جارہے تھے یوں لگتا تھا جیسے فرہاد کا ہر لفظ' ہر جملہ اپنی تاثیر کھو چکا ہے۔

صبح کاذب نمودار ہو چکی تھی جب اسے صحن میں اذلان شاہ کی آواز سنائی دی وہ امی جان سے مخاطب تھے۔

"میں جاوید ورک کی طرف جارہا ہوں تاکہ اس سے بات کرکے لڑکی ان لوگوں کے حوالے کی جاسکے' تم خیال رکھنا فرہاد تمہارے کمرے میں نہ آئے اور یہ لڑکی بھی ادھر نہ جائے میں معاملات طے کرکے واپس آتا ہوں۔"

اور پھر اذلان شاہ کے دور ہوتے ہوئے قدموں کی چاپ سنائی دی وہ جاچکے تھے جاوید ورک علاقے کا ایم پی اے تھا اور اذلان شاہ کی بہت عزت کرتا تھا شاید معتبر شخصیات کا سہارا لے کر اذلان شاہ شائستہ کے گھر والوں سے رابطہ کرنا چاہ رہے تھے فرہاد کا دل جیسے مٹھی میں آیا ہوا تھا اس کی ساری محنت بے کار گئی تھی ابھی اذلان شاہ کو گئے ہوئے زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ یکے بعد دیگرے صحن میں ہلکے ہلکے سے دھماکوں کی آواز سنائی دی۔ عجیب سی آواز تھی جیسے بلندی سے کوئی چیز گری ہو لیکن اگر چیز گرتی تو ایک مرتبہ گرتی اسے تو یہ آواز تقریباً" تین سے چار مرتبہ سنائی دی تھی اس نے حیرت سے ہونٹ سکوڑے اور پھر صورت حال جاننے کے لیے کمرے سے باہر نکلا لیکن باہر کا منظر دیکھ کر اس کی آنکھیں حیرت سے پھیلتی چلی گئیں

اونچے لمبے قد کاٹھ کے مالک تین چار افراد اچانک اس کے سامنے آگئے تھے۔

"فرہاد کون ہے؟" ان میں سے ایک کی آواز بلند ہوئی۔

"میں ہوں! لیکن پہلے تم بتاؤ کہ تم کون ہو؟ اور اس طرح تمہیں میرے گھر میں گھسنے کی جرات کیسے ہوئی ہے؟" فرہاد نے غصیلے انداز میں سوال کیا فرہاد کا جملہ مکمل ہوتے ہی وہ چاروں چیل کی طرح جھپٹے تھے ایک کا ہاتھ اس کے گریبان پر تھا اور دوسرے نے اسے گدی سے پکڑ کر دبوچ رکھا تھا۔

"ابھی بتاتے ہیں بیٹا! ذرا باہر تو نکلو۔" اور پھر اسے بری طرح گھسیٹتے ہوئے بیرونی گیٹ کی جانب بڑھے لمبے تڑنگے ان افراد کا قد کاٹھ اور ڈیل ڈول ایسا تھا کہ فرہاد ان کی گرفت میں کسی بے بس چڑیا کی مانند پھڑپھڑا کر رہ گیا۔ بیرونی گیٹ کھول کر جونہی وہ باہر نکلے فرہاد کے چودہ طبق روشن ہوگئے دروازے کے بالکل سامنے جو سب سے پہلا چہرہ اسے نظر آیا وہ شیر افگن تھا۔

شائستہ کا بھائی شیر افگن اس کے سامنے کھڑا تھا! پھر منظر ذرا واضح ہوا تو ایک عدد پولیس جیپ اور بہت سے باوردی اور مسلح پولیس والے بھی نظر آنے لگے صورت حال کافی حد تک اس کی سمجھ میں آچکی تھی اس کے گھر میں داخل ہونے والے چاروں سادہ لباس اشخاص بھی یقیناً" پولیس والے ہی تھے اور اس کو سنائی دینے والے دھماکے ان چاروں افراد کے صحن میں کودنے کی وجہ سے سنائی دیے تھے اسے شائستہ کے گھر والوں کی یہ پھرتی سمجھ میں نہیں آرہی تھی وہ حیران تھا کہ انہیں کیسے معلوم ہوگیا کہ شائستہ اس کے ساتھ آئی ہے؟ اور پھر وہ سب تو خواب آور دوا کے زیر اثر مزے کی نیند سو رہے تھے پھر اتنی صبح صبح جبکہ سورج بھی نہیں نکلا تھا وہ پولیس کے ہمراہ سیدھے اس کے دروازے تک کیسے آپہنچے تھے؟ وجہ جو بھی رہی ہو لیکن بہرحال ایسا ہو چکا تھا۔

"لڑکی کہاں ہے؟ اسے بھی لے کر آؤ۔" شیر افگن ان چاروں افراد سے مخاطب تھا جنہوں نے اسے بری

طرح دبوچ رکھا تھا اور وہ چاروں اسے گھسیٹتے ہوئے دوبارہ گھر میں داخل ہوگئے ٹھیک اسی لمحے امی جان اپنے کمرے سے برآمد ہوئیں اور باہر کی صورت حال نظر پڑتے ہی ان کے حلق سے بے اختیار ایک چیخ سی نکل گئی انہوں نے جلدی سے دوپٹہ درست کیا اور پھر ان کی بارعب آواز سنائی دی ایک عجیب سی تمکنت اور وقار تھا ان کے لہجے میں۔

"کون ہو تم لوگ؟ کیوں پکڑ رکھا ہے اسے؟ اور میرے گھر کی چار دیواری میں داخل ہونے کی جرات کیسے ہوئی تم لوگوں کو؟"

"ابھی بتاتے ہیں پہلے یہ بتاؤ لڑکی کہاں ہے؟" ٹھیک اسی لمحے شاید صحن میں ہونے والے شوروغل کی آواز سن کر سلمٰی اپنے کمرے سے باہر نکلی تھی لیکن صحن میں موجود غیر افراد پر نظر پڑتے ہی اس نے جلدی سے چہرہ دوپٹے کے پیچھے چھپالیا۔

"اچھا تو یہ ہے لڑکی؟ چلو لڑکی تم بھی باہر نکلو۔" ایک سادہ لباس والے نے سلمٰی کی طرف دیکھتے ہوئے غراہٹ آمیز آواز میں کہا۔

"یہ اس کی بیوی اور میری بہو ہے کس کی جرات ہے جو اسے یہاں سے لے جاسکے تم کس لڑکی کی تلاش میں ہو؟" امی جان کی دبنگ آواز بلند ہوئی۔

"اچھا یہ اس کی بیوی ہے؟ تو پھر وہ لڑکی کہاں ہے جسے یہ رات لے کر آیا ہے...." پولیس والے نے استفہامیہ انداز میں سوال کیا تو امی جان گویا ہوئیں۔

"یہاں کوئی اور لڑکی نہیں ہے اسے لے جاتے ہو تو لے جاؤ لیکن اب دوبارہ میرے گھر کے اندر داخل ہونے کی جرات نہیں کرنا ورنہ اپنی ٹانگوں پر چل کر واپس نہیں جاسکو گے؟" امی جان گرج رہی تھیں اور سادہ لباس والے ان کا یہ انداز دیکھ کر اور ان کا لہجہ سن کر حیرت سے ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہ گئے پھر وہ ڈنڈا ڈولی کرنے کے انداز میں اسے پکڑے ہوئے گھر سے باہر نکل آئے انہوں نے بے دردی سے اسے پولیس جیپ میں دھکیل دیا پھر ان میں سے ایک نے شیر افگن سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

"لڑکی یہاں نہیں ہے اور سرچ وارنٹ کے بغیر ہم گھر کی تلاشی نہیں لے سکتے' جتنا ہوگیا یہ بھی ضرورت سے زیادہ ہے' تھانے چلتے ہیں اور اسی سے اگلواتے ہیں۔" اور شیر افگن نے سر ہلادیا پھر کچھ ہی دیر کے بعد پولیس جیپ میں بیٹھا فرہاد ایک مرتبہ پھر تھانے کی طرف عازم سفر تھا جبکہ پولیس جیپ کے پیچھے پیچھے موٹر سائیکل پر سوار شیر افگن ان کے تعاقب میں تھا۔

تھانے پہنچنے کے بعد اسے ایک جانے پہچانے پولیس آفیسر کے سامنے پیش کیا گیا جس کی عقابی نظریں مسلسل اس کا ایکسرے کرنے میں مصروف تھیں۔

"کیوں اوئے رانجھے کڑی کتھے آ؟" (کیوں بھئی رانجھے لڑکی کہاں ہے؟) پولیس آفیسر جو کہ راؤ امداد کے علاوہ دوسرا کوئی نہ تھا گرجتے ہوئے بولا۔

"او جی میں تے پہلے ہی کیا سی کہ رولا کڑی دا اے۔" (میں نے تو پہلے ہی کہا تھا کہ معاملہ لڑکی کا ہے) ایک دوسری آواز فرہاد کی سماعتوں سے ٹکرائی اور یہ آواز ہیڈ کانسٹیبل اکرم کے سوا اور کسی کی نہ تھی! فرہاد نے ایک نظر اکرم کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"میں کسی لڑکی کے بارے میں کچھ نہیں جانتا میں تو اپنے گھر پر تھا کہ یہ لوگ زبردستی گھر میں گھس آئے اور مجھے اٹھا کر یہاں لے آئے۔"

"اوئے پاؤ اینوں لمیاں۔ دس منٹ دے اندر مینوں کڑی دا پتا چاہی دا اے۔" (اسے لمبا لٹاؤ دس منٹ کے اندر مجھے لڑکی کا ایڈریس چاہیے)

سب انسپکٹر کی دھاڑ سنائی دی اور پولیس والے وحشی بھیڑیوں کی طرح اس پر ٹوٹ پڑے تھے ڈنڈا ڈولی کرکے اسے اٹھایا گیا اور پھر یک لخت زمین پر پٹخ دیا گیا اب وہ زمین پر الٹا لیٹا ہوا تھا' یوں کہ اس کے دونوں بازو صلیب کی شکل میں کھلے ہوئے تھے دو بھاری بھرکم پولیس والے تیزی سے آگے بڑھے اور دائیں بائیں اس کے دونوں بازوؤں پر چڑھ کر کھڑے ہوگئے یہی حشر اس کی ٹانگوں کے ساتھ کیا گیا اب بیک وقت چار پولیس والے اس کی ٹانگوں اور بازوؤں پر چڑھے کھڑے

تھے پھر ایک جانب سے ایک طویل الجثہ سانڈ نما پولیس والا برآمد ہوا جو شکل صورت سے کوئی افریقی حبشی معلوم ہوتا تھا اس کے ہاتھ میں وہ خوفناک چیز جھولتی ہوئی نظر آرہی تھی جیسے پولیس والے "چھتر" کے نام سے یاد کرتے تھے قریب قریب ڈیڑھ فٹ لمبا موٹے چمڑے کا ایک ٹکڑا تھا جس کے پیچھے لکڑی کی مٹھ لگائی گئی تھی چمڑے کے اس ٹکڑے پر جلی حروف میں لکھا ہوا جملہ "آجا مورے بالما تیرا انتظار ہے" صاف نظر آرہا تھا پھر اس سانڈ نما انسان نے لکڑی کی مٹھ پر دونوں ہاتھوں کی گرفت مضبوط کی اور پھر جھوم کر اس نے دونوں ہاتھ فضا میں بلند کیے پھر اس کے ہاتھ تیزی سے نیچے آئے "شڑاپ" کی آواز بلند ہوئی اور "چھتر" پوری قوت سے فرہاد کے جسم کے ناقابل وضاحت حصے سے ٹکرایا اور اسے یوں لگا جیسے اس کے جسم کا گوشت پھٹ گیا ہو۔

تکلیف اور اذیت کی ایک شدید لہر تھی جو اس کے رگ و پے میں سرائیت کر گئی تھی اور درد کی اس لہر نے جیسے اس کے پورے وجود کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا اس کے حلق سے بے اختیار نان اسٹاپ چیخیں بلند ہونے لگیں پنجاب پولیس کی تھرڈ ڈگری کے اس مخصوص انداز کے بارے میں درست طور پر وہی بتا سکتا ہے جس کا کبھی اس سے واسطہ پڑا ہو وہاں کی پولیس کے بارے میں مشہور ہے کہ ان کے سامنے پتھر بھی فرفر بولنے لگتا ہے اور فرہاد کو اس کا عملی تجربہ حاصل ہو رہا تھا۔

سانڈ نما آدمی کے ہاتھ ایک مرتبہ پھر فضا میں بلند ہوئے "شڑاپ" درد و کرب کی ایک اور لہر اس کے پورے وجود میں پھیل گئی ایک ناقابل بیان اذیت تھی جس کا اس وقت اسے سامنا تھا اس نے تڑپ کر سیدھا ہونے کی کوشش کی لیکن اسے کامیابی حاصل نہیں ہوئی چار بھاری بھرکم ہاتھی نما انسان اس کی ٹانگوں اور بازوؤں پر چڑھے کھڑے تھے اس کا حوصلہ پست ہو گیا اور ساری خودداری دھری کی دھری رہ گئی وہ بے اختیار چلایا۔

"رک جاؤ' خدا کے لیے رک جاؤ میں سب کچھ بتاتا ہوں۔" سانڈ نما انسان نے سوالیہ نظروں سے سب انسپکٹر کی طرف دیکھا اور پھر اس کا اشارہ پاکر پیچھے ہٹ گیا چاروں آدمی بھی اس کے وجود سے نیچے اتر آئے اور پھر انہوں نے اسے کسی بے جان کیچوے کی مانند گھسیٹ کر کرسی پر بیٹھے ہوئے سب انسپکٹر کے قدموں میں بٹھا دیا سب انسپکٹر نے اپنے ہاتھ میں موجود بید کی اسٹک کی مدد سے اس کی ٹھوڑی اوپر اٹھاتے ہوئے اس کی آنکھوں میں جھانکا اور پھر درندگی آمیز انداز میں غرایا۔

"صرف سچ میری جان دے ٹوٹے! نئیں تے تیرے ٹوٹے کر کے کتیاں نوں کھوا دیاں گا۔" (صرف سچ بولنا ورنہ تمہارے ٹکڑے کر کے کتوں کو کھلا دوں گا۔)

سب انسپکٹر کا انداز اور لہجہ دیکھ کر فرہاد کے رہے سہے اوسان بھی خطا ہو گئے پھر وہ ٹیپ ریکارڈ کی طرح اسٹارٹ ہو گیا تھا۔

سب انسپکٹر کے ہر سوال کا جواب وہ فرفر یوں دیتا چلا گیا جیسے اسکول میں استاد کو سبق سنا رہا ہو' اختر کے خطوط سے لے کر شائستہ تک پہنچنے' وہاں ہونے والی گفتگو' وہاں سے اس کو لے کر آنے تک کی داستان سنانے کے ساتھ ساتھ لاہور جانے کورٹ میرج کرنے کے متعلق بھی اس نے سب کچھ بتا دیا معاملہ پھر وہیں پر آن رکا تھا کہ شائستہ کہاں ہے؟ اور فرہاد نے یہاں بھی سچ بولتے ہوئے سب کچھ صاف صاف بتا دیا پھر کچھ ہی دیر کے بعد پولیس والوں کے ہمراہ پولیس جیپ میں سوار وہ دوبارہ اپنے گھر کی جانب رواں دواں تھا لیکن وہاں پہنچ کر جو صورت حال سامنے آئی اس نے فرہاد کے ہوش اڑا کر رکھ دیے تھے۔

امی جان کے بقول ان لوگوں کے گھر سے تھانے جانے کے کچھ ہی دیر کے بعد شائستہ وہاں سے جا چکی تھی یہ سن کر سب انسپکٹر طیش میں آگیا اور بولا۔

"لے چلو اینوں تے چل کے پالو لمیاں۔" (لے چلو اسے اور دوبارہ لمبا لٹاؤ) پولیس والوں نے اسے گھسیٹتے

ہوئے دوبارہ گاڑی میں پھینکا اور واپس تھانے لے آئے لیکن سب انسپکٹر کے فرمان کے مطابق اسے دوبارہ لمبا نہیں لٹایا گیا تھا بلکہ اسے حوالات میں دھکیل دیا گیا اور باہر سے تالا لگا دیا گیا حوالات میں تین چار لوگ پہلے سے موجود تھے لیکن وہ ان کی طرف کوئی توجہ دیے بغیر ایک کونے کے اندر گھٹنوں میں سر دے کر بیٹھ گیا۔

اسے امید تھی کہ جلد ہی اس کے والد اذلان شاہ کو اس بارے میں اطلاع مل جائے گی اور وہ اس کے بچاؤ کا کوئی نہ کوئی راستہ ضرور نکال لیں گے لیکن اگلے تین چار گھنٹوں تک اس کی یہ امید بر نہ آسکی اذلان شاہ کی آمد کے بارے میں کچھ پتا چلا تھا اور نہ ہی دوبارہ اسے حوالات سے باہر نکالا گیا تھا طرح طرح کے خدشات سے نبرد آزما ہوتے ہوئے پتا نہیں کتنی دیر گزر چکی تھی جب حوالات کے دروازے میں چابی گھومنے کی آواز سنائی دی ہیڈ کانسٹیبل اکرم اور ظفری حوالات میں داخل ہوئے جو اسے پکڑ کر حوالات سے باہر لے آئے۔

تھانے کے صحن میں راؤ امداد کرسی ڈالے براجمان تھا بہت سے پولیس والے بھی ارد گرد موجود تھے جن کے نرغے میں برقعہ پہنے مجرموں کی طرح سر جھکائے شائستہ کھڑی ہوئی تھی یہ منظر دیکھ کر اس کا دل دھک سے رہ گیا تو بالآخر شائستہ کو ڈھونڈ ہی لیا گیا تھا۔ اسے بھی لے جا کر شائستہ کے برابر کھڑا کر دیا گیا ایک جانب ایک کرسی پر شیر افگن بھی بیٹھا ہوا تھا۔

"ہاں بی بی کنے بندے سن ایدے نال تے کیویں لے آئے تینوں؟" (ہاں بی بی کتنے آدمی تھے اس کے ساتھ اور کیسے لے آئے تمہیں؟)

سب انسپکٹر نے شائستہ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا شائستہ نے ایک نظر فرہاد کے چہرے پر ڈالی اور پھر سب انسپکٹر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی۔

"یہ مجھے لے کر نہیں آیا میرے گھر والوں کا سلوک میرے ساتھ اچھا نہیں تھا میں نے اپنی مرضی سے گھر چھوڑ دیا۔" شائستہ کا جواب سن کر غصے سے سب انسپکٹر کی مٹھیاں بھینچ گئیں اس نے مضبوطی سے دانت پر دانت یوں جمائے تھے کہ اس کے جبڑوں کی ہڈیاں ابھر آئی تھیں پھر جب وہ بولا تو اس کے لہجے میں جیسے کوئی آتش فشاں دہک رہا تھا۔

"ظفری! اکرم! اندر لے چلو اینوں۔" (ظفری اور اکرم اسے اندر لے چلو) سب انسپکٹر کا جملہ مکمل ہوتے ہی ظفری اور اکرم تیزی سے حرکت میں آگئے اور پھر شائستہ کو گھسیٹتے ہوئے ایک کمرے میں لے گئے سب انسپکٹر راؤ امداد بھی اٹھ کر ان کے پیچھے پیچھے کمرے میں داخل ہوا اور ایک زوردار دھماکے کی آواز کے ساتھ کمرے کا دروازہ بند ہو گیا۔

ٹھیک اسی لمحے اذلان شاہ تھانے کی عمارت میں داخل ہوا فرہاد کی نظر ان کے چہرے پر پڑی تو جیسے اس کی جان میں جان آگئی اذلان شاہ کے ساتھ ایم پی اے جاوید ورک بھی تھے اذلان شاہ نے ایک نظر فرہاد کی طرف دیکھا اور بغیر کچھ کہے ایم پی اے جاوید ورک کے ہمراہ ایس ایچ او کے کمرے کی طرف بڑھ گئے جو ان سے کافی فاصلے پر اور کمروں کی قطار کے آخری سرے پر واقع تھا۔

ٹھیک اسی وقت تھانے کی عمارت میں کربناک نسوانی چیخوں کی آواز گونجنے لگی کمرے کے بند دروازے کے پیچھے یقیناً "شائستہ کے ساتھ کوئی غیر انسانی سلوک کیا جا رہا تھا عین ممکن تھا کہ اس پر بھی تھرڈ ڈگری جیسا کوئی حربہ استعمال کیا جا رہا ہو فرہاد نے بے چینی سے پہلو بدلا لیکن اس کی نظریں کمرے کے بند دروازے سے الجھ کر رہ گئیں۔ چیخوں کی آوازیں ایک تسلسل سے آرہی تھیں دروازے کے اس پار کیا ہو رہا تھا یہ جاننے کے لیے وہ سخت مضطرب تھا لیکن اس کا کوئی ذریعہ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا شائستہ کی چیخوں کی آواز اس کی سماعتوں میں زہر انڈیل رہی تھی لیکن وہ مجبور تھا لہٰذا اپنی جگہ کسمسا کر رہ گیا' آٹھ دس منٹ تک چیخوں کی یہ آواز ایک تسلسل کے ساتھ سنائی دیتی رہی تو فرہاد کی ذہنی رو یک لخت بھٹک گئی اس کی رگوں میں دوڑنے والا خون آتش فشاں بن کر

اس کی کن پٹیوں میں ٹھوکریں مارنے لگا اور وہ شدت جوش اور فرط غضب سے دیوانہ ہو گیا وہ جیسے اڑتا ہوا سا شیر افگن پر جا پڑا اس نے شیر افگن کو گریبان سے پکڑ لیا اور غصے سے کپکپاتی آواز میں بولا۔

”بے غیرت ہو تم..... اندر تین چار پولیس والے تمہاری بہن کے ساتھ موجود ہیں کمرے کا دروازہ اندر سے بند ہے اور تم یہاں ٹانگ پر ٹانگ چڑھائے مزے سے طرم خان بنے بیٹھے ہو تم تو ہو ہی بے غیرت اگر غیرت مند ہوتے تو پولیس کا سہارا نہیں لیتے بندوق اٹھا کر اکیلے میرے گھر میں آتے ایک گولی اپنی بہن کے سینے میں مارتے اور ایک میرے سینے میں لیکن یہ کام تم جیسے نامردوں کا نہیں ہیجڑے ہو تم، مرد نہیں سمجھے۔“

فرط غضب سے الفاظ اس کے منہ سے بے ترتیب انداز میں نکل رہے تھے اور منہ سے کف بہنے لگا تھا ٹھیک اسی وقت پانچ سات پولیس والے بیک وقت اس پر پل پڑے تھے..... مکے گھونسے، لات، بندوق کے بٹ غرض سب کے سب مل کر حسب استطاعت اس کی خاطر مدارات کرنے لگے شیر افگن کا گریبان فرہاد کے ہاتھ سے چھوٹ چکا تھا اور وہ اپنے ہاتھوں کی مدد سے اپنے بچاؤ کی ناکام کوشش کر رہا تھا پھر وہ نیچے زمین پر گر گیا پانچ سات افراد نے اسے روئی کی طرح دھنک کر رکھ دیا تھا اندر شائستہ کی چیخیں گونج رہی تھیں تو باہر فرہاد کی کراہیں..... اور پھر جلد ہی یہ سلسلہ اپنے اختتام کو پہنچ گیا کمرے کا بند دروازہ کھلا تھا اور اس کی تواضع کرنے والے پولیس مین الگ ہٹ گئے اندر سے راؤ امداد کی دھاڑ سنائی دی۔

”اندر لے آؤ رانجھے نوں۔“ (اندر لاؤ اس رانجھے کو) اور پھر چند پولیس والے اسے گھسیٹ کر اندر لے گئے راؤ امداد ایک کرسی پر براجمان تھا اور دو پولیس والے اس کے عقب میں کھڑے تھے ایک کرسی پر شائستہ بیٹھی ہوئی تھی جس کا برقعہ جگہ جگہ سے مسلا ہوا اور گرد آلود دکھائی دے رہا تھا۔ راؤ امداد نے ایک نظر اس کے چہرے پر ڈالی اور پھر غصے سے بولا۔

”بٹھاؤ اینوں سامنے۔“ (بٹھاؤ اسے سامنے) اور دو پولیس والوں نے اس کے کندھوں پر دباؤ ڈالتے ہوئے اسے کرسی پر بٹھا دیا پھر راؤ امداد نے ایک کاغذ اور پین فرہاد کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

”لکھ ایہدے اتے۔“ (لکھو اس پر)

”کیا لکھوں؟“ فرہاد نے بازو کی مدد سے ہونٹوں پر سے خون صاف کرتے ہوئے سوالیہ انداز میں پوچھا۔

”وجو میں کہناں واں اوہی لکھ۔“ (جو میں کہہ رہا ہوں وہی لکھو) راؤ امداد کی آواز بلند ہوئی۔

”لکھ۔ دوا بھیج رہا ہوں بہت تیز اثر ہے یہ سب گھر والوں کو کھلا دینا میں بارہ بجے پہنچ جاؤں گا۔“ فرہاد نے کاغذ پر جملہ گھسیٹتے ہوئے حیرت زدہ نظروں سے راؤ امداد کی طرف دیکھا یہ وہی الفاظ تھے جو اس نے شائستہ کو بھیجے ہوئے خط میں تحریر کیے تھے ٹھیک اسی لمحے راؤ امداد نے کاغذ اس کے ہاتھ میں سے جھپٹ لیا پھر اس نے اپنی جیب سے ایک طے شدہ کاغذ برآمد کیا اور اسے کھول کر میز پر پھیلا دیا فرہاد سے جھپٹا ہوا کاغذ بھی میز پر اس کے برابر پھیلا دیا اور دونوں کاغذوں کی تحریر آپس میں میچ کر کے دیکھ رہا تھا فرہاد اس کی جیب سے نکلنے والے طے شدہ کاغذ کو اچھی طرح پہچان چکا تھا یہ وہ ہی خط تھا جو اس نے برقعہ پوش عورت کے ہاتھ شائستہ کو بھجوا دیا تھا۔

تحریروں کی یکسانیت کو محسوس کر کے راؤ امداد کے ہونٹوں پر ایک فاتحانہ مسکراہٹ پھیل گئی پھر وہ مسرور انداز میں بولا۔

”سن اوئے رانجھا تیری ہیر کی کہندی اے۔“ (سن لو رانجھے تمہاری ہیر کیا کہتی ہے) اور پھر اس وقت فرہاد کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب شائستہ ٹیپ ریکارڈ کی طرح اسٹارٹ ہو گئی اس کا ہر لفظ، ہر جملہ اسے حیرت کے نئے جہانوں کی سیر کروا رہا تھا وہ ایک ہی سانس میں کہے جا رہی تھی۔

”میں رات کو حوائج ضروریہ کے لیے اپنی ماں کے ساتھ گھر سے باہر نکلی اور ابھی کھیتوں کے قریب ہی پہنچی تھی کہ سفید رنگ کی ایک کار ہمارے نزدیک آکر رکی پھر اس میں سے فرہاد اور اس کے تین مسلح ساتھی

نمودار ہوئے فرہاد نے میری امی کو دھکا دے کر دور گرا دیا اور پھر اپنے ساتھیوں کی مدد سے اس نے مجھے گھسیٹ کر کار میں ڈال لیا میرے سر کو نیچے کی طرف دبا دیا گیا اور پھر یہ گاڑی بھگاتے چلے گئے میری امی چیختی چلاتی رہ گئیں لیکن ان لوگوں کو رحم نہیں آیا۔

پھر انہوں نے شہر لے جا کر مجھے ایک مکان میں بند کر دیا اور باہر سے تالا لگا دیا گیا ان لوگوں کی گفتگو سے مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ لوگ میری عزت کے درپے ہیں میں موقع پا کر وہاں سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گئی میں بھاگتی ہوئی مین سڑک پر پہنچی ہی تھی کہ سب انسپکٹر راؤ امداد صاحب اپنے ساتھیوں کے ہمراہ پولیس جیپ میں سوار نظر آئے، میں بھاگتی ہوئی ان کے قریب پہنچی اور سارا ماجرا کہہ سنایا انہوں نے مجھے اپنی تحویل میں لے لیا اور تھانے لے آئے۔“

شائستہ کا بیان ختم ہو چکا تھا اور فرہاد کی حالت یوں ہو رہی تھی کہ کاٹو تو بدن میں لہو نہ ملے وہ حیرت سے گنگ بیٹھا یہ قصہ چہار درویش سنتا رہ گیا وہ شائستہ کی دیدہ دلیری اور ڈھٹائی پر سخت حیران تھا کہ اس نے اس کے منہ پر بیٹھ کر نہ جانے کیا کیا اناپ شناپ اور انٹ شنٹ قسم کا بیان دے دیا تھا کہاں کی گاڑی؟ کہاں کے تین ساتھی؟ اور کون سا اسلحہ؟ ”کہیں کی اینٹ۔ کہیں کا روڑا، بھان متی نے کنبہ جوڑا۔“ بالکل اسی قسم کا بیان تھا جس کا حقیقت سے دور کا بھی کوئی واسطہ نہیں تھا وہ اپنی مرضی سے اپنے پاؤں پر چل کر اس کے ہمراہ پیدل شہر آئی تھی اور اب اس کا کہنا تھا کہ فرہاد اپنے تین ساتھیوں کی مدد سے اسلحہ کے زور پر زبردستی گاڑی میں ڈال کر اغوا کر لایا تھا اسے شائستہ کے اس بیان پر غصہ تو بہت آیا۔ لیکن جب اس نے حالات کا تجزیہ کیا تو اسے شائستہ بے قصور نظر آئی۔

اس کے سامنے شروع میں تو اس نے یہی کہا تھا کہ فرہاد اسے لایا ہی نہیں ہے بلکہ خود اپنی مرضی سے گھر چھوڑ آئی ہے لیکن بند دروازے کے پیچھے نہ جانے ایسا کون سا جادو چلایا گیا تھا کہ اس کا بیان یک لخت تبدیل ہو گیا شاید اس پر تشدد اور ظلم و ستم کے پہاڑ توڑے گئے تھے اس کی درد انگیز، کرب ناک چیخیں تو اس نے اپنے کانوں سے سنی تھیں چیخوں کی اسی آواز پر تو ہوش و خرد سے بے گانہ ہو کر وہ اس کے بھائی شیر افگن سے الجھ پڑا تھا۔ بہر حال جو بھی تھا شائستہ کا بیان بدل چکا تھا لیکن ایک اور بات بھی اسے شائستہ کی مظلومیت کا احساس دلاتی تھی کہ اس پورے بیان کے درمیان اس نے فرہاد کی نظروں سے نظریں نہیں ملائی تھیں یقیناً اس بیان کے لیے اسے مجبور کر دیا گیا تھا۔

جلد ہی شائستہ کا بیان درج کر لیا گیا اور فرہاد کے خلاف زیر دفعہ ۷/۷-۱۱ ایف آئی آر بھی درج کر لی گئی پھر اسے حوالات میں ڈال دیا گیا اور شائستہ کو اس کی ماں اور بھائی شیر افگن کے حوالے کر دیا گیا کچھ ہی دیر کے بعد ایم پی اے جاوید ورک سلاخ دار دروازے کے قریب آیا اور فرہاد سے مخاطب ہوا۔

”بہت نام روشن کیا اپنے باپ کا شاباش! بہر حال میں نے ایس ایچ او سے کہہ دیا ہے اب تم پر تشدد نہیں کیا جائے گا کیونکہ تمہارے خلاف مضبوط ایف آئی آر درج کی جا چکی ہے اس لیے اب تمہیں چھڑا لیا تو نہیں جا سکتا زیادہ سے زیادہ میں یہ کر سکتا تھا کہ تمہیں ان لوگوں کی مزید مار پیٹ سے بچا لوں سو وہ میں نے ایس ایچ او سے کہہ دیا ہے۔ یہ لوگ چودہ دن تک جوڈیشنل ریمانڈ پر تمہیں تھانے رکھیں گے اس کے بعد تمہیں جیل بھیج دیا جائے گا پھر تمہارے لیے کچھ کرنے کی کوشش کریں گے۔“ ایم پی اے جاوید ورک اپنی بات مکمل کر کے واپس مڑ گیا اور فرہاد اس کی پشت پر نظریں جمائے خاموش کھڑا اسے دور ہوتے دیکھتا رہ گیا۔

یہ چودہ دن اس نے کس طرح گزارے اس کا اندازہ اس کے علاوہ اور کوئی نہیں لگا سکتا تھا پھر اسے جیل بھیج دیا گیا جیل پہنچنے کے بعد بھی فرہاد اسی خوش فہمی کا شکار رہا کہ تھانے میں دیا گیا شائستہ کا بیان پولیس کے ظلم و تشدد کی وجہ سے تھا اسے امید تھی کہ شائستہ عدالت میں ضرور سچ بولے گی پھر اس دن اسے حیرت کا ایک اور شدید جھٹکا برداشت کرنا پڑا جب اسے پہلی پیشی پر جیل سے عدالت لے جایا گیا۔

شائستہ اپنے بھائی شیر افگن کے ہمراہ وہاں موجود تھی عدالت کے کٹہرے میں کھڑے ہو کر فرہاد کی نظروں سے نظریں ملائے بغیر اس نے وہ ہی بیان دوہرا لیا جو اس نے پولیس کے سامنے دیا تھا عدالت سے واپس جیل پہنچنے کے بعد بھی فرہاد یہی سوچ رہا تھا کہ شاید اس کے گھر والوں نے اسے بہت مارا پیٹا ہو گا' ڈرایا دھمکایا ہو گا لیکن اس کی یہ غلط فہمی بھی جلد ہی دور ہو گئی اس دن جب الماس اس سے ملاقات کرنے جیل پہنچا' الماس کے الفاظ اس کی سماعتوں میں پگھلے ہوئے سیسے کی مانند بہتے چلے جا رہے تھے۔

"شائستہ وہ لڑکی ہے جسے الماس نے اپنی زندگی سے بھی بڑھ کر چاہا لیکن برا ہو اس وقت کا جب میں نے اختر سے یہ شرط لگائی کہ شائستہ میرے علاوہ اور کسی کی نہیں ہو سکتی اختر نے مجھے چیلنج کیا کہ اگر یہ بات ہے تو بہت جلد شائستہ الماس کی محبت کا دم بھرنے کی بجائے اس کے گیت گائے گی پھر اس کے ہاتھ شائستہ کے لکھے ہوئے وہ چند خطوط بھی آ گئے جو شائستہ نے مجھے لکھے تھے' اختر نے ان خطوط کو سیڑھی بنا کر شائستہ تک رسائی حاصل کی اور پھر وہ ہو گیا جس کا میں تصور بھی نہیں کر سکتا تھا شائستہ نے میری محبت' میرے جذبات اور میری وفاؤں کا گلا گھونٹ دیا اب وہ الماس کی نہیں اختر کی ہو چکی تھی! پھر اختر تم تک پہنچا اور تم حادثاتی طور پر اس معاملے میں الجھتے چلے گئے اور آج جیل کی سلاخوں کے پیچھے ہو! لیکن سچائی یہ بھی نہیں تھی بلکہ سچائی کچھ اور ہے! جس کا پتا مجھے بھی ابھی چلا ہے۔

شائستہ کبھی الماس کی تھی ہی نہیں اور شائستہ کبھی فرہاد کی بھی نہیں تھی وہ صرف اختر کی تھی اور کیوں نہ ہوتی؟ اختر نے اس کے لیے کیا بھی تو بہت کچھ ہے' جاننا چاہو گے سچ کیا ہے؟" اور فرہاد کی سوالیہ نظریں الماس کے چہرے پر جم کر رہ گئیں۔

"اختر کا تم تک پہنچنا ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت تھا' تم سے خطوط پڑھوانا اور پھر شائستہ کے بارے میں انکشاف کرنا بھی طے شدہ منصوبہ کے تحت تھا اور یہ منصوبہ اختر اور شائستہ نے مل کر بنایا تھا! جو کچھ بھی ہوا وہ تمہارے لیے تو ایک حادثہ ہے لیکن اختر اور شائستہ کی توقعات کے عین مطابق! وہ جو چاہتے تھے تم نے بالکل وہی کیا اور اپنی زندگی عذاب بنا لی تمہارے ساتھ راہزنی کا جو واقعہ ہوا اس میں دو پولیس والوں کے ہمراہ ایک تیسرا شخص بھی تھا جانتے ہو وہ کون تھا؟"

اور فرہاد کے ذہن میں دو آنکھیں نمودار ہو گئیں لال انگارہ آنکھیں کس کی تھیں اب وہ سمجھ چکا تھا کہ اس نے وہ آنکھیں کہاں دیکھی تھیں! اسے ایسا کیوں لگتا تھا کہ وہ ان آنکھوں کے مالک چہرے سے اچھی طرح واقف ہے! وہ اس چہرے سے اور ان آنکھوں سے بخوبی واقف تھا وہ آنکھیں اختر کی آنکھیں تھیں۔

"لیکن کیوں' آخر شائستہ نے ایسا کیوں کیا؟ اور اختر کی مجھ سے کیا دشمنی تھی؟ آخر کیوں کیا ایسا ان لوگوں نے۔" وہ بری طرح چلا اٹھا اور الماس کے ہونٹوں پر ایک زخمی سی مسکراہٹ نمودار ہو گئی۔

"شائستہ کا کہنا ہے کہ جس دن تم نے اسے ٹھکرا کر سلمٰی سے شادی کی تھی اس نے اسی دن قسم کھائی تھی کہ وہ تم سے اس کا بدلہ ضرور لے گی' اس کا کہنا ہے کہ آخر اس میں کیا کمی تھی جو ٹھکرا دیا گیا اس کے وجود کو ریزہ ریزہ کر دیا گیا اس کی محبت کا خون کر دیا گیا' بدلہ تو اس نے لینا تھا سو لے لیا! اس نے تو صرف بے وفائی کا زہر پیا ہے' لیکن تم نے تو اپنے ہاتھوں سے اپنے ہی گھر کو آگ لگا دی تم اپنی محبت کی لاج رکھ سکے اور نہ ہی شائستہ کی ناکام محبت کا مقابلہ کر سکے تم تو یکسر خسارے میں رہے میرے دوست..... آتش دروں میں جلتی ہوئی ایک ناکام عورت نے ناکامیاں تمہارا مقدر کر دیں سوچنا ضرور کہ تمہیں کیا حاصل ہوا۔"

جملہ مکمل کرتے ہوئے الماس واپس مڑا اور پھر ملاقات کے شیڈ سے باہر نکل گیا فرہاد دونوں ہاتھوں میں سلاخیں پکڑے اسے دیکھتا رہ گیا۔

نہ خدا ہی ملا نہ وصال صنم!
نہ اِدھر کے رہے نہ اُدھر کے رہے

☆ ☆

صائمہ نورین

مکروہ تعبیر

"وہ سورج سر پر آگیا ہے اور میم صاحبہ ابھی تک سو رہی ہیں! پتا نہیں کون سی منحوس گھڑی تھی جب یہ منحوس میری بہو بن گئی' عقل تمیز تو سکھائی ہی نہیں ماں باپ نے۔"

سعدیہ کے کانوں میں زبیدہ خالہ کی مخصوص آواز پہنچی تو حسب معمول اس کی آنکھ کھل گئی اور پچھلے چار سالوں میں وہ اس معمول کی اس قدر عادی ہو گئی تھی کہ جس دن زبیدہ خالہ کے کوسنوں کی آواز سنے بغیر وہ بے دار ہو جاتی تو اسے یہ عمل غیر معمولی لگتا اور وہ پریشان ہو جاتی کہ خدانخواستہ ان کی طبیعت تو خراب نہیں جو آج صبح ان کی آواز سنے بغیر اس کی آنکھ کھل گئی' لیکن ایسا بہت کم ہی ہوتا تھا۔

پچھلے چار سال میں صرف دو یا تین موقعے آئے تھے جب اس کی صبح ان کی ڈانٹ پھٹکار کے بغیر نمودار ہو گئی تھی۔

وہ انگڑائی لے کر بے دار ہوئی اور زبیدہ خالہ پر نظر پڑتے ہی اس نے کھٹاک سے سلام جڑ دیا۔

"السلام علیکم! زبیدہ خالہ۔" اور زبیدہ خالہ نے ہونہہ کی آواز کے ساتھ چہرہ گھما لیا۔

"بس بس رہنے دو! پتا ہے مجھے تم کتنی سعادت مند ہو' اب فرماں برداری کا یہ ڈھونگ بند کرو اور جلدی سے ناشتا بنا لو' تمہیں اچھی طرح پتا ہے کہ عدنان نے آفس جانا ہوتا ہے' جبار خان کچہری جاتے ہیں' شمائلہ کو کالج جانا ہوتا ہے' لیکن تمہیں تو سونے سے ہی فرصت نہیں ملتی' اگر میں صحن میں واویلا نہ مچاؤں تو تمہاری تو آنکھ ہی نہ کھلے۔"

اور سعدیہ بے چاری زبیدہ خالہ کے اس طویل لیکچر پر دل مسوس کر رہ گئی' حالانکہ وہ روز یہ ہی سب کچھ سنتے ہوئے بے دار ہوتی تھی' لیکن اس کے ماتھے پر شکن تک نہیں آتی تھی' اسے اپنے شوہر عدنان سے بے حد محبت تھی' اس کے سسر جبار خان بھی بہت ہی مہربان اور مشفق انسان تھے۔ البتہ زبیدہ خالہ اور شمائلہ کی نظروں میں اس کا وجود شروع ہی سے کھٹک رہا تھا۔ ان کے بس میں ہوتا تو وہ ایک لمحے میں

اسے گھر سے نکال باہر کرتیں، لیکن! وہ انہیں اس کا موقع ہی نہیں دیتی تھی' ان کی کڑوی کسیلی باتیں خندہ پیشانی سے سختی اور سہتی چلی آرہی تھی' ان کے تلخ و ترش جملے سن کر وہ یوں نظر انداز کر دیتی جیسے کچھ سنا ہی نہ ہو۔

اب بھی وہ سنی ان سنی کرتے ہوئے کچن کی جانب بڑھ گئی۔ زبیدہ خالہ کی تیز بڑبڑاہٹوں نے اس کا تعاقب کیا تھا۔ اس نے جلدی جلدی آٹا گوندھا اور پھر چولہا جلا کر چائے کا پانی چڑھا دیا۔ چائے پکانے کے بعد وہ جلدی جلدی پراٹھے تیار کرنے لگی' پھر اس نے انڈے فرائی کیے اور پھر ہال کمرے میں بچھی چٹائی پر دسترخوان بچھا دیا۔ ناشتا بنانے کا عمل اس نے نا صرف تیزی سے مکمل کر لیا تھا' بلکہ ناشتا دسترخوان پر سجا بھی دیا تھا۔ ایک ایک کر کے سب آتے چلے گئے اور پھر جبار خان کے آتے ہی ناشتا شروع کر دیا گیا۔

"ہاں تو عدنان بیٹا کیا فیصلہ کیا تم نے' نبیلہ بڑی سمجھ دار لڑکی ہے اور سگھڑ بھی ہے۔ گھر ہستی کو سنبھالنا بھی جانتی ہے۔ اگر تم کہو تو میں بات چلاؤں؟"

زبیدہ خالہ نے پھر وہی تکلیف وہ بات شروع کی تو سعدیہ لرز کر رہ گئی۔ اس نے افسردہ نظروں سے زبیدہ خالہ کی جانب دیکھا اور پھر جبار خان کے چہرے سے ہوتی ہوئی اس کی بے بس نگاہیں عدنان پر جا ٹکی تھیں' جس کے چہرے پر غصے کے تاثرات تھے۔ پھر وہ دبتے ہوئے لہجے میں گویا ہوا۔

"امی جان آپ سمجھتی کیوں نہیں؟ سعدیہ میری محبت ہے' میری بیوی ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ آپ کی بہو ہے' اس کے ہوتے ہوئے میں ایسا کچھ سوچ بھی نہیں سکتا' میں اس پر یہ ظلم نہیں کر سکتا۔"

اس نے ناشتے سے ہاتھ کھینچ لیا تھا اور پھر وہ اٹھ کر غصیلے انداز میں پاؤں پٹختا ہوا ہال کمرے سے باہر نکل گیا۔ وہ ناشتا کیے بغیر آفس جا چکا تھا۔ سعدیہ نے بھی ناشتے سے ہاتھ کھینچ لیا۔ زبیدہ خالہ قہربار نظروں سے ہال کمرے کے اکلوتے دروازے کو گھور رہی تھیں جبکہ جبار خان اور شمائلہ ناشتے کے ساتھ پورا پورا انصاف کر رہے تھے۔ سعدیہ آہستگی سے اپنی جگہ سے اٹھی اور پھر وہ اپنے لرزتے وجود اور لڑکھڑاتے قدموں کو سنبھالتے ہوئے بیرونی دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

"پتا نہیں کب جان چھوڑے گی یہ منحوس! میرے بچے کی زندگی کو گہنا کے رکھ دیا ہے۔" جاتے جاتے اس کے کانوں میں زبیدہ خالہ کی بڑبڑاہٹیں گونجی تھیں۔

☼ ☼ ☼

التجا بے اثر چشمِ تر رائیگاں
یہ جبیں رائیگاں سنگِ در رائیگاں
نہ سخن معتبر نہ نظر دل نشیں
اب ترے روبرو سب ہنر رائیگاں
وہ تو نقشِ قدم ساتھ ہی لے گیا
کیا خبر تھی رہے گا سفر رائیگاں
خواب دونوں کے محروم تعبیر ہیں
ہم ادھر رائیگاں وہ ادھر رائیگاں
زیست کرنے کی اب کوئی صورت نہیں
ضبطِ غم رائیگاں، سر بسر رائیگاں
ہم سے رسمِ وفا ہو گئی معتبر
کیا کہیں کیوں رہے عمر بھر رائیگاں

غزل ختم ہوئی تو اس نے اپنی آنسو بھری نظروں سے پلٹ کر ٹی وی پر ایک نظر ڈالی اور پھر ریموٹ اٹھا کر اسے بند کر دیا۔ اس وقت وہ اپنے بستر پر اوندھی لیٹی ہوئی عدنان کی تصویر سے ہم کلام تھی جو ایک خوب صورت فریم سمیت اس کے ہاتھوں میں تھی جب اچانک ٹی وی پر وہ غزل سنائی دینے لگی اور اس غزل کی گونج میں اسے اپنا پورا وجود ایک بے در گنبد محسوس ہوا۔ غزل کا ایک ایک لفظ صدائے بازگشت بن کر اس کے اندر ہی اندر بھٹکتا رہا۔ اس کے پورے وجود کو زخمی کرتا رہا اور وہ بے اختیار سسک اٹھی۔

"اے داور کائنات! تو نے میری ہی زندگی میں یہ بے ثباتی کیوں لکھ دی؟ صرف میرے ہی خواب محروم تعبیر کیوں رہیں' اے تقدیر کے لکھنے والے تو نے میرے ہی حصے میں یہ رائیگانی کیوں لکھ دی؟" وہ سسکتی چلی گئی

اور اس کی آنکھیں جیسے ساون بھادوں بن گئیں۔ آنسو اپنے آپ ہی امڈتے چلے آئے اور چھم چھم برستے چلے گئے وہ تڑپتی رہی' سسکتی رہی اور اس کے دل کا بوجھ کم ہوتا چلا گیا۔

اس برسات کے بعد اسے عدنان کا دھلا دھلا سا چہرہ بہت اچھا لگا اور اس نے بے اختیار اپنے ہونٹ تصویر کی پیشانی پر رکھ دیے۔ وہ اس کے من مندر کا دیوتا تھا۔ ایک وہی تو تھا جس کے لیے وہ سانس لیتی تھی۔ ایک وہی تو تھا' جس کے لیے وہ زندہ تھی۔ جو اس کی تنہائیوں کا رازدار اور اس کے وجود کا امین تھا۔ اس نے ایک نظر اس کے مسکراتے ہوئے چہرے پر ڈالی اور اس کے جل کر خاکستر ہوتے وجود کو جیسے نخلستان میسر آگیا۔ اس کے دل کو ایک انوکھی سی لذت آمیز سی ٹھنڈک کا احساس ہوا اور اس کے دل کو جیسے قرار سا آگیا۔

اس کی سماعتوں میں اس کیف آگیں جملے کی شہد آمیز مٹھاس سی گھلتی چلی گئی۔

"سعدیہ تم مجھے بہت اچھی لگتی ہو' بہت ہی پیاری' بہت خوب صورت ہو تم' میں تم سے محبت کرتا ہوں' میں تمہیں اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز رکھوں گا۔ ہمیشہ؟" وہ جیسے مخمور انداز میں گنگنائی "ہونہہ" اس نے کمبل کے اندر ہی جیسے اسے گھسیٹتے ہوئے ہنکارا بھرا اور اس کے پورے وجود میں ٹھنڈک اتر آئی۔

"وہ مجھے کبھی نہیں چھوڑ سکتا۔" اس نے جیسے اپنے آپ سے کہا تھا۔ اب وہ مطمئن تھی۔ اس نے تصویر واپس سائیڈ ٹیبل پر سجائی اور پھر باہر کی طرف چل پڑی' اب اس کی چال میں ایک انوکھا سا وقار تھا اور گردن جیسے احساسِ تفاخر سے اکڑی ہوئی تھی' وہ ایک نئے حوصلے اور نئے عزم کے ساتھ قدم بڑھاتے ہوئے دوبارہ کچن میں داخل ہو گئی اور پھر پورے اطمینان سے اپنے روزمرہ کے کام نبٹانے لگی' اب اسے کسی کی کوئی پروا نہیں تھی۔

☼ ☼ ☼

"شاہ صاحب کوئی ایسا تعویذ دیں کہ میرے بیٹے کے سر سے اس ڈائن کا بھوت اتر جائے اور وہ دوسری شادی کے لیے ہاں کر دے۔" سعدیہ نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے زبیدہ خالہ کی آواز سنی اس نے بغور شاہ صاحب کی طرف دیکھا' ستر پچھتر سالہ باریش بزرگ تھے۔ سفید داڑھی' لمبی لمبی زلفیں' ماتھے پر محراب اور ہاتھ میں تسبیح لیے' سفید کپڑوں میں ملبوس تنے بستر پر گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے بیٹھے وہ بزرگ بہت ہی دین دار اور عبادت گزار نظر آرہے تھے۔

تقریباً" ایک گھنٹہ پہلے ان کی تشریف آوری ہوئی تھی اور زبیدہ خالہ تو جیسے ان کے سامنے بچھی چلی جارہی تھیں' جب سے وہ آئے تھے ان کا قیام زبیدہ خالہ کے کمرے میں ہی تھا۔ زبیدہ خالہ خود بھی بڑی مذہبی اور دین دار خاتون تھیں تسبیح ہر وقت ان کے ہاتھ میں موجود رہتی تھی' لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ وہ ایک روایتی ساس تھیں۔ زبان کی بے حد تیز تھیں اور غصہ ہمیشہ ان کی ناک پر دھرا رہتا تھا۔

پیر صاحب کی خوب خاطر مدارات کی جارہی تھیں اور اس کی تمام تر ذمہ داری باورچی خانے کی منتظم بے چاری سعدیہ کے ناتواں کندھوں پر آن پڑی تھی اور گزشتہ ایک گھنٹے کے دوران وہ تیسری مرتبہ چائے لے کر جارہی تھی' پیر صاحب کا نام سید رحمت علی شاہ معلوم ہوا تھا اور وہ شاہ کوٹ سے تشریف لائے تھے۔ مزید یہ کہ شاہ صاحب بڑے ہی پہنچے ہوئے اور "کرنی" والے تھے؟ جبار خان کے پیرو مرشد تھے اور زبیدہ خالہ ان کا بے حد احترام کرتی تھیں۔

سعدیہ نے بستر کے قریب ہی تقریباً" جوڑ کر رکھی ہوئی' میز پر چائے کے برتن سجائے تو پیر صاحب نے دریافت کیا۔

"ماشاء اللہ یہ بچی کون ہے؟" تو زبیدہ خالہ گویا ہوئیں۔

"جی شاہ صاحب' یہ ہی تو سعدیہ ہے ہماری بہو' چار سال پہلے عدنان کی دلہن بن کر یہاں آئی ہے۔" اور پیر صاحب عالمانہ انداز میں گردن ہلانے لگے جیسے سب سمجھ گئے ہوں۔ سعدیہ نے پہلے موجود خالی برتن اکٹھے

کیے اور پھر انہیں اٹھاتی ہوئی کمرے سے باہر نکل آئی۔
"شاہ صاحب کوئی ایسا تعویذ دیں کہ میرے بیٹے کے سر سے اس ڈائن کا بھوت اتر جائے اور وہ دوسری شادی کے لیے ہاں کردے۔" سعدیہ کے ذہن میں زبیدہ خالہ کا یہ جملہ باربار کسی بچھو کی طرح ڈنک مار رہا تھا اور وہ سوچ سوچ کر ہلکان ہوئے جارہی تھی کہ آخر زبیدہ خالہ اس کا گھر کیوں اجاڑنا چاہتی ہیں؟ وہ ہاتھ دھو کر اس کے پیچھے کیوں پڑ گئی ہیں؟
اس کا دل ہول رہا تھا اور آنکھیں جیسے برسنے کو بالکل تیار تھیں۔ وہ سوچ رہی تھی کہ پیر صاحب تو خاصے نمازی اور پرہیزگار شخصیت کے مالک ہیں اور ویسے بھی خاصے بزرگ آدمی ہیں' کیا وہ اس کا گھر اجاڑنے میں زبیدہ خالہ کی مدد کریں گے۔
"نہیں' نہیں وہ ایسے تو نہیں لگتے۔" اس نے جیسے خود ہی اپنی بات کی نفی کردی تو پھر زبیدہ خالہ نے ان سے کہا کیوں؟ اس نے پریشانی سے سوچا۔ قطرہ قطرہ زہر انڈیلتی ہوئی زندگی کا سارا کرب اس کی آنکھوں سے ہویدا تھا۔

☼ ☼ ☼

"میں تھک گئی ہوں سمیرا اب اور نہیں سہا جاتا۔" سعدیہ نے روتے ہوئے کہا اور سمیرا نے اسے بازوؤں کے حلقے میں لے لیا۔ سمیرا اعلیٰ نواز ملک کی بہو تھی اور سعدیہ کی ہمسائی ہونے کے ساتھ ساتھ اس کی اکلوتی دوست تھی' جسے وہ بہترین دوست مانتی تھی' ایک واحد سمیرا ہی تھی جو اس کی سلگتی ہوئی زندگی کے ایک ایک لمحے سے واقف تھی۔ وہ اس کی واحد رازدار تھی جو اس کی یہاں گزرنے والی زندگی کے ہر راز سے واقف تھی' اس نے پیر صاحب کی آمد اور پھر ان سے ہونے والی زبیدہ خالہ کی گفتگو ــــــ سب کچھ سمیرا کو بتا دیا تھا اور اب سمیرا کے بازوؤں میں سمٹی سسک رہی تھی۔
"دیکھو سعدیہ برا مت ماننا! لیکن یہ حقیقت ہے کہ ظلم سہنے والا ظلم کرنے والے سے بھی بڑا مجرم ہوتا ہے اور تم نے شروع دن سے ظلم سہنے اور پھر خاموش رہنے کی جو روش اپنائی ہے اس نے آج تمہیں اس مقام پر لا کھڑا کیا ہے کہ تمہارے آگے کھائی ہے اور پیچھے کنواں۔ بہتر یہی ہے کہ تم اپنے رویے کو تبدیل کرلو' ورنہ تمہاری ساس تمہیں کہیں کا نہ چھوڑے گی آج اس نے تعویذ گنڈوں کا سہارا لیا ہے تو کل کوئی اور ہتھکنڈا استعمال کرے گی تمہیں ابھی سے اس کا توڑ کرنا ہوگا اور اپنی ساس کو کوئی مضبوط جواب دینا ہوگا۔ ورنہ تمہارے پاس پچھتاوؤں کے علاوہ کچھ باقی نہیں رہے گا' کف افسوس ملتی رہ جاؤ گی' سمجھیں؟"
سمیرا کی طویل گفتگو کا اختتام ہوا تو سعدیہ نے اپنی غم ناک آنکھوں سے اس کا دھندلایا ہوا چہرہ دیکھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔
"لیکن سمیرا میں آخر کر ہی کیا سکتی ہوں؟"
"کرنے کو تو بہت کچھ کیا جاسکتا ہے' بس تمہیں ہمت اور جرات سے کام لینا ہوگا۔" سمیرا نے جیسے اسے دلاسا دیا۔
"میری ہمت اور جرات سے کیا ہوگا' کیا وہ اپنا ارادہ تبدیل کردیں گی؟" سعدیہ نے بے چارگی سے پوچھا۔ تو سمیرا دوبارہ گویا ہوئی۔
"دیکھو سعدیہ تمہارا مسئلہ یہ ہے کہ تم پچھلے چار سالوں میں جبار خان کے خاندان کو وارث نہیں دے سکیں' تمہارا شوہر تم سے محبت کرتا ہے. جبار خان ویسے ہی اور مزاج کے انسان ہیں وہ تمہارے کسی معاملے میں دخل اندازی نہیں کریں گے' پیچھے بچیں زبیدہ خالہ اور شمائلہ تو ان دونوں کے ہاتھوں میں اس کے علاوہ تمہارا کوئی اور کمزور پہلو نہیں ہے۔ اگر تم ان کے خاندان کو ایک عدد وارث مہیا کردیتی ہو تو تمہاری پوزیشن مضبوط ہوجائے گی اور پھر تم ناقابل تسخیر ہوجاؤ گی۔"
سعدیہ نے پریشان نظروں سے اس کی جانب دیکھا اور پھر کمزور سے لہجے میں بولی۔
"لیکن یہ سب تو اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے' جب وہ ہی نہیں چاہتا کہ ایسا ہو تو میں کیا کرسکتی ہوں؟"
اور سمیرا کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی' پھر وہ

مضبوط لہجے میں بولی۔
"اللہ کے کلام میں بڑی تاثیر ہے' اگر زبیدہ خالہ تمہارا گھر اجاڑنے کے لیے ایک پیر کا سہارا لے سکتی ہیں' تو اپنا گھر بچانے کے لیے تم کیوں نہیں؟"
سمیرا کا انداز معنی خیز تھا اور سعدیہ کی آنکھوں میں جیسے امید کے چراغ روشن ہوگئے' پھر وہ پر اشتیاق انداز میں سمیرا سے مخاطب ہوئی۔
"کیا ایسا ممکن ہے؟ کیا تم کسی ایسے صاحب کرامت بزرگ سے واقف ہو؟" اور سمیرا کے ہونٹوں پر ایک بار پھر مسکراہٹ پھیل گئی' پھر وہ شوخ انداز میں بولی۔
"ہر مشکل کا کوئی نہ کوئی حل ہوتا ہے اور تمہاری تمام مشکلات کا حل میرے پاس ہے۔" سعدیہ نے ایک طویل سانس لی اور پھر اس کے ہونٹوں پر ایک آسودہ سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

☼ ☼ ☼

گھر میں مہمان آئے ہوئے تھے اور خاصی چہل پہل تھی' زبیدہ خالہ کی بھانجی شگفتہ آئی ہوئی تھی' جس کے ساتھ اس کا ننھا منا سا گول مٹول سا بچہ بھی تھا جس کا نام ارسلان تھا' دو ڈھائی سال کا یہ بچہ گھر میں قلقاریاں مارتا پھرتا' توتلی زبان میں باتیں کرتا تو اس پہ خوامخواہ پیار آجاتا' شگفتہ' نبیلہ کی بڑی بہن تھی۔ وہی نبیلہ جس کے لیے زبیدہ خالہ باؤلی ہوئی پھر رہی تھیں اور جسے وہ اپنی بہو بنانا چاہتی تھیں۔ لیکن اس کے باوجود سعدیہ کو وہ بچہ بہت پیارا لگا تھا اور وہ اس سے مانوس بھی بہت ہوگیا تھا۔ وہ کچن میں کھانا بنا رہی ہوتی تو وہ اس کے قریب آکر بیٹھ جاتا اور اپنی توتلی زبان میں معصوم معصوم باتیں کرکے اسے خوب ہنساتا وہ دوپہر کو کچھ دیر ستانے کے لیے اپنے بیڈ روم میں جاتی تو وہ اس کے تعاقب میں وہیں پہنچ جاتا! اور وہ بے اختیار اسے اپنی گود میں بھرلیتی' اسے یوں لگتا جیسے اس کے دل میں ٹھنڈک سی اتر آئی ہو' اس کا احساس زیاں کہیں دور جا سوتا اور وہ اس بچے کی معصوم معصوم خوب صورت باتوں میں کھو سی جاتی۔
یہ بچہ اس کی اجاڑ زندگی میں بہار بن کر آیا تھا۔ خوشی کا ایک انوکھا سا احساس تھا جو اس بچے کو دیکھ کر اس کی رگ رگ میں سما جاتا تھا' لیکن آج جو کچھ ہوا اس نے اس کی خوشیوں کا گلا گھونٹ دیا تھا اور اس کو توڑ پھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ احساس محرومی ایک مرتبہ پھر اس پر غالب آگیا تھا۔
صبح جب وہ حسب معمول زبیدہ خالہ کی جلی کٹی آوازیں سن کر ناشتا بنانے کے لیے باورچی خانے میں داخل ہوئی تو اس کے کچھ ہی دیر کے بعد اسے ارسلان کی زور' زور سے رونے کی آواز سنائی دی تو وہ بے چین ہوگئی' وہ جلدی سے باہر نکلی اور اس کا فیڈر اٹھا کر واپس باورچی خانے میں آگئی وہ جانتی تھی کہ صبح اٹھنے کے بعد اگر اسے دودھ ملنے میں تاخیر ہوجائے تو وہ اسی طرح روتا تھا' اس نے جلدی جلدی فیڈر کو دھویا' اس میں چینی ڈال کر دودھ ڈالا اور پھر جیسے اڑتی ہوئی ارسلان کے بستر تک جا پہنچی' وہ ہاتھ پاؤں چلاتے ہوئے بری طرح رو رہا تھا۔
شگفتہ' شمائلہ اور زبیدہ خالہ قریب ہی پڑے صوفے پر بیٹھیں خوش گپیوں میں مصروف تھیں اور بچے کے چیخنے چلانے سے ان کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگی تھی۔
سعدیہ نے بچے کو پچکارتے ہوئے فیڈر اس کے ہاتھ میں تھما دیا' اس نے جلدی سے فیڈر منہ میں ڈالا' لیکن پہلے ہی گھونٹ پر وہ بے اختیار کھانسنے لگا۔ اسے اچھو لگ گیا تھا۔ زبیدہ خالہ نے چونک کر ادھر دیکھا اور پھر آگے بڑھ کر تیزی سے بچے کو گود میں اٹھا لیا' وہ جلدی جلدی اس کا سینہ مسلنے لگیں' کھانستے کھانستے بچے کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے اور سعدیہ پریشان نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی' پھر سب سے پہلے زبیدہ خالہ ہی گویا ہوئیں۔
"ایک تو اس ڈائن نے بے چارے معصوم بچے کی زندگی عذاب کر رکھی ہے' پتا نہیں ہر وقت کیا کیا الم غلم کھلاتی رہتی ہے' اب بھی پتا نہیں کیا ڈال دیا دودھ میں

کہ بچہ ہاتھوں سے نکلا جا رہا ہے۔" ان کے لہجے میں سعدیہ کے لیے نفرت ہی نفرت تھی اور سعدیہ دھک سے رہ گئی۔

"میں نے تو صرف چینی ملائی تھی' بچے نے بے صبری سے گھونٹ بھرا تو شاید اس لیے اسے اچھو لگ گیا۔" اس نے صفائی پیش کرنے کی کوشش کی۔

"ہاں ہاں! اسے تو جیسے بچے پالنے میں ساری عمر کا تجربہ ہے' بانجھ کہیں کی۔"

شمائلہ نے بھی اپنا حصہ ڈالا اور سعدیہ تڑپ کر رہ گئی' پھر وہ وہاں نہیں رکی تھی' وہ جیسے بھاگتی ہوئی اپنے کمرے میں داخل ہوئی اور بیڈ پر اوندھی گر کر سسکنے لگی۔

☼ ☼ ☼

وہ سمیرا کے ساتھ اس کمرے میں داخل ہوئی تھی' بڑی بڑی مونچھوں اور صفاچٹ سر والا وہ آدمی فوم کے ایک موٹے گدے پر براجمان تھا۔ اس نے گرین کلر کا ایک لمبا سا چغہ زیب تن کر رکھا تھا۔ گلے میں بہت سی مالائیں اور ہاتھ میں تیزی سے گردش کرتی ہوئی تسبیح اسے کوئی پہنچا ہوا عامل ظاہر کرنے کے لیے کافی تھی' لیکن پتا نہیں کیوں سعدیہ کچھ مطمئن نہیں ہو پا رہی تھی' اٹھائیس' تیس سالہ گھنی مونچھوں والا یہ آدمی کوئی نیک آدمی دکھائی نہیں دیتا تھا اور اس کی آنکھیں بھی اس بات کی چغلی کھا رہی تھیں' اس کی آنکھوں میں عیاری کی جھلک صاف دیکھی جا سکتی تھی۔

اس نے گھور کر ان دونوں کی طرف دیکھا اور پھر اس کی نظریں سعدیہ کے چہرے پر جیسے جم سی گئیں اور پریشان حال سعدیہ اپنے آپ میں سمٹ کر رہ گئی' سعدیہ اچھی خاصی خوش شکل اور متناسب وجود کی مالک تھی' بلکہ اس کا شمار بلا جھجک خوب صورت خواتین میں کیا جا سکتا تھا۔

"یہ عامل ساگر بنگالی ہیں۔" سمیرا نے اس کے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے کہا اور اس نے بے اختیار سر ہلا دیا' اس دوران وہ ساگر بنگالی کے سامنے بچھی چٹائی پر بیٹھ چکی تھی' عامل نے اس کی نظروں میں جھانکتے ہوئے یک دم سرسراتی سی آواز میں کہا۔

"ساس کی ستائی ہوئی ہو۔" اور سعدیہ کا دماغ گھن چکر بن گیا' بھلا یہ بات اس عامل کو کیسے پتا چلی! ابھی تو حرف مدعا اس کے ہونٹوں پر آیا ہی نہیں تھا۔

"اولاد کا مسئلہ اتنی آسانی سے حل نہیں ہوتا۔" اس نے اپنی مخصوص سرسراتی ہوئی آواز میں مزید کہا تو سعدیہ اس کی روحانیت کی قائل ہو گئی' پھر وہ ہاتھ باندھ کر گڑگڑاتی آواز میں بولی۔

"عامل بابا! آپ تو دلوں کے حال جان لیتے ہیں' خدا کے لیے کوئی ایسا تعویذ دیجیے' کوئی ایسا عمل بتائیے کہ میری سونی گود ہری ہو جائے' ورنہ میری ساس میرا گھر اجاڑ دے گی' وہ میرے عدنان کی شادی کسی اور جگہ کر دے گی' آپ کو اللہ کا واسطہ عامل بابا! میرا گھر اجڑنے سے بچا لیجیے' آپ کی جو بھی فیس ہے میں ادا کر دوں گی۔"

وہ سسک اٹھی تھی اور عامل کے چہرے پر کبیدگی کے تاثرات پھیلتے چلے گئے' وہ سعدیہ کی گفتگو کے دوران یوں برے برے منہ بنا تا رہا تھا' جیسے کوئی کڑوی چیز نگل بیٹھا تھا' پھر وہ بولا تو یہ کڑواہٹ اس کے لہجے میں بھی گھلی ہوئی تھی۔

"بی بی! ہم بابا نہیں عامل ساگر بنگالی ہیں' آپ عامل صاحب یا ساگر صاحب کہہ کر بھی بات کر سکتی ہیں' لفظ بابا سے ہمیں شدید چڑ ہے اور دوسری بات یہ کہ آپ کا ستارہ شدید گردش میں ہے! کچھ بھی ہو سکتا ہے' گھر بھی اجڑ سکتا ہے۔" اور وہ لرز اٹھی۔

"آپ کے لیے تو کوئی مشکل نہیں ہے آپ پلیز کچھ کیجیے نا؟" وہ جیسے گڑگڑا اٹھی تو عامل ساگر بنگالی گمبھیر آواز میں بولا۔

"اولاد کا سکھ اتنی آسانی سے نہیں ملتا' اس کے لیے بہت کچھ کرنا پڑتا ہے' بڑے پاپڑ بیلنا پڑتے ہیں' بڑی قربانیاں دینی پڑتی ہیں' تم نے میڈیکل چیک اپ نہیں کروایا؟"

عامل بنگالی نے یک دم سوال کیا! تو وہ جو پوری توجہ سے عامل صاحب کا ایک ایک لفظ سن رہی تھی' بے اختیار بول اٹھی۔

"جی چیک اپ تو عدنان اور میں دونوں ہی کروا چکے ہیں اور دونوں ہی کی رپورٹ او کے ہے۔"

"ہونہہ۔۔۔" عامل صاحب نے ہنکارا بھرا' پھر وہ گویا ہوئے۔

"تمہارا مسئلہ حل ہو سکتا ہے' لیکن اس کے لیے تمہیں سات دن یہاں حاضری دینی ہو گی اور روزانہ تنہا آنا پڑے گا' اگر کر سکتی ہو تو یہ عمل کل ہی سے شروع کر دو۔" اور وہ عامل صاحب کی سرخ انگارہ آنکھوں سے نظریں ملاتی ہوئی ایک عزم سے بولی۔

"میں یہ سب کرنے کے لیے تیار ہوں' میں کل ضرور آؤں گی۔" اور عامل صاحب معنی خیز انداز میں گردن ہلانے لگے' پھر وہ دونوں عامل صاحب سے اجازت لے کر وہاں سے باہر نکل آئی تھیں۔

☼ ☼ ☼

جبار خان کے گھر میں خوشیوں کی لہر دوڑ گئی' بات ہی ایسی تھی کہ جو ایک کے بعد دوسرے اور دوسرے کے بعد تیسرے کے پاس پہنچتے ہوئے پورے گھر میں پھیل گئی تھی اور زبیدہ خالہ جن کی زبان ہر وقت طعن و تشنیع کے تیر برساتی تھی' ان دنوں جیسے شہد میں لپٹی ہوئی تھی' سعدیہ نے ماں بننے کی خوش خبری کیا سنائی کہ ان کی کایا پلٹ ہو گئی تھی' وہی زبیدہ خالہ جو اکثر اسے سخت سست اور کاہل جیسے القابات سے نوازا کرتی تھیں' ان دنوں اسے زمین پر پاؤں ہی نہ رکھنے دیتیں اس کے آرام کا' اس کی خوراک کا پوری طرح خیال رکھا جاتا تھا۔

واش بیسن پر کھڑی سعدیہ نے بری طرح ابکائیاں لیتے ہوئے سب سے پہلے زبیدہ خالہ ہی کو بتایا تھا کہ وہ دادی بننے والی ہیں۔ اور وہ حیرت سے دنگ رہ گئیں' پھر رفتہ رفتہ اس حیرت پر مسرت غالب آ گئی اور انہوں نے بے اختیار سعدیہ کو بازوؤں میں بھرتے ہوئے دریافت کیا تھا۔

"واقعی! کیا تم سچ کہہ رہی ہو؟" اور اس نے اثبات میں سر ہلا دیا تھا' پھر اس خبر کو وہ زیادہ دیر تک ہضم نہیں کر پائی تھیں۔ سب سے پہلے انہوں نے شگفتہ کو یہ خبر سنائی' پھر جبار خان پھر شمائلہ اور سب سے آخر میں عدنان تک یہ خبر پہنچانے کا ذریعہ زبیدہ خالہ ہی بنی تھیں۔

وہ یہ سب کچھ دیکھ رہی تھی' ان تبدیلیوں کو محسوس کر رہی تھی' ان خوشیوں کو اپنے دامن میں بھر رہی تھی' وہ مطمئن ہو گئی تھی اور کیوں نہ ہوتی' اس معراج پر پہنچنے اور اس کامیابی کو حاصل کرنے کے لیے اس نے بڑی محنت کی تھی' بڑے پاپڑ بیلے تھے اور بڑی قربانیاں دی تھیں پورے سات دن اس نے ساگر بنگالی کے آستانے پر حاضری دی تھی' ہر روز "فیس" ادا کی تھی' پھر ستاروں کی گردش کیوں دور نہ ہوتی؟ خوشیاں اس کا مقدر کیوں نہ ٹھہرتیں؟ اس کی ناز برداریاں ہوتی رہیں۔

وقت گزرتا رہا! اور پھر اس کے قدموں تلے جنت آ گئی' اس نے ایک خوب صورت بچے کو جنم دیا' جس کا نام اس نے ارسلان رکھا تھا! اب وہ اپنے بچے کو جو بھی الم غلم کھلاتی اس کے دودھ میں کچھ بھی ملا کر اسے پلاتی کوئی کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ کسی میں بولنے کی جرات ہی نہ تھی' یہ اس کا بچہ تھا! اس کا اپنا بچہ' اس کا اپنا ارسلان! گھر پر اس کی حکومت مسلمہ حقیقت اختیار کر چکی تھی زبیدہ خالہ دن بھر بچے سے کھیلتیں اور باقی وقت مصلے پر بیٹھی رہتیں شمائلہ میں بھی دم مارنے کی جرات نہ رہی تھی' لیکن وہ خود آج بھی محروم تعبیر تھی جو خوشی اس کے اندر سے پھوٹنی چاہیے تھی وہ نہیں تھی' وہ جب جب اپنے ارسلان کا چہرہ دیکھتی اسے اس کے معصوم چہرے میں ساگر بنگالی کا عکس دکھائی دیتا اور اس کے چہرے پر احساس جرم کی سیاہی پھیل جاتی۔

☼ ☼

یہی نام ہے پیار کا

ملیحہ رفیق

ناولٹ

"اینڈ ناؤ اٹس دا ٹائم ٹو ڈسکو۔" ارسل نے ہاتھ میں پکڑے ٹی وی ریموٹ کو مائیک کی طرح گھماتے ہوئے کہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی کرکٹ بیٹ کو گٹار بنا کر بجاتے فرقان کی ٹون بالکل کسی چینل کی طرح چینج ہوئی تھی۔ لاؤنج میں چوکڑی مارے تمام سامعین نے بوریت سے ایک دوسرے کی جانب دیکھا تھا۔ جن کے پیش نظر صرف وہ ٹریٹ تھی جو کسی بھی فریق کے ہارنے کی صورت میں ان لوگوں کو ملنی تھی۔

"دل میں میرے ہے دردِ ڈسکو..... دردِ ڈسکو۔" جبکہ اس تمام صورت حال سے بے نیاز فرقان احمد تمام پاپ اسٹارز کو مات دیتا شاہ رخ خان بننے کی کوشش میں سرگرداں تھا۔

"اینڈ ناؤ غزل ٹائم۔" فرقان کی خوف ناک سریلی آواز سے جلد ہی ارسل سمیت سب کے کانوں نے پناہ مانگی تھی اس سے پہلے کہ سامعین بیرونی اثرات لیتے "جوتا مارو" مہم شروع کرتے ارسل نے فرقان کو ایک موقع اور دیا تھا۔ وہ سب لوگ انتاکشری کھیل رہے تھے۔

"یہ آرزو تھی کہ تجھے گل کے روبرو کرتے۔" فرقان احمد کی گائی غزل اگر اس وقت امانت علی خان صاحب سن لیتے تو یقیناً "مزید کبھی نہ گانے کا عہد کر لیتے۔ اسی اثنا میں پورچ میں گاڑی رکنے کی آواز آئی تھی جس پر سب سے پہلے ارسل نے لاؤنج میں اتری سیڑھیوں سے اوپر اپنے کمرے کی جانب دوڑ لگائی تھی جبکہ نہال اور امثال نے کچن کو محفوظ پناہ گاہ تصور کرتے اس کی جانب رخ کیا تھا۔ جبکہ اس تمام افتاد سے بے نیاز فرقان احمد ایک کان پر ہاتھ رکھے آنکھیں موندے لہک لہک کر گانے میں مصروف تھے اور ان سے کچھ فاصلے پر دنیا جہان سے بے خبر اپنی کسی نئی تخلیق کو عملی جامہ پہنانے کا سوچتی سنبل تھی۔ جس کو فرقان کی طرح ابھی تک گاڑی کے رکنے اور ان تینوں کے غائب ہو جانے کا علم نہیں ہو سکا تھا۔

"ابے نالائق!" دماغ کے اوپری حصے میں غزل کے الفاظ بری طرح ڈگمگائے تھے جیسے چلتی بس کو جھٹکا لگا ہو۔

"میاں فرقان احمد صاحب!" اب کی بار نجانے کیوں آنکھوں کے سامنے امانت علی خان کی تصویر کے عکس میں دادا جان کی جھلک نظر آئی تھی فرقان کے دماغ میں یکدم خطرے کی گھنٹیاں بجی تھیں اور پھر اس نے پٹ سے آنکھیں کھولی تھیں۔

"دادا جان..... آپ۔" اس کے حلق سے بمشکل آواز نکلی تھی۔

"یہ سب کیا ہو رہا ہے میاں کیا میراثیوں کے کسی قبیلے سے جا ملے ہو..... ہیں۔" دادا جان نے کڑک لہجے میں کہتے ہوئے اپنی اسٹک کو گھماتے ہوئے پوچھا تھا۔ اب کے سنبل بھی بری پھنسی تھی۔

"جی نہیں..... جی نہیں دادا جان۔ دراصل ارسل کی یونیورسٹی میں فنکشن تھا تو اس کی تیاری میں ہم سب مدد کر رہے تھے۔" فرقان نے اپنی جان بچاتے ہوئے ارسل پر تمام ملبہ گرایا تھا جو کہ پورے ڈرون حملے کی طرح اس پر ہی آگرا تھا۔ کیونکہ لاؤنج میں سوائے ان دونوں کے اور کوئی نہیں تھا اور دادا جان کو آج کل کی موسیقی سے سخت نفرت تھی اور فرقان اکثر ہی اپنی بے تکی حرکتوں کی وجہ سے ان کے زیر عتاب رہتا تھا۔ جبکہ ارسل ہمیشہ ہی بڑی ہوشیاری سے صاف بچ نکلتا تھا اور پھر دادا جان نے پورے سو اٹھک بیٹھک کروائے تھے۔ دادا جان کی ہر بار دی جانے والی ہائی پوٹینسی ڈوز فرقان کے لیے کسی کڑوی گولی کی مانند بن چکی تھی جو کہ وقتی اثر رکھتی تھی اور دادا جان کے جانے کے بعد اس کا اثر غائب۔

"سنبل آپا..... بھئی کہاں ہیں آپ جلدی سے آجائیے۔" فرقان نے بیف روسٹ اور چکن تکوں کے شاپرز کچن کی شیلف پر رکھے تھے اور سنبل کو آواز دینے کے بعد خود پلیٹیں نکالنے لگا۔

"ارے فرقان ہم تو یہاں ہیں تم خود کو کیوں زحمت دے رہے ہو لاؤ میں سیٹ کرتی ہوں۔" لاؤنج میں

سے فرقان کو لوازمات کے شاپرز لے جاتے دیکھ کر بھلا نہال اور امشال کہاں رہ سکتی تھیں۔ نہال نے آگے بڑھ کر فرقان کو نرم لہجے میں کہا تھا۔

"او..... آپ لوگ اب تک یہاں ہیں۔ ویری فنی آپ کو تو اس وقت کوہ قاف میں ہونا چاہیے تھا؟" فرقان نے خالصتاً" زنانہ آواز نکالتے ہوئے ان دونوں کو اسی انداز میں جواب دیا تھا۔ جس پر وہ دونوں کھسیانی سی ہو کر ہنسنے لگیں۔ اسی اثنا میں سبزل بھی آچکی تھی اور فرقان کولڈ ڈرنک کے گلاس اٹھا کر ڈائننگ ٹیبل پر رکھنے لگا۔ سبزل نے باقی تمام چیزیں ٹیبل پر لگائیں جبکہ نہال اور امشال اب شدت سے ارسل کو یاد کر رہی تھیں کیونکہ ایک وہی تھا جو کسی طرح بھی چیز حاصل کر لیتا تھا اور بعض وقت کی دعا بڑی جلدی قبول ہو جاتی ہے۔ جیسے ان کی ہوئی تھی۔

"واؤ یار..... تمہیں کیسے پتا چلا کہ مجھے آج ہانیہ نے ڈنر نہیں کروایا۔" کندھے پر بیگ لٹکائے جیسے ہی ارسل لاؤنج میں داخل ہوا تھا سامنے ہی لوازمات سے سجی ٹیبل نے اس کے ہوش اڑا دیے تھے۔

"خبردار..... خبردار جو کسی نے ایک نگاہ غلط بھی ٹیبل کی طرف ڈالی۔" فرقان نے ان تینوں یعنی نہال، امشال اور ارسل کو ٹیبل کی طرف بڑھتے دیکھ کر وارن کیا تھا۔

"یار فرقان تیری یہی اسپیشل کوالٹی ہے تو مذاق بے حد غلط ٹائم پر کرتا ہے۔" ارسل نے قدم ٹیبل کی طرف بڑھاتے ہوئے نہال اور امشل کو آنکھ مار کر اشارہ کیا تھا۔ جس پر وہ تینوں مسکراتے ہوئے آگے بڑھنے لگے۔ فرقان نے دونوں پلیٹیں جلدی سے ٹیبل سے اٹھالی تھیں۔

"ارے لڑکیو ڈرو مت بھئی فرقان میاں اکیلے کھانے کے عادی نہیں ہیں۔" ارسل نے مزید جلتی پر تیل چھڑکا تھا۔

"بہت خوب! اب میری عادات آپ کو یاد آنے لگیں اور اس وقت مصیبت میں ہٹلر کے سامنے مجھے اکیلا چھوڑ کر آپ لوگ کسی ماہر بیوروکریٹ کی طرح سین سے بالکل غائب ہو چکے تھے۔" فرقان نے ایک ہی سانس میں اگلے پچھلے حساب بے باق کیے تھے۔ مگر مدمقابل بھی ڈھیٹوں کا ٹولا تھا۔ اس سے پہلے کہ چھینا جھپٹی شروع ہوتی حسب معمول سبزل ثالث کا رول پلے کرنے میدان میں اتری تھی۔

"فرقان..... ہم انہیں اپنی ٹریٹ میں شامل کریں گے۔" اس نے کرسی سے اٹھتے ہوئے نہایت سنجیدہ لہجے میں کہا تھا۔ جسے سنتے ہی وہ تینوں ایک دوسرے کو فاتحانہ نظروں سے دیکھ کر مسکرائے تھے۔

"مگر آپا....." فرقان نے بے یقینی سے کچھ فاصلے پر کھڑی سبزل کو دیکھا تھا۔

"لیکن اس کے لیے ہماری بھی ایک شرط ہے۔" سبزل نے لہجے کو کڑک بناتے ہوئے کہا تھا جس پر وہ تینوں ایک لمحے کے لیے ساکت ہوئے تھے۔

"وہ کیا؟" ارسل نے بے صبری سے پوچھا تھا۔

"وہ یہ کہ تم تینوں دادا جان کے سامنے اپنی غلطی تسلیم کرو گے اور پھر ہم دونوں کو ٹریٹ دو گے وہ بھی اچھے سے کسی ریسٹورنٹ میں۔" ان تینوں نے سزل ہوتے ایک دوسرے کو پھر دیکھا تھا۔ شرط ماننے کی صورت میں انہیں دادا جان سے وہی سزا ملنی تھی جو فرقان بھگت چکا تھا۔

"ٹھیک ہے اگر نامنظور ہے تو۔" سبزل نے ہاتھ جھاڑتے ہوئے ترچھی نظروں سے پلیٹوں کی طرف دیکھ کر کہا تھا۔

"نہیں، نہیں! ہمیں منظور ہے۔" ارسل نے فوراً" ندیدوں کی طرح آگے بڑھتے ہوئے کہا۔ یکے بعد دیگرے نہال اور امشال نے بھی اس کی پیروی کی تھی اور پھر کچھ ہی دیر میں پورا لاؤنج ان کے قہقہوں سے گونج اٹھا تھا۔ ان سب کی دوستی ایسی ہی تھی دھوپ چھاؤں سی اور الگ بات تھی کہ عموماً" دھوپ کا روپ ارسل ہی دھارتا تھا اور چھاؤں کا سبزل کیونکہ وہ بے حد صلح جو قسم کی لڑکی تھی۔

☆ ☆ ☆

سردار حیات خان کا گھرانہ ہمیشہ ہی سے محبت اور اتحاد کی مثالی تصویر رہا تھا بیگم حیات خان جب تک زندہ رہیں خاندان میں ہر ایک کو بے حد چاہت سے نوازا۔ اس کے بعد حیات خان کے بیٹوں یعنی سردار داؤد خان اور سردار احمد خان نے اس روایت کو قائم رکھا۔ اگرچہ وہ دونوں حیات خان کی طرح گاؤں میں رہائش پذیر نہ ہوئے بلکہ شہر میں اعلا تعلیم حاصل کی اور اچھی ملازمتوں کے ساتھ شہر میں ہی رہائش اختیار کی مگر خاندانی روایتوں اور رسم رواج کے ساتھ ساتھ گاؤں والوں کے دکھ درد میں برابر کے شریک ہوئے۔

اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ سردار حیات خان نے حویلی نہیں چھوڑی تھی بلکہ وہ زمینوں پر ہی رہتے تھے۔ مگر جدید دور کے تقاضوں کو سمجھتے ہوئے انہوں نے اپنے بیٹوں پر کبھی پابندی نہ لگائی تھی۔ یہ بیگم حیات خان کی چاہت ہی کا اثر تھا کہ ان کی دونوں بہوؤں نے ایک ساتھ رہنے کا فیصلہ کیا تھا اور بچوں کے بڑے ہو جانے کے باوجود آج تک ان میں کسی قسم کا اختلاف نہ ہوا تھا۔ بلکہ اس یگانگت کو ارسل اور سبزل کی شادی کی صورت مضبوط کرنے کا سوچا جا رہا تھا کہ یہ دادا جان کی بھی شدید خواہش تھی۔

اس طرح "حیات ہاؤس" میں سردار داؤد خان' ان کی تین بیٹیاں سبزل جو کہ ایم اے اردو کر چکی تھی اور سب کزنز میں پہلے نمبر پر تھی۔ پھر نہال اور امشال جڑواں تھیں اور دونوں ایف ایس سی پارٹ ٹو کی اسٹوڈنٹس تھیں۔ دوسری طرف سردار احمد خان جن کے دو ہی بیٹے تھے بڑا ارسل جو کہ بی اے کے فائنل ایئر میں تھا اور یونیورسٹی لائف کو خوب انجوائے کر رہا تھا۔ چھوٹا فرقان احمد جو کہ بی کام کر رہا تھا اور ارسل کے برعکس یونیورسٹی کی رنگینیوں سے کوسوں دور تھا یوں یہ گھرانہ ایک مثالی گھرانہ مانا جاتا تھا۔

☆ ☆ ☆

"بابا جان! آپ نے بلایا تھا خیریت۔" گول کمرے کا دروازہ کھولتے ہوئے داؤد خان نے پوچھا۔ جبکہ باقی سب وہاں پہلے سے موجود تھے۔

"ہاں داؤد! آؤ کچھ ضروری بات کرنی تھی۔" دادا جان نے پلنگ پر داؤد خان کے بیٹھنے کی جگہ بناتے ہوئے کہا تھا بلکہ باقی حضرات صوفے پر براجمان تھے۔

"دیکھو احمد! ماشاء اللہ سے سبزل ایم اے سے بھی فارغ ہو گئی ہے۔ آج کل — اس کے رشتے آنے لگے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ گھر کی بات گھر میں ہی طے ہو جائے تو یہ ہم سب کے لیے بے حد باعث خوشی و راحت ہو گا۔ تم سمجھ رہے ہو نا۔" سردار حیات خان نے سامنے بیٹھے احمد اور مسز احمد یعنی شہلا بیگم سے پوچھا تھا۔

"بابا جان! ہمیں تو کوئی اعتراض نہیں ہے۔ مگر ارسل ابھی پڑھ رہا ہے۔ اپنے پیروں پر کھڑا ہو جاتا تو زیادہ بہتر تھا۔" احمد خان نے بات مکمل کر کے سب کی طرف دیکھا تھا۔ تقریباً" سب ہی اس بات کو مانتے تھے سوائے حیات خان کے کہ وہ آج کل کے نوجوانوں پر بالکل بھی بھروسہ نہیں کرتے تھے۔

"دیکھو میاں! گھر کا بچہ ہے۔ شادی کے بعد بھی پڑھتا رہے تو کوئی حرج نہیں اور پھر میرے جیسے چراغ سحری کا کیا بھروسہ کب بجھ جائے اور تمناؤں کا محل دل میں ہی راکھ ہو جائے۔" بابا جان کے کہنے پر سب ہی آبدیدہ ہو گئے تھے۔

"آپ ایسی باتیں کیوں کرتے ہیں بابا جان اللہ کرے کہ آپ کے پڑپوتے بھی آپ کی گود میں کھیلیں۔" شہلا بیگم اور ثمینہ بیگم دونوں نے بیک وقت کہا تھا جس پر سب نم آنکھوں سے مسکرانے لگے تھے۔

"بھئی تم لوگ شادی کرو گے تو میں پڑپوتے کھلاؤں گا مگر تم لوگ تو آئندہ دس سال بعد کی پلاننگ کر رہے ہو اور بھئی مجھے اتنا جینے کی تمنا نہیں ہے۔" بابا جان نے آنکھوں سے نمی کو صاف کر کے خوشگوار لہجے میں کہا تھا۔

"اگر آپ کی ضد ہے بابا جان تو ٹھیک ہے۔ میں ارسل سے بات کروں گا۔ وہ یقیناً" ہماری بات مان

جائے گا۔" اور پھر سب نے احمد خان کی بات پر ان شاء اللہ کہا تھا۔ دور پرے کونے میں تقدیر کا پنچھی انسان کی حکمت عملی پر مسکرا کر اڑا تھا۔

☼ ☼ ☼

"زل آپا!" جب تک آپ ٹریٹ دینے کا وعدہ نہیں کریں گی ہم آپ کو گڈ نیوز نہیں سنائیں گے۔" وہ جو جلدی جلدی ایک ادھورا ناول مکمل کرنے میں مگن تھی۔ نہال اور امثال کے اس بے جا مطالبے پر چڑ گئی تھی۔

"بھئی کیا تم لوگ ہر بات پر حکومت کی طرح ٹیکس لگائے رکھتی ہو۔ کچھ بتاؤ تو کیا نیوز ہے۔" سنزل نے مسلسل ان کی ایک ہی رٹ سے تنگ آکر جھنجلاتے ہوئے کہا تھا جس پر ان دونوں کا ایک شاندار قہقہہ گونجا تھا۔

"کیا کریں جناب! ہمیں ٹریننگ ہی ایسی ملتی ہے۔ کچھ لو اور کچھ دو۔" وہ دونوں ایک دوسرے کے ہاتھ پر ہاتھ مار کر ہنسی تھیں۔ ان کا اشارہ ارسل کی جانب تھا کہ ان دونوں کی زیادہ تر اسی سے بنتی تھی۔

"جی بالکل! غلط صحبت کا غلط اثر ہی ہوتا ہے۔ اسی لیے کہتی ہوں ہم جیسے مہذب لوگوں کی صحبت اختیار کرو۔" سنزل نے فرضی کالر جھاڑتے ہوئے انہیں جلایا تھا۔

"اوکے بابا! آپ تو خفا ہونے لگیں۔ جناب خبر یہ ہے کہ آپ کے قسط وار ناول کو کتابی شکل میں شائع کیا جا رہا ہے اور ماہنامے کی طرف سے آپ کو خصوصی مبارکباد کا یہ لیٹر ارسال کیا گیا ہے۔" نہال کے ہاتھ میں لہراتے لیٹر کو سنزل نے بے یقینی سے دیکھا تھا۔ ایک حیران کن نظر پاس کھڑی امثال پر ڈالی اور اس نے آنکھوں سے اثبات کا اشارہ کیا تھا۔ کتنی دیر اس پر بے یقینی کی کیفیت طاری رہی تھی۔ جیسے یقین نہ آ رہا ہو کہ اس پاک ذات نے اس جیسی حقیر سی چیز کو اتنی رحمتوں سے نواز ڈالا تھا کہ اپنا دامن چھوٹا لگنے لگا تھا۔ نہال اور امثال نے سب کو گھر میں بتایا تھا۔ سب ہی نے اسے مبارکباد دی تھی۔ جبکہ بابا جان نے باقاعدہ ماتھے پر بوسہ دیا تھا اور ڈھیروں دعاؤں سے نوازا تھا۔ بے اختیار اس کے کرم اور احسانات کا سوچ کر سنزل کی آنکھوں سے شکر کے جذبات آنسوؤں کی صورت بہہ نکلے تھے۔ جس پر چچا جان نے اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا تھا۔

"ہماری اتنی پیاری بیٹی کی آنکھوں میں تو ستارے جگمگانے لگے۔" سب اس بات پر مسکرائے تھے۔ سوائے ارسل کے جو بالکل خاموش تھا۔ سنزل کو اس کی خاموشی بے حد محسوس ہوئی تھی اور پھر تھوڑی دیر بعد ہی وہ بغیر کسی سے کچھ کہے لاؤنج سے اٹھ کر چلا گیا تھا۔ سب لوگ اپنی اپنی باتوں اور تبصرہ کرنے میں مصروف تھے شاید اسی لیے کسی نے اس کی خاموشی کا نوٹس نہیں لیا تھا مگر سنزل کو اس کی خاموشی بے حد کھلی تھی۔ مگر جلد ہی اس نے اپنی کیفیت پر قابو پا لیا تھا کہ وہ اس فن میں بہت ماہر تھی۔ یا شاید بے پایاں خوشی نے اس وقتی احساس سے باہر نکال کھینچا تھا۔ مگر یہ بھی ایک اٹل حقیقت ہے کہ خوشی کا احساس اسی وقت ہوتا ہے جب آپ کو مد مقابل اس کا احساس دلائے اور خوشی کی اہمیت بھی اسی وقت انمول ہوتی ہے جب ہمارے اردگرد کے لوگ ہمیں اس کا احساس و یقین دلاتے ہیں۔

اور آج اسی انجان احساس نے سنزل کی پلکوں کے نیچے نجانے کتنے آس کے دیے جلائے تھے۔ کچھ پا لینے کا، کچھ کر دکھانے کا عزم رگوں میں خون کی مانند دوڑا تھا۔ نجانے کیوں اور کب اس کے خیالات نے لفظوں کا روپ دھارا اور روشنائی کی صورت کاغذ پر بکھرنے لگے۔ مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کا یہ وقتی شوق جنون کی شکل اختیار کر گیا اور پھر اس کا زیادہ وقت اس کے ہمراز کاغذوں میں گزرنے لگا۔ مگر اب وہ ایک کامیاب رائٹر بننا چاہتی تھی۔ اور یہ اس کی منزل کی طرف بڑھنے والا پہلا کامیاب قدم تھا اور اب اسے آگے ہی بڑھنا تھا۔ بہت آگے۔

☼ ☼ ☼

"ارسل! بات سمجھنے کی کوشش کرو۔ یہ ہماری روایت بھی ہے اور ہماری شدید خواہش بھی اور پھر خاندان میں شادی کرنے میں حرج ہی کیا ہے۔" چائے کی ٹرے تھامے ابھی سنزل دروازے پر دستک دینے ہی والی تھی کہ شہلا بیگم کی جھنجلائی ہوئی آواز سنائی دی اور نادانستہ سنزل کا ہاتھ رک گیا تھا۔ یوں تو اسے اس طرح غیر اخلاقی حرکت زیب نہیں دیتی تھی مگر اندر کہیں تجسس کے پرندے نے اپنے پنجے گاڑے تھے۔

"ماما! روایات ہم سے پوچھ کر نہیں بنائی گئیں جسے نبھانا ہمارا فرض ہو۔ اگر یہ سو کالڈ زنجیریں آپ لوگوں نے بنائی ہیں تو انہیں شوق سے آپ لوگ ہی پہنیں۔" ارسل نے نہایت خود سری سے کچھ فاصلے پر بیٹھی شہلا بیگم کو نہایت بد تمیزی سے جواب دیا تھا جبکہ شہلا بیگم اپنے انوکھے لاڈلے کی ضد پر حیران تھیں۔ انہیں قطعاً" امید نہ تھی کہ ارسل اس طرح بی ہیو کرے گا۔

"آخر تمہیں اعتراض کس بات پر ہے۔ جلدی شادی کرنے پر یا پھر سنزل سے شادی پر۔" شہلا بیگم نے اپنے اڑیل گھوڑے کو غصے سے دیکھا تھا جو کوئی بھی سرا ہاتھ نہیں آنے دے رہا تھا۔ وہ بھی ایک ایسے موڑ پر جب بڑوں میں ہر بات طے ہو چکی تھی اور اسی بات نے شہلا کے ہوش اڑا دیے تھے۔ جبکہ دروازے کے پار کھڑی سنزل پر حیرتوں کے پہاڑ یکے بعد دیگرے ٹوٹے تھے۔ وہ جو ابھی ارسل کی شادی پر ہی حیران تھی اس کے ساتھ اپنی ذات کی وابستگی کا سوچ کر مزید حیران ہوئی تھی۔ اس کا دل زور سے دھڑکا تھا جبکہ جسم کا ہر عضو گویا کان بن گیا تھا۔

"ماما! میرے خیال میں میں آپ کو پہلے بھی بتا چکا ہوں۔ مگر پھر بھی آپ کو کلیئر کٹ بتا رہا ہوں کہ سنزل کسی بھی طرح میرے آئیڈیل سے میچ نہیں ہے۔ میرے خیالات اور اس کے خیالات میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ وہ دقیانوسی ٹائپ کی بورنگ لڑکی ہے اور میں رنگین دنیا کا باسی۔" سنزل کے ہاتھوں میں ٹرے بری طرح لرزی تھی۔ مگر وہ ابھی اور سننا چاہتی تھی ارسل کے دل میں چھپی نفرت کو اپنے ضبط کے پیمانے میں بھر کر دیکھنا چاہتی تھی۔

"آخر کیا برائی ہے سنزل میں خوب صورت پڑھی لکھی، سلیقہ مند بچی ہے۔ دیکھی بھالی ہے اور سچ پوچھو تو تم سے زیادہ قابل بھی ہے۔" شہلا بیگم کی آخری بات ___ ارسل کو جلتے کوئلوں پر گھسیٹ لائی تھی۔ وہ بل کھا کر ان کی طرف پلٹا تھا۔

"ماما! میں کسی ایسی لڑکی سے شادی نہیں کرنا چاہتا جو ہر وقت خیالات کا لبادہ اوڑھے سوچوں کی پائل پہنے کاغذوں کے سفید لباس پر فطری جذبات کی روشنائی بکھیرتی حقیقی زندگی سے کوسوں دور رہتی ہو۔ مجھے پریکٹیکل لائف پارٹنر چاہیے جو اپنے ساتھ ساتھ میری زندگی کے لیے بھی چمکتے سورج کی مانند ہو اور سنزل .... اسے تو سننے کے لیے بھی دو گھنٹے سوچنا پڑتا ہے۔ ہونہہ۔" باہر کھڑی سنزل کو ہر شے اپنے آپ پر ہنستی محسوس ہوئی ___ جیسے تمام در و دیوار ارسل کی بات پر اس پر تحقیرانہ انداز میں ہنس رہے ہوں۔

نجانے کتنے ہی پل اسے اپنی ذات کی ٹوٹی کرچیوں کو سمیٹنے میں لگے تھے۔ خوب صورتی دیکھنے والی آنکھ میں ہوتی ہے، ہاں! کتنا سچ ہے یہ کتنی آسانی سے ارسل نے اس کی تمام خوبیوں، اس کی منفرد صلاحیتوں کو گرد آلود چشمے سے دیکھا تھا۔ اس کی محنت، اس کی تمام ریاضتوں کے مینار کو یکدم اپنی حقیر سوچ کے وار سے زمین بوس کر دیا تھا۔ اپنے ٹھنڈے پڑتے وجود کے ساتھ اس نے چائے واپس کچن میں لا کر اسی طرح رکھ دی تھی اور چپ چاپ کمرے کی طرف چل دی تھی کہ اس وقت وہ اپنی آنکھوں میں مچلتے آنسوؤں کو قید نہیں کرنا چاہتی تھی۔

☼ ☼ ☼

"ارے .... رے! سارا دودھ ابل گیا۔ اوہو.... چولہا تو بند کر دو۔ سنزل۔" لنچ کے لیے تیاری کرتی تبسم بیگم نے جھنجلاتے ہوئے برنر کے پاس کھڑی سنزل کو دیکھا تھا۔

"اچھا سنبل! یوں کرو بریانی کے لیے ذرا یہ چاول چن دو۔" انہوں نے چاولوں کا باؤل شیلف پر رکھتے ہوئے جلدی جلدی کہا تھا۔ جبکہ وہ خود کبابوں کے لیے قیمہ دیکھنے لگی تھیں' آج سنڈے تھا اور سنڈے کو ماما اور چچی جان مل کر اچھے سے لنچ کا اہتمام کرتی تھیں۔ چونکہ آج چچی جان کی طبیعت ناساز تھی لہٰذا سنبل ان کی کمی کو پورا کر رہی تھی۔

"اے لڑکی! کیا گونگے کا گڑ کھا کر آئی ہو۔" آمیزہ ملانے کے بعد تبسم بیگم جو سنبل کی طرف پلٹی تھیں تو اسے اسی پوزیشن میں بت بنے کھڑا دیکھ کر حیران ہوئی تھیں جبکہ سنبل نے ایک بار بھی اپنے جھکے ہوئے سر کو نہ اٹھایا تھا۔ تبسم بیگم کو اس کے انداز میں غیر معمولی پن نظر آیا اور وہ یکدم سب کچھ چھوڑتی اپنی فرماں بردار بیٹی کی طرف بڑھی تھیں۔

"سنبل! کیا بات ہے بیٹا۔" اور وہ جو ابھی تک سود و زیاں کے گول دائرے میں گھوم رہی تھی۔ ماما کی تفکر آمیز آواز پر چونکی تھی۔

"کچھ نہیں ماما۔" اس نے کھوکھلے لفظوں اور خاموش نگاہوں سے انہیں تسلی دینا چاہی تھی۔

"اگر کچھ نہیں ہے بیٹا تو پھر اتنی گم سم کیوں ہو۔" انہوں نے پیار سے اس کی ٹھوڑی کو چھوا تھا۔ آنسوؤں کے بھید میں چھپے شکوؤں نے آنکھوں سے رہائی طلب کی تھی۔

"مما! آپ لوگوں نے ایسا کیوں کیا۔" اس نے بمشکل آنسوؤں کو واپس دھکیلا تھا۔

"کیا کیوں کیا؟" مما نے اب کی بار چونکتے ہوئے اسے دیکھا تھا۔

"یہی میری اور ارسل کی ....." اس نے بات ادھوری چھوڑتے ہوئے رخ پھیرا تھا۔

"بیٹا! یہ کوئی ایسی انوکھی خواہش نہیں ہے۔ سارے والدین ہی اپنی بیٹیوں کو خوش و آباد دیکھنا چاہتے ہیں اور اگر وہ خوشیاں انہیں ان کی نظروں کے سامنے ملیں تو سونے پہ سہاگہ والی بات ہوتی ہے۔" مما نے اپنے مخصوص نرم انداز میں اسے سمجھانا چاہا تھا

مگر سنبل کے دل کے سمندر میں اٹھتے شکوؤں کے تلاطم میں جیسے کچھ اور شدت پیدا ہوئی تھی۔ دل و دماغ میں ایک بار پھر ارسل کے تحقیر آمیز جملے کانٹوں کی مانند چبھنے لگے تھے۔

"مگر مما! آپ لوگوں کو پہلے مجھ سے بھی تو رائے لینی چاہیے تھی۔" ارسل کے الفاظ بے وقعتی کی بیل کی مانند اس کے دل سے لپٹ گئے ہیں۔ "اگر آپ لوگ مجھ سے میری رائے معلوم کرتے تو شاید وہ بھی ارسل کے جواب سے مختلف نہ ہوتی۔ مگر مما آپ لوگوں نے مجھ پر نسوانیت کی مہر لگا کر میری رائے کے حق کو تلف کر کے زمانے کی ریت و رواج کو برقرار رکھا اور ایک مرد کو اونچے سنگھاسن پر بٹھا دیا۔ آپ لوگوں نے اچھا نہیں کیا مما۔" اس کے سارے بدن میں جیسے ایک آگ سی بھڑک اٹھی تھی۔ ایک بے ضرر سے شوق کی بدولت ارسل نے اس کی ذات کو ایک بدنما دھبا بنا دیا تھا۔ ایسا نہیں تھا کہ وہ ارسل کے لیے کوئی نرم جذبات رکھتی تھی۔ مگر جس انداز میں ارسل نے اس کی محنت' اس کے فن کو پرکھا تھا اور اسے ٹھکرایا تھا یہ بھی اس کی نسوانیت پر کوڑے کی مانند لگے تھے اور اس کی انا زخمی سانپ کی طرح بلبلا کر رہ گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

"او ہیلو پرنس! خوابوں سے نکل کر حقیقت کی وادی میں قدم رنجہ فرمایئے۔" گاڑی ایک جھٹکے سے انڈس ویلی کے سامنے رکی تھی۔ بہت سارے دن اس نے ______ اپنے ہمراز کاغذوں کے ساتھ گزارے تھے۔ نہال' امثال اور فرقان کے مڈ ٹرم ایگزیمیز چل رہے تھے۔ جس کی وجہ سے وہ بھی اس کے بدلے ہوئے موڈ کو محسوس نہ کر سکے۔ مگر اب اچانک ایگزیمز ختم ہوتے ہی انہوں نے انڈس ویلی میں لگی آرٹ اینڈ کیلی گرافی ایگزیبیشن دیکھنے کا پروگرام بنایا تھا۔ جو خزاں کے موسم سے یکدم بہار کی آمد محسوس ہوا تھا۔ کافی دنوں کی فرسٹریشن کے بعد اسے ______ بہت اچھا محسوس ہوا تھا۔

ایگزیبیشن کے لاسٹ ڈیز تھے جس کے باعث رش بہت زیادہ تھا۔ وہ تینوں فرقان کی ہمراہی میں گلاس ڈور کو پش کرتی اندر داخل ہوئی تھیں۔

"سبحان اللہ!" وہ جو سامنے لگی بے حد خوب صورت تصویر کو دیکھنے میں مگن تھی۔ کسی اجنبی آواز پر بے ساختہ چونکی تھی۔ مگر مد مقابل ساتھ والی تصویر دیکھنے میں مگن تھا۔ وہ بھی خاموشی سے اسی تصویر کا بغور جائزہ لینے لگی۔ جس کا تھیم سورۃ الرحمٰن پر تھا' ______ آڑی ترچھی لکیروں کے ذریعے جنگل میں تنہا اور ویران راستہ دکھایا گیا تھا۔ بے حد خوب صورتی سے کیلی گرافی کے ذریعے اس میں سورۃ کی ایک آیت لکھی گئی تھی۔ نہ جانے کتنی دیر وہ اسی کو دیکھنے میں محو رہتی کہ اچانک وہی اجنبی آواز پھر گونجی تھی۔

"انسان بعض اوقات کشمکش کے کیسے دوہراہے پر آکھڑا ہوتا ہے کہ نظر نہ تو قدرتی شاہکار سے ہٹنے کو تیار ہوتی ہے اور نہ ہی انسانیت کا حق ادا کرتے فن پاروں کو دیکھنے سے گریزاں ہوتی ہے۔" اس نے حیرانی اور پریشانی کے ملے جلے تاثرات لیے اس اجنبی سے انسان کو دیکھا تھا جو بظاہر تو اسی تصویر کو دیکھ رہا تھا مگر اس کی آواز اس قدر تھی کہ جیسے کسی دوسرے سے مخاطب ہو اس نے اپنے دل میں ابھرتے خدشے کے تحت گیلری میں چاروں جانب نظر دوڑائی تھی مگر اسے اپنے اور اس کے سوا کوئی نظر نہ آیا تھا۔ دراصل یہ ہال سے ملحقہ رومز کی طرف جانے والی گیلری تھی جس میں جگہ کی تنگی کے باعث چند ایک فن پارے آویزاں تھے۔ مگر وہ اپنی آدم بے زار طبیعت کے زیر اثر نہال اور امثال کو فرقان کے ساتھ چھوڑ کر اس طرف آ نکلی تھی۔

"ایان! یار چلو' لنچ ٹائم ختم ہوئے بھی گھنٹہ گزر چکا ہے میرے بھائی ہری اپ کم بیک۔" اس سے پہلے کہ وہ اس سے مخاطب ہوتی ہال کی سائیڈ سے کسی نے اسے آواز دی تھی اور وہ کسی روبوٹ کی طرح اس آواز کی سمت چل دیا تھا۔ اس سے پہلے کہ اس کی سوچ کا

پرندہ کہیں اور پرواز کرتا گیلری میں بڑھتے رش کے باعث اس نے اپنے قدم نہال لوگوں کی طرف بڑھائے تھے اور پھر ایک بھرپور دن گزارنے کے بعد وہ لوگ آرٹ پر تبصرہ کرتے واپسی کی راہ پر چلے تھے۔

رات کو سونے سے پہلے اسے اچانک ہی اس اجنبی کے الفاظ یاد آئے تھے جو کہ اس کی سمجھ سے بالاتر تھے۔ مگر پھر بھی وہ جانتی تھی کہ اس نے وہ الفاظ اس کے لیے کہے تھے۔ ہائے یہ عورت' سنبل کے دل میں عجیب سی گدگدی ہوئی تھی اور لبوں پر اک مسکراہٹ آن ٹھہری تھی۔ مگر ان پر لطیف جذبات پر اچانک ہی کسی سیاہ رات کی مانند ارسل کے الفاظ نے تاریکی بکھیری تھی۔ مسکراتے ہونٹ لمحوں میں سکڑے تھے۔

☼ ☼ ☼

"مسٹر ایان! ڈیٹ اینڈ کریڈٹ کی تمام فائلز لے کر میرے آفس آئیں۔" ایان جو اپنے ہی خیالوں میں رب کی تخلیق کو سراہ رہا تھا پاس سے گزرتے باس کی آواز پر یکدم ہڑبڑا کر کھڑا ہوا۔ مگر وہ راکٹ کی سی تیزی سے واپس جا چکے تھے۔ واپس بیٹھتے اچانک اس کی نظر سامنے پورے بتیس دانت نکالتے باقر نیازی پر پڑی تھی۔

"یار! معلوم ہے کہ تو نے اپنا ٹوتھ پیسٹ چینج کر لیا ہے۔" ایان نے اپنے آپ کو نارمل ظاہر کرتے اسے چھیڑا تھا۔

"بدلے بدلے میرے سرکار نظر آتے ہیں۔" جواباً اس کی مسکراہٹ مزید گہری ہوئی تھی۔

"کیا مطلب ہے تمہارا! کیا میرے دو سینگ نکل آئے یا میں سپرمین کی طرح ہوا میں چھلانگیں لگا رہا ہوں۔" ایان نے اپنے دل کو ڈانٹتے ہوئے اسے بھی ڈانٹا تھا' مگر وہ کہتے ہیں نا عشق اور مشک چھپائے نہیں چھپتے۔

"آ..... ہم..... حضرات کل سے ہمارے عزیزم اپنی ایک متاع حیات ایک ایگزیبیشن میں بھول آئے ہیں۔ خدا جانے کون کب کہاں وسیلہ حاصل سبب

بنے۔" باقر نیازی نے خالصتاً" اردو بولنی شروع کی تھی۔

"شٹ اپ یار باقر! ایسا کچھ نہیں ہے۔" ایان نے اسے ٹالنے کی کوشش کی تھی۔ دراصل وہ اور باقر نیازی ایک ہی کیبن شیئر کرتے تھے۔

"ویسے یار کیا وہ بہت حسین تھی۔" اب کے باقر نے سیدھے ہوتے ہوئے سنجیدہ لہجے میں پوچھا تھا اور ایک پل کو ایان بھی واپس کل میں چلا گیا تھا۔

"ہوں..... شاید وہ مشرقی حسن کا پیکر تھی۔" کھوئے ہوئے لہجے میں اس کے حسن کی تعریف کے لیے الفاظ تلاشے تھے۔

"او..... تو اب سمجھ آیا کہ موصوف کا پیمانہ جام' معیار ذوق حسن ہے۔" باقر نے اس کے بارے میں قیاس آرائی شروع کی تھی یکدم ہی اسے ایک سنجیدہ سوال یاد آیا تھا۔

"یار باقر! اگر میں یہی سوال تجھ سے کروں تو۔" ایان نے گہری نظریں جمائے باقر نیازی سے پوچھا تھا۔

"حسن ایک اٹل حقیقت ہے اس کائنات کی میرے دوست۔"

باقر نیازی نے اگرچہ سچ کہا تھا کہ واقعی خوب صورتی اس دنیا کی اولین سچائیوں میں سے ایک ہے۔ مگر وہ ایسا نہیں سوچتا تھا۔

"نہیں باقر! میرے نزدیک دنیا کی طرح حسن بھی فانی شے ہے۔ یہ جوانی کے ساتھ چڑھتا اور بڑھاپے کے ساتھ ڈھلتا سورج ہے۔ انسان کے پاس کچھ ایسا خاص ضرور ہونا چاہیے جو اسے لاثانی کردے۔ جو اسے سب میں ممتاز و منفرد کردے۔" اس نے کھوئے ہوئے لہجے میں غیر مرئی نقطے پر نگاہیں جمائے اپنے خیالات کا اظہار کیا تھا۔

"یار شاید تمہارے جیسے ہی کسی دیوانے کے لیے شاعر نے کیا خوب کہا ہے۔"

[illegible] ناکامی کا اک سبب یہ بھی ہے فراز
[illegible] مانگتے ہیں اوروں سے جدا مانگتے ہیں

اور [illegible] ایان کو فائل کا خیال آیا۔ اس نے جلدی سے مطلوبہ فائل اٹھائی تھی۔ جب اسے کیبن سے نکلتے دیکھ کر باقر نے پیچھے سے ہانک لگائی تھی۔

"ارے صاحب تعریف تو کرتے جائیے۔" اور پھر ان دونوں کا قہقہہ گونجا تھا۔

☆ ☆ ☆

انسانی رشتے بھی کتنے عجیب ہوتے ہیں کبھی تو یہ چٹانوں کی مانند مضبوط نظر آتے ہیں اور کبھی ذرا سی ٹھیس پہنچنے پر شیشے کی مانند ٹوٹ کر بکھر جاتے ہیں۔

"حیات خان ہاؤس" بھی آج کل کچھ اسی قسم کی ٹوٹ پھوٹ کا شکار تھا۔ چچا جان اور چچی جان ارسل کے انکار کے بعد سے شدید شرمندگی کا شکار تھے۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ داؤد خان نے ارسل اور فرقان دونوں کی صورت میں بیٹوں کی کمی کی پیاس بجھائی تھی۔ انہیں اندازہ نہ تھا کہ ارسل اس قدر بدلحاظی کا مظاہرہ کرے گا۔ یہاں تک کہ جب اس پر زیادہ دباؤ ڈالا گیا تو اس نے خودکشی کی دھمکی دے ڈالی۔ دن اسی طرح گزرنے لگے۔ دادا جان ناراض ہو کر زمینوں پر واپس چلے گئے اور بظاہر ہر کوئی اپنے کام میں مگن نظر آنے کی کوشش میں ایک دوسرے سے نگاہیں چرانے لگا۔ آہستہ آہستہ اس بات کی خبر نہال اور امشال کو بھی ہو گئی تھی۔ جس پر انہوں نے بھی ارسل کا خاموش بائیکاٹ کر دیا تھا۔ یوں سب کے درمیان ایک ان دیکھی دیوار کھنچ گئی تھی۔

☆ ☆ ☆

حیات کا سمندر وقت کی لہروں کے سنگ دوبارہ اسی تسلسل سے بہنے لگا تھا کہ اچانک اس سمندر میں ایان آفندی کی صورت میں گرنے والے پتھر نے ایک ارتعاش پیدا کیا تھا۔ دراصل کچھ ماہ قبل سنبل کی دوست رائنہ کی شادی ہوئی تھی اور اسی شادی میں ایان کی فیملی نے سنبل کو دیکھا تھا۔

ایان اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھا اور C.A کرنے کے بعد ایک ملٹی نیشنل فرم میں پرکشش جاب رکھتا تھا۔ یوں وہ لوگ رائنہ کے توسط سے آئے تھے۔

چونکہ رائنہ کی فیملی کو بھی سب جانتے تھے کہ وہ سنبل کی بچپن کی سہیلی تھی اور ان کا ساتھ بہت پرانا تھا۔ یوں ایک مضبوط حوالے لے کر ایک خوب صورت شام میں مسٹر الیاس آفندی اور سلطانہ آفندی سنبل کے لیے جھولی پھیلائے حیات خان ہاؤس چلے آئے تھے اور دادا جان اور بابا جان نے رسمی سی سوچ بچار کے لیے وقت مانگا تھا۔ دادا جان نے لڑکے کی جاب اور اس کے متعلق باوثوق ذرائع استعمال کرتے ہوئے چھان بین کروائی تھی اور سب کچھ پرفیکٹ ہونے پر ان لوگوں کو ٹھیک دو ہفتے بعد ہاں کا عندیہ بھجوا دیا گیا تھا۔ سب اس اچانک مل جانے والی خوشی پر حیران بھی تھے اور خوش بھی کہ بہت عرصے بعد حیات خان ہاؤس میں یوں خوشیوں نے اپنا رخ ہواؤں کے سنگ کیا تھا۔

☆ ☆ ☆

لے جائیں گے۔
لے جائیں گے دل والے دلہنیا لے جائیں گے

فرقان نے کچن کی شلف پر چوکڑی مارتے ہوئے پلیٹ کو بجانا شروع کیا تھا۔ ساتھ ہی بریانی کا مسالا بناتی نہال اور امشال بھی اپنی ٹون میں واپس آئی تھیں۔

ارے رہ جائیں گے رہ جائیں گے
گھر والے دیکھتے رہ جائیں گے

نہال اور امشال نے فرقان کی طرف دیکھ کر جوابی حملہ کیا تھا۔ جب سے سنبل کی ہاں ہوئی تھی وہ تینوں اسی طرح ہلا گلا کرنے میں لگے ہوئے تھے۔ کچھ ہی دن بعد رمضان المبارک کی آمد ہونے والی تھی اور ان کا کہنا تھا کہ پھر ہم ہلا بازی نہیں کر سکیں گے۔ فی الحال ایک ہفتے بعد انگیجمنٹ کا فنکشن رکھا گیا تھا اور عید کے فوراً بعد شادی کا ارادہ تھا۔ تبسم بیگم کے تو ہاتھ پاؤں پھولے جا رہے تھے۔ ویسے تو تمام تیاری انہوں نے کر رکھی تھی مگر پھر بھی کپڑے' زیورات اور دیگر سامان کی فہرست بھی خاصی طویل تھی اور وہ رمضان المبارک سے پہلے شاپنگ مکمل کرنا چاہتی تھیں۔ سو آج کل کچن پر ان تینوں کا راج تھا جبکہ فرقان ان کا سپورٹر تھا۔ جس کے بغیر بقول اس کے کوئی کام مکمل نہ ہو سکتا تھا۔

یہ گلیاں یہ چوبارہ
یہاں آنا نہ دوبارہ
کہ اب ہم تو ہوئے پردیسی
کہ تیرا یہاں کوئی نہیں

سنبل جو اپنے ہی دھیان میں کھڑی نہال لوگوں کو بھنگڑا ڈالتے دیکھ رہی تھی کہ اچانک دروازے کی سمت سے آنے والی آواز نے ان سب کے ساتھ اسے بھی چونکایا تھا۔ جہاں ارسل عجیب تاثرات لیے سنبل کی طرف دیکھ کر "یہ گلیاں یہ چوبارہ" گنگنا رہا تھا سنبل کی آنکھوں میں آئے یکدم ہی ڈھیر سارے آنسو اس کے گالوں سے ملنے چلے آئے تھے۔

"ارے واہ بھئی! کیوں نہ آئے دوبارہ یہ کوئی بدمنی کولہا پوری تھوڑی ہی ہے۔" امشال نے معصومیت سے فلمی سچویشن کو یاد کرتے ہوئے برا سا منہ بنایا تھا مگر سنبل جانتی تھی کہ ارسل کی باتوں میں طنز کا زہر شامل تھا۔ جسے صرف وہ ہی محسوس کر سکتی تھی۔

"بھئی سب باتوں کو چھوڑو۔ پتا ہے میں نے دولہا کے استقبال کے لیے ایک شاندار سونگ سلیکٹ کیا ہے۔" ارسل نے یکدم موڈ کو خوش گوار بناتے ہوئے سب کی طرف دیکھ کر کہا تھا۔

"اچھا! جلدی سے بتائیں۔ کون سا سونگ سلیکٹ کیا ہے۔" امشال نے جلدی سے ارسل کے قریب آتے ہوئے پوچھا تھا۔

"بھئی اکشے کمار کا بہت ہی مشہور گانا ہے۔"

تینوں گھوڑی کنے چڑھایا
بھوتنی دے

"کیسا ہے۔"

ارسل نے باقاعدہ گھوم کر گاتے ہوئے ان کی طرف دیکھا تھا۔

"شٹ اپ! ارسل تمہیں کوئی حق نہیں پہنچتا کسی کے بارے میں کچھ بھی کہنے کا۔" سنبل نے بمشکل

اپنے آپ کو سخت الفاظ کہنے سے روکا تھا۔ جبکہ باقی سب بھی یکدم غصے سے اس کی طرف پلٹے تھے۔ کیونکہ ارسل نے ایان کے سانولے رنگ کو تنقید کا نشانہ بنایا تھا۔

"بھئی! تم لوگ تو اس طرح بی ہیو کر رہے ہو جیسے میں نے کوئی بہت بڑا جھوٹ بول دیا ہو ارے سچ ہی تو کہا ہے۔" ارسل نے ان سب کے لال بھبوکا چہروں کو دیکھ کر لطف اندوز ہوتے ہوئے کہا تھا۔

"مسٹر ارسل احمد خان! کاش کہ آپ ایک نارمل انسان ہوتے تو یقیناً" میں آپ کو آپ کے سوال کا جواب ضرور دیتی مگر آپ جیسے سائیکو کیس لوگوں کو کچھ بھی بتانے اور سمجھانے سے کچھ فائدہ نہیں کیونکہ آپ آنکھ رکھتے ہوئے بھی اچھائی دیکھنے والی بینائی سے محروم ہیں۔ سو..... آئندہ کسی پر کمنٹس پاس کرنے سے پہلے اپنے آپ کو آئینے میں ضرور دیکھ لیجیے گا۔" اور اب کے شرمندہ ہونے کی باری ارسل کی تھی۔ سنبل نے ایک ہی بار میں چیک اینڈ میٹ کیا تھا۔ ایسا پہلی بار ہوا تھا کہ کسی نے ارسل کو آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پاگل قرار دیا تھا اور وہ بھی سب کے سامنے سب کچھ کہنے کے بعد سنبل نے آرام سے رخ موڑ کر چولہے کی آنچ دھیمی کی تھی یعنی اسے گیٹ لاسٹ کا سائن دیا گیا تھا۔ جبکہ ارسل مٹھیاں بھینچتا باہر کی طرف بڑھا تھا۔

"نہ جانے بھائی کو کیا ہو گیا ہے۔ آئی ایم ریئلی سوری آپا۔" اس کے جانے کے بعد فرقان نے شیلف سے اتر کر سنبل کے پاس آتے ہوئے شرمندگی سے چور لہجے میں کہا تھا۔ جبکہ حقیقتاً" وہ کچھ عرصے سے ارسل کے بدلے رویے سے بے حد اپ سیٹ تھا۔

"اٹس او کے فرقان! کچھ لوگوں کو دوسروں کو چوٹ کرنا اچھا لگتا ہے۔ مگر اس میں تم پریشان مت ہو۔" سنبل نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہتے فرقان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے تسلی دی تھی کہ وہ جانتی تھی فرقان بہت ساری باتوں سے انجان تھا۔

☼ ☼ ☼

"سنبل! آخر تم میری بات سمجھنے کی کوشش کیوں نہیں کر رہی ہو۔" تبسم بیگم نے بالآخر جھنجھلاتے ہوئے اپنے سے کچھ فاصلے پر کاغذوں کو سیاہ کرتی سنبل کو دیکھا تھا۔ وہ جو پچھلے آدھے گھنٹے سے اس کے فارغ ہونے کا انتظار کر رہی تھیں اب بالآخر ان کا صبر کا پیمانہ لبریز ہونے لگا تھا۔

"ممّا! آپ بولیں نا میں سن رہی ہوں آپ کی بات۔" سنبل نے پہلے کہے ہوئے فقرے کو دوبارہ دہرایا تھا۔ ویسے تو وہ جانتی تھی کہ یقیناً" کوئی خاص بات ہی ہو گی جو تبسم بیگم اوپر اس کے کمرے میں آئی ہیں کہ جب سے ان کے جوڑوں کے درد کا مسئلہ ہوا تھا وہ سیڑھیاں بہت کم چڑھتی تھیں مگر وہ بھی کیا کرتی کہ اسے ناول مکمل کرنا تھا ہر صورت میں کیونکہ نہال لوگوں نے اسے آج تک کی ڈیڈ لائن دی تھی اور پھر اسے منگنی کے ہنگاموں میں ان کا ساتھ دینا تھا۔

"نہیں! پہلے تم ادھر آؤ میرے پاس۔" تبسم بیگم نے اسے بیڈ پر اپنے پاس آنے کا اشارہ کیا تھا اور اب کی بار سنبل خاموشی سے اٹھ کر ان کے پاس چلی آئی تھی۔

"جی کہیے!" اس نے بیڈ پر آلتی پالتی مارتے ہوئے کہا۔

"زل! تمہیں ہمارے فیصلے سے کوئی اختلاف تو نہیں ہے بیٹا۔ دیکھو جان ابھی بھی تمہارے پاس وقت ہے۔ ہم روایت پسند ضرور ہیں بیٹا مگر شدت پسند نہیں۔ تم اگر ایان سے خود ملنا چاہو تو ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہو گا اور نہ ہی اس بات کا تمہارے بابا جان اور میرے علاوہ کسی کو پتا چلے گا۔" اس نے حیرانی سے تبسم بیگم کی طرف دیکھا تھا جو آس و یاس کی کیفیت میں ابھی اس کے جواب کا انتظار کر رہی تھیں۔ اس لمحے سنبل کے دل سے پچھلے تمام شکوے یک دم ختم ہوئے تھے۔ اس نے آنکھوں میں اترتی نمی کو چھپانے کے لیے سر جھکا لیا۔

"ممّا! مجھے آپ لوگوں کی پسند پر پورا بھروسہ ہے۔

کوئی والدین اپنے جسم کے کسی حصے کو جان بوجھ کر تکلیف میں نہیں ڈال سکتے۔ باقی میرے نصیب۔" اس نے تبسم بیگم کے ہاتھ کو اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے کہا تھا اور ساتھ ہی ان کی ہتھیلی پر بوسہ دیا تھا۔

"میری پیاری بیٹی' میری جان' اللہ تمہارے نصیب میں چاند سی ٹھنڈک اور سورج سی روشنی عطا کرے آمین۔" تبسم بیگم نے اسے گلے لگاتے ہوئے پیار کیا تھا کہ اپنی یہ بیٹی انہیں سب سے زیادہ عزیز اور پیاری تھی۔

"ایک اور بات زل! میں چاہتی ہوں کہ کچھ عرصے کے لیے تم اپنا لکھنے کا شوق چھوڑ دو۔ دیکھو بیٹا! بیٹی اور بہو میں یوں تو کوئی خاص فرق نہیں ہوتا مگر جب لڑکی بیٹی ہوتی ہے نا تو اس پر توجہ دی جاتی ہے اور جب لڑکی بہو بنتی ہے تو سسرال والے اس کی توجہ پر اپنا حق سمجھتے ہیں اور اچھی بہو وہی ہوتی ہے جو اپنے گھر اور سسرال کو پیار اور توجہ دے تاکہ اس کے والدین کی تربیت پر کوئی انگلی نہ اٹھائے۔ تم میری بات سمجھ رہی ہو نا زل۔" تبسم بیگم نے پیار سے اس کی ٹھوڑی کو چھوا تھا کہ جانتی تھیں اس وقت اس پر کیا گزر رہی ہے۔

"ممّا! ضروری تو نہیں کہ ہر کوئی ارسل جیسی پست سوچ ہی رکھتا ہو۔" بہت دیر بعد اس کی خاموشی میں آواز گونجی تھی۔

"اللہ کرے بیٹا! میری تو ہر سانس دعا گو ہے تمہارے لیے۔ مگر بیٹا فی الحال احتیاط تو کی جا سکتی ہے نا بعد میں تم دونوں کی انڈر اسٹینڈنگ ہو جائے اور تم اس کے رجحانات' خیالات جان لو تو بے شک اپنے شوق کو جاری رکھو۔"

"ممّا! کبھی کبھی مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ہم لڑکیاں بھی قفس میں قید پرندوں کی مانند ہیں اور ان کی آزادی کی حد صرف پر کاٹ کر کھلا چھوڑ دینے کی حد تک ہو۔" اس نے خالی خالی نظروں سے ممّا کی طرف دیکھا تھا۔

"دیکھو سنبل! یہ ایک قانون فطرت ہے۔ پرندوں کو کائنات کی خوب صورتی اور اللہ کی پاکیزگی بیان کرنے کے لیے بنایا گیا ہے۔ اسی طرح عورت کو گھر کی زینت بنایا گیا اور بیٹا! یہ ایک اٹل حقیقت ہے کہ عورت کی ذات کا تقدس' احترام اس کے گھر کی خوشحالی اور بقا میں ہی چھپا ہے۔ اسی لیے رب کریم نے ہر رشتے کی حد مقرر کر دی ہے اور یاد رکھو جو اس حد سے تجاوز کرنا چاہے تو وہ دیوار سے ٹکرانے والے اس شیشے کی مانند ہوتا ہے جو چکنا چور ہو کر زمین پر بکھر جاتا ہے اور اس کی شناخت ممکن نہیں رہتی۔" انہوں نے لہجے کو مضبوط کرتے اسے آنے والی ذمہ داریوں سے آگاہی دینا چاہی تھی۔ اس نے ایک نظر ممّا پر ڈالی تھی۔ پھر خاموشی سے اٹھ کر اپنے ادھورے پڑے ناول کو فائل میں مقید کیا تھا اور پھر اسے دراز میں لاک کر کے چابی ان کی ہتھیلی پر رکھ دی تھی جس پر انہوں نے ایک گہرا سانس خارج کیا تھا کہ کچھ فیصلے وقت کی ناؤ میں ڈال دینے چاہئیں یہی سب کے لیے بہتر تھا۔

☼ ☼ ☼

منگنی کا فنکشن بے حد شاندار رہا تھا۔ چونکہ لڑکے والوں نے اسی شہر سے آنا تھا لہٰذا نائٹ فنکشن رکھا گیا تھا۔ مگر شاید قدرت بھی اس دن خاص مہربان تھی کہ دن میں بھی بے حد سہانا موسم رہا تھا۔ فنکشن میں چند قریبی حلقہ احباب کے علاوہ گاؤں کے کچھ عزیزوں نے شرکت کی تھی۔ جبکہ ایان لوگوں طرف سے رائنہ کی فیملی کے علاوہ چند مہمان اور دوست شامل تھے۔ سبھی نے ان کی جوڑی کو بے حد سراہا تھا کہ بھلے ہی ایان کا رنگ سنبل کے مقابلے میں تھوڑا سانولا تھا مگر اس کی پرسنالٹی بے حد شاندار تھی۔ جس کا اعتراف سنبل نے بھی دل ہی دل میں کیا تھا۔ ایان نے سنبل کو ڈائمنڈ رنگ پہنائی تھی۔

"ارے بھئی! رنگ اچھی طرح چیک کر لینا۔ ڈائمنڈ اصلی بھی ہے۔" جیسے ہی ایان نے انگوٹھی سنبل کو پہنائی تھی۔ یکدم ارسل کی آواز گونجی تھی جس پر سب نے چونک کر اسے دیکھا تھا۔

"ارے! اس کی تو عادت ہے مذاق کرنے کی۔" چچی

جان نے جلدی سے بات کو دوسرا رخ دیا تھا کہ مبادا نئے نئے سسرالی بات کو سنجیدہ ہی نہ لے لیں۔ ساتھ ہی ارسل کو آنکھیں دکھائی تھیں اور پھر واقعی سب نے مذاق سمجھ کر اس بات کو انجوائے کیا تھا۔ جس پر ارسل کے حلق تک میں کڑواہٹ گھل گئی تھی کہ اس کا بنا بنایا پروگرام بگڑ گیا تھا۔ پھر کھانے کا دور۔ چلا تھا اور تقریباً ایک بجے وہ لوگ رخصت ہوئے تھے۔

دادا جان بے حد خوش تھے کہ انہیں ایان کی نیچر بے حد پسند آئی تھی۔ سنجیدہ اور سوبر سا ایان ویسے تو سبھی کو پسند آیا تھا۔ مگر اس کے ٹھہرے ٹھہرے لہجے نے تو دادا جان کا دل ہی موہ لیا تھا۔ کہ وہ اپنی سب سے عزیز اور قابل پوتی کے لیے ایسا ہی شریک سفر چاہتے تھے۔ آج انہیں ارسل کو دیکھ کر شدید دکھ ہوا تھا کہ وہ واقعی سنبل کے قابل نہ تھا۔

☼ ☼ ☼

فضا میں ایک مخصوص سی پاکیزگی اور نور پھیل گیا تھا۔ ہر کوئی اپنی دنیاوی سرگرمیوں کو پس پشت ڈال کر رمضان کی برکتیں سمیٹنے میں مشغول تھا۔ مگر کہتے ہیں نا دینے والا تو دے ہی دیتا ہے۔ مگر لینے والے کو لینے کا ہنر آنا چاہیے۔ تو اسی میں ارسل جیسے لوگ بھی شامل تھے جو جمعۃ المبارک میں بھی اپنی رنگینیوں اور مستیوں میں کھوئے خرد سے بے گانہ سراب کی طرف بھاگتے رہتے ہیں۔ ویسے تو ابلیس کو رمضان المبارک میں قید کر دیا جاتا ہے۔ مگر اس کے پھیلائے زہر کو جو ہماری شریانوں میں خون کی طرح دوڑتا ہے۔ انسان قید نہیں کر سکتا۔ اسی طرح کے زہریلے خون میں سازشیں جنم لیتی ہیں۔ بالکل ایسی ہی سازش آج کل ارسل کے دل و دماغ میں سنبل کو خوش دیکھ کر پنپ رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

"ارے لڑکیو! جلدی جلدی ہاتھ چلاؤ۔ بھئی وقت کم ہے اور مہمان آتے ہی ہوں گے۔" تبسم بیگم نے کچن میں جھانک کر انہیں ہائی الرٹ کیا تھا در اصل آج ایان اور اس کی فیملی کے لیے جائے کا اہتمام کیا جا رہا تھا اور ساتھ ہی وہ لوگ سنبل کی عیدی بھی لا رہے تھے۔ لہٰذا آج "خان ہاؤس" میں خوب ہلچل مچی تھی کہ خاندان کا پہلا داماد ہونے کی حیثیت سے ایان کو خاص پذیرائی حاصل تھی۔

"مما! آپ بے فکر رہیں۔ بس سب مکمل ہے اور ابھی تو افطار میں بہت ٹائم ہے۔" سنبل نے سیلڈ میں کریم مکس کرتے مما کی طرف پیار سے دیکھ کر انہیں تسلی دینا چاہی تھی۔

"ارے! تو کیا تم لوگ عین افطار تک کچن میں گھسی رہو گی۔" تبسم بیگم نے جھنجلاتے ہوئے کہا تھا جس پر ان تینوں نے مسکرا کر ایک دوسرے کو دیکھا تھا۔

"تائی جان! بازار سے کچھ لانا تو نہیں ہے۔" ابھی وہ ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر کچھ کہنے ہی والی تھیں کہ ارسل چلا آیا تھا۔ جو آج خلاف معمول بے حد بیبا بچہ بنا ہوا تھا اور ہر کام میں پیش پیش تھا۔

"شاید اسے اپنی غلطی اور رویے کا احساس ہو گیا ہے۔" سنبل نے فرماں برداری سے کھڑے ارسل کو دیکھ کر سوچا تھا۔

"نہیں بیٹا! تم بھی اب فریش ہو جاؤ۔ صبح سے باہر کا تمام سودا سلف تم ہی لائے ہو۔ جاؤ شاباش۔" تبسم بیگم نے نہال ہوتے ہوئے اسے پیار بھرے انداز میں کہا تھا کہ وہ ایسی ہی تھیں۔ پل میں سب بھلا دینے والی۔ سنبل نے انہیں دیکھ کر ایک ٹھنڈی آہ خارج کی تھی اور ساتھ ہی شیلف کی طرف مڑی تھی۔

☼ ☼ ☼

"اوہ نو! برے پھنسے یار۔" گول دائرے کی شکل بناتی بوتل ـــ ایان کی جانب رک گئی تھی۔ جس پر اس نے مصنوعی غصے سے اسے گھورا تھا جبکہ باقی سب انجوائے کر رہے تھے۔ در اصل افطار کے بعد ان کے فائیو اسٹار گروپ نے ایان کو بڑوں کی کمپنی سے الگ کر لیا تھا اور اب وہ سب پچھلے پندرہ منٹ سے spin the bottle کھیل رہے تھے۔

"گھبرائیے مت دولہا بھائی! ہم اتنے مشکل سوال نہیں کریں گے کہ آپ لاجواب ہو کر رہ جائیں۔" امشال نے اپنی بڑی بڑی آنکھوں کو گھماتے اسے ریلیکس کرنا چاہا تھا جبکہ وہ بالکل بھی کنفیوژ نہیں تھا۔

"لٹل گرل! آپ ہمیں لاجواب کر ہی نہیں سکتیں کیونکہ ہمارے پاس ہر سوال کا جواب ہے۔ بس آپ اپنے سوالوں کی پٹاری کھولیے ہم اپنے جوابوں کا خزانہ آپ کے حضور پیش کرتے ہیں۔" ایان نے بیٹھے بیٹھے سر جھکا کر کسی دربان کی طرح کہا تھا جس پر سب نے بے ساختہ قہقہے لگائے تھے جبکہ ان کے قہقہوں کی آواز پر شہلا بیگم نے کچھ دور بیٹھے ایان کی جانب دیکھا تھا اور جیسے ان کے اندر تک رگ رگ میں سکون پھیل گیا تھا اور دل ہی دل میں انہوں نے ڈھیروں دعائیں مانگی تھیں مگر شاید وہ وقت قبولیت کا نہیں تھا یا پھر جو غم نصیب میں لکھا ہوتا ہے وہ ہمیں ہر حال میں مل کر رہتا ہے جلد یا بدیر پھر سب کچھ ٹھیک ہو جاتا ہے۔

"اوکے! تو ایک سمپل سا سچ بول دیجیے کہ کیا آپ پہلی نظر کے گھائل ہونے پر یقین رکھتے ہیں۔ اگر ہاں تو بتائیے آپا کی پہلی نظر نے کب آپ کو گھائل کیا اور ہاں نو چیٹنگ۔" سوالوں کی بوچھاڑ کرنے کے بعد اس نے فوراً ہاتھ اٹھاتے اسے وارن کیا تھا۔ جبکہ دوسری طرف امشال کے بائیں جانب خاموش بیٹھی سنبل کو اپنی سانس سینے میں اٹکتی محسوس ہوئی تھی اور چہرہ شرم کی لالی سے رنگ چکا تھا۔ اس سے نگاہیں اٹھانا مشکل ہو گیا تھا۔ اور اپنی ساری کنفیوژن امشال پر اتارتے اس نے اسے بازو پر ہلکی سی چٹکی کاٹی تھی۔ جس پر اس نے بے ساختہ سی کیا تھا اور پھر ایان کی طرف متوجہ ہو گئی تھی۔

"اجی بالکل جناب! ہم پہلی نظر کے گھائل ہونے پر پورا یقین رکھتے ہیں اور ہمارے ساتھ یہ خوب صورت حادثہ انڈس ویلی کی سائیڈ گیلری میں رونما ہوا۔" ایان کا جواب گویا ان پر ڈرون حملہ ثابت ہوا تھا۔ خود سنبل بھی شاکڈ رہ گئی تھی۔

"کیا! مگر ہم تو سمجھے تھے کہ آپ نے آپا کو شادی میں دیکھا ہے۔" ایان نے اسی اطمینان سے ان سب کے پرجوش چہروں کی طرف دیکھ کر کہا تھا۔ عین اسی پل سنبل نے نگاہیں اٹھائی تھیں اور پھر فوراً ہی پلکوں کی جھالر گرا لی کہ ان چمکتی آنکھوں میں محبت کے سمندر میں اسے اپنا وجود ڈوبتا محسوس ہوا تھا۔ اس کی اس معصوم ادا پر ایان بے ساختہ مسکرایا تھا۔ جبکہ باقی لوگ ابھی تک سرگوشیوں میں مصروف تھے۔

"بھئی! اب گیم ری اسٹارٹ کریں۔" ایان نے دوبارہ سے بوتل کو گھمانا شروع کیا تھا اور پھر بوتل ارسل کی جانب رک گئی تھی سب نے ہوٹنگ کرنا شروع کی تھی کہ جب بھی کسی کی ٹرن آتی وہ سب ایسے ہی کر رہے تھے۔ مد مقابل کو کنفیوژ کرنے کے لیے۔

"جی ارسل بھائی! اب آپ بھی ایان بھائی کی طرح ہمیں اپنا کوئی نیا سیکرٹ بتائیں۔" فرقان نے گم سم بیٹھے ارسل کی طرف دیکھ کر اسے انکریج کیا تھا۔ جبکہ آج کی ٹیم میں اب تک وہ خاموش ہی بیٹھا تھا جس پر نہال اور امشال نے اسے ایک دو بار ٹوکا بھی تھا مگر وہ اسی طرح اپنی سابقہ پوزیشن برقرار رکھے ہوئے تھا۔

"چلیے نا! ارسل بھائی بتائیں اپنا کوئی سیکرٹ۔" اسے خاموش دیکھ کر ہر طرف سے اصرار بڑھنے لگا تھا کہ اس نے ایک سپاٹ نظر ایان پر ڈالی تھی اور پھر کسی نئے جذبے سے چمکتی سنبل کی آنکھوں میں دیکھا تھا۔ اسے یہ موقع اپنی آگ کو ٹھنڈا کرنے کے لیے سب سے مناسب لگا تھا۔

"مجھے apologise کرنا ہے۔" کچھ دیر کی مبہم خاموشی کے بعد اس کی آواز گونجی تھی۔

"اپالوجائز؟ مگر کس سے اور کیوں؟" سب نے یکدم حیرانی سے اسے دیکھا تھا کہ وہ اور اپنی غلطی مان لے ناممکن۔

"سنبل سے۔" اور اب کی بار ایان بری طرح اس کے غیر معمولی انداز پر چونکا تھا۔ دل تو سنبل کا بھی ایک سیکنڈ میں بے تحاشا دھڑک اٹھا تھا مگر کسی انجانے

خوف سے۔

"دراصل میری زندگی کے آسمان پر خواہشوں کے اتنے ستارے سجے تھے کہ ان کی جگمگاہٹوں میں مجھے صحیح اور غلط کی پہچان ختم ہو چکی تھی۔ اور پھر جیسے جیسے زندگی گزرتی ہے کسی کالی سیاہ رات کی مانند اس میں ستاروں کا اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ میں بھی ان ستاروں کے پیچھے بھاگنے والا ایک اندھا شخص تھا جو ان کی روشنی میں راستہ تلاش کرتا پھر رہا تھا۔ اور ان انجان راستوں میں چلتے اپنے تمام رشتوں کو زمین میں روندتا چلا گیا۔ مگر آج میں سب کے سامنے یہ اعتراف کرتا ہوں سبزل کہ میں نے تمہیں ٹھکرا کر، تمہارے عظیم فن اور جذبے کی تذلیل کر کے تمہارے دل کو ٹھیس پہنچائی ہے۔ میں نہیں جانتا کہ مجھے تم سے معافی مل جائے گی یا نہیں مگر ہانیہ کے ٹھکرانے کے بعد مجھے اس تکلیف کا اندازہ ہوا ہے۔ جس سے کبھی تم اور تم سے وابستہ لوگ گزرے ہوں گے۔ پلیز سبزل مجھے معاف کر دو۔ میرے دل کے دروازے ہمیشہ تمہارے..."

"چٹاخ۔" اس کی بات ابھی مکمل نہ ہوئی تھی کہ تھپڑ کی تیز آواز سے خان ہاؤس کے در و دیوار گونج اٹھے تھے اور ساتھ ہی تمام نفوس یوں جاگے تھے کہ جیسے پتھر کے مجسموں کو جادو کی چھڑی چھو جائے۔

اس نے ڈوبتے دل اور ڈبڈبائی آنکھوں سے گال پر ہاتھ رکھے کھڑے ارسل کی طرف دیکھا تھا اور پھر خاموشی سے اٹھتے ایان کو اپنے سے دور جاتے دیکھا تھا۔ جبکہ بابا جان ضبط سے مٹھیاں بھینچتے ارسل کو سخت سست سنا رہے تھے۔ اس کے گلشن میں بہار آنے سے پہلے ہی خزاں در آئی تھی۔ اسے کسی کی آوازیں سمجھ میں نہیں آرہی تھیں۔ اس نے اپنے چکراتے سر کو دونوں ہاتھوں سے تھامنے کی کوشش کی تھی مگر شور تھا کہ بڑھتا ہی جا رہا تھا یہاں تک کہ اسے اپنی نسیں پھٹتی محسوس ہوئی تھیں اور پھر جیسے ہر چیز پر گہرا اندھیرا چھا گیا تھا اور دوسرے ہی پل وہ زمین پر ڈھے گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

اس نے لڑکھڑاتے قدموں پر اپنے جسم کو بمشکل کھڑا کرتے ہوئے انٹینسیو کیئر یونٹ کے بڑے سے لکڑی کے دروازے میں موجود شیشے کی چھوٹی سی کھڑکی سے اندر جھانکا تھا۔ آج دو دن ہو چکے تھے اور وہ اس کے دیے زخموں سے لڑتے لڑتے نڈھال ہو چکی تھی۔ ندامت و شرمندگی اس کی آنکھوں سے جھرنے کی مانند بہنے لگی تھی۔ اس نے ایک بار پھر اس کے لٹھے کی مانند سفید چہرے کی طرف دیکھا تھا جہاں کچھ ہی گھنٹوں پہلے زندگی کا آفتاب جذبات کی شعاعیں اور کرنیں بکھیر رہا تھا جہاں محبت کی کونپل ابھی صحیح طرح پھوٹنے بھی نہ پائی تھی۔ جہاں کسی کی ایک نظر کی گرمائش سے وہ ابھی کھلنے بھی نہ پائی تھی۔ جہاں کسی کے چاہے جانے کا زعم کسی پر غرور سمندر کی طرح ابھی تلاطم برپا کرنے ہی والا تھا کہ اس نے اس سمندر میں اپنی سوچ کا زہریلا پانی ڈال دیا تھا اس نے اس معصوم چہرے سے چاہے جانے کا زعم نوچ ڈالا تھا۔ اس نے کسی نوخیز کلی کو پیروں تلے روند ڈالا تھا۔ اس نے کسی اژدھے کی مانند کسی کی تمام خوشیاں نگل لی تھیں۔ اور کسی ایک کی خوشیاں کیوں اس نے تو اپنے اور اس سے وابستہ تمام لوگوں کو اذیت کی سولی پر لٹکا دیا تھا۔ زندگی میں چھوٹے چھوٹے مذاق کرتے۔

دوسرے کی ذات پر پھبتی کستے ہم یہ کیوں بھول جاتے ہیں کہ اگر کیچڑ کسی کی ذات پر اچھالیں گے تو پہلے ہاتھ اپنے گندے ہوں گے اور اس کے ساتھ بھی تو یہی ہوا تھا۔ بچپن سے سبزل سے ضد باندھتے ہر چھوٹی چھوٹی بات پر اس کی ذات کا استعمال کرتے اس کی کامیابیوں پر حسد سے جلتے آج اس کی زندگی کے ساتھ کیسا بھیانک مذاق کیا تھا اس نے کہ اسے موت کی دہلیز تک کھینچ لایا تھا۔ کیوں وہ اپنی ذات کے غرور میں اس کی ذات کو اتنا حقیر کرتا گیا کہ اس سے وابستہ رشتے بھی اس کی نظر میں حقیر ہوتے چلے گئے۔ نہ جانے کب اور کیسے حسد کے ناگ نے اسے اپنی لپیٹ میں لیا اور وہ جو اس کے ڈسنے سے زہریلا ہو گیا تھا دوسروں کو بھی اسی طرح ڈسنے لگا۔ اپنی ذات پر غرور تو اسے شروع سے ہی

تھا کہ خان ہاؤس میں وہ سب کا منظور نظر تھا۔

مگر رفتہ رفتہ سبزل کی کامیابیوں اور حلیم الطبع نے سب کی توجہ اپنی طرف کھینچ لی تھی اور اس طرح وہ لڑکا ہوتے ہوئے بھی سبزل کی طرح سے پیار نہیں لے سکا تھا۔ اس کی ایک وجہ اس کی پڑھائی میں عدم توجہی بھی تھی۔ ہر سال مارکس کم آنے کی وجہ سے وہ چچا جان کے لیے بھی باعث پریشانی بن چکا تھا اور رہی سہی کسر اس نے یونیورسٹی کی رنگینیوں میں گم ہو کر پوری کر دی تھی۔ مگر دوسری طرف سبزل نے ہر کلاس میں فرسٹ پوزیشن لی تھی۔ اس طرح سب اس کے گن گانے لگے اور حسد کی آگ میں جلتے ارسل کو جب موقع ملتا تو وہ اس آگ کے چھینٹے سبزل پر ضرور پھینکتا۔

سبزل کے پرپوزل کو ٹھکرا کر اس کا خیال تھا کہ وہ اس سے اس کے ساتھ کی بھیک مانگے گی اور اس طرح اس کے رحم و کرم کی محتاج ہو گی کہ ان کے خاندان کی یہ روایت تھی کہ بھلے ہی عمروں میں فرق ہو مگر پہلی اولادوں کو آپس میں ہی بیاہا جاتا تھا مگر دادا جان نے اس روایت کو ختم کر کے سبزل کا رشتہ ایان سے کر دیا اور اس طرح اس کے تمام ارادوں پر پانی پھر گیا۔ مگر وہ پھر بھی باز نہیں آیا تھا۔ سبزل کے چہرے پر بکھرے چاہے جانے کے رنگ اسے کسی طور چین لینے نہ دیتے تھے اور بالآخر اسے موقع مل گیا تھا۔ مگر زندگی میں پہلی بار اس کے چند جملوں نے ہر چیز کو تہس نہس کر دیا تھا بابا جان نے ہاتھ سے کھینچتے اسے گھر سے باہر نکال دیا تھا اور اس نے حیرت سے اپنے ماں باپ کو دیکھا تھا جنہوں نے اپنے لاڈلے بیٹے کو دیکھنے سے بھی انکار کرتے ہوئے منہ موڑ لیا تھا۔

پچھلے اڑتالیس گھنٹوں سے وہ سڑک پر ایک ہی پوزیشن میں بیٹھا تھا کہ ان سب کو افطاری کے لیے گھر جاتا دیکھ کر وہ ہمتیں جمع کرتا اس معصوم پری پیکر کو دیکھنے آیا تھا۔ کتنا بدنصیب تھا وہ اپنے ہی ہاتھ سے اپنے دامن کو داغ دار کر گیا تھا۔ بابا نے اسے عاق کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا اور وہ جو محبتوں کی آکسیجن لیتے جوان ہوا تھا۔ نفرت کی ہوا میں سانس نہیں لے پا رہا تھا۔ نہ جانے کتنی دیر اس نے اس دروازے کے پار دیکھتے زندگی کے گزارے پلوں کا حساب کیا تھا۔ مگر ہر گزرتے پل میں تاریکی ہی تاریکی تھی۔

☼ ☼ ☼

مسجد کے ٹھنڈے فرش پر ایک ہی پوزیشن میں بیٹھے نہ جانے کتنے پل گزرے تھے اور ہر گزرتے پل کے ساتھ الجھنوں میں اضافہ ہی ہوتا جا رہا تھا۔ ایسا نہیں تھا کہ وہ کوئی شکی مزاج انسان تھا۔ بلکہ اپنے دل کے اجڑنے کے احساس نے گنگ کر دیا تھا۔ اس نے اسے پہلی بار ایگزیبیشن کی گیلری میں دیکھا تھا۔ اتنا مکمل حسن دیکھ کر — ٹھٹک گیا تھا اور پھر اس کی ہیزل گرین آنکھوں میں تیرتی نمی اور اداسی کو دیکھ کر مزید چونکا تھا۔ اس نے اسے اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کی تھی مگر اتنے میں ہی اسے باقر نیازی نے آواز دے ڈالی اور وہ واپس آ گئے۔ دوسری بار — اسے رائنہ کی شادی میں دیکھا تھا اور وہ یکسر مختلف انداز میں اس کے سامنے آئی تھی۔

بے حد سادہ مگر نفیس سوٹ پہنے ہاتھوں میں مصنوعی زیورات کی بجائے صرف پھولوں کے گجرے پہنے ہوئے وہ ہر کام میں پیش پیش تھی۔ وہ خود میں اتنی مگن تھی کہ کسی کی نگاہوں کی تپش بھی اس کو متوجہ نہ کر سکی یا پھر شاید اس کو اس کا احساس ہی نہ تھا کہ کوئی اس کو دیکھے، سراہے جانے کے جذبے سے عاری وہ اسے مزید حیران کر گئی تھی۔ ایان کی پسندیدگی البتہ رائنہ سے چھپی نہ رہ سکی اور اس نے اس کے بارے میں مزید تفصیل سے آگاہ بھی کیا اور ساتھ میں اس کی صفات بھی ازبر کروانے لگی۔ جن میں سے بہت سی تو وہ — دیکھ چکا تھا جیسے وہ ملنسار اور خوش اخلاق تھی۔ تمام مہمانوں کو آنٹی کے ساتھ مل کر سرو کر رہی تھی۔ مگر جس خوبی نے اسے ورطہ حیرت میں مبتلا کر دیا تھا وہ اس کا چھوٹی سی عمر میں ایک کامیاب رائٹر بن کر ابھرنا تھا بظاہر وہ لاپروا سی لڑکی درحقیقت کتنی پختہ اور گہری سوچ کی مالک ہو گی اس کا اندازہ اس کی تحریروں سے

لگایا جو کہ رانتہ کی بدولت اس تک پہنچی تھیں۔ وہ بے حد حیران تھا کہ اتنی کم عمری میں کوئی اتنا پرفیکٹ کیسے ہو سکتا ہے۔ مگر سبزل کو دیکھ کر ان سب باتوں پر یقین کرنا پڑا کہ وہ اس کی توقعات سے بھی بڑھ کر محبت کرنے والی ثابت ہوئی تھی۔ مگر اب اگر اس کی دلی وابستگی ارسل سے ہوئی تو..... ایان اس سے آگے کچھ سوچنا نہیں چاہتا تھا۔ مگر سوال تھے کہ خودرو پودے کی مانند اس کے اردگرد بڑھتے ہی جا رہے تھے۔

"اگر سبزل نے اس کو معاف کر دیا اور واپس اس کی طرف پلٹ گئی تو۔ کیا سبزل مجھ سے پہلے ارسل سے محبت کرتی تھی اور اس کے ٹھکرانے کے بعد اس کی زندگی میں کوئی بھی آجاتا تو اسے کوئی فرق نہ پڑتا۔" ایک اور خودرو کانٹا اسے چبھا تھا۔

"کیا اس کے دل کی بستی میں ارسل آباد تھا۔" اس نے ہاتھوں کی انگلیوں سے بالوں کو جکڑا تھا یوں محسوس ہوا تھا کہ جیسے یہ سوال دماغ کی نسیں چیر کر رکھ دے گا۔ بار بار ایگزیبیشن کے دن والی اس کی نم آنکھیں یاد آ رہی تھیں جو یقیناً "کسی گہرے دکھ اور غم کی ترجمان تھیں تو کیا وہ دکھ ارسل کو کھو دینے کا تھا۔ نجانے کب تک یہ زہریلی سوچیں اس کے وجود کو زہریلا کرتیں کہ اسے اپنے کندھے پر کسی کا پیار بھرا لمس محسوس ہوا تھا اور اس نے کرب سے بوجھل سرخ آنکھوں کو بمشکل کھولتے ہوئے قریب کھڑے وجود کو دیکھا تھا۔

"تم۔" اسے دیکھتے ہی اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا تھا۔

☼ ☼ ☼

"سبزل! اٹھو بیٹا یہ کیا حالت بنا رکھی ہے۔ چلو شاباش منہ ہاتھ دھو لو اور ہو سکے تو کپڑے بھی چینج کر لو ہو سکتا ہے کہ آج چاند نظر آجائے اور کل عید ہو تو تیاری بھی کرنی ہے اور تمہیں تو معلوم ہے کہ تمہارے دادا جان تمہارے ہاتھ کا شیر خرما کھا کر نماز پڑھنے جاتے ہیں۔ چلو اب جلدی سے اٹھ جاؤ میری پیاری بیٹی۔" مما جلدی جلدی۔ کہتی اس کے ماتھے پر بوسہ دیتی باہر نکل گئیں۔ اس نے آنکھوں میں آئی نمی کو گلے میں اتارا تھا۔

"یہ سب مجھے بہلانے کے لیے خوش نظر آنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ درحقیقت ارسل کے اس طرح بے باک انداز نے ایان کو مجھ سے بدگمان کر دیا ہو گا اور اس نے مجھے چھوڑنے کا فیصلہ....." اس نے اپنی ہی سوچ پر پہرے لگائے تھے۔ اس کی نظروں کے سامنے ایان کا زرد پڑتا چہرہ بار بار آ رہا تھا۔ دو دن پہلے وہ ڈسچارج ہو کر گھر آئی تھی۔ اسے شدید نروس بریک ڈاؤن ہوا تھا۔ اسی لیے ڈاکٹرز نے اسے سکون کی دوائیں دی تھیں۔ جن کے زیر اثر اس کا زیادہ تر وقت سو کر ہی گزرا تھا اور اب مما کتنے آرام سے عید کی باتیں کر رہی ہیں۔ بھلا مردہ لوگوں کے لیے بھی کوئی خوشی ہوتی ہے۔ ہاں میں مردہ ہی تو ہوں زندہ ہوتی تو ارسل مجھے یوں ذلیل و رسوا نہ کرتا۔

"آپا! چلیں چاند دیکھنے چھت پر چلتے ہیں۔" وہ نجانے کب تک اپنے ٹوٹے بکھرے وجود کی نارسائی پر ماتم کیے جاتی جب وہ تینوں کمرے میں ایک ساتھ داخل ہوئے تھے۔

"چاند دیکھنے۔" یاد کی پرچھائیاں گہرے سائے کی طرح اس پر جھکی تھیں اور اسے منگنی کے بعد والی ایک حسین شام یاد آئی تھی جب چاند ادھورا تھا اور اس نے اسے دیکھتے ہوئے اللہ تعالیٰ سے نجانے کتنی دعائیں مانگی تھیں۔ چاند کا وجود مکمل نہیں ہے۔ وہ کبھی آدھا ہوتا ہے اور کبھی پورا مگر وہ مکمل ہونا چاہتی تھی اور اسی لیے چاند کو دیکھ کر اس دن غرور سے مسکرائی تھی۔ شاید اس کی نگاہوں میں احساس برتری دیکھتے چاند بھی اپنی کم مائیگی کو محسوس کرنے لگا تھا اور آج وہ اس کو کیسے دیکھتی۔

"نہیں، نہیں مجھے چاند نہیں دیکھنا وہ..... وہ مجھ پر ہنسے گا۔ میرے ادھورے پن پر ہنسے گا۔" اس نے اپنے ہاتھ نہال کے ہاتھوں سے چھڑاتے ہوئے کہا تھا۔

"نہیں آپا! وہ کیوں ہنسے گا۔ وہ تو خوشیوں کا پیامبر بن کر افق پر ظاہر ہو گا آج۔" نہال نے دوبارہ اس کے ہاتھ پکڑ کر اپنے ہاتھوں میں دبائے تھے۔

"آپا! آپ ادھوری نہیں ہیں۔ آپ کیوں ایسا سوچتی ہیں، آپ کا ساتھ کسی کو بھی مکمل کر دے گا کیونکہ آپ اپنی ذات میں مکمل ہیں۔" فرقان نے اس کے کندھوں کو تھامتے اس کا رخ اپنی جانب موڑا تھا۔

"مکمل ہوتی تو کیا ہر بار ٹھکرائی جاتی۔" سبزل نے ایک مجرم کی طرح نیچے سر جھکا کر ہولے سے کہا تھا۔ کتنے خواب دیکھے تھے چاند رات کے حوالے سے مگر سب روئی کے گالوں کی مانند وقت کی ہوا کے سنگ بکھر کر رہ گئے تھے۔

"اوہو آپا! اب بس کریں اور اٹھیں ہری اپ۔" نہال اور امثال نے اسے بازوؤں سے پکڑ کر قطعیت بھرے لہجے میں کہا تھا اور میں اب کی بار انکار نہ کر سکی تھی۔ آسمان صاف شفاف تھا اور اس کے ماتھے پر جلد ہی جھومر کی مانند ایک سفید باریک بال جیسی پٹی ابھری تھی، ہر طرف سے چاند مبارک کا شور مچا تھا۔ کچھ منچلوں نے پٹاخے بھی پھوڑے تھے۔ اس نے آہستہ سے آنکھوں میں آئی نمی کو صاف کیا تھا اور پھر خاموشی سے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے تھے۔ بالکل اسی طرح ایک دن چاند نظر آنے پر رمضان المبارک کا آغاز ہونے والا تھا اور چاند کو دیکھ کر اپنے اور ایان کے لیے ڈھیروں دعائیں مانگی تھیں۔ اس نے سوچا تھا کہ اس بار وہ دونوں زندگی کی پہلی عید کا چاند اکٹھے دیکھیں گے۔ یکدم اس کی آنکھوں میں ٹوٹے خوابوں کی کرچیاں چبھی تھیں۔ جس سے اس نے فوراً" آنکھیں کھول دی تھیں اور پھر جیسے ہی اپنے خالی پہلو کی طرف دیکھنے کے لیے گردن موڑی تھی ہر چیز ساکت ہونے لگی تھی۔ اس نے دو تین بار آنکھیں جھپکائی تھیں مگر شبیہہ تھی کہ مسکراتی ہی جا رہی تھی۔ اس کا خیال، اس کا خواب۔ مجسم اس کے پہلو میں کھڑا تھا۔ ہاں وہ ایان تھا۔ اس نے اپنے خیال کو یقین کا جامہ پہنانے کے لیے اسے چھونے کو ہاتھ بڑھایا تھا۔

"چاند مبارک ہو؟" اس سے پہلے کہ سبزل کا ہاتھ ایان کو چھوتا ایان نے اس کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے کہا تھا۔ جبکہ وہ۔ جو ابھی تک بے یقینی کے سراب میں بھٹک رہی تھی یکدم پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"اگر معلوم ہوتا کہ یہ چاند ہمیں اتنا حسین تحفہ دے گا تو یقین جانیے اس کو محبت کا واسطہ دے کر کب کا ظاہر کروا چکے ہوتے۔" وہ نہ جانے کب تک اس کے سینے سے لگی اپنے غبار کو آنسوؤں کی صورت بہاتی کہ اس کی پر شوق آواز پر چونکی تھی اور پھر فوراً" پیچھے ہٹی تھی۔

"اوں ہوں! اب تو ہمیں یہ تحفہ حق کی صورت میں عمر بھر کے لیے چاہیے۔" وہ اور قریب آتے ہوئے بولا تھا اتنا کہ اس کی سانسوں کی مہک اس کے چہرے کا طواف کرنے لگی تھی۔

"ایان! آپ مجھ سے پلیز بدگمان مت ہونا میں آپ کے بغیر جینے کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔ پلیز مجھے چھوڑ کر مت جائیے گا۔ اس دن ارسل نے جو کچھ بھی ....." وہ جو اپنی صفائی دینا چاہتی تھی کہ ایان نے اپنا ہاتھ اس کے لبوں پر رکھ کر مزید کچھ بھی کہنے سے روکا تھا اور وہ حیرانی سے اس کی طرف دیکھنے لگی تھی۔

"بس! خاموش مجھے سب کچھ معلوم ہو چکا ہے۔" ایان نے پرسکون انداز میں کہتے ہوئے غیر ارادی طور پر اس کے لبوں پر اپنی انگلیاں پھیری تھیں۔

"مگر کس سے؟" سبزل نے اس کے ہاتھ کو پیچھے کرتے ہوئے کہا تھا۔

"فرقان سے۔" ایان نے جیسے اس کے اوپر بم پھوڑا تھا۔ وہ جو فرقان کو ہر معاملے سے بے خبر سمجھتی تھی درحقیقت غلط تھی ایان کو فرقان نے بتایا تھا کہ کس طرح ارسل بات بات پر سبزل کو چھٹ کرنے کی کوشش کرتا تھا اور حسد کی آگ نے اسے اندھا کر دیا تھا اسے شدید حیرت ہوئی تھی وہ جو سمجھتی تھی کہ کاش ہمارا ایک بھائی ہوتا جو ہمیں ڈیفائنڈ کرتا اور ارسل کو منہ توڑ جواب دیتا اور یہ کمی فرقان نے پوری کر دی تھی۔ وہ

بہترین محافظ کے طور پر سامنے آیا تھا۔ سبزل کو بے ساختہ ہی اس پر ڈھیروں پیار آیا تھا۔

"اچھا جناب! ہمیں تو عید کا خوب صورت تحفہ مل گیا۔ کیا آپ کو ہم سے تحفہ نہیں چاہیے۔" اس نے اسے کندھوں سے تھام کر نزدیک آتے ہوئے اس کی آنکھوں میں جھانکا تھا جبکہ ان چمکتی آنکھوں میں اپنا عکس دیکھ کر وہ آسودہ ہونے لگی تھی۔

"دینے والے کو خود احساس ہونا چاہیے۔" اس نے مصنوعی ناراضی دکھاتے ہوئے منہ موڑا تھا۔

"زل!" ــــ سبزل کے اردگرد جیسے مدھر سی گھنٹیاں بجی تھیں اس نے یکدم اس کی طرف رخ موڑا تھا اور اس کے ہاتھ پر نظر پڑتے ہی جیسے بری طرح چونکی تھی۔

"یہ!" سبزل کے منہ سے بے ساختہ اس گولڈن خوبصورت کیس میں بند قلم کو دیکھ کر لفظ بکھرے تھے۔

"ہوں اور میں چاہتا ہوں کہ اس قلم سے آپ میری اور اپنی پیار بھری داستان لکھ دیں تاکہ میرے پیار کا ذکر ہر زبان ــــ پر ہو۔" وہ ابھی تک حیرت سے اسے تکے جا رہی تھی۔ جو اس پر پرت در پرت کھل رہا تھا۔

"زل! میں چاہتا ہوں کہ آپ کے قلم کی سچائی ہر ایک کے لیے مشعل راہ ثابت ہو مجھے آپ پر فخر ہے۔ بے حد فخر اور شاید آپ کو پا لینے کے بعد خود پر غرور ہونے لگے۔" پھر وہ دھیرے سے بولا تھا۔

اپنے احساس سے چھو کر مجھے صندل کر دو
میں کہ صدیوں سے ادھورا ہوں مکمل کر دو

اس کے بازوؤں کا گھیرا تنگ ہونے لگا تھا اور وہ اپنے رب کی فیاضی پر حیران تھی جس نے اس کا دامن خالی نہیں رہنے دیا تھا بلکہ اسے اتنا بھر دیا تھا کہ اپنا آپ آج ایک ذرے سے آفتاب بنتے دکھائی دینے لگا تھا۔

"زل! اگر اس لمحے میں آپ سے کچھ مانگو تو دیں گی۔" خاموشیوں میں ایک بار پھر اس کی آواز گونجی تھی۔ اس نے خوابناک آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا تھا۔ عالم سپردگی میں تو کوئی جان بھی لے لے تو غم نہیں ہوتا۔

"جی کہیے۔" اس نے خاموشی سے اس سے الگ ہوتے ہوئے کہا تھا۔

"ارسل کو معاف کر دیجیے۔" انجانے میں ہی اس نے اس کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھا تھا اور وہ تڑپ اٹھی تھی۔ مگر اس کے بولنے سے پہلے ہی وہ بول اٹھا تھا۔

"میں جانتا ہوں اس نے کسی کا دل توڑنے جیسا کبیرہ گناہ کیا ہے۔ مگر زل جو شخص محبتوں میں رہنے کا عادی ہو اسے نفرت میں ایک پل جینا بھی صدیوں برابر لگتا ہے۔ اسے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ چچا جان اور چچی جان کی آنکھیں خوشی کے موقع پر بھی ساون برساتی ہوں۔ ہمیں ان کی ذات کے بارے میں بھی سوچنا ہو گا آپ پلیز ارسل کو معاف کر دیں تاکہ خان ہاؤس کے دروازے اس پر کھل سکیں۔" سبزل نے فخر سے ایان کی طرف دیکھا تھا۔ وہ شخص جو محض ایک مہینے پہلے اس خاندان کی محبتوں کا حصہ دار بنا تھا۔ کس قدر فرض شناس تھا اور کس قدر اسے اس گھر کے لوگوں کا خیال تھا اور ارسل جو سالوں سے ان محبتوں کا حصہ دار تھا مگر ان کی قدر نہ کر سکا۔ اور سبزل کے لیے تو ویسے بھی اس کا وجود بے معنی تھا۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا تھا اور ساتھ ہی نظر آسمان کی سمت اٹھی تھی چاند ان دونوں کو مکمل دیکھ کر آسمان کی آغوش میں چھپ گیا تھا۔ ساتھ ہی نہال، امثال اور فرقان اوپر چلے آئے تھے اور ان کا خوب ریکارڈ لگایا تھا۔ نیچے آنٹی انکل اور بابا جان سب ان کے منتظر تھے۔ سبزل نے ایک نظر اپنے پہلو میں کھڑے اپنے ماہی پر ڈالی تھی اور اسی پل انہوں نے اس کی طرف دیکھا تھا اور دونوں مسکرائے تھے۔

☼ ☼

ضوباریہ ساحر

مقید خاک

"بعض انسانوں کا اپنی زندگی میں ایسے حیرت انگیز اور ناقابل فہم واقعات سے واسطہ پڑتا ہے کہ انہیں خود یقین نہیں آتا کہ آیا ایسا حال حقیقت میں ان کے ساتھ ہو گزرا ہے یا ماضی میں جو کچھ بھی ہوا وہ محض ایک خیال' ایک حیران کن خواب تھا؟ ایک ایسا خواب جس کا حقیقت سے دور کا بھی تعلق نہ ہو۔

اس کے باوجود کچھ واقعات ہماری کتاب حیات پر اس طرح نقش ہو جاتے ہیں کہ برسوں بیت جانے کے باوجود جب کہ ہم اپنے ماضی کو تاریکیوں کے حوالے کر کے' مستقبل کی روشنیوں میں بہت آگے آچکے ہوتے ہیں اور ہمیں اپنے عقب میں دھند لکوں کے ماسوا کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ اپنی کتاب حیات کے اوراق پلٹتے ہوئے اپنے ماضی کے انہی دھند لکوں میں جھانک کر کچھ دیکھنے کی کوشش کر رہے ہوتے ہیں تو ایسے میں مخصوص اوراق پر پہنچ کر ہم خود ساکت رہ جاتے ہیں اور ہمارا لاشعور فوراً" حرکت میں آجاتا ہے' تمام تاریکیاں اور دھند لکے چھٹ جاتے ہیں تمام واقعات کردار و مناظر ہمارے پردہ تصور پر روز اول کی طرح واضح اور روشن ہو جاتے ہیں۔ ہمیں یوں لگتا ہے جیسے یہ تمام واقعات ابھی کل کی بات ہوں۔

ایسا ہی ایک دور بذات خود میری اپنی زندگی کا حصہ رہ چکا ہے۔

میں جب بھی اپنے ماضی کے اس دورانیے کے بارے میں سوچتا ہوں تو خود کو ایک عجیب سی سنسنی خیز کیفیت کا شکار پاتا ہوں۔

میرا خیال ہے کہ پہلے میں سرسری طور پر آپ کو اپنے بارے میں بتادوں تو زیادہ مناسب رہے گا۔

جیسے کہ آپ کو معلوم ہے کہ میں ایک کارڈیالوجسٹ ہوں تو ظاہر ہے کہ میڈیکل کا یہ شعبہ میں نے اپنے شوق سے ہی چنا ہو گا۔ مجھے شروع سے ہی دل کا بہت بڑا ڈاکٹر بننے کا شوق تھا۔ مگر آج جو کامیابی' عزت' شہرت اور مقام مجھے حاصل ہے' یہ میں نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ ایک دن میں اتنا بڑا ڈاکٹر بن جاؤں گا اور پوری دنیا میں مجھے ایک "ہارٹ اسپیشلسٹ" کے نام سے پہچانا جائے گا۔ مجھے تو یہی یقین نہیں تھا کہ میں ایم بی بی ایس مکمل کر سکوں گا۔

اس کی وجہ یہ تھی کہ میرا تعلق ایک متوسط گھرانے سے تھا ان دنوں ہمارا پورا خاندان مصر کے شہر "سیوا" میں آباد تھا۔ تعلیم کے اخراجات اٹھانا ابا جی کے بس کی بات نہیں تھی۔ یہی وجہ تھی کہ میں پارٹ ٹائم جاب کے طور پر ایک پرائیویٹ کلینک پر بطور ڈسپنسر کام بھی کرتا تھا۔ ایم بی بی ایس میں ٹاپ کرنے کے بعد ابا جی نے اپنی ایڑی چوٹی کا زور لگا کر چچا جی کے ساتھ مل کر مکان بیچا اور مسلسل قرض ادھار لے کر مجھے اسپیشلائزیشن کے لیے امریکہ روانہ کر دیا۔ شاید قدرت کی رضا بھی میرے ساتھ تھی۔

اسپیشلائزیشن کے بعد واپس آکر ہسپتال بنوایا۔

ہسپتال کا افتتاح ہوا تو سب اپنی جگہ مصروف ہوتے گئے۔ چاروں طرف کی بستیوں اور دیہاتوں سے مختلف رئیسوں کے پیغام اور دعوت نامے میرے نام آنے لگے۔ روز روز کی ان دعوتوں سے میں اس قدر تنگ آگیا کہ کچھ عرصے کے لیے میں نے خود کو ہسپتال میں پوری طرح مصروف کر لیا۔

تقریباً" ایک ماہ کا عرصہ گزر گیا آس پاس کے علاقوں

سے ایسے مریض جن کے امراض خطرناک تھے یا شدید اور مختلف امراض میں مبتلا ہونے کے باعث دور دراز کے ہسپتالوں میں ایڈمٹ تھے اور دوری کے باعث مسلسل دوہری پریشانیوں کا شکار تھے۔ وہ بھی اب یہیں ٹرانسفر ہو رہے تھے اور پورا عملہ مصروف کار تھا۔

میں اپنے آفس میں تھا۔ دو سینئر ڈاکٹر اور ایک لیڈی ڈاکٹر بھی آفس میں موجود تھے۔ ہم نہایت اطمینان سے کافی کی چسکیاں لے رہے تھے اور ہسپتال کے کچھ ضروری امور پر گفت و شنید کرنے میں مگن تھے کہ اچانک ایک شور کی آواز سنائی دی اور ہم سب چونک پڑے۔ کوئی زور' زور سے چلا رہا تھا۔

"منقور و طور خس ..... صطفوا' صطفوا ..... آر قو صطفوا' صطفوا۔" میں نے کپ ٹیبل پر رکھا اور فورا" باہر نکل آیا' چند افراد تھے جو راہداری میں ایک اسٹریچر بھگائے لا رہے تھے۔ غالبا" کوئی مرد اس پر بے ہوش پڑا تھا۔

ایک اونچا لمبا حبشی آگے آگے تھا۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی وہ برق رفتاری سے میری جانب دوڑا اور گھٹنوں کے بل میرے قدموں میں بیٹھ گیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے وہ میرے گھٹنے تھامتے ہوئے میری جانب دیکھ کر بولا۔

"میسحو ..... میسحو رحمی' مارو قلبو معکوسط ..... میسحو پاشا بارتا دیوتا' پاشا قلبو معکوسط ..... میسحو رحمی پاشا نفس الدورا۔" وہ حبشی کوئی افریقی تھا جو قدیم مصری اور افریقی قبائلی زبان کو مرکبی انداز میں پیش کر رہا تھا مگر اس کی بات کا مفہوم اور پھر صورت حال؟ میں سمجھ گیا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔

"مسیحا (ڈاکٹر) مالک کا دل الٹ گیا ہے (یعنی ہارٹ اٹیک) یہ میرا دیوتا ہے مسیحا پاشا کا دل الٹ گیا ہے' مسیحا رحم کرو ورنہ پاشا کی روح جسم سے دور ہو جائے گی۔"

اسٹریچر بالکل قریب آچکا تھا ڈاکٹر میرے برابر آ کھڑے ہوئے' میں نے انہیں مخاطب کیا۔

"ایمرجنسی گو ہری اپ گو فاسٹ۔" میں تیز آواز میں کہتا ہوا خود بھی آپریشن روم کی جانب دوڑ پڑا۔

مریض ایک ادھیڑ عمر کا آدمی تھا جو اپنی آخری سانسوں پہ تھا اور یہ حقیقت تھی کہ اگر میڈیکل ٹریٹمنٹ میں چند منٹ بھی دیر ہو جاتی تو اس کا بچنا ممکن نہ تھا لیکن شاید ابھی اس کی زندگی تھی جو اس کے اقربا اسے بروقت ہسپتال لے آئے تھے۔ یہ تو مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ وہ کوئی معمولی ہستی کا مالک نہیں بلکہ ایک بہت ہی امیر کبیر آدمی ہے۔ عدلان پاشا ..... ہاں یہی نام تھا اس کا عدلان پاشا۔

میں جیسے ہی آپریشن روم سے باہر نکلا ایک نرس مجھ سے مخاطب ہوئی۔ "سر لیڈیز ویٹنگ روم میں پاشا صاحب کے کچھ عزیز آپ کے منتظر ہیں۔"

"ہوں ....." میں گردن ہلاتا ہوا ویٹنگ روم کی جانب بڑھ گیا۔ اندر داخل ہوتے لمحے میں ایک ذرا ٹھٹک کر رک گیا۔ میرے ٹھٹکنے کی وجہ وہ حسن برق نما تھا جو بے ردا و حجاب سامنے ہی صوفے پر موجود تھا۔ غالبا" یہ عدلان پاشا کی صاحبزادی تھی۔ وہ پریشانی میں گم و صم اداس بیٹھی تھی۔ اس کا رخ سامنے کی سمت تھا اس کے علاوہ دو ادھیڑ عمر کی عورتیں بھی اندر موجود تھیں جو حلیے اور انداز سے خادمائیں معلوم ہوتی تھیں۔ میں اندر داخل ہو گیا مگر وہ بے خبر اس طرح بیٹھی رہی۔ ایک لمحے کو میں اس کی صورت دیکھ کر خالی الذہن کیفیت کا شکار ضرور ہو گیا تھا کیونکہ اس کے چہرے پر کچھ ایسی ہی سادگی اور بھولپن بکھرا ہوا تھا اوپر سے اس معصوم صورت پر ایک سوگوار سی پرچھائیں۔

میں نے گلا کھنکارا تو وہ یوں چونک پڑی جیسے اچانک کسی نے سوتے میں سے جگا دیا ہو۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی وہ ہڑبڑا کر اٹھ کھڑی ہوئی اور بوکھلائے ہوئے انداز میں ادھر ادھر دیکھنے لگی۔

غالبا" وہ اپنی چادر ڈھونڈ رہی تھی جو اسے اس لیے نظر نہ آرہی تھی کہ وہ صوفے کے عقب میں گری پڑی تھی میں نے آگے بڑھ کر وہ ریشمی سی چادر اٹھائی اور اس کی جانب بڑھا دی۔ اس نے چادر پکڑی اور جسم سے لپیٹتے ہوئے مخملی سے لہجے میں میرا شکریہ ادا کیا اور رخ پھیر کر کھڑی ہو گئی۔ میرا خیال تھا کہ کچھ کہے گی مگر خلاف توقع جب وہ کافی دیر خاموش کھڑی رہی تو میں نے ہی کہا۔

"فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں اب آپ کے والد صاحب خطرے سے باہر ہیں۔" میں نے ایسی تو کوئی بات نہیں کی تھی جو غیر اخلاقی ہوتی مجھے علم تھا کہ میرے ان الفاظ کا اس پری زاد پر کیا اثر ہو گا لیکن میرے جملے کے مکمل ہوتے ہی وہ کچھ اس برق رفتاری سے میری جانب پلٹی تھی کہ میں ہڑبڑا کر دو قدم پیچھے ہٹ گیا کہ مبادا مجھ پر حملہ آور ہی نہ ہو جائے۔

اس کے چہرے پر زلزلے کے تاثرات ابھر آئے تھے اور وہ عجیب سی نظروں سے' یک ٹک مجھے گھور رہی تھی۔

"یہ آپ کیا فرما رہے ہیں؟" حیرت اس کا انداز تھی۔

"کیا مطلب؟ میں نے کچھ غلط کہہ دیا کیا..... ؟ میں نے تو صرف اتنا کہا ہے کہ فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں آپ کے والد صاحب اب خطرے سے باہر ہیں۔"

وہ دونوں ہتھیلیوں کی اوک میں چہرے کو تھام کر پھٹی پھٹی آنکھوں سے مجھے دیکھتے ہوئے گویا ہوئی۔

"للہ..... خاموش ہو جائیں یہ آپ کیا کہے جا رہے ہیں! وہ میرے والد نہیں' میرے خاوند ہیں..... میرے مجازی خدا۔"

اور اس بار حیران ہونے کی باری میری تھی۔ وہ چالیس برس کا بوڑھا اور یہ کمسن سی لڑکی جو بمشکل سترہ سال کی رہی ہو گی اور یہ اس بوڑھے کی بیوی؟ جانے کیوں مجھے بڑا دھچکا سا لگا اور میں نے اس کمسن لڑکی کے لیے اپنے دل میں بڑی ہمدردی محسوس کی۔

"معزز خاتون! میں معذرت خواہ ہوں مجھے معلوم نہ تھا۔ لہٰذا میری معذرت قبول کی جائے۔" میں نے دلی خلوص سے معذرت کی۔

"آپ کے خاوند اب پروردگار کی رضا سے خطرے سے باہر ہیں۔"

وہ لڑکی برابر مجھے گھور رہی تھی جیسے اسے کوئی خاص چیز نظر آرہی ہو۔ جیسے وہ مجھ میں کچھ تلاش کر رہی ہو۔

میں نے ایک نظر ان خادماؤں کی طرف دیکھا' وہ بدستور اپنی جگہ یوں بے حس و حرکت کھڑی تھیں جیسے پتھر کی مورتیاں ہوں۔ اس لڑکی کی نظریں جھک گئیں اور روشن پیشانی پر سوچ کی لکیریں ابھر آئیں۔

میں نے رسمی سے الفاظ کہے اور کمرے سے نکل آیا۔

میری تمام فیملی "سیوا" میں ہی رہائش پذیر تھی۔ سو میں چند ڈاکٹروں کے ساتھ ہسپتال کی عقبی عمارت میں ہی رہتا تھا۔ میں سیدھا اپنے کمرے میں جا کر بیڈ پر دراز ہو گیا۔ اس لڑکی کی معصوم سی صورت کثیف دھوئیں کی طرح میرے دماغ کے اندر جھومنے لگی۔ بے چاری کی تمام خواہشوں کو روند کر حسرتوں میں بدل دیا گیا تھا۔ بھلا وہ بوڑھا کھوسٹ اس کی تمام تر

ضروریات کیسے پوری کرتا ہوگا؟ اور یہ معصوم بھلا اس بوڑھے کے پوپلے وجود کو کس طرح برداشت کرتی ہو گی؟ طرح طرح کے خیالات دماغ میں امنڈتے چلے آ رہے تھے آخر کو میں سو گیا۔

☼ ☼ ☼

عدلان پاشا بالکل صحت یاب ہو کر ہسپتال سے اپنے محل کو رخصت ہو گیا۔ وہ مجھ پر نہایت مہربان تھا۔ سمجھتا تھا کہ میری وجہ سے اس کی زندگی بچی ہے اگر میں نے یہاں ہاسپٹل نہیں کھولا ہوتا تو اس کا دسواں بھی ہو چکا ہوتا۔ بہرحال جاتے جاتے وہ مجھے اپنے ہاں دعوت کے لیے ضرور پابند کر گیا تھا اور میں نے بھی چارو ناچار ہامی بھر لی تھی۔ اب یہ مشیت ایزدی کہ دو روز بعد ہی مجھے ایک میڈیکل کانفرنس کے سلسلے میں آسٹریلیا روانہ ہونا پڑ گیا اور وہاں سے مہینے کے آخری عشرے کے آخری دنوں میں میری واپسی ہوئی تو پتا چلا کہ عدلان پاشا کا حبشی غلام بیسیوں بار میرا معلوم کر گیا ہے اور میں مسکرا کر رہ گیا۔

اس روز ایک بہت ہی خاص واقعہ ہوا۔ ایک ایمرجنسی آپریشن آیا تھا بظاہر تو اس واقعہ میں کوئی حیران کن یا خاص بات نہیں تھی بلکہ یہ ایک قابل افسوس واقعہ تھا کہ ایک غریب مزدور "بحر مرگ کنار" پہنچ گیا تھا۔ مگر اس میں گرنے سے بچ گیا تھا لیکن درحقیقت اس حادثے کے پس پردہ بہت ہی حیران کن اسرار مخفی تھے۔

چند مزدور اپنے ایک زخمی ساتھی کو لے کر آئے تھے۔ وہ خون میں لت پت نیم بے ہوشی کی حالت میں تھا۔ اس کے دائیں کندھے میں کدال لگی تھی اور کندھے کی ہڈی کو چورہ چورہ کر گئی تھی۔ اس کے علاوہ ایک نوجوان صرف بے ہوش تھا اور بظاہر وہ زخمی بھی نہیں تھا جب اسے آپریشن روم لے جایا جا چکا' آپریشن شروع ہو گیا تو ان کے ساتھ جوان کا سپروائزر تھا میں نے اسے طلب کیا اور اس حادثے کے رونما ہونے کی جو وجہ کہانی کی صورت اس نے میرے گوش گزار کی وہ مجھے بڑی دلچسپ لگی۔

سپروائزر کا نام "یوساف بے" تھا میں نے اسے آفس میں بلایا اور سوال جواب شروع کیے۔

"مسٹر' یوساف بے' آپ نے بتایا نہیں کہ اس جوان کو کدال لگی کیسے؟"

اس مختصر سے سوال کے جواب میں یوساف نے کہا۔

"ڈاکٹر صاحب ہم یہاں سے کچھ دوری پر کھدائی کا کام کر رہے ہیں۔ مشرقی سمت یہاں سے دس بارہ کلو میٹر کے فاصلے پر جو نیلگوں چٹانیں موجود ہیں نا' ان کے دوسری جانب..... سبھی اپنی محویت میں کھدائی کر رہے تھے یہ بھی کھدائی کر رہا تھا کدال کا وار کرنے کے لیے جیسے ہی سامنے کی جانب جھکا' دوسرے مزدور نے عقب سے اس پر کدال کھینچ ماری۔ اگر یہ جھک نہیں گیا ہوتا تو کدال کندھے کی بجائے اس کی کھوپڑی پر پڑتی اور اس کی کھوپڑی ٹکڑوں میں تقسیم ہو جاتی! اور حیرت کی بات یہ ہے کہ حملہ کرنے والا اس کا حقیقی بھائی ہے..... اور ان دونوں کی ایک دوسرے میں جان ہے اور اب غم کی شدت سے بار بار اس پر بے ہوشی کے دورے پڑ رہے ہیں..... یہ جو دوسرا نوجوان بے ہوش تھا نا' اسی نے وار کیا تھا۔"

"حیرت ہے! جب اتنی ہی محبت تھی تو اس نے اسے جان سے مارنے کی کوشش کیوں کی؟"

"ڈاکٹر صاحب! اس نے بتایا ہے کہ یہ وار اس نے ازخود نہیں کیا بلکہ نا چاہنے کے باوجود وہ ایسا کر بیٹھا۔"

"اس کا کیا مطلب ہوا؟"

"مطلب تو جی معلوم نہیں مگر بے ہوشی سے قبل اس نے سرسری سا بتایا تھا کہ وہ کھدائی کر رہا تھا اس کا بھائی اس سے دو قدم آگے اپنے کام میں مگن تھا' کہتا ہے کہ اچانک جب کدال میں نے سر سے بلند کر رکھی تھی مجھے یوں معلوم ہوا جیسے کسی نادیدہ قوت نے اسے فضا میں ہی تھام لیا ہو میں نے زور لگایا مگر کدال نیچے نہ آئی میں نے کدال چھوڑنا چاہی مگر باوجود کوشش کے چھوڑ نہیں پایا۔ مجھے خوف محسوس ہوا کہ یہ بھائی کے سر میں لگے گی۔ میں نے چیخ کر اسے خبردار کرنا چاہا مگر میرے حلق سے آواز نہیں نکل پائی اور پھر اچانک وہ بھائی کے کندھے میں اتر گئی۔"

میں بغور یوساف کی صورت دیکھ رہا تھا۔ وہ پوری طرح سنجیدہ تھا اس کی آنکھیں اور چہرے کے تاثرات اس کے سچ کی گواہی دے رہے تھے۔ میں نے بے یقینی کے سے انداز میں اسے مخاطب کیا۔

"یوساف بے' کیا یہ بات قابل یقین ہے؟ کیا ایسا ممکن ہے.....؟ میں ہرگز نہیں مانتا اس کہانی کو۔"

"آپ کے ماننے نہ ماننے سے کیا ہو گا؟" چند لمحے ہمارے درمیان خاموشی رہی پھر میں نے ہی اسے مخاطب کیا۔

"اچھا یہ کھدائی کس سلسلے میں ہو رہی ہے؟"

یوساف بے مسکرایا اس کی مسکراہٹ میں چھپے ہوئے مضحکہ خیز اور طنزیہ تاثرات کو میں نے بخوبی محسوس کر لیا تھا۔

"ایک خشک دماغ بوڑھا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ اس جگہ زمین کے نیچے صدیوں پرانا کوئی مقبرہ دفن ہے اور وہ اسے دریافت کرنا چاہتا ہے۔"

"ہوں..... ویری انٹرسٹنگ! پھر کیا کوئی آثار ملے۔"

"نہیں ابھی تک تو کوئی نام و نشان نہیں ملا اور شاید آئندہ پچاس سال تک کوئی آثار ملے بھی نہ۔" ہم باتیں کر رہے تھے کہ چپڑاسی اندر داخل ہوا۔

"سر! توسامہ آیا ہے۔ آپ سے ملنا چاہتا ہے۔"

"کون توسامہ.....؟"

"سر وہ..... عدلان پاشا کا حبشی غلام۔"

"ہوں..... بھیج دو اسے۔" یوساف مجھ سے ہاتھ ملا کر باہر چلا گیا تو وہ کالا بھوتنا اندر آ گیا۔ پہلے تو اس نے دونوں ہاتھ سینے پر جوڑ کر مجھے تعظیم دی اس کے بعد زیر ناف ہاتھ باندھ کر نظریں جھکا کر با ادب کھڑا ہو گیا۔

"کہو توسامہ کیسے آئے ہو؟" میں نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا اور وہ اپنے مخصوص انداز میں گویا

ہوا۔

"مسیحو مارتے آقا عمت بلنوا حامص د قمامت مرت طمت اندروا۔" (مسیحا میرے آقا نے تمہیں کھانے پر بلایا ہے اور میں تمہیں لینے آیا ہوں) چند لمحے کی خاموشی کے بعد میں نے اسے مخاطب کیا۔

"مسرت مصوا پچھم آترت حلیم۔" (میں مصروف ہوں شام کو آنا میں چلوں گا) کچھ دیر وہ خاموشی سے نظریں جھکائے کھڑا رہا پھر آہستگی سے واپس پلٹ گیا۔

دن میں اس بے ہوش ہو جانے والے نوجوان سے میری ملاقات ہوئی تو میرے دریافت کرنے پر اس نے وہی کہانی دوہرائی جو میں یوساف بے کی زبانی سن چکا تھا وہ سب تو واپس جا چکے تھے البتہ زخمی ہونے والے مزدور کو کم از کم تین چار ہفتے کے لیے روک لیا گیا تھا اسے اپنے بھائی سے کوئی شکایت نہیں تھی کہ اس نے اس پر اتنا کاری وار کیا تھا کہ وہ مرتے مرتے بچا تھا۔

غروب آفتاب کے وقت توسامہ دوبارہ آن پہنچا اور میں اس کے ساتھ روانہ ہو گیا۔ تقریباً" پندرہ منٹ بعد ہم ایک خوب صورت اور عالی شان قدیم طرز کی عمارت کے صحن میں موجود تھے۔ جن کے عین وسط میں سنگ مرمر کا فوارہ پانی اگل رہا تھا' نیچے تالاب تھا جس میں ہلکے آسمانی رنگ کا سنگ مرمر استعمال کیا گیا تھا اور نیلا نیلا شفاف پانی بڑا ہی بھلا دکھائی دے رہا تھا۔

تالاب کے چاروں کونوں میں "آئی سس" اور "عدونس" کے مجسمے سجائے گئے تھے' سنگی روشوں کے گرداگرد سبز سبز گھاس بچھی ہوئی تھی جس میں جگہ جگہ "قلوپطرہ" اور "گالیکا" کے خوش رنگ پھول کھلے ہوئے نظر آرہے تھے۔

اس کے آگے کافی دوری تک سبزہ بچھا ہوا تھا جس کی حد بندی سیاہ گلاب کے خوب صورت پودوں سے کی گئی تھی اور اس سے آگے سفید سنگ مرمر سے تعمیر کردہ وہ خوب صورت محل نما عمارت تھی جس کے درو بام اس قدر شفاف' ملائم اور چکنے تھے کہ نظر پھسل پھسل جاتی۔ عمارت کے اوپری برج و منارے اس قدر بلند و بالا تھے کہ سر اٹھا کر دیکھتے ہوئے یہ خوف دامن گیر ہوتا کہ سر کندھوں سے لڑھک کر عقب میں نہ جا گرے۔

عجیب سحر خیز ماحول تھا۔ میں حیران نظروں سے یہ سب دیکھتا ہوا توسامہ کی ہمراہی میں آگے بڑھ رہا تھا۔

میں یہ کہنے میں کوئی عار محسوس نہیں کر رہا کہ ایسی بہشتی خوب صورتی اس سے قبل میری نگاہوں سے نہیں گزری تھی۔ یہ ماحول دیکھ کر ہر کوئی بخوبی اندازہ کر سکتا تھا کہ عدلان پاشا کس قدر رنگین مزاج اور حسن پرست انسان ہے اور ظاہر ہے حسن پرست انسان عیاش نہ ہو یہ کوئی قابل یقین بات تو نہیں؟ میں جیسے جیسے آگے بڑھ رہا تھا ایک عجیب سی بوجھل بوجھل بے خود کر دینے والی مہک بھی میرا احصار کیے جا رہی تھی۔

پھر ہم چلتے چلتے عمارت کے سامنے برآمدے میں پہنچ گئے۔ اس قدر نفاست' اس قدر صفائی ستھرائی مجھے حیران کیے دے رہی تھی۔ جانے یہاں کے دیوار و در' فرش وغیرہ کیسے کیمیکل سے دھوئے جاتے ہوں گے کہ کہیں کوئی ہلکا سا داغ' ہلکا سا دھبا بھی نام کو نہ تھا۔ تمام کا تمام پتھر ہی استعمال کیا گیا تھا' مگر اس میں ایسا اجلا پن تھا کہ یوں لگ رہا تھا جیسے سفید دودھیا شیشہ استعمال کیا گیا ہو۔ فرش اور دیواروں میں مجھے اپنا تمام سراپا صاف دکھائی دے رہا تھا اور حیرت کی بات کوئی مکھی نہ کوئی چیونٹی' کچھ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ شاید اس بات کا خاص خیال رکھا گیا تھا کہ چیونٹیوں کے رینگنے سے فرش آلودہ ہو جائے گا۔ سو چیونٹیوں اور مکھیوں کا خاص انتظام کیا گیا ہو گا۔

برآمدے تک پہنچنے کے لیے چھ زینے تھے۔ میں جیسے ہی آگے بڑھنے لگا میرا پاؤں پھسل گیا۔ وہ تو برق اندازی سے توسامہ نے مجھے تھام لیا۔ ورنہ تو میرا ناک ماتھا برابر ہو جاتا۔ میں نے ہارڈ سول کے جوتے پہن رکھے تھے' مجبوراً" وہ مجھے اتارنے پڑے۔ توسامہ نے بھی جوتے اتار دیے اور ہم ٹھنڈے فرش پر ننگے پاؤں ہی آگے بڑھنے لگے۔ عمارت میں داخلے کے لیے ایک محرابی راستہ تھا' جس کے ذریعے ہم اندر داخل ہوئے' بڑا وسیع و عریض ہال نما کمرہ تھا جس میں چاروں طرف کی دیواریں اطلسی پردوں کے پیچھے گم تھیں اور انہیں پردوں میں سے جابجا دروازے نظر آرہے تھے جو غالباً" صندل کی لکڑی سے تیار کردہ تھے۔

چاروں طرف صندل کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی فرش پر انتہائی نرم و نفیس قالین بچھا ہوا تھا جس کی دبیزیت کا یہ عالم تھا کہ پاؤں رکھتے ہی احساس جاگزیں ہوتا کہ پورے کا پورا وجود ہی اس میں دھنس کر رہ جائے گا۔ چھت کے ساتھ' جہازی سائز فانوس لٹک رہا تھا۔ جس میں لگے ہوئے بیش قیمت ہیروں کی کچھ ایسی چمک تھی کہ فانوس روشن کرنے کی ضرورت ہی نہ تھی۔

میں تو اس خواب نگری میں آکر بالکل ہی گم صم ہو کر رہ گیا تھا۔ سامنے کی جانب ایک راہداری تھی جس کے دروازے پر دونوں اطراف دو سنگی سپاہیوں کے مجسمے تلواریں تھامے ایستادہ تھے جو بظاہر بے جان پتھر تھے مگر عدلان پاشا کا نہایت ہی وفادار غلام توسامہ ساتھ نہ ہوتا تو میں یقیناً" آگے بڑھتا اور بے خبری میں ان کی تلواروں کا شکار ہو جاتا۔

توسامہ نے ان کے شانوں پر ہاتھ رکھے تو وہ دونوں مجسمے روبوٹ کی طرح گھوم گئے اور توسامہ میرا ہاتھ پکڑ کر راہداری میں داخل ہو گیا۔

مجھ پر کچھ ایسی محویت طاری تھی کہ میں سمجھ ہی نہیں سکا کہ توسامہ مجھے کدھر کدھر سے گھما کر اس کمرے تک لایا تھا۔ اتنا تو مجھے یقین ہو گیا تھا کہ اب اگر از خود چاہوں تو واپسی کا راستہ تلاش نہیں کر سکوں گا۔ مجھے ایک صوفے پر بٹھا کر وہ خود کمرے سے باہر نکل گیا اور میں اپنے منجمد ہوتے ہوئے حواس بحال رکھنے کی کوشش میں مصروف ہو گیا۔ اصل میں یہاں کا ماحول ہی کچھ ایسا تاثر انگیز تھا کہ میں خود کو انتہائی زیادہ انڈر پریشر محسوس کرنے لگا تھا۔ شاید اسی باعث میرے حواس معطل ہوئے جا رہے تھے۔ بہرحال جلد ہی میں خود پر قابو پانے میں کامیاب ہو گیا۔

یہاں تک آتے ہوئے مجھے صرف چند افراد ہی نظر آئے تھے' عمارت سے باہر کچھ مرد غالباً" خادم اور اندرونی حصے میں آتی جاتیں خادمائیں۔

کچھ دیر مزید گزری تھی کہ توسامہ آگیا اس نے مجھے بتایا کہ کھانا تیار ہے اور عدلان پاشا آپ کے منتظر ہیں۔ میں اس کے ہمراہ ایک اور ہال کمرے میں پہنچ گیا جہاں قالین پر انواع و اقسام کے کھانے سجے ہوئے تھے۔ عدلان پاشا نے اپنی جگہ سے اٹھ کر مجھے تعظیم دی۔

کھانے کے بعد کچھ دیر تک گپ شپ ہوتی رہی پھر میں نے اجازت مانگی۔ عدلان پاشا اور اس کی کمسن زوجہ انا آطو مصر تھے کہ میں رات رکوں مگر میرا دل اچانک بری طرح اس جگہ سے اچاٹ ہو چکا تھا۔ سو میں عدلان پاشا کی ہزار ضد کے باوجود واپس ہو لیا۔ توسامہ مجھے ہسپتال تک چھوڑنے میرے ہمراہ آیا تھا۔

اس کے بعد کافی دیر تک عدلان پاشا' توسامہ سے میری ملاقات نہیں ہوئی۔ تقریباً" ایک ماہ گزر گیا زخمی ہونے والا مزدور اب تندرست تھا گو کہ اس کا زخم پوری طرح مندمل نہیں ہوا تھا مگر اب وہ بہت بہتر تھا سو اسے ڈسچارج کیا جا سکتا تھا۔

اس کا بھائی اور سپروائزر یوساف بے اکثر آتے تھے مگر میری ان سے ملاقات نہیں ہو پاتی تھی۔ زخمی ہونے والے مزدور کی زبانی مجھے معلوم ہو چکا تھا کہ ان کا کھدائی کا کام بند ہو چکا ہے وجہ معلوم نہیں تھی۔ آخر ایک دن یوساف بے آیا اور میری اس سے ملاقات ہو گئی۔

"بس ڈاکٹر صاحب چند عجیب و غریب اور ناقابل فہم واقعات ظہور پذیر ہوئے اور وہ خبطی بوڑھا خوفزدہ ہو کر شہر ہی چھوڑ گیا اور اسی باعث کام درمیان میں ہی بند ہو گیا۔" میرے پوچھنے پر یوساف بے نے تفصیل بتائی۔

"بھلا ایسے کیا عجیب و غریب واقعات تھے جو وہ اتنا گھبرایا کہ شہر ہی چھوڑ بھاگا؟"

"رات کے وقت ہم وہیں کیمپوں میں ہی سو جایا کرتے تھے اور صبح سورج کی پہلی کرن کے ساتھ ہی اپنے کام کا آغاز کر دیتے تھے۔ پچھلے چھ دنوں سے ہم بھی ایک نامعلوم سے خوف کا شکار تھے اور سبھی کی متفقہ رائے تھی کہ اس علاقے میں کچھ نادیدہ وجود بھی موجود

ہیں جو ان کے اردگرد چکراتے رہتے ہیں۔ اکثر مزدوروں نے رات کو کچھ پراسرار انسانی ہیولے وہاں چکراتے، ٹہلتے ہوئے بھی دیکھے اور ایک رات تو میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا.....!

وہ کوئی دوشیزہ تھی۔ اس نے قدیم طرز کا لباس زیب تن کر رکھا تھا اور وہ ایک مخصوص جگہ پر دائرے کی صورت چکرا رہی تھی..... اس کے جسم کے کھلے حصوں میں سے ایک عجیب قسم کی روشنی منعکس ہو رہی تھی اس کے ہاتھ پاؤں اور چہرے سے دودھیا رنگ کی سبزی مائل روشنی پھوٹ رہی تھی..... فاسفورس نما! اور پھر میرے دیکھتے ہی دیکھتے وہ چاند کی مدھم روشنی میں ہی مدغم ہو کر رہ گئی اور تو اور رات کو اکثر کسی عورت کے رونے، کراہنے کی آوازیں، گمبھیر خاموشی میں چاروں طرف پھیل جاتیں اور باوجود کوشش کے ہم کسی بھی عورت کو تلاشنے میں ناکام رہتے۔ آخر کار وہ بوڑھا خوفزدہ ہو کر تمام سامان، مشینیں اور اوزار وغیرہ سمیٹ کر بھاگ نکلا۔"

میں نے تیکھی نظروں سے یوساف بے کو گھورتے ہوئے مخاطب کیا۔ "یوساف! کیا تم مجھے بے وقوف بنا رہے ہو؟"

"باخدا ڈاکٹر صاحب میں سچ بیان کر رہا ہوں۔"

"یعنی تمہارا کہنے کا مقصد یہ ہے کہ وہاں بھوتوں کا بسیرا ہے؟"

"بات کچھ ایسی ہی ہے۔"

"یوساف! کیا تم مجھے احمق سمجھ رہے ہو؟ اگر اصل وجہ نہیں بتانا چاہتے تو نہ سہی مگر یہ بچکانہ کہانیاں سنا کر مجھے الو بنانے کی کوشش تو نہ کرو۔"

"ڈاکٹر صاحب آپ کا کیا خیال ہے! کیا میں آپ سے محض مذاق کر رہا ہوں؟ یا آپ یہ سمجھ رہے ہیں کہ میں آپ سے جھوٹ بول رہا ہوں؟"

"تو پھر یہ سب کیا خرافات ہیں؟ کیا تم قدیم عہد فراعنہ میں بیٹھے ہو جو اس طرح کی لغویات کا یقین کیا جائے۔ یہ سائنس کا دور ہے، مشینری کا دور ہے اور اس دور میں بھلا بھوت اور بدروحیں..... عجیب منطق ہے؟"

"ڈاکٹر صاحب یہ سب میرا آنکھوں دیکھا اور کانوں سنا ہے اور پھر میرے علاوہ بھی بہت سے لوگ ان واقعات کے گواہ ہیں اور اگر پھر بھی آپ کو یقین نہیں آتا تو آپ خود چار دن وہاں رہ کر کھدائی کروا کر دیکھ لیں آپ کو خود بھی کچھ نا کچھ نظر آجائے گا۔" یوساف کی بات پر میں چونک پڑا۔ یوساف کے الفاظ پانی میں پھینکے ہوئے پتھر کی طرح میرے دماغ کی گہرائیوں میں بیٹھتے چلے گئے اور میں یک ٹک یوساف کو دیکھے گیا لیکن میرا ذہن میری بصارت کی جانب نہیں بلکہ کسی اور جانب متوجہ تھا۔

"آپ مجھے ایسے کیوں دیکھ رہے ہیں؟" یوساف قدرے پریشان ہو گیا۔ میرے زیر لب ایک مسکراہٹ ابھر آئی۔ میں نے بدستور اس کے چہرے پر نظریں جمائے اسے مخاطب کیا۔

"یوساف ابھی ابھی تم نے کہا کہ میں خود کھدائی کروا کر دیکھ لوں مجھے کچھ نہ کچھ نظر آجائے گا؟"

"ہاں..... یہ میں نے اس لیے کہا ہے کہ ظاہر ہے آپ کو کھدائی کے دوران وہاں قیام کرنا ہو گا یا آپ چاہیں تو ویسے ہی چار راتیں وہاں گزار کر دیکھ لیں کوئی نا کوئی پراسرار واقعہ تو پیش آئے گا ہی سو آپ کو میرے کہے پر یقین آجائے گا۔"

"یوساف اگر میں کھدائی کروا کر وہ مقبرہ تلاشنا چاہوں تو کیا تم میرا ساتھ دو گے؟"

"مم..... میں، کیوں جی....." میں نے صاف محسوس کیا کہ ایک لمحے کو یوساف کے چہرے کی رنگت متغیر ہو گئی تھی مگر جلد ہی اس نے خود کو سنبھال لیا۔

"کیا بات ہے یوساف..... کیا تم وہاں دوبارہ سے کھدائی کرنے سے خائف ہو؟"

"نہیں تو..... مگر ڈاکٹر صاحب آپ اتنے بڑے ڈاکٹر ہیں..... آپ کا ہسپتال ہے..... اس ہسپتال کو آپ کی ضرورت ہے بھلا آپ کو ویرانوں کی خاک چھاننے کی کیا ضرورت ہے؟"

"یوساف میں انسانی دلوں کے آپریشن کرتا ہوں۔ اب میں نے سوچا ہے کہ ایک آپریشن اس سنگلاخ زمین کا بھی کر کے دیکھ لوں جہاں تم لوگ ناکام ہو گئے۔ ممکن ہے کہ مجھے زمین کے دل تک رسائی ہو جائے۔"

"مگر ڈاکٹر صاحب کوئی مشین ہے نہ اوزار ہیں مزید کھدائی ہاتھوں سے تو کی نہیں جاسکتی اور کھدائی کے مکمل سامان پر تو بہت زیادہ اخراجات آجائیں گے اسٹون ڈرلز، ڈرل مشین، جیکر مشین، کرینز، جنریٹر، پریشر کٹر، اسٹون کٹر، اور چھوٹا چھوٹا بہت سامان..... یہ سب کہاں سے آئے گا؟ ہمارے پاس تو کچھ بھی نہیں۔"

"تم اتنے دنوں تک کھدائی کرتے رہے ہو تمہیں معلوم ہو گا کہ مزید کتنی کھدائی کرنا ہو گی۔"

"ڈاکٹر صاحب وہ تو ابتدائی کھدائی تھی اصل کام تو ابھی شروع ہوا تھا..... اور مزید کتنی کھدائی کرنا ہو گی، اس بارے میں کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ ہو سکتا ہے ابھی سینکڑوں فٹ گہرائی تک کھدائی کرنا پڑے....."

میں چند لمحے خاموش ہو رہا۔ مجھے روپے پیسے کی فکر تھی اور نہ کسی مشینری وغیرہ کی۔ دنیا کے بڑے بڑے ممالک تک میری رسائی تھی اور میں جدید سے جدید مشینری حاصل کر سکتا تھا۔ میں نے یوساف کو مخاطب کیا۔

"یوساف کیا تم میرا ساتھ دو گے؟"

"ڈاکٹر صاحب اگر آپ مشینری کا مناسب بندوبست کر لیں تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔" یوساف نے کندھے اچکائے اور میں مسکرا اٹھا۔

"تو ٹھیک ہے تم تمام مشینری اور ضروریات کی ہر چیز کی لسٹ تیار کر کے مجھے دو اور مزدوروں کو تیار رکھو ہم جلد ہی کھدائی شروع کرا رہے ہیں۔" میری بات ختم ہوتے ہی یوساف نے قلم اور پیڈ سنبھالا پھر سامان کی فہرست ترتیب دینے کے لیے ٹیبل پر جھک گیا۔

☼ ☼ ☼

کھدائی کا یہ مقام ہاسپٹل سے تقریباً" دس بارہ کلو میٹر پر مصر کے قدیم شہروں "بلبیس" اور "فرما" کے درمیان واقع تھا۔ یوں تو صحرائی علاقوں کے علاوہ ایسے علاقے بھی تھے مگر کم تھے۔ یہ ایک پہاڑی خطہ تھا جس کے دونوں اطراف میں چٹانیں بکھری ہوئی تھیں۔ یہ چھوٹا سا چٹانی خطہ اگر عبور کر لیا جاتا یا کسی بلند چٹان کی چوٹی پر چڑھ کر دیکھا جاتا تو لق و دق صحرا ہی دکھائی دیتا تھا۔

یہاں سے ٹھیک پندرہ میل دور وہ مقام تھا جہاں 634ء اور 635ء کے درمیان میں مجاہدین اسلام کے لشکر اور رومی فوج کے درمیان بڑی ہی گھمسان کی جنگ ہوئی تھی۔ میرا خیال ہے مختصر سا یہ ذکر بے جا نہیں ہو گا۔

اس دور میں شام، ایران اور مصر پر رومی عیسائیوں کا تسلط تھا۔ مصر میں زیادہ تعداد قبطیوں کی تھی۔ قیصر روم "ہرقل" ذاتی شجاعت، جنگی قیادت اور فطری فرعونیت کے لحاظ سے دہشت کا ایک نام تھا۔ اسے طاقت کا دیو کہا جاتا تھا اور قیصر روم کی جنگی طاقت ہیبت ناک دو طاقتوں میں سے پہلے نمبر پر خیال کی جاتی تھی۔ کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ ان دو طاقتوں (دوسری طاقت کسریٰ ایران) میں سے کسی ایک کو بھی کوئی اور طاقت اٹھ کر کمزور کر سکے گی۔

لیکن ایک تیسری طاقت ابھرتی چلی آرہی تھی یہ صرف ایک جنگی طاقت نہیں تھی بلکہ ایک نظریہ تھا ابتدا میں ایرانیوں اور رومیوں کے محلات میں اس کی خبریں پہنچیں تو ان دونوں قوموں نے کہا کہ یہ صحرائے عرب کے لٹیرے بدو ہیں۔ انہوں نے مذاق اڑا کر ان خبروں کو نظر انداز کر دیا۔ یہ تیسری طاقت افق سے اس طرح اٹھی جس طرح طوفان باد و باراں کی کالی گھٹائیں بجلیوں سے لدی ہوئی اٹھا کرتی ہیں یا وہ صحرائی طوفان اٹھتا ہے جو ٹیلوں اور ٹیکریوں کو اپنے ساتھ اڑا کر لے جاتا ہے۔ یہ تیسری طاقت ہتھیاروں سے کم اور ایک ایسے جذبے سے زیادہ لیس تھی جو اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعے ان پر اتارا تھا۔ یہ ایک ایسا لشکر تھا جس کی نفری بہت ہی تھوڑی تھی لیکن اسے اللہ تعالیٰ نے

ایسی قوت عطا کی تھی جسے ایمان کی قوت کہا جاتا ہے۔ یہ تیسری طاقت ایسی ابھری کہ تیز و تند طوفانوں کی طرح باطل کی قوتوں کو خس و خاشاک کی طرح اڑا اور بہا کر لے گئی اور ان بادشاہوں پر جو اپنے آپ کو ناقابل تسخیر طاقتیں سمجھتے تھے یہ لشکر آسمانی بجلیاں بن کر گرے۔ پھر زمین و آسمان نے دیکھا کہ دنیا کی سب سے بڑی جنگی طاقتوں میں مٹھی بھر مجاہدین کے آگے ٹھہرنے کی تاب نہیں رہی تھی۔ ان ہی مجاہدین کو ایرانیوں اور رومیوں نے عرب کے بدو کہا اور ہنس کر نظر انداز کر دیا تھا۔

عراق اور شام کے نصیب جاگے اور اللہ تعالیٰ کا پیغام ان خطوں میں پہنچ گیا۔ عراق اور شام کے چھن جانے پر ہرقل بھاگا بھاگا پھر رہا تھا اور اسے کہیں پناہ نہ مل رہی تھی یہ 640ء اور 642ء کا دور تھا اور یہی ہرقل جو خود کو طاقت کا دیو کہلاتا تھا اور جو دہشت کا ایک نام تھا اس حال تک پہنچا دیا گیا تھا کہ وہ بحیرہ روم کے اس پار "بزنطیہ" میں جا بیٹھا تھا اور وہاں سے مصر میں اپنی فوج کو احکام بھیجتا رہا۔ حتیٰ کہ وہ انتہائی مایوسی کے عالم میں انتقال کر گیا۔ تاریخ دان آج بھی حیران ہیں آٹھ دس ہزار مجاہدین نے ہرقل رومی کی اتنی طاقتور فوج کہ جس کی تعداد ایک لاکھ سے زیادہ تھی کس طرح ہر میدان اور قلعے میں شکست پہ شکست دے کر مصر سے بھگا دیا تھا۔

جس جگہ میں کھڑا تھا' یہاں سے ٹھیک پندرہ میل کے فاصلے پر وہ شہر تھا جسے کہ ناقابل تسخیر سمجھا جاتا تھا۔ فرعونوں کے زمانے میں اسے "پلوز" کہا جاتا تھا۔ زمانے گزرتے گئے' مصر قبطیوں کے زیر تسلط آتا گیا تو پلوز کا نام پرمون رکھ دیا گیا پھر آگے چل کر کسی دور میں اس کا نام فرما رکھ دیا گیا۔ اب تو دریائے نیل بھی رستہ بدل چکا ہے اس وقت جس علاقے میں فرما واقع تھا وہاں دریائے نیل جا کر سات شاخوں میں تقسیم ہو جاتا تھا ایک کا نام جسے نہر کہا جاتا تھا پلوزی تھا اس لیے اس شہر کا نام پلوزر کھا گیا۔ فرما کا یہ شہر ایک بلند پہاڑی پر آباد کیا گیا تھا اس کی حفاظت کے لیے شہر کے گرد ایک مضبوط فصیل تھی۔ اس کے علاوہ متعدد قلعہ بندیوں سے محفوظ کیا گیا تھا۔ یوں اس شہر کی تسخیر تقریباً" ناممکن بنا دی گئی تھی۔ دوسرا یہ پہاڑی پر آباد تھا۔ یہ محاصرہ کرنے والوں کے لیے بڑی زبردست مشکل پیدا کر دی گئی تھی۔

اس شہر پر حملہ کرنے والے لشکر کے سپہ سالار عمرو بن عاص رض تھے ــــــــ شہر پر چڑھائی کرنے سے پہلے عمرو بن عاص رض ــــــــ نے لشکر سے خطاب کیا۔ جو خاص طور پر تاریخ کا اہم حصہ ہے۔ انہوں نے کہا۔

"ہم مصر کو جانے والے اس راستے پر جا رہے ہیں جو ایک قدیم ترین راستہ ہے۔ ہمارے پیغمبر دنیائے عرب سے اسی راستے مصر آئے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام' حضرت یعقوب علیہ السلام' حضرت یوسف علیہ السلام' حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا پورا خاندان اسی راستے مصر پہنچا تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اسی راستے سے فرعون کے جادوگروں کے منہ پھیر کر اور ان کے دانت کھٹے کر کے مصر سے دنیائے عرب کو گئے تھے۔ یہی دریائے نیل تھا جس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل کو راستہ دے دیا تھا اور جب ان کے تعاقب میں آنے والا فرعون "رعمیس سوم" نیل میں اترا تو نیل نے راستہ بند کر دیا اور فرعون ڈوب مرا تھا۔ یہ ایک مقدس راستہ ہے۔ یہ ہمارے پیغمبروں کا راستہ ہے۔ یہ نہ سمجھنا کہ ہم کوئی ملک فتح کرنے آئے ہیں! یہ ہماری اپنی سرزمین ہے۔ اس ملک میں صرف اللہ تعالیٰ کی حکمرانی چلے گی اور یہ حکمرانی تم قائم کرو گے ان شاء اللہ..... اس راستے کے تقدس کا اندازہ اس سے کرو کہ مصر اور افریقہ سے حج کو جانے والے مسلمان اسی راستے سے جاتے ہیں۔ یہ راستہ مسلمانوں کے لیے ہی نہیں عیسائیوں کے لیے بھی مقدس ہے۔ عیسائی اس راستے سے بیت المقدس آتے اور جاتے ہیں۔ یہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا راستہ ہے۔ لیکن مصر میں ایک بادشاہ نے عیسائیت کا چہرہ مسخ کر ڈالا ہے اور اس نے اپنی عیسائیت بنا دی ہے اور یہ عیسائیت منوانے کے لیے اس نے بھی عیسائیت کے ماننے والے ہزاروں لوگوں کو قتل کیا ہے۔ ہم ان عیسائیوں کو ہرقل کی عیسائیت' بربریت اور ظلم و تشدد سے نجات دلانے آئے ہیں۔" اور زمین و آسمان ان مسلمانوں کی جرات' بے جگری' پامردی اور بے خوفی و حوصلے دیکھ کر گنگ رہ گئے۔ جو قلعہ ناقابل تسخیر سمجھا جاتا تھا مسلمانوں نے اس کی بلندیوں کو اپنے قدموں تلے روند ڈالا۔ قلعے کے دیوار و در اور گلیاں خون میں یوں رنگین تھیں جیسے آسمانوں سے خون کا مینہ برسا ہو۔

اور آج میں اس مقام کے پہلو میں کھڑا تھا تو مجھے اپنے اردگرد چیخ و پکار اور آہ و فغاں کا طوفان سنائی دے رہا تھا۔ فضا میں ثقیل ثقیل سی کسل مندی طاری کرنے والی لہو کی بو رچی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ میں حیران حیران سا اردگرد کا ماحول دیکھ رہا تھا۔ دو اطراف چٹانیں تھیں تو بائیں جانب تقریباً" ایک فرلانگ کے فاصلے پر جنگلی جھاڑیوں اور خود رو پودوں کے جھنڈ دکھائی دیتے تھے۔ جن کی حد بندی ایک خشک ندی کرتی تھی جو گھومتی گھماتی جانے کدھر سے آتی تھی اور کدھر جاتی تھی۔

کسی دور گزشتہ میں اس ویرانے میں یہ وسیع ندی بڑی سحر انگیز اہمیت کی حامل رہی ہو گی مگر اس وقت وہ خشک پڑی تھی۔ اس کے دامن میں خود رو گھاس اور جنگلی جھاڑیاں اگ آئی تھیں اور اس کے دامن میں دراڑیں پڑی ہوئی تھیں۔ خشک' سوختہ تہہ پپڑیوں میں تقسیم ہوئی پڑی تھی۔ ندی کا نظارہ کر کے میرے ذہن میں خود بخود ایک خستہ حال بڑھیا کا چہرہ ابھر آیا تھا جو صدیوں سے ایک ہی جگہ بے یار و مددگار کسی کی محبت کے زیر اثر راہگزر میں بیٹھی اپنے محبوب کا انتظار کر رہی ہو اور موسموں کے تھپیڑوں سے اس کی حالت اثر انگیز صورت اختیار کر گئی ہو جس کا وجود جھریوں میں اس طرح چھپ گیا ہو کہ اس کا تمام بدن باریک دراڑوں میں منقسم ہوا معلوم ہوتا ہے۔

جو ہماری مطلوبہ جگہ تھی وہاں جگہ جگہ پر گڑھے کھدے ہوئے تھے۔ مٹی اور پتھروں کے ڈھیر بکھرے ہوئے تھے اور اس مقام سے کچھ دوری پر کچھ کھنڈرات کے آثار نظر آتے تھے مگر انہیں دیکھنے کا ابھی مجھے وقت نہیں ملا تھا۔ کسی نے اس ویرانے کو آباد کرنے کی کوشش کی ہو گی مگر نجانے ایسے کیا حالات رہے ہوں گے کہ وہ بنے بنائے مکان چھوڑ کر چلے گئے؟ اب وہی مکانات کھنڈرات میں بدل چکے تھے۔

تمام سامان اور مشینیں ارینج کرنے میں مجھے تقریباً" ایک ماہ کی مدت لگی تھی۔ خیمے لگ چکے تھے۔ جنریٹرز مناسب جگہوں پر فٹ کر لیے گئے تھے۔ مشینیں چالو تھیں اور کام شروع ہو چکا تھا۔ آج ہی کام کا افتتاح ہوا تھا۔

شاید میں اس علاقے کا کبھی رخ نہیں کرتا! مگر یوساف نے کچھ ایسے ایسے واقعات کا ذکر کیا تھا کہ مجھے تجسس میں ڈال دیا تھا اور تجسس کیسی بلا ہے یہ سبھی جانتے ہیں اور جن حضرات کا محبت سے واسطہ پڑا ہو وہ تو بخوبی سمجھ سکتے ہیں کہ تجسس کی اصل حقیقت کیا ہے اور یہ کیونکر راتوں کی نیندیں حرام کر دیتا ہے؟

تقریباً" پچاس فٹ تک کھدائی ہو چکی تھی مزید ابھی جاری تھی مگر صورت حال کچھ ایسی تھی کہ جو اس زمین کی کوکھ کے بانجھ ہونے کی گواہی دے رہی تھی۔

ان دنوں سخت گرمی کے دن تھے۔ سورج سے بھی آگ برستی تھی اور زمین بھی حبس اگلتی تھی۔ شام کا اندھیرا پھیلتے ہی مشینیں روک دی گئیں اور کام بند کر دیا گیا۔ تمام مزدور ایک جانب خس کی بنی ہوئی صفوں پر ہلکا ہلکا پانی چھڑک کر ان پر جا بیٹھے اور آپس میں محو گفتگو ہو گئے۔ کھانا وغیرہ ہسپتال سے ہی تیار ہو کر آتا تھا۔ رات تقریباً" نو بجے کے قریب میرا ملازم "عبدل" کھانا لے کر آ گیا۔ میری "آلسٹن سیون" لانگ باڈی جیپ ان دنوں اسی کے استعمال میں تھی اور وہ خوب مزے کر رہا تھا۔

کھلی فضا میں دریاں بچھا دی گئیں اور کھانا لگا دیا گیا۔ تمام مزدور چار چار کی ٹولیوں میں بیٹھے کھا رہے تھے۔ میں یوساف اور عبدل ایک طرف بیٹھے کھانا کھانے

میں مصروف تھے۔ چاند آہستہ آہستہ بلند ہو رہا تھا اور حبس زدہ ماحول پر ٹھنڈک برسنے لگی تھی۔ کھانے کے بعد مخصوص مصری قہوے کا دور چلا تو میں نے یوساف کو مخاطب کیا۔

"یوساف! وہ جو اس طرف کھنڈرات نظر آتے ہیں وہ کیسے ہیں؟"

"وہ..... ان کے بارے میں جی میرے پاس کوئی ٹھوس معلومات نہیں۔ روایت در روایت سنا ہے کہ یہاں کبھی ایک عالیشان محل ہوا کرتا تھا۔ انتہائی خوب صورت، سحر انگیز اور قابل رشک۔ وہ مکمل سنگ مرمر کا تھا اور ایسا شفاف کہ شیشے کی مانند..... اس کے قریب جانے کی کسی کو اجازت نہیں ہوا کرتی تھی۔ ایک حبشی کے علاوہ اس محل کے آس پاس یا محل میں آتے جاتے کبھی کسی کو نہ دیکھا گیا تھا۔ وہ حبشی محل کی حفاظت پر مامور تھا۔ کہتے ہیں کہ اسے چوبیس گھنٹے پوری طرح چوکس پایا جاتا۔ وہ کسی جانور کو بھی محل کے قریب نہیں پھٹکنے دیتا تھا اور کسی بھوت کی مانند محل کے اطراف میں چکراتا رہتا تھا۔ دن میں سورج کی روشنی سے اس محل میں سے اس قدر چمک منعکس ہوتی کہ آنکھیں تاب نہ لا پاتیں؟ اور کہا جاتا ہے کہ اس کی تعمیر بھی بہت ہی حیران کن انداز میں ہوئی تھی۔

شام کا اندھیرا پھیلا تو یہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ رات گزری دن کا سورج طلوع ہوا تو یہاں ایک عالی شان محل کھڑا تھا۔ لوگ خوفزدہ تھے، کسی کی کبھی ہمت ہی نہ ہوئی کہ وہ محل کی جانب جاتا اور جس پراسرار انداز میں یہ ایک ہی رات میں تعمیر ہوا تھا ایک وقت آیا کہ ٹھیک اسی طرح ایک ہی رات میں صدیوں پرانے کھنڈرات میں تبدیل ہو گیا۔"

یوساف نے بات مکمل کر لی تو میرا دل چاہا کہ اس احمق انسان کا گلا گھونٹ دوں مگر میں برداشت کر گیا۔ یہ بکواس کہانی قطعی مہمل اور لغویات کا پٹارہ تھی۔ مگر میں نے کوئی تبصرہ نہیں کیا اور خاموش ہو رہا۔

رات کو سب اپنی جگہ لیٹ گئے۔ صرف ایک آدمی کی ڈیوٹی تھی کہ وہ تمام رات جاگ کر نگرانی کرے اور اگر کوئی غیر معمولی واقعہ پیش آئے تو وہ اپنے ساتھیوں کو جگا دے گو کہ اس کی ضرورت نہیں تھی مگر پھر بھی مصلحتاً" ایسا کیا گیا تھا۔

مجھے نیند نہیں آ رہی تھی۔ میں منتظر تھا کہ کوئی غیر معمولی واقعہ رونما ہو۔ ذرا ذرا سی آہٹ پر میں چونک اٹھتا، رات آدھی سے زیادہ گزر گئی مگر میری توقع کے مطابق کچھ بھی نہ ہوا اور آخر کو رات کے کسی پہر میری آنکھ لگ گئی۔

بخیر و عافیت صبح ہو گئی۔ مشینوں کے انجن گرج اٹھے، پتھر کٹ رہے تھے، ریزہ ریزہ ہو رہے تھے اور جہاں سے پہلے ہی کھدائی ہو چکی تھی وہاں مزدور گہرائیوں میں اتر کر بیلچوں کی مدد سے مٹی کھود رہے تھے۔ جمع ہو جانے والی مٹی کو کرین کی مدد سے باہر نکال لیا جاتا تھا۔ سات دن اور چھ راتیں گزر گئیں نہ تو کھدائی کا کوئی نتیجہ نکلا اور نہ ہی رات کو کوئی پراسرار یا غیر معمولی واقعہ پیش آیا۔ اب مجھے یقین ہو چلا تھا کہ یا تو یوساف نے مجھ سے جھوٹ کہا تھا اور حقیقت چھپائی تھی یا پھر یہ لوگ وہم کا شکار ہوئے تھے۔

میں نے سوچ لیا تھا کہ ایک دو روز میں یہ فضول سی کھدائی بند کراؤں اور واپس ہو جاؤں مگر آنے والی ساتویں رات کو ایک ایسا واقعہ پیش آیا کہ مجھے اپنی یہ سوچ ترک کرنا پڑی۔ اتوار کا روز تھا۔ سارا دن جسم کو جھلسا دینے والی سلگتی ہوئی ہوا چلتی رہی۔ آخر دہکتا ہوا سورج مغرب کی جانب جھکتے جھکتے نیلی چٹانوں کے عقب میں اتر گیا۔ چٹانوں کے سائے لمبے ہو گئے اور ہم سائے کی پناہ میں آ گئے مگر ابھی سورج غروب نہ ہوا تھا کہ شمالی سمت سے سیاہ بادلوں کے ٹکڑے بلند ہوئے اور تیرتے ہوئے آہستہ آہستہ فضا میں پھیلنے لگے۔ یوں جیسے بلندیوں سے ہمارے گرد گھیرا ڈال رہے ہوں۔

دن بھر جو ہوا عذاب جان بنی ہوئی تھی اور کھال جھلساتی رہی تھی! اب وہی ہوا ایک بے خود کر دینے والی طاقت کا احساس دلانے لگی تھی۔

ویران بے آب و گیاہ اور پتھریلا علاقہ، آسمانوں پر

پھیلے ہوئے سیاہ بادل، شفاف اور دھلی دھلی سی فرحت بخش ہوا۔ ماحول بڑے ہی روح پرور نظاروں میں ڈھل گیا تھا۔

سورج غروب ہوتے ہی کام بند کر دیا گیا اور تمام مزدور روزمرہ کے معمول کے مطابق گپ بازی میں مصروف ہو گئے۔ روزانہ کی مناسبت آج سب کے چہرے قدرے کھلے کھلے سے تھے۔ شاید موسم کی اس معمولی سی تبدیلی کے باعث ایسا تھا۔

اندھیرا پھیل چکا تھا سو لیمپ روشن کر لیے گئے۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا بدستور چل رہی تھی۔ رات کھانے وغیرہ اور دیگر مصروفیات سے فارغ ہو کر میں بھی اپنی مخصوص جگہ پر دراز ہو گیا۔

مزدوروں کے ہنسی مذاق اور قہقہوں کی آوازیں میں کافی دیر تک سنتا رہا پھر آہستہ آہستہ سب خاموش ہوتے گئے۔ مگر میں جاگ رہا تھا۔ سبھی بغیر قنات کے خیمے کے نیچے سوتے تھے تاکہ اطراف سے تازہ ہوا آتی رہے۔

آسمان پر سیاہ بادل پھیلے ہوئے تھے کبھی کبھار چاند بادلوں کی اوٹ سے چہرہ نکال کر ہم زمین نشین انسان کو ایک نظر دیکھتا پھر فوراً" ہی بادلوں کی سیاہ چادر چہرے پر اوڑھ لیتا اور ماحول پر اندھیرا چھا جاتا۔ رات آہستہ آہستہ رینگتی رہی اور میں تاریک آسمان پر نظریں جمائے اپنی جگہ لیٹا رہا۔ سبھی مزدور دن بھر کی تھکان کے باعث اب نیند کے زیر اثر بے سدھ پڑے تھے۔ عبدل معمول کے مطابق دو نالی رائفل اٹھائے جاگ رہا تھا۔ وہ مجھ سے دائیں طرف تھوڑے فاصلے پر ایک پتھر پر بیٹھا ہوا تھا، رائفل اس کی گود میں پڑی تھی اور وہ مزے سے بیٹھا سگریٹ پھونک رہا تھا۔

رات نصف سے زیادہ گزر گئی تو مجھ پر ہلکی ہلکی غنودگی طاری ہونے لگی میں نے گردن گھما کر عبدل کی جانب دیکھا وہ چاق و چوبند نظر آ رہا تھا۔ میں نے مطمئن ہو کر دائیں جانب کروٹ لی اور آنکھیں بند کر کے سونے کی کوشش کرنے لگا اور میرے دماغ پر مسلط غنودگی کی تہ مزید گہری ہوتی چلی گئی۔

مجھے آنکھیں بند کیے زیادہ سے زیادہ دس منٹ ہوئے ہوں گے کہ ایک تیز نوکیلی نسوانی چیخ پرسکون فضا کا پیٹ چیرتی ہوئی تاریک وسعتوں میں کہیں گم ہو گئی۔ مجھ پر مسلط نیند کی دیوی شدید گھبراہٹ کے باعث ہڑبڑا کر کسی اور جانب پرواز کر گئی اور میرے اعصاب نیند کی غفلت انگیز کیفیت کی گرفت سے آزاد ہو گئے۔

آواز اس قدر تیز اور بلند تھی کہ میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ میں نے مزدوروں پر نگاہ ڈالی میری طرح دو افراد اور بے دار ہو چکے تھے۔ ایک یوساف اور دوسرا "ایکیلاس" یہ وہ مزدور تھا جس نے اپنے بھائی پر کدال سے وار کیا تھا۔

عبدل رائفل اٹھائے اپنی جگہ کھڑا حیرت بھرے انداز میں ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ ہم ایک دوسرے سے کچھ دریافت کرتے وہ کرب ناک چیخ دوبارہ بلند ہوئی اور ہماری سماعتوں پر خراشیں ڈالتی ہوئی گزر گئی۔ چیخ کس سمت سے بلند ہوئی تھی میں اس کا تعین نہیں کر سکا تھا۔ میں نے بستر چھوڑا اور لپک کر عبدل کے قریب پہنچ گیا۔ چیخ سہ بارہ بلند ہوئی اور پھر تو جیسے ذرے ذرے پر موت اتر پڑی! آہ و فغاں کا ایک ایسا شور بلند ہوا کہ الامان۔ تمام مزدوروں میں ہلچل سی مچ گئی۔

"صاحب جی..... یہ..... یہ کیا ہو رہا ہے؟" عبدل نے بوکھلائے ہوئے انداز میں کہا۔ بھلا میں اسے کیا بتاتا کہ کیا ہو رہا ہے؟ چیخنے والی صرف ایک عورت تھی مگر آواز اس قدر بلند اور تیز تھی جیسے سینکڑوں بدروحیں کسی بھوت کی لاش پر نوحہ کناں ہوں۔ ان چیخوں میں کچھ ایسی شدت، ایسا ہیجان تھا..... کچھ ایسا سوز و کرب تھا کہ میں نے ایسی اثر انگیز آواز پہلے کبھی کہیں نہ سنی تھی۔ بلاوجہ ہی اعصاب ایک بوجھل سنسنی کا شکار ہوئے جا رہے تھے۔ یوساف اور ایکیلاس بھی ہمارے قریب آ پہنچے۔

"ڈاکٹر صاحب..... یہ..... یہ چیخیں آپ کو سنائی دے رہی ہیں نا؟ یہ اسی پراسرار دوشیزہ کی ہیں اور.....

اور میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ یہ یقیناً" کوئی بدروح ہے۔"

"مگر یہ آوازیں آکدھر سے رہی ہیں؟" میں نے اطراف میں نگاہیں دوڑائیں۔ چیخیں بدستور بلند ہو رہی تھیں مگر آواز کی سمت کا کوئی تعین نہ ہو پا رہا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے ذرہ ذرہ زمین و آسماں، سنگ و پربت ہر چیز سے چیخیں بلند ہو رہی ہوں..... جیسے بذات خود فضا رو رہی ہو۔ پھر اچانک خاموشی پیدا ہو گئی اور چند لمحوں بعد ایک پرسوز نسوانی صدا بلند ہوئی۔ یوں لگا جیسے کوئی عورت آسمانوں کی جانب منہ اٹھائے پکار رہی ہو۔

اے مقدس خلوتوں کے مکین
اے آسمانوں اور بحروبر کو قابو میں رکھنے والے
اے پانیوں سے روحیں کشید کرنے والے
ہائے..... ہائے میری بدنصیبی
تو میری سنتا کیوں نہیں؟
اے ٹھوس پتھروں میں ہوا کو مقید رکھنے والے

اور پھر اچانک ماحول پر خاموشی مسلط ہو گئی۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے یہ آواز پہلے بھی سن چکا ہوں؟ مگر کہاں یہ مجھے یاد نہیں آ رہا تھا۔ میرے کانوں میں ہلکی ہلکی سائیں سائیں ہو رہی تھی۔ ہم سب دوبارہ کوئی آواز سننے کے منتظر تھے مگر چاروں طرف خاموشی چھائی رہی۔

تمام مزدور ہمارے گرد آ جمع ہوئے تھے۔

"ڈاکٹر صاحب اب تو آپ کو میرے کہنے پر یقین آ گیا ہو گا۔" یوساف نے کہا۔

"کیسا یقین؟ کس بات پر یقین یوساف؟"

"یہی کہ یہ پرانے بھوتوں اور بدروحوں کا مسکن ہے۔"

"یوساف تمہارا دماغ تو خراب نہیں..... چند نسوانی چیخیں سنائی دیں تو تم انہیں بدروحوں سے منسوب کر بیٹھے..... بہت کمزور دل کے مالک نکلے تم تو یوساف۔"

"نن..... نہیں ڈاکٹر صاحب میں کمزور دل یا بزدل نہیں ہوں۔ اور اگر میں کمزور دل ہوتا تو اب مزید ایک منٹ بھی یہاں نہ رکتا مگر میں تو کہیں بھی نہیں بھاگ رہا۔ اب آپ جب تک کہو گے ہم یہیں آپ کے ساتھ ہیں۔"

"تو پھر یہ بدروحوں کی کیوں اڑا رہے ہو..... کیا مزدوروں کو خوفزدہ کرنا چاہتے ہو؟"

"ڈاکٹر صاحب آپ خود غور کریں بھلا اس ویرانے میں اتنی رات گئے وہ بھی کسی عورت کا موجود ہونا کچھ خلاف عقل بات نہیں اور..... اور پھر کیا یہ جو چیخ و پکار کی آواز تھی کتنی غیر فطری سی تھی انسان آواز تو لگتی نہیں تھی۔"

"ختم کرو یوساف....." میں نے بے زاری سے کہا۔

"اگر کوئی ہمیں نقصان پہنچانے کی کوشش کرے گا تو ہم اس کا بخوبی بندوبست کر لیں گے۔ ورنہ چاہے سینکڑوں بدروحیں اردگرد منڈلاتی رہیں ہمیں خوفزدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔" میں نے مزدوروں کا ڈر دور کرنے کے لیے کہہ دیا تھا حالانکہ خود میری اپنی ذہنی حالت نہایت دگرگوں تھی۔ پھر ہم سب اپنی اپنی جگہ واپس آ گئے۔ تھوڑی دیر بعد ہی یوساف میرے قریب آ گیا۔

"اب کیا ہوا.....؟"

"ڈاکٹر صاحب میرا خیال ہے کہ کسی قدیم زبانوں کے جاننے والے شخص کو اب چند روز ہمارے درمیان رہنا چاہیے۔ کیونکہ یہ چیخیں دوبارہ پھر سنائی دیں گی۔ اس طرح کم از کم ہمیں یہ تو معلوم ہو جائے گا کہ یہ عورت بانگ بلند پکارتی کیا ہے؟ شاید اس طرح یہ معاملہ سمجھ میں آ جائے۔"

میں نے حیرت سے یوساف کی طرف دیکھا۔

"یوساف! کیا تمہیں سمجھ نہیں آئی؟"

وہ دانت نکال کر بولا۔ "ڈاکٹر صاحب یہ تو قدیم ترین زبان میں کسی کو پکار رہی تھی۔ بھلا کیسے سمجھ آتا۔" اور میں حیران نظروں سے اسے گھورنے لگا چند اور مزدوروں سے تصدیق کی گئی مگر وہ الفاظ کسی کی بھی سمجھ میں نہیں آئے تھے۔ یوساف اپنی جگہ واپس چلا گیا اور میں حیرت سے سوچنے لگا کہ پھر میری سمجھ میں کس طرح آ گئے۔

زبان تو واقعی ہی قدیم تھی۔ قدیم ترین مصری زبان اور جو وہ پکار رہی تھی وہ الفاظ میری سمجھ میں بھی نہ آئے تھے مگر ان کا مفہوم خود بخود میری سمجھ میں آ گیا تھا۔ بھلا یہ کیا کرشمہ تھا؟ میں بہت دیر تک انہی سوچوں میں غلطاں و پیچاں رہا مگر میری عقل میں کچھ نہیں آیا، آخر کو میں سو گیا۔

☼ ☼ ☼

سورج سروں کے عین اوپر معلق تھا۔ اس کے باوجود حدت میں کمی تھی کیونکہ کل سے بدستور سیاہ بادل چاروں طرف یوں منڈلاتے پھر رہے تھے جیسے اردگرد کے علاقے کا سروے کرتے پھر رہے ہوں۔

ہوا بھی بدستور جاری تھی۔ کبھی کوئی بادل کا ٹکڑا سینہ تان کر سورج کے سامنے ڈٹ جاتا تو ایک خوشگوار سایہ پورے علاقے کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا۔ مگر جلد ہی شاہ خاور اسے تھپکی دے کر ایک طرف ہٹا دیتا۔

تمام مزدور کھدائی میں لگے تھے۔ یوساف ان کے درمیان چکراتا پھر رہا تھا اور میں تمبو کے نیچے تنہا بیٹھا تھا۔ میں جانتا تھا یہ کھدائی بہت ہے یہاں سے کچھ برآمد ہونے والا نہیں مزدور بھی عجیب بددلی سے اپنا کام مکمل کر رہے تھے۔ شاید انہیں بھی اندازہ تھا کہ یہ کھدائی فضول ہے۔ تقریباً" سو فٹ تک کھدائی کی جا چکی تھی۔ اگر کچھ نکلنا ہوتا تو اب تک کچھ نہ کچھ تو ضرور نکل چکا ہوتا۔ مگر انہیں مزدوری کرنی تھی۔ انہیں آمدنی سے غرض تھی سو وہ بلاچوں و چرا حکم کی تعمیل میں لگے ہوئے تھے۔

تین دن مزید گزر گئے کوئی غیر معمولی واقعہ رونما نہیں ہوا اور نہ ہی کھدائی کا کوئی نتیجہ سامنے آیا۔ راتیں بھی پرسکون گزر رہی تھیں۔ دوبارہ وہ نسوانی چیخ و پکار بھی سنائی نہ دی تھی۔ مگر چوتھی رات ایک اور عجیب و غریب واقعہ پیش آ گیا۔

رات کھانے کے بعد میں نے یوساف سے کہہ دیا کہ "صبح ہماری واپسی ہو گی لہٰذا مزدوروں سے کہہ دو۔" اور یوساف نے تمام مزدوروں کو آگاہ کر دیا "صبح سے کام ختم اور ہم واپس چلیں گے۔"

رات کا آخری پہر تھا تمام مزدور خواب غفلت کی حالت میں اپنے آپ سے بھی غافل پڑے ہوئے تھے۔ میں بھی گہری نیند میں تھا کہ اپنے کندھے پر ایک سخت گرفت محسوس کرتے ہوئے میری آنکھ کھل گئی۔ عبدل میرا کندھا ہلا رہا تھا اس کے چہرے پر عجیب سے تاثرات تھے۔

"صاحب جی..... صاحب جی اٹھیں۔"

"کوئی خطرہ!" میرے ذہن میں جھماکا ہوا اور میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔

"کیا ہوا..... کیا بات ہے؟"

"صاحب جی ادھر..... ادھر دیکھیں۔" میں نے عبدل کے اشارے کا تعاقب کیا اور چونک پڑا۔ ایک انسانی ہیولہ.....؟

جہاں کھدائی ہو رہی تھی وہاں سے تقریباً" نصف فرلانگ شمال کی جانب ایک انسانی ہیولہ دکھائی دے رہا تھا۔ میں نے اردگرد نگاہ ڈالی میرے اور عبدل کے علاوہ سبھی سو رہے تھے۔ پانچ چھ روز سے مسلسل موسم ابر آلود ہو رہا تھا جس کے باعث چاروں طرف گاڑھا اندھیرا چھایا ہوا تھا مگر اس کے باوجود وہ ہیولہ واضح دکھائی دے رہا تھا، بلکہ یہ بھی معلوم ہو رہا تھا کہ وہ کوئی مرد نہیں بلکہ عورت ہے۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ فاسفورس کے سیال سے وضو کر کے آ رہی ہو۔ وہ ایک مخصوص جگہ دائرے کی صورت چکرا رہی تھی اور اس کے اس انداز سے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ انتہائی اضطراب و کرب میں مبتلا ہو۔

"صاحب جی یہ کون ہے؟"

"جو بھی ہے میری رشتہ دار نہیں ہے۔" عبدل کے اس فضول سوال نے مجھے غصہ دلا دیا تھا۔ میرے جواب پر وہ جھینپ کر خاموش ہو گیا۔

وہ اپنی جگہ رک گئی اس کا کھڑے ہونے کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ اپنے قدموں کی جانب کسی چیز کو بغور دیکھ

رہی ہے اور میں گہری نظروں سے اس کا جائزہ لے رہا تھا۔ اس دوران میرے ذہن میں بڑی شدت سے یہ خیال ابھر رہا تھا کہ مجھے واپس نہیں جانا چاہیے..... واپس نہیں جانا چاہیے۔

پھر یکایک وہ جہاں کھڑی تھی وہیں بیٹھ گئی۔ پھر گھٹنوں کے بل جھک گئی اور یوں زمین تھپتھپانے لگی جیسے دستک دے رہی ہو۔ پھر وہ سجدے کی سی حالت میں چلی گئی اور میری سماعت سے بہت ہلکی ہلکی آواز ٹکرانے لگی اور میں ہمہ تن گوش ہو گیا' وہی خلاف فہم زبان مگر قابل فہم مفہوم! اور وہی نسوانی آواز!

"مریاقس..... ! مریاقس..... مریاقس کیا تم میری آواز سن رہی ہو؟"

"اے عالی مرتبت مریاقس مجھے جواب دو۔"

"صاحب جی کیا یہ نماز پڑھ رہی ہے؟" عبدل کی آواز نے میری توجہ اپنی جانب مبذول کرالی اور آواز کا وہ ہلکا ہلکا ارتعاش میری سماعت سے دور ہو گیا۔

"کیا تم اپنی چونچ کچھ دیر کے لیے بند نہیں رکھ سکتے۔" میں نے غصیلے لہجے میں کہا۔

"میں تو یہ سوچ رہا تھا کہ یہ مشرق کی سمت سجدہ کیوں کر رہی ہے؟"

وہ اٹھ کھڑی ہوئی تھی میں عبدل کی سنی ان سنی کر کے دوبارہ اس کی جانب متوجہ ہو گیا وہ کچھ دیر مضطربانہ انداز میں کھڑی رہی پھر وہ ایک جانب جھکی اور میں نے دیکھا کہ اس نے کدال اٹھالی ہے۔ ایک تیز ہوا کے جھونکے نے ہمارے عقب سے پرواز کی اور ہمیں چھوتا ہوا برق رفتار سے پراسرار عورت کی جانب پرواز کر گیا۔

اس نے کدال سر سے بلند کی اور پہلی ضرب دھرتی کے سینے پر لگائی۔ ضرب اس قدر شدید اور وحشت بھری تھی کہ فضائیں چنگھاڑ اٹھیں۔ چاروں طرف سے آسمانی بجلیاں بادلوں کے سینے فگار کرتی ہوئیں اس کی جانب لپکیں۔ مگر کسی انجانے خوف کے زیر تحت اسی طرح واپس انہیں بلندیوں میں گم ہو گئیں۔ جدھر سے ظاہر ہوئی تھیں اور پوری زمین لرز کر رہ گئی۔

ایک تیز ہوا کے جھونکے نے اس کے کپڑوں کو جھنجھوڑ ڈالا۔ اس کے چہرے پر پڑا ہوا سفید باریک ریشمی نقاب کھل کر ایک جانب جھولنے لگا۔

دوسری ضرب پر تیز ہوا مزید تیز تر ہو گئی' مٹی اڑانے لگی اور اڑا اڑ کر ہم پر برسنے لگی۔ وہ جنونی انداز میں کدال چلا رہی تھی اور کچھ ایسی تیزی دکھا رہی تھی جیسے رات ہی رات میں پاتال کی گہرائیوں میں اتر جانے کا مصمم ارادہ کر چکی ہو۔ رہ رہ کر بجلیاں کڑک رہی تھیں۔ اسے منع کر رہی تھیں' مگر وہ موسم' ماحول کی غضب ناکیوں سے لاپروا کھدائی میں مگن تھی۔ ایک ایک کر کے تمام مزدور بھی بے دار ہوتے جا رہے تھے۔ بادل بھی اپنی پر جلال اور ہیبت ناک آواز میں اسے وارننگ دے رہے تھے' مگر اس پر کسی چیز کا کوئی اثر نہ تھا۔ میں نے عبدل کے بیلٹ سے ٹارچ کھینچی پھر اس کے ہاتھ سے رائفل جھپٹی اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

"صاحب جی..... صاحب جی..... کہاں جا رہے ہیں آپ؟"

"یہیں رکو..... خبردار میرے پیچھے کوئی نہ آئے۔"

اور پھر میں تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا اس شوریدہ سر عورت کی جانب بڑھنے لگا۔ عبدل عقب سے مجھے آوازیں دے رہا تھا' مگر میں نے اپنی رفتار مزید تیز کر دی۔ بات وہی تھی یہ تجسس کم بخت چیز ہی بڑی نامراد ہے.....!

میں لحہ بہ لحہ اس کے قریب تر ہوتا گیا اور پھر اچانک وہ ٹھٹک کر رک گئی۔ وارننگ دینے کے بعد اب بادل نے شاید حملے کی سوچی تھی جو ہلکی ہلکی بارش شروع ہو گئی تھی۔ اس نے سر اٹھا کر آسمان کی جانب دیکھا چند لمحے قہر بار عالم میں دیکھتی رہی پھر میری جانب دیکھنے لگی۔ میں مزید اس کے قریب پہنچ چکا تھا پھر جب وہ میری جانب گھومی تو گویا دست حیرت نے میرے پورے وجود کو اپنی قوی گرفت میں جکڑ لیا۔ میں جہاں تھا وہیں ٹھٹک کر رک گیا اور شدید حیرت سے پھٹی پھٹی آنکھوں سے یک ٹک اس کے دہکتے ہوئے چہرے کو دیکھے گیا۔

وہ سراپا..... وہ صورت میرے لیے اجنبی تو نہ تھی۔ اسے پہچانتے ہی جیسے میری سانس میرے حلق میں اٹک کر رہ گئی۔ پھر اچانک ہی وہ پلٹی کدال اس نے کندھے پر رکھی اور ڈری ہوئی ہرنی کے مصداق چوکڑیاں بھرتی ہوئی مخالف سمت دوڑ پڑی۔

"اے..... اے..... اے سنو۔"

اس کے دوڑتے ہی اچانک بارش میں بھی تیزی آ گئی۔ میں نے ٹارچ روشن کر لی۔ میرے دائیں ہاتھ میں لوڈڈ رائفل تھی اور بائیں میں ٹارچ اور میں اندھا دھند اس پری جمال دوشیزہ کے پیچھے دوڑ رہا تھا۔ بجلی چمکتی تو دور دور تک روشنی پھیل جاتی۔ اس کا رخ منہدم محل کے کھنڈرات کی جانب تھا' جدھر دن کی روشنی میں بھی کوئی جانا پسند نہیں کرتا تھا۔ رہ رہ کر بادل گرج رہے تھے' بارش مزید تیز ہو گئی تھی۔ گہری تاریکی' طوفانی بارش کی مخصوص آواز' بادلوں کی دل دہلا دینے والی گرج اور بجلی کی اعصاب چٹخا دینے والی چنگھاڑیں! ان سب چیزوں نے مل کر ماحول کو بڑی ہی پرہیبت اور دہشت ناک صورت دے دی تھی۔ مگر میں خوف زدہ ہو کر رکا نہیں بلکہ اس کے تعاقب میں دوڑتا رہا۔ مگر وہ نازک اندام سی دوشیزہ لحہ بہ لحہ مجھ سے دور ہوتی جا رہی تھی۔ میں مسلسل اسے رک جانے کے لیے کہہ رہا تھا مگر میری آوازوں کا اس پر کوئی اثر نہ ہو رہا تھا۔

اور تو اور وہ کھنڈرات جو دیکھنے میں بالکل نزدیک ہی دکھائی دیتے تھے وہ آنے کا نام ہی نہیں لے رہے تھے۔ ہم کافی دیر تک دوڑتے رہے میں اس سے کافی پیچھے رہ گیا اور وہ کھنڈرات کی حدود میں داخل ہو گئی۔ بجلی پوری قوت سے چمکی ہر طرف تیز سفید روشنی پھیل گئی اور اس تیز روشنی میں ہی میں نے اسے ایک دیوار کے شگاف میں غائب ہوتے دیکھا تھا۔

میری سانس بری طرح پھول چکی تھی اور میرا سینہ اس قدر شدت سے پھول پچک رہا تھا جیسے ایک زوردار دھماکے سے چیتھڑوں میں بدل جائے گا۔ میں لڑکھڑاتے قدموں سے اس دیوار کے ساتھ جا لگا۔ دیوار کا سہارا لے کر میں نے چند لمحے سانس درست کی پھر میں بھی اس شگاف کے ذریعے اندر داخل ہو گیا۔ چند قدم کے فاصلے پر اصل عمارت کے آثار دکھائی دے رہے تھے۔ غالباً" جس جگہ میں کھڑا تھا کسی وقت یہ اس محل کا عقبی حصہ رہا ہو گا جبکہ اب تو اس کی کوئی شناخت ہی نہ رہ گئی تھی۔ وہ ان کھنڈرات میں کہیں گم ہو گئی تھی اور اب موسم کی غضب ناکیوں میں بھی کمی واقع ہو گئی تھی' بارش بھی تقریباً" تھم چکی تھی۔

میں ٹارچ کی زرد بیمار روشنی میں آگے بڑھنے لگا ساتھ ہی بلند آواز میں اسے پکار رہا تھا۔

"دیکھیے گھبرائیے مت میں آپ سے چند باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ ہو سکتا ہے میں آپ کے کام آسکوں..... آپ کو میری مدد کی ضرورت ہے۔" مگر "صدا بصحرا" ہنوز خاموشی رہی تو میں بھی خاموشی سے آگے بڑھنے لگا۔

یقیناً" کسی وقت یہ محل بہت عالی شان اور خوب صورت رہا ہو گا' مگر اس وقت تو اس کے در و دیوار خود آپ اپنی حالت پر نوحہ کناں تھے' دیواریں منہدم' چھتیں غائب' فرش میں دراڑیں' جگہ جگہ پتھروں' سنگ مرمر کی اینٹوں اور ملبے کے ڈھیر' دیواروں میں جگہ جگہ شگاف' راہداریوں سے چھتیں آگری تھیں۔ مجھے تو یوں لگ رہا تھا کہ اگر میں نے زور سے سانس بھی لی تو دیواریں میرے اوپر آگریں گی۔ پاؤں زور سے کہیں پڑ گیا تو پاؤں کی آہٹ کی دھمک سے دیواریں جھک کر مجھ سمیت میرے پاؤں بھی چوم لیں گی اور میں چرمر ہو کر رہ جاؤں گا۔

علاوہ ازیں ایک بے نام سا احساس میرے لاشعور کے اندھیروں میں کسمسا رہا تھا۔ میں ایک عجیب سی بے چینی محسوس کر رہا تھا۔ میں نے اپنے ذہن کو کریدا تو چونک پڑا یہ کھنڈرات' یہ جگہ میں پہلی بار تو نہ دیکھ رہا تھا..... یہ تو' یہ تو..... میں تو پہلے بھی یہاں آچکا تھا..... یہ تو..... عدلان پاشا کا محل تھا۔

وہی محل جہاں کہ تھوڑا عرصہ پہلے میں عدلان پاشا کے پہلو بہ پہلو بیٹھ کر ایک دعوت کے مزے اڑا چکا تھا

......اور...... اور شاید وہ دوشیزہ بھی اسی لیے دوڑ کر یہاں آئی تھی کہ وہ اپنے شوہر کے ساتھ یہیں اسی محل میں تو قیام پذیر تھی اور اسے پہچاننے میں بھی مجھ سے کوئی غلطی نہ ہوئی تھی، وہ وہی کمسن دوشیزہ اناآطو تھی جس سے کہ ہسپتال میں میری ایک ملاقات ہو چکی تھی۔ مگر بقول یوساف کے یہ کھنڈرات جانے کب سے یونہی کھنڈرات تھے۔

"یاالٰہی یہ کیا گورکھ دھندہ ہے؟" میں بری طرح الجھ کر رہ گیا تھا اور حقیقتاً "اب مجھے خوف محسوس ہونے لگا تھا۔

میں جہاں کھڑا تھا ایک بغیر چھت اور دروازے کا کمرہ تھا۔ جس کی عقبی دیوار میں دو بڑے بڑے شگاف پڑے ہوئے تھے، بغلی دیوار تھی ہی نہیں۔ ٹارچ میرے ہاتھ میں تھی اور رائفل میرے کندھے کے ساتھ جھول رہی تھی۔ اب میں جلد سے جلد اس شیطان نگری سے نکل جانا چاہتا تھا کہ اچانک ایک تیز پھڑپھڑاہٹ کی آواز پر میں اچھل پڑا۔ میں نے ٹارچ کی روشنی چاروں طرف پھینکی مگر کچھ دکھائی نہ دیا۔

اور پھر بالکل اچانک ہی ایک بھاری اور گونج دار آواز ابھری۔

"ڈاکٹر شکیل ظفر...... شکیل ظفر...... شکیل ظفر۔"

"کک...... کک...... کون؟"

"تم فوراً" واپس چلے جاؤ ڈاکٹر...... ڈاکٹر...... ڈاکٹر!" میں نے فوراً" آواز پہچان لی۔ "عدلان پاشا! یہ تم ہو۔"

"تم نے ٹھیک پہچانا ڈاکٹر...... ڈاکٹر...... ڈاکٹر! مگر میرا اصل نام عدلان پاشا نہیں بلکہ دتمیر اطوس ہے۔"

"دتمیر اطوس......" میں زیر لب بڑبڑایا۔

"چلو دتمیر اطوس ہی سہی مگر میرے سامنے آؤ کہاں چھپے ہوئے ہو...... مجھے بتاؤ یہ سب کیا طلسم ہے؟"

"ڈاکٹر میں موت کی تاریکیوں میں چھپا ہوں، مجھ سے ملاقات کے لیے تمہیں بھی تاریکیوں میں آنا پڑے گا۔ بہتر یہی ہے کہ فوراً" واپس لوٹ جاؤ۔ تمہاری زندگی بہت اہمیت کی حامل ہے۔"

"آں...... ہاں ہاں!...... میں جا رہا ہوں...... مم...... میں جا رہا ہوں۔"

یہاں کا ماحول میرے اعصاب پر کچھ ایسا اثر انداز ہوا کہ میں حواس باختہ ہو کر بھاگ نکلا۔ باہر کا موسم ایک دم بدل چکا تھا۔ چاند نکلا ہوا تھا اور آسمان کی آغوش میں لاکھوں کروڑوں ستارے مسکرا رہے تھے، کھنڈرات سے کچھ دور جاتے ہی مجھے کچھ حوصلہ ہوا کیونکہ تقریباً" پندرہ بیس مزدور، یوساف اور عبدل میری تلاش میں ادھر ہی آ رہے تھے۔

"ڈاکٹر صاحب! سب خیریت تو ہے نا؟" یوساف نے فوراً" آگے بڑھ کر کہا۔ میں کافی حد تک اپنے بکھرے ہوئے حواس پر قابو پا چکا تھا۔

"ہاں...... نکل گئی نامعلوم کہاں گم ہو گئی۔" میں نے گمبھیر لہجے میں کہا اور یوساف مجھے عجیب سی نظروں سے گھورتے ہوئے خاموش رہا۔ اب اصل حقیقت کیا تھی یہ بتا کر میں اپنا مذاق اڑانا تو پسند نہیں کر سکتا تھا۔ کیونکہ ظاہر ہے کسی نے میری بات کا یقین ہی نہیں کرنا تھا۔ واپس پہنچتے پہنچتے صبح کی سفیدی نمودار ہونے لگی اور صبح کا موسم بڑا دلکش ہو گیا تھا۔ کچھ بارش کا اثر تھا کچھ نسیم صبح۔ صاف اور دھلی ہوا۔

واپس پہنچتے ہی میں نے عبدل کو کھانا لانے کے لیے بھیج دیا۔ میں نے اس جگہ کا جائزہ بھی لیا جہاں رات وہ کھدائی کرتی رہی تھی وہاں ایک چھوٹا سا گڑھا نظر آ رہا تھا۔ جو بارش کے پانی سے لبالب بھرا ہوا تھا۔

میرا ذہن بری طرح الجھ کر رہ گیا تھا۔ اس تمام کہانی کا کوئی سرا ہاتھ نہ آ رہا تھا، کوئی کڑی بھی آپس میں نہ ملتی تھی اور میں جتنا اس کو سلجھانے کی کوشش کر رہا تھا یہ سارا معاملہ اتنا ہی الجھ رہا تھا۔ میرا حال شاعر کے اس شعر کے جیسا ہو رہا تھا۔

فلسفی کو بحث کے اندر خدا ملتا نہیں
ڈور کو سلجھا رہا ہے اور سرا ملتا نہیں

یہ بات بھی بری طرح ذہن میں کھٹک رہی تھی کہ وہ یہاں کھدائی کیوں کر رہی تھی؟ اور یہاں بیٹھ کر کسے پکار رہی تھی؟ آخر کافی سوچ بچار کے بعد میں نے ایک فیصلہ کیا اور یوساف کو اس کا حکم دے دیا۔ پہلے تو اس نے عجیب سی نظروں سے میری جانب دیکھا پھر میرے کہنے پر عمل کرانے لگا۔

یہاں سے کھدائی بند کر دی گئی۔ تمام اوزار، اور ضرورت کا سامان اور تمام مشینری نصف فرلانگ شمال کی جانب منتقل کر دی گئی اور جس مقام پر رات وہ کھدائی کر رہی تھی ٹھیک اس مقام پر کھدائی شروع کر دی گئی۔ تھوڑے فاصلے پر ہی خیمے لگا دیے گئے کھانا وغیرہ کھا کر عبدل تو جا سویا اور تمام مزدور کھدائی میں مصروف ہو گئے۔

دن رات یوں گزرنے لگے کہ پتا ہی نہ چلا۔ نہ کوئی پراسرار غیر معمولی واقعہ پیش آیا۔ جدید ترین مشینری کی مدد سے کھدائی اور مسلسل ایک محدود مقام پر تقریباً" گیارہ دن کی محنت سے مزدور زمین سے ستر فٹ کی گہرائی تک جا اترے۔

نہ جانے مجھے ایک یقین سا کیوں تھا کہ یہاں کی زمین کے شکم سے لازمی طور پر کچھ نہ کچھ برآمد ضرور ہو گا۔

وہ ایک جلتی ہوئی دوپہر تھی۔ زمین بھی تپ رہی تھی ہوا بالکل بند تھی۔ تمام مزدور اس قہربار عالم میں بھی کھدائی میں مگن تھے۔ یوساف میرے قریب ہی تنبو میں بیٹھا تھا، کہنے لگا۔

"ڈاکٹر صاحب! کھدائی کا ابھی تک کوئی نتیجہ نہیں نکلا مگر جانے کیوں دل کہتا ہے یہاں سے یقیناً" کوئی حوصلہ افزا نتیجہ ہی نکلے گا۔"

"اس کی کیا کوئی خاص وجہ؟"

"ڈاکٹر صاحب جہاں ہم پہلے کھدائی کر رہے تھے، وہاں بہت عجیب عجیب واقعات ہوئے آپ کے آنے کے بعد بھی۔ مگر آپ کے آنے سے پہلے تو انتہا ہو گئی تھی۔ رات کو اکثر ہمیں آواز آتی کوئی عورت کہتی تھی کہ تم یہ غلط کر رہے ہو، یہ کھدائی عبث ہے تمہاری کوشش رائیگاں جائے گی۔ اور جب ہم نے کوئی نوٹس نہ لیا، تو عجیب و غریب واقعات رونما ہونے شروع ہو گئے۔ یہاں تک کہ ایکیلاس نے بے خود ہو کر اپنے بھائی کو جان سے مار ڈالنے کی کوشش کی۔

اس وقت تو ان لفظوں کا مفہوم میں نہ سمجھ پاتا تھا مگر اب کچھ کچھ سمجھ میں آتا ہے۔"

"مثلاً"......؟"

"مثلاً" یہ کہ ان الفاظ کا مطلب یہ تھا کہ ہم غلط جگہ کھدائی کر رہے ہیں اس لیے ہماری کوشش رائیگاں جائے گی۔ ہماری یہ کھدائی بے کار ہے، اصل میں یہ ہماری راہنمائی کی جا رہی تھی مگر ہم سمجھ ہی نہ پائے اور دیکھ لیں جس روز سے ہم نے یہاں کھدائی شروع کی کتنا سکون ہے، کوئی بھی پریشان کن واقعہ پیش نہیں آیا۔"

اس سے پہلے کہ میں اسے کوئی جواب دیتا پسینے اور مٹی میں ملفوف ایکیلاس ہماری جانب دوڑتا ہوا آیا۔

"صاحب جی!...... صاحب جی اور...... او...... ادھر کچھ ہے صاحب جی!"

اور ہم دونوں تڑپ کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ پھر ہم تیزی سے اس کے ساتھ چلتے ہوئے اس جگہ پہنچ گئے جہاں دائرے کی صورت میں تقریباً" پچاس فٹ قطر کا، پچھتر فٹ گہرا کنواں کھدا ہوا تھا، اس کنویں میں پینتالیس مزدور موجود تھے گہرائی اس قدر تھی کہ عموماً" سارا دن گہرائی تک سورج کی دھوپ نہ پہنچ پاتی تھی۔ اس وقت چونکہ سورج بالکل سر پر تھا اس لیے کنویں میں دھوپ سیدھی اتر رہی تھی۔ اس کے باوجود آدھے کنویں میں چھاؤں تھی۔

"کیا بات ہے...... کیا کچھ ہے یہاں؟" یوساف کنویں میں جھانکتے ہوئے باآواز بلند بولا۔

"صاحب نیچے پتھریلی زمین آ گئی ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے نیچے پختہ فرش یا کوئی بڑی چٹان ہو۔"

"ایسا کرو، دستی، کر کے نرم مٹی کی تہہ اوپر سے ہٹا لو اور اس پتھریلی سطح کو ابھار لو۔" یوساف کی ہدایت کے مطابق تمام مزدور حرکت میں آ گئے اور ہم پلٹ کر واپس خیمے کی جانب آ گئے۔ ایکیلاس کو ہم نے

وہیں کھڑا رہنے کے لیے کہہ دیا تھا۔ ایک ہیجان خیز تجسس رگ و پے میں کھلبلی مچائے ہوئے تھا کہ جانے نیچے کیا پراسرار چیز نکلے گی۔ تقریباً" دو گھنٹے کے بعد ایکیلاس پلٹ کر ہماری جانب آنے لگا تو ہم خود ہی اٹھ کر کھڑے ہو گئے، ہیٹ ہم نے سروں پر جمائے اور آگے بڑھ گئے۔

"صاحب جی ...... پتھر سا ہے۔" ہمارے قریب پہنچتے ہی ایکیلاس بولا۔

ہم نے آگے بڑھ کر کنویں میں جھانکا۔ کنویں کے عین وسط میں ایک سیاہ گنبد نما گول چٹان نظر آرہی تھی جس کی اونچائی دس فٹ اور حجم میں بھی وہ تقریباً" اتنی ہی رہی ہو گی۔ ہم نے سوالیہ نظروں سے ایک دوسرے کی جانب دیکھا تو نیچے سے ایک مزدور با آواز بلند بولا۔

"صاحب! یہ تو ٹھوس چٹان ہے! یوں لگتا ہے کہ جیسے یہاں ایک وسیع پہاڑی سلسلہ نیچے ہی نیچے پھیلا ہوا ہو؟" اور ہمارے چہرے اتر گئے۔

"ساری محنت لاحاصل ...... کھودا کنواں ...... نکلے پہاڑ۔" یوساف نے بددلی سے کہا۔

"ایسا کرو اس چٹان کے گرداگرد خندق کھود دو اور اسے ابھارتے رہو۔" اور پھر ہم واپس تنبو کے نیچے آ بیٹھے۔

طبیعت پر سوگواریت سی طاری ہو گئی تھی مگر یہ سوگواریت ہماری حماقت تھی۔ اس کا اندازہ ہمیں اس وقت ہوا جب تقریباً" تین گھنٹے بعد ایکیلاس دوبارہ آیا۔

"کیا بات ہے۔ کیا ایک چٹان اور نمودار ہو گئی؟" یوساف نے کہا۔

"نہیں صاحب جی! ...... چٹان تو وہی ہے مگر ...... اس پر بکرے بیٹھے ہوئے ہیں۔"

"ایں ...... بکرے ...... زمین کے نیچے کہاں سے آ گئے؟"

"نن ...... نن ...... نہیں صاحب جی وہ بکرے نہیں ...... بکروں کی تصویریں ہیں چٹان پر۔"

اور میں چونک پڑا۔ میں نے یوساف کی طرف دیکھا اور پھر ہم دونوں ہی تیزی سے کنویں کی جانب بڑھ گئے

چٹان اب بہت واضح ہو چکی تھی۔ وہ اونچائی اور حجم میں اب تقریباً" بیس فٹ ہو چکی تھی۔ کچھ مزدور مزید کھدائی کر رہے تھے اور کچھ آہنی "برشز" کے ذریعے باحتیاط چٹان پر جمی ہوئی نمدیدہ مٹی اتار رہے تھے۔ ہم "کنکریٹ لفٹ" کے ذریعے کنویں میں اتر گئے۔ اب کنویں میں مکمل چھاؤں تھی۔ مگر کنویں میں وسیع تر وسعت کے باعث اندھیرا بالکل نہ تھا۔ ہم چٹان کے بالکل سامنے جا پہنچے۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے دفن کرنے کی غرض سے یہ سیاہ فام چٹان از خود اتار کر اس کنویں کے وسط میں سجا دی گئی ہو۔ اس چٹان کا جو حصہ اب زمین سے برآمد ہونے لگا تھا وہ اوپری حصہ سے قطعی مختلف تھا۔ اس چٹان کے پتھریلے وجود میں بھی نمایاں فرق نظر آرہا تھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے نچلے حصے کے اوپر ایک قدرتی چٹان رکھ کر اسے چھپانے کی کوشش کی گئی ہو۔ کھدائی کے بعد نیچے والی چٹان کا جو حصہ اب واضح ہوا تھا اس پر واقعی کچھ واضح شکلیں بنی ہوئی نظر آرہی تھیں۔ میں گھٹنوں کے بل بیٹھ کر انہیں بغور دیکھنے لگا، یوساف بھی میرے قریب ہی تھا۔

اس چٹان کو تراش کر مختلف النوع جانوروں کی تصویریں بنائی گئی تھیں۔ جن میں پرندے بھی شامل تھے اور ان میں زیادہ تعداد الوؤں، کوؤں اور چغدوں کی تھی۔ باقی کچھ ایسے پرندے تھے جو آج تک کم از کم میری نظروں سے تو نہیں گزرے تھے۔ یہ عجیب و غریب سی تصویریں اس چٹان کے چاروں اطراف کھدی ہوئی تھیں۔ ان تصویروں اور نقش و نگار کو دیکھ کر ذہن میں قدیم مصری سنگ تراشوں اور مصوروں کا خیال اجاگر ہوتا تھا۔

"ڈاکٹر صاحب ...... یہ تو ...... یہ تو کوئی اہرام معلوم ہوتا ہے۔" فرط انبساط اور حیرت سے یوساف کی آواز کپکپا رہی تھی۔ میں نے چونک کر اس کی جانب دیکھا

اس کے چہرے کے خدوخال نہایت سنسنی خیز کیفیت کا شکار تھے اور وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے نچلی چٹان کو دیکھ رہا تھا۔

میں نے حیران کن لہجے میں کہا۔ "یوساف! کوئی عقل کی بات کرو بھلا یہاں اہرام کہاں سے آگیا؟"

"ڈاکٹر صاحب ...... ذرا غور تو کریں اس نچلی چٹان کو تو دیکھیں۔ میری ساری زندگی ویرانوں، پہاڑوں میں کھدائی کرتے کرواتے گزر گئی ہے۔ میرا تجربہ ہے ڈاکٹر صاحب! یہ اوپر کی اور نچلی چٹان بالکل مختلف ہیں ...... اور ...... اور اگر میں غلط فہمی کا شکار نہیں ...... میرا دماغ صحیح کام کر رہا ہے تو میں دعوے سے کہتا ہوں کہ یہ نچلی چٹان وہی ہے، یہ وہی پتھر ہیں جو ہزاروں سال قبل اہراموں کی تعمیر میں استعمال کیے گئے ہیں۔"

"تم یہ بات اتنے دعوے سے کیسے کہہ سکتے ہو؟"

"ڈاکٹر صاحب میری ساری زندگی انہی پہاڑوں، پتھروں میں بھٹکتے ہوئے گزری ہے اور پھر یہ تصویریں دیکھیں۔ یہ بالکل ہو بہو ویسی ہی ہیں جیسی کہ اہراموں پر اور فراعنہ کے تابوتوں پر ان کے عہد میں کندہ کی جاتی تھیں۔ اسے تصویری زبان کہتے ہیں اور اصل میں یہ تصویریں جو ہمیں بے مقصد اور فضول نظر آرہی ہیں تا ان میں بھی ایک تاریخ پوشیدہ ہے! اب اگر میں یا آپ اس کو سمجھ سکتے تو ہمیں اس کی یہاں موجودگی کی وجہ بھی معلوم ہو جاتی اور یہ بھی معلوم ہو جاتا کہ یہ کس فرعون کے زمانے میں تعمیر کیا گیا تھا۔"

میری نظریں نچلی چٹان پر جمی ہوئی تھیں اور میں لاشعوری طور پر دانتوں سے اپنے نچلے ہونٹ کو چبا رہا تھا" مجھے یقین نہیں آرہا تھا کہ یہاں اہرام ......!

میں عجیب سے شش و پنج میں مبتلا تھا کہ یوساف مزدوروں سے مخاطب ہوا۔

"ایسا کرو تم کھدائی جاری رکھو۔" اور مزدور دوبارہ کھدائی میں مصروف ہو گئے۔ مزید ایک دن کی کھدائی میں تقریباً" تمام چٹان نکال لی گئی اور اب یہ حقیقت جھٹلائی نہیں جا سکتی تھی کہ یہ واقعی ایک چھوٹا سا اہرام تھا۔ وہی پتھر وہی اہراموں کا مخصوص انداز تعمیر مگر یہ بات ناقابل یقین حد تک حیران کن تھی کہ اس علاقے میں اہرام ......

اب کنویں میں کھڑے ہونے کے لیے اہرام کے اطراف بہ اطراف کچی دیواروں کے ساتھ ساتھ تقریباً" چھ فٹ کی چوڑائی میں جگہ بچی تھی باقی کنویں میں یہ اہرام پھیل چکا تھا۔ تمام مزدور بھی شدید حیرت زدگی کے عالم میں اہرام کے گرد طواف کر کر کے اس کا جائزہ لے رہے تھے۔

ہم چاروں طرف سے بغور باریک بینی سے اس کا جائزہ لے چکے تھے مگر ہماری سمجھ میں یہ بات نہ آرہی تھی کہ اس کا دروازہ کس جانب ہے اور کس طرح اس کے اندر جایا جا سکتا ہے اور تجسس بری طرح اکسا رہا تھا کہ جلد از جلد اس کے اندر اتر کر اندرونی ماحول کا جائزہ لیا جائے۔ یہ اہرام کی مثلث عمارت تقریباً" 44 فٹ مربع کے حجم میں تھی اور چاروں طرف سے نہایت عمدہ نقش و نگار سے مزین تھی۔

یوساف پیشانی مسلتے ہوئے نہایت فکرمندی کے انداز میں بولا۔

"ڈاکٹر صاحب! اس اہرام کا دروازہ ڈھونڈنا تقریباً" ناممکن ہے اگر اس تصویری زبان پر ہمیں عبور ہوتا ہم اسے سمجھ سکتے تو یقیناً" پھر ہمیں کسی پریشانی کا سامنا نہ ہوتا اور ہم نہایت آسانی سے دروازہ ڈھونڈ بھی لیتے اور اسے کھولنے میں کامیاب بھی ہو جاتے۔ مگر یوں دروازہ ڈھونڈنا ممکن نہیں۔"

"تو پھر یوساف! اب کیا کیا جائے؟"

"اب کسی قدیم زبانوں پر تحقیقات کرنے والے اور قدیم مصری زبانوں کو پڑھنے سمجھنے والے کو ڈھونڈنا ہو گا۔ جو تاریخی زبانوں پر مکمل عبور رکھتا ہو؟"

اور میرے ذہن میں فوراً" ایک نام گونجا۔ پروفیسر فاضل بصاری!

پروفیسر فاضل بصاری کو میں ذاتی طور پر جانتا تھا۔ وہ "جامعتہ الازھر" میں تاریخ مصر کے پروفیسر تھے اور میری ان سے بڑی گہری واقفیت تھی۔

وہ علم فلولوجی (تحقیق زبان کا علم) پر بھی مکمل عبور

رکھتے تھے۔ یہ مسئلہ تو حل ہوتا نظر آرہا تھا۔ میری خاطر وہ یقیناً" اس دریافت شدہ اہرام کا کسی سے ذکر نہ کرتے اور میری ہر ممکن مدد بھی کرتے۔ مگر ان سے ملاقات کے لیے مجھے قاہرہ جانا پڑتا اور میں اہرام سے ایک منٹ کے لیے بھی دور نہیں ہونا چاہتا تھا۔

ہم تقریباً" پچاس آدمی یہاں موجود تھے مگر اس کے باوجود اکیلے پن کا احساس ہوتا تھا۔ اہراموں اور فراعنہ کا نام سنتے ہی ذہن میں لاتعداد پراسرار واقعات' ظلم و ستم اور عجیب عجیب کہانیاں چکرانے لگتی ہیں اور اس وقت تو ہمارے سامنے ایک بلند و بالا اور وسیع الجثہ اہرام بڑی شان و شوکت سے خاموش سینہ تانے اور سر اٹھائے ایستادہ تھا۔ جس کے سامنے ہم سب ہی خود کو بونے' ناسمجھ بچے اور کمزور محسوس کر رہے تھے کہ یہ اہرام صدیوں سے یونہی آغوش لحد میں خاموش و ساکت کھڑا تھا۔ اس کی عمر صدیوں پر محیط تھی اور یہ اپنے تاریک اور وسیع سینے میں صدیوں سے جانے کیسی کیسی کربناک و پراسرار کہانیاں چھپائے ہوئے تھا اور جانے اس کے سینے میں ایسا کیا پوشیدہ تھا کہ جسے انسانوں کی نظروں سے بچائے رکھنے کی خاطر یہ تاریک زمین کی گہرائیوں میں آچھپا تھا۔ مگر اب شاید صدیاں گزر جانے کے باعث اس پر بڑھاپا غالب آچکا تھا۔ جو چند انسان تعاقب کرتے کرتے اسے کھوجتے ہوئے اس کے سر پر آپہنچے۔

مگر اب بھی یہ اہرام جو کئی ہزار سال کی عمر کو پہنچ چکا تھا۔ جسمانی طور پر نہایت مضبوط دکھائی دے رہا تھا اور بڑے طمطراق سے ہمارے مقابل سینہ تانے کھڑا تھا۔ جیسے خاموش زبان سے کہہ رہا ہو کہ مجھے اتنی آسانی سے زیر کر کے میرے سینے میں مدفون رازوں کو نہ پاسکو گے ناسمجھ بچو! کہ میں صدیوں سے انہیں اپنی محافظت میں لیے ہوئے ہوں۔

ہمیں اپنے اردگرد عجیب پرہول ویرانہ اور سناٹا معلوم ہو رہا تھا۔ سبھی افراد ایک نامعلوم سی سنسنی کا شکار نظر آرہے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے کچھ نادیدہ وجود اس اہرام کے پتھریلے وجود سے نکل کر ہمارے گرد پھیلتے جا رہے ہوں...... جیسے سینکڑوں نگاہیں ہمیں گھور رہی ہوں۔ میں نے یوساف کو مخاطب کیا تو میری آواز نے سب کو چونکا دیا۔

"یوساف! ذرا کوشش دوبارہ کرو۔ اہراموں کی تعمیر کو سامنے رکھتے ہوئے پھر سے دروازہ ڈھونڈنے کی کوشش کرو' شاید کہ کچھ کامیابی ہو جائے۔"

اور یوساف دوبارہ آگے بڑھ کر اہرام کا جائزہ لینے لگا۔ وہ نہایت غور سے اس پر کھدی ہوئی جانوروں کی تصویروں کا جائزہ لے رہا تھا۔ کافی دیر تک وہ یہ تصویریں دیکھتا رہا اور پھر مختلف تصویروں کو زور دے دے کر دبانے کی کوشش کرنے لگا۔ کافی دیر گزر گئی مگر کچھ حاصل نہ ہوا۔ وہ آستین سے پیشانی کا پسینہ پونچھتے ہوئے دوسرا ہاتھ کمر پر رکھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کی نظریں اب بھی تصویروں پر جمی ہوئی تھیں اور وہ پوری طرح ان میں مگن تھا۔ پھر وہ سامنے کی جانب چل پڑا سیدھا چلتا گیا اور پھر اہرام کے آخری کونے سے اہرام کی دوسری جانب گھوم کر نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ غالباً" وہ چاروں اطراف کا جائزہ لینا چاہتا تھا۔ ایکیلاس میرے قریب ہی کھڑا تھا۔ تمام مزدور بھی آج حیرت انگیز طور پر خاموش خاموش تھے' شاید اہرام کی ہیبت ان کے اعصاب پر اثر انداز تھی۔

میں نے سر اٹھا کر اوپر کی جانب دیکھا بلندی پر تیز روشنی کی چمک تھی اور اوپر آسمان کا معمولی سا ٹکڑا دکھائی دے رہا تھا۔

اچانک کنویں میں ایسی ہیبت ناک گونج بلند ہوئی کہ جیسے آسمان پھٹ گیا ہو' سورج شق ہو گیا ہو یا پھر دھرتی میں شرق یا غرب دراڑ پڑ گئی ہو۔ گونج سے واضح طور پر زمین لرز اٹھی تھی۔ کتنے ہی مزدور اس اچانک شور سے لرز اٹھے' میں خود ہڑبڑا گیا۔

عجیب دل دہلا دینے والی سماعت فگار گڑگڑاہٹ تھی جیسے کوئی بہت بڑی چٹان کسی بلند و بالا سنگلاخ پہاڑ کی چوٹی سے نیچے کی جانب لڑھکتی چلی آرہی ہو۔ پھر اچانک یہ گڑگڑاہٹ فضا میں منجمد ہو گئی۔ خاموشی..... سناٹا..... ولدوز سکوت.....!

سمت کا تعین ہوا تو میں چونک پڑا' یہ آواز تو اسی جانب سے بلند ہوئی تھی جدھر کچھ دیر پہلے یوساف گیا تھا۔

پھر یکبارگی وہی گڑگڑاہٹ بشمول ایک انسانی چیخ دوبارہ بلند ہوئی۔ چیخ یقیناً" یوساف کی تھی۔ مگر زمین کو لرزا دینے والی گڑگڑاہٹ میں دب کر رہ گئی تھی۔

اچانک جیسے میرے حواس لوٹ آئے اور میں بے اختیار یوساف کو پکارتے ہوئے دوڑ پڑا اور میرے حرکت کرتے ہی جیسے تمام مزدور ہوش و خرد کی وادی میں لوٹ آئے اور پھر وہ سب بھی میرے عقب میں دوڑ پڑے۔

میں کونے کے قریب تر ہوا جا رہا تھا۔ صاف محسوس ہو رہا تھا کہ اہرام کی نکڑ مڑتے ہی..... نکڑ کے دائیں جانب سے یہ شور بلند ہو رہا ہے۔ میں گڑگڑاہٹ کے مقام کے بالکل قریب پہنچ چکا تھا..... موڑ چند قدم کے فاصلے پر تھا..... گڑگڑاہٹ کی آواز دائیں جانب سے بلند ہو رہی تھی۔ مجھ سے چند قدم کے فاصلے پر..... چار قدم!..... تین قدم!..... دو قدم! ..... ایک قدم اور یکایک گڑگڑاہٹ تھم گئی!..... میں سامنے کی کچی دیوار سے ہاتھ ٹیکتے ہوئے دائیں جانب گھوم آیا۔ مگر یہاں تو کچھ بھی نہ تھا' کوئی ایسی چیز نہ تھی جس سے کہ یہ اندازہ کیا جاتا کہ گڑگڑاہٹ کا مرکز یہی تھی..... اور نہ ہی کوئی ایسی غیر معمولی تبدیلی نظر آرہی تھی جو کہ قابل توجہ ہوتی..... سب نارمل تھا۔ اب البتہ 44 فٹ دور اہرام کے دوسرے کونے تک یوساف دکھائی نہ دے رہا تھا۔ غالباً" وہ دیوار کا جائزہ لیتے ہوئے دوسری سمت چلا گیا تھا۔ تمام مزدور حیرت بھری نظروں سے کبھی اہرام کی دیوار دیکھتے کبھی بلندی کی جانب اور کبھی میری جانب۔ ان کی تو کیا خود میری سمجھ سے باہر تھا کہ گڑگڑاہٹ کا یہ شور کیسا تھا؟

ایکیلاس آگے بڑھا۔ "صاحب یہ آواز کیسی تھی۔"

میں بھلا کیا بتاتا۔ میں نے ہونٹ کاٹتے ہوئے کہا۔ "آؤ یوساف کو اس جانب دیکھیں۔"

پھر میں دوڑنے کے سے انداز میں آگے بڑھ گیا اور اس کچی دیوار' زمین کی راہداری میں وہ سب میرے پیچھے پیچھے آنے لگے۔

ہم سب اہرام کے گرد گھوم کر دوسری جانب آئے تو چونک پڑے۔ یوساف ادھر بھی موجود نہ تھا۔ پریشان تو میں پہلے ہی ہو چکا تھا۔ میری چھٹی حس مجھے کسی انہونی کا یقین دلا رہی تھی اور اب تو مجھے یقین ہو گیا تھا کہ کوئی زبردست گڑبڑ ہے!..... اور یوساف کسی مصیبت کا شکار ہو گیا ہے۔ پھر میں یوساف کو پکارنے لگا۔ مگر مجھے صرف اپنی آواز کی بازگشت سنائی دیتی رہی ..... اہرام کے گرد ہم نے کئی چکر لگا ڈالے مگر یوساف کا کچھ پتا نہ چلا..... یوں لگتا تھا جیسے وہ زمین کی گہرائیوں میں کہیں غرق ہو گیا ہو یا پھر اہرام کا نوالہ بن کر اس کے تاریک شکم میں اتر گیا ہو۔ میں دوبارہ اسی جانب آگیا جدھر سے گڑگڑاہٹ بلند ہوئی تھی۔ میں بغور اہرام کی اس دیوار کا جائزہ لینے لگا۔ ایک ایک انچ معائنے کے بعد بھی مجھے کوئی خاص بات نظر نہ آئی۔ دماغ عجیب الجھاؤ کا شکار ہو گیا تھا' کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کیا جائے اور کیا نہیں۔

آخر کار میں نے حتمی فیصلہ کرتے ہوئے ایکیلاس کو مخاطب کیا۔ اب اس کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا کہ ادھر سے یہ چٹان کاٹنے یا توڑنے کی کوشش کی جائے۔ ایکیلاس کو بھی میں نے یہی حکم دیا اور وہ فوراً" عمل پیرا ہو گئے۔ ڈرل مشین میں اسٹون ڈرل فٹ کیا گیا اور تین مزدور مشین سنبھالے آگے بڑھ آئے اور پھر مشین کی مخصوص آواز گونج اٹھی۔ باقی کے مزدور چند قدم ہٹ کر کھڑے ہو گئے۔

تینوں مزدور "ڈرل" سنبھالے دیوار پر زور آزمائی کرنے لگے۔ "ڈرل" انتہائی تیزی سے گردش میں تھا ۔ پتھر نہایت آہستہ آہستہ ریت کی طرح نیچے گرنے لگا۔ تقریباً" پندرہ منٹ گزر گئے۔ ڈرل اور پتھر سے دھواں اٹھنے لگا۔ آخر مشین بند کر دی گئی۔ ایکیلاس نے ڈرل چیک کیا اور پھر پتھر کی جانب دیکھنے لگا۔ وہاں ابھی ایک انچ بھی سوراخ نہ ہوا تھا۔

"صاحب! پتھر بہت سخت ہے ڈرل کی نوک جواب دے گئی ہے۔" اور میری پریشانی اور بڑھ گئی۔

"ڈرل چینج کرلو' ہارڈ ڈرل فٹ کرو۔"

اور پھر ڈرل تبدیل کر لیا گیا اور مشین دوبارہ اسٹارٹ ہو گئی۔ تقریباً" پانچ منٹ ہی گزرے ہوں گے کہ ایک زبردست کڑاکے کے ساتھ ڈرل ٹوٹ گیا۔ مشین آف کردی گئی اور مزدور سوال طلب نظروں سے میری جانب دیکھنے لگے۔ میں نے نچلا ہونٹ کاٹتے ہوئے کہا۔

"ایکپلاس مجبوری ہے یونہی کٹر مشین چلا کر دیکھو۔" اور وہ سرہلا کر رہ گیا۔

گو کہ بغیر "سنٹرل ہول" کے کسی سخت چٹان کو کٹر مشین سے کاٹنا خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔ مگر اب اس کے سوا چارہ نہ تھا۔

آخر مشین میں تین بائی چار کا کٹر فٹ کیا گیا۔ ماؤتھ کلوز کرنے کے بعد مشین اسٹارٹ کردی گئی اور مزدور نہایت احتیاط سے دوبارہ اپنی کوشش میں مصروف ہو گئے۔ کٹر آہستہ آہستہ اہرام کی اس سخت دیوار پر لکیر نما نشان لگاتا جارہا تھا چونکہ "سنٹرل ہول" نہ تھا اس لیے انتہائی احتیاط سے کام لیا جارہا تھا اور پھر آہستہ آہستہ دیوار پر لکیر نما نشان گہرا ہوتا چلا گیا۔ ٹھوس سخت پتھریلی چٹان کٹنا شروع ہو گئی تھی اور کٹنے والی جگہ پر سے پتھر مٹی کی طرح اڑنے لگا تھا۔

ایک بے چینی رگ و پے میں تھرتھری مچائے ہوئی تھی۔ سبھی دم سادھے خاموش کھڑے تھے اور میری نظریں "کٹر" پر جمی ہوئی تھیں جو لحظہ بہ لحظہ دیوار میں اترتا جارہا تھا۔ گہرائی میں..... مزید گہرائی میں اور پھر اچانک برق رفتار سے گھومتے ہوئے کٹر کی رفتار میں کمی ہونے لگی' اس کی رفتار آہستہ ہونے لگی تھی۔ مزدوروں کی گرفت ہینڈل پر مضبوط تر ہوتی چلی گئی اور پھر اچانک ایکپلاس چلا اٹھا۔

"کٹر سیز ہو رہا ہے..... کھینچو! واپس۔" پاس کھڑے تمام مزدور ہڑبڑا کر دور ہٹ گئے۔ میں بھی لاشعوری طور پر چند قدم پیچھے ہٹ گیا۔ ایکپلاس باقی دونوں مزدوروں کے ساتھ مشین واپس کھینچنے کی کوشش کررہا تھا اور کٹر کی رفتار دھیمی پڑتی جارہی تھی مشین کی "موٹر" اور گراریوں کی آواز بھاری ہو چکی تھی۔

ڈبل موٹر' ہارڈ گراریاں' ہیوی رولر' تھری ریس رولر' پھر پیچھے سے فل الیکٹرک پاور بھلا تین افراد سے کہاں مشین سنبھالی جاتی نتیجہ یہ رہا کہ "کٹر" تو پتھریلی دیوار میں تھا۔ مشین تین آدمیوں کی گرفت میں ہونے کے باوجود گھوم گئی اور اس نے تینوں کو پٹخ دیا ایک زور کی آواز کے ساتھ کٹر ٹوٹ گیا۔

تینوں مزدور برق رفتاری سے پیچھے ہٹے اس کے باوجود ٹوٹا ہوا کٹر ایک کی ران کا اچھا خاصا گوشت کا لوتھڑا کپڑے سمیت اڑا گیا اور وہ کربناک انداز میں چیخ اٹھا۔

ایکپلاس اور دوسرا مزدور بجلی کی سی تیزی سے دور ہو گئے۔ مشین بھی از خود آف ہو گئی۔ میں نے جلدی جلدی زخمی مزدور کو مزید تین مزدوروں کے ساتھ وہاں سے بھیج دیا' باہر خیمے میں فرسٹ ایڈ کا سامان بھی موجود تھا اور عبدل بھی وہیں تھا اس لیے مجھے زیادہ پریشانی کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ ایکپلاس دوسرے مزدور پر برہم ہو رہا تھا۔

"پش بٹن تمہارے ہاتھ کے نیچے تھا تم ہاتھ ہٹا کر مشین آف نہیں کرسکتے تھے؟"

"ایکپلاس..... میں کہہ تو رہا ہوں کہ میں ہاتھ ہٹا چکا تھا۔ بٹن نہ جانے کیسے از خود دبا رہا میں خود سخت حیران ہوں..... اور کیا تم نے محسوس نہیں کیا کہ مشین ہمارے استعمال سے باہر ہو گئی تھی۔ ہم اپنی جانب کھینچ رہے تھے اور کٹر از خود دیوار میں دھنسا جارہا تھا۔ جیسے دیوار کے اندر سے کوئی اسے اپنی جانب کھینچ رہا ہو۔"

اور ایکپلاس خاموشی اور پریشانی کے عالم میں ہونٹ چبانے لگا۔ میں اپنی جگہ پریشانی کے عالم میں کھڑا تھا۔ کچھ سمجھ میں نہ آرہا تھا کہ کیا کیا جائے۔ کٹر کا ٹوٹا ہوا آدھا حصہ دیوار میں دھنسا ہوا تھا۔ ایکپلاس پلٹ کر اسے نکالنے کی کوشش کرنے لگا مگر وہ ہل بھی نہ رہا تھا۔ تھوڑی ہی دیر گزری ہو گی کہ عبدل بھی وہیں آ

پہنچا۔

"کیا ہوا ڈاکٹر صاحب!..... کیا کوئی کامیابی ہوئی؟"

"تم نیچے کیوں آئے ہو؟" میں نے الٹا سوال کردیا۔

"وہ جی..... زخمی مزدور کی بینڈیج میں نے کردی ہے اور ان چاروں کو وہاں بیٹھا کر خود یہاں آگیا کہ دیکھوں تو سہی کہ آپ کا کام کہاں تک پہنچا ہے؟"

اور میں خاموش ہو رہا۔ کٹر نکالنے کے لیے ایکپلاس نے کدال اٹھالی اور کٹر کی جڑ میں ترچھی ضربیں لگانے لگا۔

تھوڑی دیر بعد عبدل بولا۔

"سر آپ ایسا کریں تو اسٹون بائیٹ لیزر گن سے اس دیوار کو کاٹ لیں۔" اس سے پہلے کہ میں اس کو کوئی جواب دیتا ایکپلاس کا ہاتھ تھوڑا اٹھا اور فولادی کدال کی بھرپور ضرب کٹر سے چار پانچ انچ دائیں جانب پڑی اور اچانک ایک ہولناک گڑگڑاہٹ بے دار ہوئی' جیسے ضرب کی تکلیف محسوس کرتے ہوئے اہرام دھاڑ اٹھا ہو۔ زمین لرز اٹھی اور پھر ایک حیران کن منظر نظر آیا۔

ہمارے بالکل سامنے سے تقریباً" دس فٹ کی دیوار کا ٹکڑا کسی دروازے کی طرح از خود اندرونی جانب کھلتا چلا گیا۔

ایکپلاس گھبرا کر چند قدم پیچھے ہٹ گیا۔ اہرام کے اندر گہری تاریکی تھی سب کے منہ فرط حیرت سے کھلے کے کھلے رہ گئے۔ چند لمحوں کے لیے جیسے میرے اعصاب بھی حیرت کے طلسم کے زیر اثر پتھرا کر رہ گئے ہوں' پھر تمام مزدور دروازے کی جانب امنڈتے چلے آئے۔ سب کے چہروں پر تجسس تھا' ایک عجیب سی بے چینی تھی۔

اس کھلے ہوئے حصے سے ایک نامانوس سی مہک کے بھبکے خارج ہو رہے تھے۔ ایک عجیب سی کیف آور مدہوش کن خوشبو جو طبیعت کو ناگوار نہ گزر رہی تھی' مگر قوت تمام کو بے حس کیے دے رہی تھی۔ اہرام کا اندرونی حصہ اس قدر تاریک تھا کہ اندر داخل ہونا کسی طور بھی مناسب نہ تھا۔ میں نے ایکپلاس کو مخاطب کیا۔

"ایکپلاس..... فوراً" لائٹوں کا انتظام کرو۔ اہرام کے اندر دن کا سا سماں ہونا چاہیے۔ جلدی کرو..... فوراً" جلدی۔" اور وہ آٹھ دس مزدوروں کو ہمراہ لے کر ایک جانب بڑھ گیا۔ چارجنگ ٹیوب لائیٹس' سرچ لائٹس' ٹارچیں' بہت تعداد میں میں نے اکٹھی کر لی تھیں۔ باقی مزدوروں کو میں نے اب وہاں روکنا مناسب نہ سمجھا' اسی خیال کے تحت میں نے تین مزدوروں کو روک لیا' باقی کو کہا کہ تم باہر اوپر خیموں میں ہمارا انتظار کرو اور وہ سب چلے گئے۔ اب میرے اور عبدل کے علاوہ وہاں تین مزدور اور کھڑے تھے جلد ہی ایکپلاس واپس آگیا تھوڑے تھوڑے فاصلے پر دو اطراف میں جنریٹر آن کردیے گئے۔ دس چھوٹی چھوٹی ٹرالیوں میں 500 واٹ کی سرچ لائٹس فٹ تھیں' ہر سرچ لائٹ کے ساتھ آٹومیٹک خود کار دو دو بیٹریاں منسلک تھیں کہ ایک آن رہتی اور دوسری خود بخود چارج ہوتی رہتی۔ چند مزدور جنریٹر سے اہرام کے گرد روشنی کا بندوبست کرنے لگے۔ ایکپلاس نے ایک ٹرالی اہرام کے دروازے کے سامنے روکی۔ سرچ لائٹ کا رخ اہرام کی اندرونی جانب فکس کیا اور لائٹ آن کردی۔

تیز روشنی تاریکی کا کھوکھلا سینہ چیرتی ہوئی اہرام میں داخل ہوئی اور برق رفتاری سے تمام اندھیرے چاک کرتی ہوئی اہرام کی آخری حد سے جا ٹکرائی۔ تمام اہرام منور ہو گیا اور اندرونی منظر واضح ہو گئے۔ یہ ایک سیدھی راہداری نظر آرہی تھی جس کا اختتام چوالیس فٹ دور سامنے والی دیوار پر ہوتا تھا۔

باقی کی تمام سرچ لائٹس بھی روشن کرلی گئیں سب نے احتیاطاً" گیس ماسک چڑھائے اور پھر میں بشمول عبدل اور ایکپلاس نو مزدوروں کے ہمراہ اللہ کا نام لے کر اہرام میں داخل ہو گیا۔ سبھی ایک ایک ٹرالی دھکیلتے ہوئے اہرام میں داخل ہوئے تھے اور اندر اس قدر روشنی پھیل گئی تھی کہ اگر دس قدم کے فاصلے پر سوئی بھی پڑی ہوتی تو صاف دکھائی دیتی۔

ایک عجیب سا سکوت..... گمبھیر خاموشی..... بڑا ہی پراسرار ماحول تھا اندر کا۔ ہم آہستہ روی سے آگے بڑھتے چلے گئے۔ اس ایک راہداری میں سے بیسیوں راہداریاں دائیں بائیں نکل رہی تھیں جن کا اختتام نہ جانے کہاں ہوتا ہوگا' ہم تو ناک کی سیدھ میں بڑھتے چلے گئے۔ جگہ جگہ دیواروں پر سورج کی تصویریں کھدی ہوئی تھیں۔ ہر راہداری' ہر کونے پر عجیب و غریب فوق الفہم نقش و نگار بنے ہوئے تھے۔ درودیوار کے تمام پتھر عجیب سی حالت میں تھے کہ میری سمجھ میں نہیں آتا ان کا حلیہ کس انداز میں بیان کروں۔

ہلکے بھورے سبزی مائل' خشک تر' سنگلاخ' سوختہ رو!

آخر ہم راہداری کی آخری حد تک آگئے۔ سامنے ایک مضبوط ٹھوس دیوار تھی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا دو دروازے کے بیچوں بیچ ٹرالی پر سرچ لائٹ روشن نظر آرہی تھی۔ جس کی تیز روشنی اتنی دوری کے باوجود آنکھیں چندھیا رہی تھیں۔

"کون ہے ؟" اچانک اس پراسرار خاموشی میں ایک کانپتی لرزتی ہوئی آواز بلند ہوئی اور سحر انگیز سکوت کرچی کرچی ہو کر بکھر گیا۔

ہم سب ہی چونک پڑے' دل ایک خوف و دہشت کی لذت سے ملے جلے احساس سے دھڑکنے لگا۔ بھلا صدیوں سے بند اس اہرام میں کون ہو سکتا ہے؟ کم از کم کوئی انسان تو نہیں ہو سکتا پھر.....؟

آواز ایک بار پھر بلند ہوئی۔

"ارے بھائی کون ہے..... جواب کیوں..... نہیں دیتے' خدارا میرے پاس آؤ۔" آواز میں ایسا عجیب غم انگیز کرب تھا کہ میرے وجود کا رواں رواں جھنجھنا اٹھا۔ آواز میں ایسی کپکپاہٹ اور لرزش تھی جیسے بولنے والے کی زبان میں رعشہ ہو۔

ہم سب کی نظریں اپنے سے چند قدم پیچھے اس راہداری کے کونے پر جمی ہوئی تھیں جو کہ اس آواز کا اصل منبع تھی۔ تمام مزدوروں کے چہروں پر موت کے سائے منڈلا رہے تھے اور ان کی رنگت زرد پڑی ہوئی تھی۔ عبدل اور ایکبلاس کے چہرے پر بھی ہوائیاں اڑ رہی تھیں اس وقت تو میں اپنی کیفیت کے متعلق سوچنے سمجھنے کی صلاحیت کھو بیٹھا تھا ہاں آج سوچتا ہوں کہ اس وقت میری اپنی حالت بھی دگرگوں تھی۔ میری رگیں ایسے تناؤ کا شکار تھیں جیسے ابھی کے ابھی سینکڑوں ٹکڑوں میں بٹ جائیں گی۔"

واقعہ کچھ ایسا ہی رونما ہو گیا تھا کہ تیز سنسنی خیز لہریں میرے پورے وجود کو ڈسنے لگی تھیں ہم سب اپنی اپنی جگہ مبہوت' خاموش کھڑے تھے کہ پھر عجیب سی ہلکی ہلکی سرسراہٹیں ابھرنے لگیں یا کچھ گھسٹنے' رگڑنے کی آوازیں.....

ہم سب کی نظریں بدستور اسی راہداری کی نکڑ پر گڑی ہوئی تھیں جس میں سے یہ آوازیں ابھر ابھر کر معدوم ہو رہی تھیں اور پھر ہم نے وہاں سے ایک عجیب الخلقت چیز نمودار ہوتے دیکھی' وہ ایک گوشت کا طویل ترلو تھڑا سا تھا جو سانپ کی طرح راہداری میں پتھریلے فرش پر رینگتا ہوا اس جانب سے نمودار ہوا تھا۔ عجیب لجلجا سا' خون میں تر! جیسے..... جیسے کسی ٹھوس وزنی پتھر سے اسے بری طرح کچل دیا گیا ہو۔ گوشت کے چھوٹے چھوٹے ذرے خون کے ساتھ فرش پر پھیل رہے تھے۔ پھر ویسا ہی ایک اور سانپ سا نمودار ہوا۔ دونوں برابر آہستہ روی سے رک رک کر گھسٹ گھسٹ کر سامنے آرہے تھے۔ تمام سرچ لائٹوں کا رخ اسی جانب تھا اور میں تیز روشنی کے باوجود یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ یہ کیا بلا ہے اور اگر یہ عجیب الخلقت بلا بیرونی راستے میں حائل نہ ہوتی تو یقیناً" اب تک ہم بھی چھلانگیں مارتے ہوئے اہرام سے باہر نکل چکے ہوتے۔ وہ مقامی مزدور لرزتی آوازوں میں دعائیہ کلمات بڑبڑانے لگے تھے۔ ان سانپوں کے عقب میں ایک بھاری بھرکم گوشت کا تقریباً" چھ فٹ لمبا ڈھیر گھسٹتا ہوا راہداری میں آگیا تھا جس کے اندر سے سرخ سرخ خون ابلا پڑ رہا تھا اور اس خون کے ساتھ گوشت کے باریک باریک ریزے بہتے ہوئے راہداری کے فرش پر پھیلتے جارہے تھے اور اب وہ پورا وجود ہمارے ہمارے سامنے سرچ لائٹوں کی زد میں تھا۔ ایسا قبیح صورت منظر اس سے پہلے میری نظروں سے نہ گزرا تھا میرے اعصاب شل ہوئے جا رہے تھے۔ جانے یہ کون سی مخلوق تھی جس کا کہ کوئی سر پیر ہی سمجھ میں نہ آرہا تھا کہ اس کی ابتدا کدھر سے ہوتی ہے اور اختتام کدھر ہوتا ہے؟ بس گوشت اور ہڈیوں کے ملغوبے کا ایک چھ فٹ لمبا ڈھیر سا تھا۔

اس وجود کی حالت کذائی کچھ ایسی تھی کہ ہم اس کی حقیقت کبھی نہ جان پاتے اگر وہ از خود بول نہ پڑتا۔ پہل عبدل کی خوفزدہ آواز نے کی تھی۔

"صص..... صاحب یہ..... یہ کیا ہے ؟"

پھر اس گوشت کے ڈھیر سے ایک کانپتی لرزتی آواز خارج ہوئی۔

"کون ہے..... ڈاکٹر صاحب کیا یہ آپ ہی ہیں ؟ کیا آپ اندر آچکے ہیں ؟" پہلے تو مجھے اس بات پر شدید جھٹکا لگا کہ مجھے ڈاکٹر صاحب کہہ کر پکارا گیا تھا۔ آواز میرے لیے بالکل نامانوس تھی۔ مگر "ڈاکٹر صاحب" کہنے کا انداز میرے لیے قطعی اجنبی نہ تھا اور ایک قیامت خیز خیال نے مجھے بے اختیار بولنے پر مجبور کر دیا۔

"یوساف..... کیا یہ تم ہو ؟" میرے لب و لہجے میں ناقابل یقین حد تک حیرت کا انداز رچا ہوا تھا۔

"ہاں ڈاکٹر صاحب..... یہ..... میں ہی ہوں۔ ساڑھے چار ہزار سال سے انسانی وجود کے انتظار میں بے قرار و مضطرب شیطانی روحوں کے عذاب کا شکار ہونے والا میں ہی ہوں..... آپ کا خادم..... یو..... ساف!"

فرط حیرت سے میری زبان گنگ ہو کر رہ گئی تھی..... وہاں موجود سبھی افراد کی آنکھیں شدت حیرت سے پیالہ ہو گئی تھیں اور سبھی ناقابل یقین نظروں سے یوساف کے وجود کو دیکھے جارہے تھے۔ یوساف دوبارہ کپکپاتی نیند زدہ آواز میں بڑبڑایا۔

"ڈاکٹر صاحب! فوراً" واپس لوٹ جائیں ورنہ آپ بھی کسی دردناک عذاب کا شکار ہو جائیں گے..... واپس لوٹ جائیں..... واپس لوٹ جائیں..... واپس لو..... ٹ..... جا۔" یوساف کی آواز خاموش ہو گئی اس کے گوشت کے لوتھڑوں میں چھپے ہوئے ہونٹوں پر "اجل نواز" نے ہمیشہ کے لیے خاموشی کے قفل ڈال دیے تھے۔ سبھی کی آنکھوں میں کچھ دیر پہلے خوف سمٹا ہوا تھا اور اب یوساف کی دردناک موت پر سبھی کی آنکھیں نم تھیں۔ میں ایک ڈاکٹر تھا' انسانی وجود کی چیر پھاڑ' گوشت' لاشیں' خون یہ سب میرے لیے نئی چیزیں نہ تھیں مگر یوساف کی لاش ایسی اثر انگیز حالت میں تھی کہ مجھے کراہیت محسوس ہو رہی تھی۔ اور جی بری طرح متلا رہا تھا۔

"صاحب..... اب ہمیں فوراً" نکل جانا چاہیے۔"

"ہاں..... چلو..... آؤ۔"

اور پھر ہم احتیاط سے راہداری کے خون آلود حصے سے گزر کر بیرونی دروازے کی جانب بڑھ گئے۔ خوف و دہشت کا سیاہ عفریت ہمارے دماغوں میں پنجے گاڑے خاموش..... ہمارے اعصاب پر مسلط تھا۔

راہداری میں ہمارے قدموں کی آواز گونج رہی تھی یا پھر ٹرالیوں کے پہیوں کی چرچراہٹیں گونج رہی تھیں اور ہم تیز رفتاری سے بیرونی دروازے کے قریب تر ہوئے جارہے تھے کہ اب ہم جلد از جلد اس دہشت

کدے سے نکل جانا چاہتے تھے۔ بیرونی دروازہ ہم سے صرف چند قدم کے فاصلے پر تھا کہ دفعتاً ''ایک دھماکے سے دروازے کے بیچوں بیچ پڑی ہوئی سرچ لائٹ ٹوٹ گئی۔ سرچ لائٹ کے شیشے ہمارے قدموں تک اڑ کر آئے اور تمام راہداری میں بکھر گئے۔ بے اختیار ہم ٹھٹک کر رک گئے۔ سرچ لائٹ سے سفید دھوئیں کے کثیف مرغولے جھومتے ہوئے بلند ہو رہے تھے اور پھر ایک اور حیرت انگیز بات ہوئی۔ اہرام کا کھلا ہوا دروازہ از خود ایک تیز گڑگڑاہٹ سے بند ہوتا چلا گیا ہم آگے کی جانب دوڑے کہ بند ہوتی ہوئی دیوار کو پکڑ سکیں مگر راستہ مکمل طور پر بند ہو چکا تھا۔

ہم چوہوں کی طرح اس اہرام میں محبوس ہو کر رہ گئے تھے۔ گھبراہٹ اور خوف سے ہمارے حواس معطل ہو کر رہ گئے تھے۔ ہم خوف نشین نظروں سے ادھر ادھر دیکھ رہے تھے۔ یوساف کی لاش ہماری بصارت کے ریکارڈ ڈیکشن میں سفید اسکرین پر بار بار دکھائی دینے لگی اور ہمیں بھی اپنا انجام ویسا ہی ہوتا نظر آنے لگا۔

ہم منتظر تھے کہ ابھی کسی اور سے ہم پر بد روحیں جھپٹیں گی اور ہمارا انجام بد خیر ہو جائے گا۔ میں تیزی سے آگے بڑھ کر دروازے کو ٹٹولنے لگا۔ ایک ٹھوس پتھریلی دیوار میرا منہ چڑا رہی تھی۔ کوئی ہلکا سا رستہ یا نشان تک ایسا نہیں تھا جس سے یہ اندازہ ہوتا کہ کچھ دیر پہلے یہاں ایک دروازہ تھا! میری دیکھا دیکھی عبدل اور اکیلاس اور دوسرے ملازم بھی آگے بڑھ کر دروازے کی جگہ موجود اس چٹان سے زور آزمائی کرنے لگے کہ شاید یہ اپنی جگہ سے سرک جائے اور ہم موت کے منہ سے نکل کر زندگی کی آغوش میں پہنچ سکیں، مگر ہر کوشش ناکام رہی۔ ہم ایک چوہے دان میں پھنس چکے تھے اور اب فضول میں دروازے کی جگہ زور صرف کر رہے تھے حالانکہ یہ یقینی تھا کہ پوری فوج بھی اسے سرکانے میں ناکام رہے گی۔

آخر کچھ دیر کی کوشش کے بعد تمام مزدور پیچھے ہٹ گئے۔ ان کے چہروں پر وحشت برس رہی تھی۔

''ڈاکٹر صاحب! اب کیا کریں..... ہم باہر کیسے نکلیں گے؟'' اکیلاس نے سہمے ہوئے لہجے میں کہا۔

''کچھ نہیں کہا جا سکتا اکیلاس! ہو سکتا ہے ہماری لاشیں یہیں گل سڑ کر ختم ہو جائیں اور کسی کو کبھی علم بھی نہ ہو سکے۔'' میں نے دلگرفتگی سے جواب دیا۔ یہاں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرنے کے خیال سے میرا دل ڈوبنے لگا تھا۔ ناامیدی، مایوسی نے فوراً ہی میرے دل و دماغ پر تسلط جما لیا۔

''صاحب!'' عبدل نے کچھ سوچتے ہوئے مجھے مخاطب کیا۔

''کیا اس دروازے کو کھولنے کے لیے اندرونی جانب کوئی میکنزم نہیں ہو گا۔ جیسے یہ باہر سے کھلا ہے ہو سکتا ہے ویسے ہی اسے اندرونی جانب سے کھولنے کا بھی کوئی طریقہ کار ہو۔''

''نہیں اہراموں کے دروازے صرف باہر سے ہی کھولے جا سکتے ہیں کیونکہ ممیوں کو باہر نکلنے کی ضرورت پیش نہیں آتی تھی سو اندرونی جانب ایسا کوئی میکنزم نہیں رکھا جاتا تھا۔''

''کیا کوئی اور راستہ بھی نہیں ہو گا باہر جانے کا؟''

''مجھے کیا پتا؟ میں ساری زندگی اہرام نہیں کھنگالتا رہا۔'' میری بات پر ایک اور مزدور مجھ سے مخاطب ہوا۔

''پر صاحب جی! اب آپ کوئی حل تو نکالیں..... ہم یہاں سے باہر کیسے نکل سکتے ہیں۔ آپ کوئی راستہ ڈھونڈنے کی کوشش کریں یوں یہاں کھڑے رہے تو مایوسی کے بوجھ سے ہی سب مر جائیں گے۔'' مجھ سے کوئی جواب نہ بن سکا میں پریشانی سے اپنا نچلا ہونٹ کاٹنے لگا۔

کچھ دیر پریشانی کے عالم میں کھڑے رہنے کے بعد ایک بار پھر بند دروازہ کا جائزہ لینے لگا۔ ایک طویل مغز ماری کے بعد پوری طرح مایوس ہو گیا۔ اعصاب سن ہو گئے، عقل جواب دے گئی، تمام حواس گویا سلب ہو کر رہ گئے تھے!

''اب یہ دروازہ نہیں کھل سکتا!'' میں نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا تو مزدوروں کی حالت متغیر ہو گئی۔

''کک..... کیا مطلب؟ کیا اب ہم باہر نہیں نکل سکیں گے؟'' عبدل ہکلایا۔

''ہاں! اب تو کوئی معجزہ ہی ہوا تو ہم زندہ سلامت باہر نکل سکیں گے ورنہ اور تو کوئی صورت نہیں! ہم بری طرح پھنس چکے ہیں عبدل اور میں تم لوگوں کو کوئی جھوٹی آس امید نہیں دلانا چاہتا۔ شاید یہ اہرام ہی ہم سب کی قبر بنے گا۔'' میری آواز نے کچھ دیر کے لیے سب پر سکتہ طاری کر دیا۔ مزدوروں کی آنکھیں پھیل گئیں اور چہروں پر موت کی زردی کھنڈ گئی سب اپنی اپنی جگہ بے حس و حرکت کھڑے رہ گئے۔

میں اس راہداری کی دیوار سے ٹیک لگا کر فرش پر ہی بیٹھ گیا۔ چند لمحوں تک اہرام کی بوجھل اور پراسرار خاموشی میں موت سی سرسراتی رہی پھر اچانک جیسے مزدوروں پر ایک جنون طاری ہو گیا۔ سب دیوانہ وار دروازے کی چٹان پر ٹوٹ پڑے۔ وہ دروازے کی جگہ ٹھوکریں مار رہے تھے چٹان کو دھکے دے رہے تھے مگر بھلا اس سے کیا حاصل ہونے والا تھا؟ میں اپنے جگہ سر جھکائے خاموش بیٹھا رہا۔ شاید کتاب زیست میں یہی رقم تھا۔ دنیا کے نامور ہارٹ اسپیشلسٹ ڈاکٹر شکیل ظفر کی زندگی اتنی ہی تھی اور انجام یہی تھا۔ اہرام کا قید خانہ، بے بسی کی اذیت ناک موت! کسی کے خواب و خیال میں بھی یہ بات نہیں ہو گی کہ پاتال کے اندر پوشیدہ ایک اہرام ڈاکٹر شکیل ظفر کی آخری آرام گاہ بنے گا۔

کچھ ہی دیر میں مزدوروں کے کپڑے پسینے سے تربتر ہو گئے تھے۔ تمام مزدور راہداری میں بے سدھ گر کر ہانپنے لگے۔ عبدل بھی تھکے ہوئے انداز میں میرے قریب ہی گھٹنوں کے بل گر پڑا۔ میں نے سر اٹھا کر اس کی سمت دیکھا اس کی رنگت سرخ ہو رہی تھی اور چہرے پر پسینے کے قطرے جھلملا رہے تھے، سانس بری طرح پھول رہی تھی۔ میں نے زاویہ نگاہ بدلا دوسرے مزدوروں کی حالت بھی اس سے کچھ مختلف نہ تھی سبھی منہ کھولے سانس لے رہے تھے اور ان کے نتھنے پھڑپھڑا رہے تھے۔

اچانک ایک اور روح فرسا خیال سے میری ریڑھ کی ہڈی میں برف کا کنکھجورا سا رینگ اٹھا! میں نے چونک کر عبدل کی طرف دیکھا اس کی آنکھوں کے شیشوں پر پانی جھلملا رہا تھا، نتھنے پھول پچک رہے تھے، گردن کی رگیں رہ رہ کر ابھرتی تھیں۔

''عبدل..... عبدل کیا ہو رہا ہے تمہیں؟ تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا!''

صص..... صاب جی حلق..... حلق اور ناک میں جلن سی ہونے لگی ہے اور اچانک پتا نہیں کیوں؟'' عبدل نے گلا کھنکارتے ہوئے کہا، تو تشویش کی زیادتی سے میری آنکھیں سکڑ گئیں۔ میں فکرمندی سے دوسرے مزدوروں کی جانب دیکھنے لگا ان کی حالت اب سنبھل چکی تھی۔ وہ سب اٹھ کر دوبارہ دروازے کی سمت متوجہ ہوئے تو مجھ سے خاموش نہیں رہا گیا۔

ٹھہرو..... رک جاؤ تمہاری یہ کوشش فضول ثابت ہو گی یہ دروازہ نہیں کھلے گا، بے کار میں قوت صرف نہیں کرو۔''

''تو کیا ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھ رہنا ہمارے لیے کار آمد ثابت ہو گا؟'' ایک مزدور نے ترش لہجے میں مجھے مخاطب کیا۔

''یوں بیٹھ کر موت کا انتظار کرنے سے بہتر ہے کہ ہم زندگی کے لیے تگ و دو کرتے ہوئے مریں۔''

''تگ و دو اور حماقت میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ بچھو کے اطراف اگر آگ جلا دی جائے تو وہ بھی چاروں طرف بھاگتا دوڑتا ہے، ٹکریں مارتا ہے اور آخرکار خود ہی کو ڈنک مار کر مر جاتا ہے۔ حالانکہ اگر وہ آگ کے ٹھنڈا ہونے کا انتظار کرنا جانتا ہو تو زندگی کو محفوظ رکھ سکتا ہے مگر اس کے پاس عقل نہیں ہوتی اور تم لوگ بھی اسی طرح خود کو ڈنک مار رہے ہو، حماقت کا ثبوت دے رہے ہو، جو بے وقوفوں کی طرح اس دروازے پر زور آزمائی کر رہے ہو۔''

''یہاں زندگی اور موت کی مصیبت پڑی ہوئی ہے اور آپ آگ بچھو کی پہیلیاں بیان کر رہے ہیں؟''

''میں پہیلیاں نہیں بیان کر رہا، تمہاری عقلیں پہیلیاں بن گئی ہیں۔ اہرام کی چار دیواری اس وقت

آگ ہے اور اس آگ سے باہر نکلنے کے لیے تم لوگ بچھو والی حماقت ہی کر رہے ہو۔"

"صاحب جی! صاف صاف بات کریں' آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟" ایکیلاس نے پریشان کن لہجے میں کہا اور گلا کھنکارنے لگا۔

"دیکھو ایکیلاس۔" میں نے گمبھیر لہجے میں کہنا شروع کیا۔

"پہلے تو ہمیں اس بات کا پورا احساس ہونا چاہیے کہ اس وقت ہم کہاں موجود ہیں اور کیا صورت حال ہے؟ ہم بیسیوں فٹ زمین کے اندر ایک ایسے اہرام میں محبوس ہیں جو غالباً" ساڑھے چار ہزار سال سے مکمل طور پر بند تھا اور اب کچھ دیر دروازہ کھلا رہنے کے بعد دوبارہ بند ہو چکا ہے اور ہم اندر قید ہو کر رہ گئے ہیں۔ یہاں آکسیجن برائے نام ہے اور وہ بھی مسموم۔ ہم زیادہ دیر زندہ نہیں رہ سکتے اور جس طرح تم لوگ فضول میں دروازے پر زور آزمائی کر رہے ہو گویا خود کو موت کی اندھی کھائیوں کی سمت دھکیل رہے ہو اگر یہاں کی زہریلی ہوا میں ہم دس گھنٹے زندہ رہ سکتے ہیں تو یوں قوت صرف کرنے سے وہ دس گھنٹے کی زندگی کے امکان سمٹ کر دو گھنٹے رہ جائیں گے۔ اب اس بات کا فیصلہ تم لوگ خود کر لو کہ دس گھنٹے زندہ رہنا چاہو گے یا دو گھنٹے؟ اسی (۸۰) فیصد یقینی موت ہے اور بیس فیصد زندگی کے امکان ہیں کہ شاید کوئی معجزہ رونما ہو جائے۔ اب اگر تم لوگ معجزات پر یقین نہیں رکھتے تو اس ٹھوس چٹان پر اپنا زور ضائع کر سکتے ہو مجھے کوئی اعتراض نہیں! ہاں البتہ میں دو گھنٹے کی بجائے دس گھنٹے کی زندگی کو ترجیح دوں گا۔" میری بات سن کر مزدور بھی گنگ رہ گئے ان کی حالت مزید دگرگوں ہو گئی کہ کاٹو تو لہو نہیں!

سب اپنی اپنی جگہ کھڑے رہ گئے کوئی دروازے کی سمت نہیں بڑھا۔

"کیا میری بات تم لوگوں کی سمجھ میں نہیں آئی۔۔۔ دروازہ ہٹا سکتے ہو تو ہٹا لو!"

"نہیں ہم دس گھنٹے زندہ رہنا چاہتے ہیں۔" یہ وہی مزدور تھا جو کچھ دیر پہلے مجھ سے ترش لہجے میں بول رہا تھا۔

"ہاں ڈاکٹر صاحب! جب موت ہر صورت میں ہے تو کیوں نا زندگی کے ساتھ زیادہ سے زیادہ وقت گزارنے کی کوشش کی جائے۔" ایکیلاس بھی دروازے سے ہٹ کر میرے قریب آ بیٹھا تو اس کی تقلید میں باقی مزدور بھی پیچھے ہٹ آئے۔ زندگی چیز ہی ایسی ہے انسان کو پتا بھی ہے کہ زندگی کا ہر راستہ آخر کار موت کی سرحد پر جا کر رک جاتا ہے اس کے باوجود وہ زندگی سے چمٹے رہنے کی کوشش میں لگا رہتا ہے۔ ایک دن' ایک رات' ایک گھنٹہ' ایک منٹ' ایک سانس ہی سہی' چھوڑ دینے کی ہمت نہیں ہوتی۔

"ڈاکٹر صاحب حلق اور ناک میں عجیب۔۔۔ خارش اور جلن سی ہونے لگی ہے۔ کہیں۔۔۔ کہیں یہ۔۔۔"

"ہاں ایکیلاس! اگر تم کچھ دیر اور دروازے کے ساتھ کشتی کرتے تو شاید یہ سوال تمہارے حلق سے باہر نہیں نکل پاتا۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔ پھر عبدل سے مخاطب ہوا۔

"عبدل پانچ لائیٹیں آف کر دو چار آن رہنے دو۔" میری بات سن کر عبدل خاموشی سے اٹھ کر ٹرالیوں کی طرف بڑھ گیا۔ مزدور راہداری کے فرش پر خاموش بیٹھے تھے مگر ان کے ہونٹ مرتعش تھے یقیناً" وہ دعائیں بڑبڑا رہے تھے۔ خدا کے حضور گڑگڑا رہے تھے کہ کوئی معجزہ رونما ہو اور ان کی زندگیاں بچ جائیں یا پھر وہ مغفرت کی دعائیں مانگ رہے ہوں گے کہ الٰہی ہمیں بخش دے۔ ہمارے گناہ' ہماری خطائیں معاف فرما۔ یہی انسانی فطرت ہے۔ جس نے زندگی میں کبھی بھولے سے بھی اللہ کو یاد نہیں کیا ہوتا ایسے مشکل وقت میں جب اس کے سامنے کوئی راستہ باقی نہیں رہتا تب وہ اللہ کو یاد کرنے لگتا ہے' اسے یاد آجاتا ہے کہ ہاں کوئی اللہ بھی ہے جس نے تمام عالم تخلیق کیے ہیں۔۔۔ جو ہمارا خالق ہے' جو بچانے' مارنے' سننے' معاف کرنے اور ہر چیز پر قادر ہے۔ سو ان لمحات میں انہیں بھی اللہ کی یاد نے آلیا تھا کیونکہ ان کے پاس بھی کوئی راستہ نہیں بچا تھا اگر کوئی راستہ تھا تو وہ تھا موت کا' کربناک موت کا۔۔۔!

کافی دیر تک ہم سب اپنی اپنی جگہ سر جھکائے افسردہ اور خاموش بیٹھے رہے سب نے منہ سے ماسک ہٹا رکھے تھے۔

"یہاں کی آکسیجن زہر لتھڑی ہے' لہٰذا ماسک چڑھا لو ورنہ حلق اور نتھنوں سے خون ابل پڑے گا۔" میں نے ماسک پہنتے ہوئے ان سب کو مخاطب کیا تو سب نے ماسک چڑھا لیے۔

"صاحب! کیا کسی طریقے سے ہم باہر والوں کو خبر نہیں کر سکتے؟" عبدل نے کہا۔

"تم کر سکتے ہو۔۔۔ ایسا کرو جا کر ان سب کو بتاؤ اور جلدی سے واپس آجاؤ۔" میرے جواب پر عبدل خاموش ہو گیا۔

سبھی کے چہرے مرجھائے ہوئے تھے۔ شعور میں موت کا یقین بیٹھا ہوا تھا جبکہ لاشعور آس' امیدیں بندھا رہا تھا مگر کسی کا ذہن بھی ان امیدوں پر مطمئن نہیں ہو رہا تھا کیونکہ تمام ذہنوں پر بے کسی کی اذیت ناک موت کا یقین کسی ناگ کی طرح پھن کاڑھے بیٹھا تھا۔

ہم سب اہرام کی مرکزی راہداری کے فرش پر کسی سینکڑوں میل کی مسافت کے بعد تھک کر پڑاؤ کرنے والے صحرائی قافلے کی طرح بیٹھے ہوئے تھے اور راہداری کے دونوں اطراف میں کئی اور راہداریاں موجود تھیں جو اہرام کو کھنگالنے والوں کو گمراہ کرنے کی غرض سے بنائی جاتی تھیں۔

کافی دیر تک ہم سب خاموش بیٹھے رہے کسی نے کوئی بات نہیں کی ان ہزاروں سال پرانے پتھروں سے سحر انگیز لہریں نکل نکل کر ہمارے اعصاب پر بوجھ انداز ہو رہی تھیں۔ پھر ایکیلاس کی آواز نے ہی فضا میں تنی خاموشی کو مرتعش کیا۔

"صاحب جی کیا اب ہم یونہی بیٹھے رہیں گے؟" میں نے استفہامیہ نظروں سے اس کی جانب دیکھا۔

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ وقت تو دھیرے دھیرے گزر تا رہے گا اور ہر گزرتے لمحے کے ساتھ ہماری سانسیں گھٹتی جائیں گی اور آخر کار ہم یہاں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر دم توڑ دیں گے اور یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔"

"تم کیا چاہتے ہو۔۔۔؟"

"ڈاکٹر صاحب! ہم نے اس مقبرے کے اسرار جاننے کے لیے اپنی زندگیاں داؤ پر لگائی ہیں اور موت ہم سے زیادہ دور نہیں۔ ملک الموت ہمارے آس پاس ہی کہیں منڈلا رہا ہو گا کہ کب اسے اشارہ ملے اور وہ ہماری گردنیں مار لے۔ یہاں یوں اداس و ملول بیٹھے رہے تو موت کی ہیبت بڑھتی چلی جائے گی اور زندگی کا دامن چھوڑتے ہوئے ہماری روح میں اذیت کے بھنور بے دار ہو جائیں گے۔ جب مرنا ہی ٹھہرا تو کیوں نا بے کسی اور مایوسی کی گرد کو ذہن سے جھاڑ دیں اور موت کا خیال ذہنوں سے جھٹک کر اس مقبرے میں دفن اسرار کھوج نکالیں۔۔۔ جس مقصد کی تکمیل میں ہم موت کا شکار ہونے والے ہیں کم از کم اس مقصد کو مکمل تو کر جائیں! یوں پل پل موت کا اندازہ تو ہمیں موت آنے سے پہلے ہی مار ڈالے گا۔" ایکیلاس کے لہجے سے ایک عزم جھلکنے لگا تھا۔

"ایکیلاس! تمہاری بات بالکل درست ہے' اگر ہم دلوں میں موت کا یقین لے کر بیٹھ گئے تو موت کا خوف اور مایوسی' ہمارے خون میں گھل کر ہماری دھڑکنوں کا گلا گھونٹ دے گی۔ ابھی ہمارے سینوں میں سانسیں موجود ہیں۔ اعضاء میں زندگی کی توانائیاں بھری ہوئی ہیں اور اگر ہم مردوں کی طرح یہاں پڑے رہیں تو یہ ہماری بزدلی اور ہمارے انسان ہونے کی توہین ہو گی' زندگی کی تذلیل ہو گی اور موت کا تو ایک وقت مقرر ہے جس میں کہ ایک لمحے کا بھی ردوبدل ہونا ممکن نہیں۔۔۔ ہم موت پر یقین رکھتے ہیں پھر موت سے خوف کیا؟ موت سے تو ہمیں تب خوف کھانا چاہیے کہ جب ہمیں موت پر یقین نہ ہو۔" میں نے مضبوط لہجے میں ایکیلاس کی بات کی تجدید کی اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

اٹھو عبدل..... اٹھو ایکیلاس' یہ اہرام اپنے اسرار چھپائے رکھنے کی خاطر ہماری زندگیاں نگل لینا چاہتا ہے مگر ہم مرتے مرتے بھی اس میں دفن تمام اسرار کھوج کر بے حجاب کر دیں گے۔" میں نے مزدوروں کو مخاطب کیا۔

"اگر تم لوگ ہمارا ساتھ دینا چاہو تو ہمیں خوشی ہوگی اور اگر یہاں بیٹھ کر سانسوں کا شمار کرنا چاہو تو اس پر بھی ہم اعتراض نہیں کریں گے۔" میری بات پر مزدوروں نے ایک دوسرے کی صورتوں کا جائزہ لیا اور پھر وہ بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔

"ہم ہر صورت حال اور ہر کام کے لیے تیار ہیں۔" ایک مزدور نے پرجوش انداز میں کہا۔

"تو آؤ پھر یہ پانچ ٹرالیاں یہیں رہنے دو اور یہ چار دھکیل لاؤ۔" میں نے روشن سرچ لائٹوں والی چاروں ٹرالیوں کی جانب اشارہ کیا تو چار مزدوروں نے آگے بڑھ کر ٹرالیاں سنبھال لیں۔ اہرام کے مہیب سناٹے میں ٹرالیوں کے وہیلوں کی چرچراہٹیں گونج اٹھیں۔

ہم دائیں ہاتھ موجود ایک راہداری میں داخل ہو گئے۔ تقریباً" بیس قدم کے فاصلے پر یہ راہداری بائیں ہاتھ رخ بدلتی تھی۔ اس سے پہلے بائیں ہاتھ ہی ایک محرابی دروازہ آتا تھا ہم سب اس دروازے کی طرف بڑھ گئے۔

راہداری کی بوڑھی دیواروں پر گویا ہزاروں آنکھیں اگ آئی تھیں جن کی سنسنی خیز لہریں میرے جسم پر سرسرا رہی تھیں۔ ہر قدم پر یوں لگتا جیسے ابھی کوئی دیوار پھٹے گی اور ایک صدیوں پرانی لاش ہمارے سامنے آکھڑی ہوگی! یقیناً" باقی سب کی کیفیت بھی مجھ سے مختلف نہیں تھی۔

اس دروازے سے گزر کر ہم ایک گنبد نما چھت کے کمرے میں آگئے جس کی سنگی دیواروں پر سنگتراشوں کی صناعی کے شاہکار بکھرے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔ کمرے کی دائیں اور سامنے کی سمت ایک ایک دروازے کی وضع کا خلا موجود تھا باقی کمرہ خالی تھا۔

ہم نے دائیں طرف کے خلا کا رخ کیا۔ یہ تقریباً" پانچ فٹ عرض اور بیس فٹ طول کی راہداری تھی جو آگے جاکر بائیں طرف کو رخ بدلتی تھی۔ ہم سب اسی سمت آگے بڑھ گئے۔

تقریباً" دو گھنٹے ہم اسی طرح ان راہداریوں میں چکراتے رہے۔ ہر راہداری میں ایک کمرہ تھا اور ہر کمرے میں دو دروازے تھے جو راہداریوں میں نکلتے تھے۔ دائیں طرف کی راہداری گھوم کر سامنے کی سمت موجود دروازے کی اور آنکلتی تھی۔ اور وہاں سے گھومتی ہوئی آئندہ دروازہ کی بائیں سمت جاتی تھی اور اہرام کی مرکزی راہداری سے متصل نکلتی۔

ان دو گھنٹوں کی تگ و دو نے مجھے قدیم مصریوں کی ذہانت اور فن تعمیر کا معترف کردیا تھا۔ یہ کم حیران کن بات نہیں تھی کہ اس قدیم مصری دور میں جبکہ ریاضی کے اصول بھی وضع نہیں ہوئے تھے اس کے باوجود تعمیر کا یہ کام اس خوب صورتی اور تکنیکی اصولوں کے مطابق ہوا تھا کہ اگر آج کے ریاضی دان غور کریں تو ان کی عقل کی گتھیاں الجھ کر رہ جائیں۔

راہداریوں اور کمروں کو کچھ اس انداز میں آپس میں الجھایا گیا تھا کہ ہمارے ذہن بھی چکرا کر رہ گئے تھے۔ ہر راہداری اور ہر کمرہ ایک ہی حجم اور ایک ہی بناوٹ کا تھا' ہر کمرے اور راہداری میں سنگتراشی بھی ایک ہی نوعیت کی تھی۔ یہ فیصلہ کرنا ناممکن تھا کہ ہم ابھی تک پہلے کمرے کے گرد ہی چکراتے پھر رہے ہیں یا کہ کہیں آگے پہنچ چکے ہیں۔

یونہی راہداریوں میں چکراتے ہوئے ہم ایک ایسے دروازے نما خلا تک پہنچ گئے جو پہلے دروازوں کی نسبت خاصا کشادہ تھا اور جس کے دائیں بائیں سنگی دیواروں پر کھدے ہوئے نقش و نگار میں ایک مخصوص ترتیب تھی۔ ہم بغیر کسی تاثر کے اس کمرے میں داخل ہو گئے مگر پھر جیسے ہی سرچ لائٹوں کی روشنی میں اندر کا ماحول روشن ہوا تو بے اختیارانہ طور پر مزدوروں کے حلق سے دہشت گزیدہ آوازیں خارج ہو گئیں۔ مجھے خود اپنے سینے کے اندر ایک دھچکا سا

محسوس ہوا' دل ایک جھٹکے کے ساتھ حلق میں آپھنسا اور شہ رگ دھڑک اٹھی۔

ہمارے سامنے کمرے کے فرش پر چند استخوانی ڈھانچے پڑے تھے۔ جن میں چار تو انسانی تھے' دو یقیناً" پالتو جانوروں کے تھے۔ جو اپنی زندگی میں یہاں دفن ہستی کی تحویل و خدمت پر مامور رہے ہوں گے۔ وقت کی ودیعت کی ہوئی شکستگی نے ان کے جوڑ الگ الگ کر دیے تھے۔

یہ کمرہ نسبتاً" کشادہ تھا۔ کمرے کے وسط میں بنے چبوترے پر ایک جہازی سائز' سونے کا پلنگ پڑا تھا جس کے اوپر سیاہ آبنوس کی لکڑی کا ایک تابوت رکھا تھا' جو قیمتی اور نایاب پتھروں سے مرصع تھا۔ لائٹوں کی تیز روشنی میں وہ پتھر قوس و قزح کے دامن میں رکھے ہوئے چراغوں کی مانند جگمگا اٹھے۔ پلنگ سے بھی سنہری لہریں چھچما اٹھیں۔ یوں لگا جیسے بے شمار رنگین پروں والے پرندے پروں سے رنگ بکھیرتے ہوئے چھت کی جانب اڑے ہوں! ایک طرف چھ فٹ اونچے پتھر کے چبوترے پر "راع دیوتا" (سورج دیوتا ..... قدیم مصری سورج کی عبادت کرتے تھے) کا ایک نادر روزگار مجسمہ نظر آرہا تھا۔ بائیں طرف کی دیوار کے ساتھ فرعون مصر "اخناتون" کا برنجی مجسمہ ایستادہ تھا۔ (گزشتہ صدی کے شروع میں کھدائی کے دوران اخناتون کی ممی ملی تھی۔ اس کا مجسمہ (LOUVRE) کے عجائب گھر میں محفوظ ہے۔) اس مجسمے کے دائیں ہاتھ اس کی ماں "طیبہ" کا مجسمہ تھا اور بائیں ہاتھ اس کی خوب صورت بیوی "نوفرتیت" کا۔

یہ وہی نوفرتیت تھی جو "راع دیوتا" کے بڑے پجاری "آئی" کی بیٹی تھی۔ (نوفرتیت کا مجسمہ برلن کے عجائب گھر میں محفوظ ہے۔ حال ہی میں قدیم آفارنہ شہر کی کھدائی کے دوران بھی اس کا ایک مجسمہ ملا ہے اور یہ دنیا کا حسین ترین مجسمہ مانا گیا ہے۔)

دوسری جانب کی دوار کے ساتھ نہایت حسین تراش کے اصفہانی خنجر لٹک رہے تھے جن کے دستوں پر ہیرے جگمگا رہے تھے۔ قدیم مصری معبدوں میں عبادت کے کام آنے والے پراسرار ظروف جن پر قیمتی پتھر جڑے ہوئے تھے اور جانے کیا کیا یہاں موجود تھا۔ دیواروں پر قدیم مصری زبان میں ایک تاریخ کندہ تھی۔

اگر میں یہ زبان سمجھتا ہوتا تو نہ جانے کتنے اسرار میرے سامنے فاش ہو جاتے۔ مگر یہ بے ربط تصویریں میری سمجھ سے بالا تھیں۔ مگر یہ ماحول کچھ ایسا پراسرار' اثر انگیز تھا کہ میرے اعصاب پر سحر انگیز کیفیت اتر پڑی۔ ہمارے اطراف عجیب سرسراہٹیں بے دار ہو گئی تھیں گویا صدیوں پرانی روحیں ہماری آمد پر مضطرب ہو گئی ہوں اور مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میں لمحوں کے سفر سے صدیوں کا فاصلہ طے کرتے ہوئے ماضی کے ان دھندلکوں میں آپہنچا ہوں..... جہاں "اخناتون" زندہ تھا۔ جہاں اس کی ماں "طیبہ" تھی۔ جہاں اس کی بیوی "نوفرتیت" تھی۔

اخناتون کا اصل نام "آمون ہوتپ چہارم" تھا۔ اسے آمون سے اخناتون بنانے والی اس کی ماں "طیبہ" تھی اور طیبہ' رع دیوتا کے پہلے بڑے پجاری "اتریکا" کی بیٹی تھی اور کبھی خود بھی رع دیوتا کے معبد میں ایک پجارن رہی تھی۔

میں نے مشہور مورخ جوزف وارڈ کی ایک تصنیف میں پڑھ رکھا تھا کہ طیبہ شروع میں پجارن تھی اور اس کا بڑا بھائی بھی رع کے معبد میں پجاری تھا۔ لہٰذا طیبہ شروع ہی سے "آمون دیوتا" کے بجائے رع دیوتا کی طرف مائل تھی اور اس کی ساری ہمدردیاں رع دیوتا کے نام تھیں۔

طیبہ کی شادی کے کچھ ہی عرصہ بعد اس کا باپ مرگیا لہٰذا رع دیوتا کے معبد کا بڑا پجاری "اتریکا" کے بیٹے اور طیبہ کے بڑے بھائی کو بنادیا گیا۔

طیبہ رع دیوتا سے ایسی رغبت اور محبت رکھتی تھی کہ جب اس کے ہاں اس کا بیٹا آمون ہوتپ چہارم پیدا ہوا تو اس نے اسے رع دیوتا کے معبد میں اپنے بھائی کے پاس بھیج دیا تاکہ اس کی پرورش رع دیوتا کے پجاریوں کی نگرانی میں ہو۔ اور وہ رع دیوتا کا معتقد بن کر

رہے لیکن جلد ہی طیبہ کا بڑا بھائی اور رع دیوتا کے معبود کا بڑا پجاری مر گیا اور اس کی جگہ "آئی" نام کے پجاری کو رع دیوتا کا بڑا پجاری بنایا گیا۔ لہٰذا طیبہ نے آمون ہوتپ چہارم کو آئی کے حوالے کر دیا۔ آمون ہوتپ چہارم اکثر آئی کے ہاں ہی رہتا تھا۔ آئی کی ایک بیٹی تھی "نوفرتیت" اکٹھے رہنے کی وجہ سے یہ دونوں ایک دوسرے کو پسند کرنے لگے۔ لہٰذا کم سنی میں ہی ان کی شادی کر دی گئی۔ جب آمون ہوتپ چہارم اپنے باپ آمون ہوتپ سوئم کی موت کے بعد بادشاہ بنا تو اس کی ماں نے اسے ایک روز بلا کر کہا۔

"اے میرے بیٹے! رع دیوتا کا پرانا نام "آتون" ہے۔ جس کے معنی ہیں "سورج" قدیم دور میں رع کی پرستش "آتون" کے نام سے ہی کی جاتی تھی اب لوگ رع کے اس پرانے نام کو بھولتے جا رہے ہیں لیکن میں اس کے اس پرانے نام کو دوبارہ شہرت دے کر زندہ کروں گی لہٰذا اے میرے بیٹے! آج سے تیرا نام آمون ہوتپ نہیں بلکہ "اخناتون" ہے۔ اے میرے بیٹے! اخناتون کے معنی ہیں "آتون دیوتا کی روح۔" اور یوں آمون ہوتپ چہارم اخناتون بن گیا۔

میری سحر زدہ نظریں دوبارہ کمرے کے وسط میں موجود سونے کے پلنگ پر رکھے سیاہ آبنوسی تابوت پر مرتکز ہو گئیں۔ اس خیال سے ہی نظام تنفس گڑبڑا گیا تھا کہ اس سیاہ تابوت میں ایک صدیوں پرانی لاش پڑی ہے! ہم سب آہستہ آہستہ قدموں سے آگے بڑھے، سب عجیب سنسنی خیز کیفیت کا شکار تھے اور یوں قدم اٹھا رہے تھے کہ اگر ہلکی سی آہٹ بھی پیدا ہوئی تو تابوت کے اندر موجود ہستی ڈھکن اٹھا کر باہر نکل آئے گی۔

مزدور پھٹی پھٹی آنکھوں سے کمرے میں موجود ساز و سامان کو دیکھ رہے تھے۔ ایک ایک چیز سے ہیبت ٹپک رہی تھی۔ مزدور سونے کے پلنگ کو چھو چھو کر محسوس کر رہے تھے۔ تابوت کے ڈھکن پر ہیروں کو ترتیب وار انداز میں جوڑ کر کوئی نام لکھا گیا تھا۔ یقیناً اس کا جس کی لاش اس تابوت میں موجود تھی۔

"صاحب جی! اب کیا کرنا چاہیے۔ کیا اس تابوت کو کھولا جائے؟" ایکیلاس کا لب و لہجہ جانے کن احساسات کی وجہ سے بدلا ہوا تھا۔

میں نے ایک طائرانہ نظر سے کمرے میں موجود تمام اشیاء کا جائزہ لیا پھر جواب دیا۔

"ایکیلاس ایسا کرو اس تابوت کو اٹھوا کر مرکزی راہداری میں لے چلو اسے وہیں چل کر کھولیں گے اور عبدل تم باقی کا تمام سامان سمیٹ لو۔" میری بات پر تمام مزدور حرکت میں آ گئے۔ چند مزدور ایکیلاس کے ساتھ تابوت پلنگ سے نیچے اتارنے لگے اور چند مزدور عبدل کے ساتھ دیگر ساز و سامان سمیٹنے لگے۔

کمرے سے نکلنے کے بعد اندیشہ تو تھا کہ مرکزی راہداری تک پہنچنے کے لیے بڑی مغز ماری کرنا پڑے گی مگر ایسا نہیں ہوا ہم با آسانی راہداری میں نکل آئے۔ یہ راہداری کا آخری حصہ تھا جہاں کہ فرش پر یوساف کا خون جما ہوا تھا۔ حیرت، سنسنی اور خوف کے ملے جلے احساسات خون میں گھس گئے مگر ہم بغیر رکے اہرام کے بند دروازے کی سمت بڑھ گئے۔ تابوت اچھا خاصا وزنی تھا۔ یوں جیسے اس کے اندر ایک بے جان وجود نہیں بلکہ پتھر بھرے ہوئے ہوں۔

مردہ صدیاں بے دار ہو اٹھی تھیں۔ ہزاروں سال سے ساکت وقت کی نبضیں پھر سے چل پڑیں صدیوں پہلے وقت کا رک جانے والا دل پھر سے دھڑک اٹھا تھا۔ ہزاروں سال کے درمیان حائل اسرار کی دیواریں گویا تحلیل ہو گئیں، رگ و جاں میں ایک عجیب کیفیت طاری تھی۔ ہزاروں سال پرانا ماضی اور حال سمٹ کر آپس میں مدغم ہو رہے تھے اور اس سچویشن نے میرے دل و دماغ پر ایک ایسی انوکھی کیفیت طاری کر دی تھی کہ جو بیان کی حدود و قیود سے ماورا ہے ایک..... ایک انجانی سی خوشی تھی، ایک خوف، اضطراب، سنسنی، حیرت، تجسس، پریشانی یہ سب کیفیتیں مل کر ان کے یکجان ہونے کے بعد جو کیفیت جنم لیتی ہو گی ان لمحوں میں اسی کیفیت کے زیر اثر تھا۔

تمام مزدور بھی خاموش چل رہے تھے۔ سب کی زبانیں گنگ تھیں۔ ہونی ہی تھیں؟ فرعونوں کا جاہ و حشم..... ظلم و ستم..... سحر و اسرار..... طمطراق!

اہرام کے بند دروازے کے پاس پہنچ کر تابوت فرش پر رکھ دیا گیا۔ برنجی مجسمے اور دیگر نوادرات بھی ایک طرف ڈھیر کر دیے گئے۔

"صاحب جی! کیا اس میں کسی فرعون کی ممی ہے؟ کیا اب اسے کھولیں گے؟ یا یونہی یہ یہاں پڑا رہے گا۔" عبدل نے مجھے مخاطب کیا۔

"اسے یہاں تک اٹھا کر لائے ہیں تو اس کے اندر بھی جھانک کر ضرور دیکھیں گے کہ اس میں استراحت فرمانے والی ہستی ہے کیسی؟ اسی کے باعث تو ہم موت کے بھیانک جبڑوں میں پھنسے ہیں۔" میں نے کہا اور تابوت پر جھک گیا۔ تابوت کو بند کرنے کے لیے ڈھکن میں بارہ پیتل کے کھیل ٹھونکے گئے تھے۔ میں نے نوادرات میں سے ایک خوفناک شکل کا بھاری خنجر اٹھایا اور کیل نکالنے کی کوششیں کرنے لگا۔ میری دیکھا دیکھی عبدل، ایکیلاس اور مزید دو مزدور بھی اس کوشش میں مصروف ہو گئے۔ خنجروں کی دھار سے کیلوں کے آس پاس سے تابوت کی لکڑی تھوڑی تھوڑی چھیلنا پڑ رہی تھی اس کے بعد ابھر آنے والی کیل کی کیپ کے نیچے خنجر پھنسا کر کیل کو لکڑی سے کھینچنا بڑا وقت طلب کام تھا۔ مگر ہم نے ہمت نہیں ہاری اور اپنی کوششوں میں لگے رہے۔

مزدور کھانس رہے تھے، کھنکار رہے تھے مگر صورت حال کی سنگینی کو وہ پوری طرح محسوس نہیں کر رہے تھے۔ مگر میری تشویش بڑھتی جا رہی تھی۔ ان کی کھانسی میرے دماغ میں خطرے کے الارم بجا رہی تھی۔ زندگی کی روشنی بڑی برق رفتاری سے ان سے دور ہو رہی تھی اور موت کے اندھیرے بڑی سرعت سے بڑھے آ رہے تھے اور اب تو میرے اپنے حلق اور نتھنوں میں جلن شروع ہو گئی تھی یوں لگ رہا تھا جیسے ناک کی اندرونی جلد سلگنے لگی ہو۔

ہم پانچ افراد تابوت میں سے کیل نکالنے میں مصروف تھے جب کہ باقی کے مزدور قریب خاموش کھڑے تھے۔ پھر سب سے پہلے ایکیلاس کیل نکالنے میں کامیاب ہوا۔ اس کے حلق سے مسرت انگیز آواز خارج ہوئی اور آنکھوں میں چمک سی ابھر آئی۔

پیتل کا وہ کیل تقریباً" چھ انچ لمبا تھا۔ دوسرا کیل عبدل نے نکالا۔ تیسرا میں نے اور پھر ایک ایک کر کے کیل نکلنے لگے۔ انگلیاں دکھنے لگی تھیں، بازوؤں میں اینٹھن ہونے لگی اور آخر کار کوئی گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ کی مشقت کے بعد ہم تمام کیل تابوت سے نکال لینے میں کامیاب ہو گئے۔ اب تابوت کا ڈھکن بجز کسی دقت کے اٹھایا جا سکتا تھا۔

مزدوروں کے چہروں پر سراسیمگی کے تاثرات امنڈ آئے۔ سب کی نظریں کبھی میری جانب اٹھتیں اور کبھی تابوت پر جم جاتیں جیسے اس میں سے ملک الموت آزاد ہونے والا ہو۔

میں پسینہ صاف کرتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔

"عبدل..... ایکیلاس..... ڈھکن ہٹا دو۔" میری بات پر ایک لمحے کو دونوں ہچکچائے پھر تابوت پر جھک گئے۔ اس سے پہلے کہ وہ ڈھکن ہٹاتے ایک مزدور تقریباً" چیخ اٹھا اور ہم سب ہی ہڑبڑا گئے۔

"نن..... نہیں! یہ..... یہ ڈھکن نہیں ہٹانا..... تابوت مت کھولنا۔ ایکیلاس اس سندر لاش کو بے پردہ نہیں کرو، ورنہ ہم کسی مصیبت کا شکار ہو جائیں گے۔" اس کے اس طرح اچانک چیخنے پر ایک ذرا تو ہم بوکھلا کر رہ گئے کہ یہ کیا افتاد آن پڑی ہے مگر پھر اس کی بات سن کر ایکیلاس ناگوار لہجے میں اس سے مخاطب ہوا۔ "یاغان یہ کیا حماقت ہے؟ کیا ہم پہلے مصیبت کا شکار نہیں ہیں۔ اب اور بھلا کیا مصیبت ہمیں شکار بنائے گی!"

"نہیں خدا کے لیے تم یہ تابوت مت کھولو ایکیلاس ورنہ اور کوئی بڑی مصیبت نازل ہو جائے گی ہم..... ہم کسی عذاب میں مبتلا ہو جائیں گے..... تم یہ ڈھکن مت ہٹاؤ۔"

"ہو لینے دو عذاب نازل، بھگت لیں گے۔ ویسے

بھی اب ہم یہاں سے زندہ سلامت تو باہر نکل نہیں پائیں گے۔ مرنے سے پہلے کسی عذاب سے بھی دل لگی ہو جائے تو یہ بھی زندگی کا بخشا اعزاز ہوگا..... پکڑو عبدل اٹھاؤ ڈھکن۔" آخری الفاظ اس نے عبدل کو مخاطب کرکے کہے۔

"نہیں ایکیلاس....." یاغان حلق کے بل چیخا تو اسے کھانسی کا دورہ پڑ گیا اور وہ کھانستا ہوا ایک طرف راہداری کی دیوار کے ساتھ گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔

ایکیلاس اور عبدل نے تابوت کا ڈھکن تھام لیا۔ میں تابوت کے قریب ہی کھڑا تھا اور میرا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ اندر صرف ایک مردہ وجود' ایک لاش ہوگی اس کے باوجود مجھے ایک انجانا سا خوف محسوس ہو رہا تھا اور یوں لگ رہا تھا کہ جیسے راہداری میں ہمارے اردگرد نادیدہ وجود منڈلانے لگے ہوں۔

ایکیلاس اور عبدل نے ایک جھٹکے سے تختہ اٹھا کر ایک طرف پھینک دیا۔ صندل اور کافور کی تیز خوشبو آزادی ملتے ہی راہداری میں پھیل گئی۔ سب کے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے اور ایک دوسرے کی صورت دیکھنے لگے' ہمارا تو خیال تھا کہ اندر سر تا پا سفید پٹیوں میں ملفوف ایک وحشت ناک لاش لیٹی استراحت فرما رہی ہوگی مگر اندر کوئی لاش تو نہ تھی..... تابوت میں کسی ممی کی بجائے ایک مجسمہ لیٹا ہماری شکلیں دیکھ دیکھ کر مسکرا رہا تھا جیسے ہمارا مذاق اڑا رہا ہو۔ کسی حسین ترین دوشیزہ کا خالص سونے کا بنا ہوا مجسمہ سرچ لائٹوں کی روشنی میں چمک رہا تھا۔ بنانے والے نے غضب کی چیز بنائی تھی۔ جیسے کہ اپنی تمام زندگی اس ایک مجسمے پر ہی خرچ کر گیا تھا۔

ایک نظر میں تو یہی لگتا تھا جیسے جیتی جاگتی کسی دوشیزہ پر سونے کی پالش کرکے اسے تابوت میں لٹا دیا گیا ہو۔ ایک ایک عضو کو اس دلجمعی اور محبت سے ڈھالا گیا تھا کہ یقین نہ آئے' وہ مجسمہ خواب وصل جیسا نشہ انگیز تھا۔ اس کے چہرے پر طلسمات جہاں کا سا صیقل پن اور جلا تھی..... اس کی ساکت بے جان آنکھوں میں شمع شبستان اور اسرار خمستان جیسی رعنائی اور کشش تھی۔ تابوت کا ڈھکنا ہٹتے ہی یوں لگا جیسے راہداری میں حسن کا سیلاب' روح کی شادمانی اور صولت و سطوت پھیل گیا ہو۔ ایک نشہ پرور..... حواس سلب..... ایک پاگل کر دینے والی مسکراہٹ اس دوشیزہ کے ہونٹوں پر ثبت کر دی گئی تھی۔ ان لمحات میں ایک نظم پوری شدت کے ساتھ میرے دماغ میں گردش کر رہی تھی۔

اے سیہ فام حسینہ تیرا عریاں پیکر
کتنی پتھرائی ہوئی آنکھوں میں غلطیدہ ہے
جانے کس دور المناک سے لے کر اب تک
تو کڑے وقت کے زندانوں میں خوابیدہ ہے
تیرے شبرنگ ہیولے کے یہ بے جان نقوش
جیسے مربوط خیالات کے تانے بانے
یہ تیری سانولی رنگت یہ پریشان خطوط
بارہا جیسے مٹایا ہو انھیں دنیا نے
ریشۂ سنگ سے کھنچی ہوئی زلفیں جیسے
راستے سینۂ کہسار پہ بل کھاتے ہوں
ابروؤں کی جھکی محرابوں میں جامد پلکیں
جس طرح تیر کمانوں میں الجھ جاتے ہیں
منجمد ہونٹوں پہ سناٹوں کا سنگین طلسم
جیسے نایاب خزانوں پہ کڑے پہرے ہوں
تند جذبات سے بھرپور برہنہ سینہ
جیسے ستانے کو طوفان ذرا ٹھہرے ہوں
جیسے یونان کے مغرور خداوندوں نے
ریگزاران حبش کی کسی شہزادی کو
تشنہ روحوں کے ہوسناک تعیش کے لیے
حجلۂ سنگ میں پابند بنا رکھا ہو

فرق صرف سنگ اور دھات کا تھا۔ ہم سب بے خودی کے عالم میں یک ٹک اسے دیکھے جا رہے تھے۔ کتنی مضحکہ خیز بات تھی مگر وہ مجسمہ اپنے اندر اتنا ہی حسن اور اتنی ہی دلکشی سمیٹے ہوئے تھا کہ دیکھنے والی ہر آنکھ پر از خود بے خودی طاری ہو گئی تھی۔

میں سوچ رہا تھا کہ یہ مجسمہ ہے' اگر یہی دوشیزہ

خود دوبدو آ جائے تو کیا دل پھٹ تو نہ جائے گا؟

"صاحب! اس پر بھی کوئی قدیم تحریر کندہ ہے۔" ایکیلاس تابوت پر جھک کر مجسمے کو بغور دیکھتے ہوئے گویا ہوا تو میں بھی جھک گیا۔ واقعی مجسمے کے پورے وجود پر باریک نقش و نگار بنے ہوئے تھے۔

"صص..... صاحب' صاحب جی....." ایک دہشت زدہ آواز پر میں چونک پڑا اور پھر جو منظر میں نے دیکھا اس نے میرے رونگٹے کھڑے کر دیے۔ راہداری کی دیوار کے ساتھ یاغان آڑا ترچھا سا بے حس و حرکت پڑا تھا اس کی پھٹی ہوئی آنکھیں چھت کی جانب مرتکز تھیں اور ناک منہ سے باریک باریک سرخ لکیروں کی صورت خون رس رہا تھا۔ وہ دم توڑ چکا تھا۔ موت کی دیوی نے اپنے کھیل کا آغاز کر دیا تھا۔ ایک جام زندگی کی شراب سے خالی ہو گیا تھا اور باقی اپنی باری کے منتظر تھے۔

بے بسی کی کربناک موت کے تصور سے ہی ہم سب کے چہروں پر زردیاں کھنڈ گئیں۔ اجسام کے زندانوں میں مقید روحیں کسمسانے لگیں اور کسمساہٹ کے اس ارتعاش نے ہمارے تمام حوصلے اور بے فکری کے تمام نقوش کھرچ کر رکھ ڈالے' اسرار کھوج نکالنے کا تمام تجسس جیسے پل بھر میں کہیں تحلیل ہو گیا اور ہمیں اپنی زندگیوں کی بقا کی فکر نے دبوچ لیا۔

ہم میں سے کسی کو بھی اپنے ایک ساتھی کی موت کا کوئی تاسف نہیں تھا بلکہ اپنی اپنی فکر تھی کیونکہ وہ ایک ساتھی ہمارے لیے آئینہ بن گیا تھا اور ہم اس آئینے میں اپنا انجام دیکھ رہے تھے۔

"صاحب جی! انسان کوشش کرے تو کیا نہیں ہو سکتا؟ ہمیں اس اہرام میں مدفن نوادرات کو بھول کر اپنی زندگیوں کے لیے تگ و دو کرنا چاہیے۔ زندگی ہے تو ایسے سینکڑوں اہرام کھنگالے جا سکتے ہیں اور اگر زندگی نہ رہے تو ان تابوتوں اور مجسموں سے کیا حاصل؟" عبدل کا لہجہ بہت بجھا بجھا سا تھا۔

میں خاموشی سے ہونٹ کاٹتا رہا تو عبدل دوبارہ گویا ہوا۔ "صاحب جی مایوسی گناہ ہے' ناامیدی کفر ہے۔ ہمیں کوشش کرنا چاہیے شاید خلاصی کی کوئی راہ سجھائی دے جائے۔"

"کدھر سے راہ سجھائی دے گی عبدل؟ تم ہی بتا دو میری عقل تو کام نہیں کر رہی۔"

"صاحب جی آپ دروازے کا معائنہ کریں پتا نہیں کیوں میرا دل کہتا ہے کہ یہ اندر سے بھی کھل سکتا ہے اور اس کا کوئی نہ کوئی طریقہ کار ضرور ہوگا۔" میں نے ایک ذرا عبدل کی جانب دیکھا۔

"عبدل ٹھیک کہہ رہا ہے صاحب جی! کوشش کرنے میں کیا حرج ہے؟" ایکیلاس نے بھی عبدل کے خیال کی تائید کی تو میں اہرام کے بند دروازے کی سمت بڑھ گیا۔ عبدل' ایکیلاس اور تمام مزدور بھی میرے ساتھ ہی دروازے کے سمت بڑھے۔ مجھے یقین تھا کہ یہ دروازہ کسی صورت نہیں کھلے گا' دروازے کی جگہ موجود چٹان کسی طرح بھی اپنی جگہ سے نہیں ہٹے گی۔ اس کے باوجود میں دروازے کی جگہ موجود اس ٹھوس چٹان کا جائزہ لینے لگا جس نے ہم پر زندگی کے راستے بند کر دیے تھے۔

کہیں کوئی درز' کوئی ہلکا سا رخنہ تک نہیں تھا۔ ایک سپاٹ پتھریلی دیوار تھی۔ میں نے اس دیوار کے مختلف حصے ٹٹولنے اور دبانے شروع کر دیے۔ کافی دیر کی کوشش کے باوجود کوئی نتیجہ نہیں نکلا تو میں اضطراری طور پر ٹہلنے لگا۔ تمام مزدور آنکھوں میں امید و بیم کی تصویریں سمیٹے میری جانب دیکھ رہے تھے۔

گھٹن اور حبس کا احساس ہر لحظہ قوی ہوا جا رہا تھا۔ سینے میں جیسے درد بوجھ بن کر بیٹھا جا رہا تھا اور سانسوں میں کسی نے گندھک کا تیزاب پھونک دیا تھا۔

حلق میں خارش' نتھنوں میں ایک عجیب سی جلن شروع ہو گئی تھی۔ روحیں گویا اجسام کی صلیبوں پر مصلوب ہو کر رہ گئی تھیں۔ اطراف میں بھی موت کے نادیدہ سائے رقصاں تھے اور وجود کے اندر بھی.....

باقی آئندہ شمارے میں

رودادِ قفس

روشنی بخاری

آماج

سبزہ سبزہ سوکھ رہی ہے پھیکی زرد دوپہر
دیواروں کو چاٹ رہا ہے تنہائی کا زہر
دور افق تک گھٹتی' بڑھتی' اٹھتی' گرتی رہتی ہے
کہُر کی صورت بے رونق دردوں کی گدلی لہر
بستا ہے اس کہُر کے پیچھے روشنیوں کا شہر

زنداں کی بلند دیواروں کے اس پار کی دنیا بہت حسین ہوتی ہے ڈھیروں مناظر نظروں سے گزرتے ہیں آوازیں سماعتوں سے ٹکراتی ہیں آزاد اور پرلطف زندگی چاروں طرف رقصاں ہوتی ہے۔ آزادی ایک حسین اور تابناک چیز ہے اس کی قدر و قیمت و اہمیت اس سے پوچھیں جس پر جیل کی چھوٹی سی دنیا میں کائنات محدود کردی جاتی ہے۔
کرن میں ــــ نیا سلسلہ "رودادِ قفس" کے نام سے شروع کیا ــ ہے۔ جیلوں میں قید خواتین کے حالات و واقعات پر مبنی۔ آخر ایسے کون سے مسائل و حالات تھے جن کی وجہ سے وہ قید و بند کی صعوبتیں اٹھانے پر مجبور ہوئیں۔ اس سلسلے کی کوئی کہانی آپ کے پاس ہے تو ہمیں روانہ کریں۔ ہم نوک پلک سنوار کر اسے شائع کریں گے۔

"تڑاخ" شیزہ کا ہاتھ گھوما تھا اور بوڑھی ملازمہ اچھل کر نیچے گر گئی۔
پاس ہی کھڑا اشرفو جو قینچی کی مدد سے پودوں کی کاٹ چھانٹ میں مصروف تھا' اس نے چونک کر ادھر دیکھا' وہ اس وسیع و عریض کوٹھی جسے "شیزہ لاج" کا نام دیا گیا تھا' میں پچھلے دو سال سے بطور مالی اپنے فرائض سرانجام دے رہا تھا' اس نے چند لمحوں تک جیسے صورت حال کو سمجھنے کی کوشش کی' جوں ہی اسے معاملے کی نزاکت کا احساس ہوا اس نے فوراً" چہرہ گھما لیا اور پوری تندہی سے اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔
"ہونہہ ..... بگڑے ہوئے باپ کی بگڑی ہوئی اولاد۔" وہ بے اختیار بڑبڑا اٹھا۔
اسے بوڑھی بانو کے ساتھ شیزہ کا یہ سلوک پسند نہیں آیا تھا اور اسے ہی کیا چوکیدار زمان خان' خانساماں' انور علی اور گھر کی صفائی ستھرائی پر مامور ملازمہ ثریا کو بھی اس کے یہ انداز و اطوار ایک آنکھ نہیں بھاتے تھے۔ لیکن وہ سب کے سب جانتے تھے کہ "نوکری تے نخرہ کی۔" "نوکر انسان تھوڑی ہوتے ہیں۔ وہ تو بے چارے بھیڑ بکریوں کی طرح بے زبان قسم کی مخلوق ہوتے ہیں' جن کو نہ تو زیادہ سننے کی اجازت ہوتی ہے اور نہ ہی لب کشائی کی' سب کچھ دیکھتے ہوئے بھی آنکھیں بند رکھنے والے لوگ ہی اعلا پائے کے ملازم ثابت ہوتے ہیں' اشرفو نے آزردگی سے سوچا۔
اس کے اندر کی کیفیات جو بھی رہی ہوں' لیکن مجال تھی کہ ان خیالات کے عکس کی معمولی سی جھلک بھی اس کے چہرے سے ظاہر ہو جاتی۔ وہ اس طرح سے اپنے کام میں مصروف تھا جیسے کچھ ہی فاصلے پر موجود چیختی چنگھاڑتی شیزہ کے وجود سے یکسر لاعلم ہو اور

ناولٹ

اسی کا نام تو نوکری تھا' مالکوں کی کسی بات میں وہ کوئی دخل دے بھی تو نہیں سکتا تھا۔ وہ دل مسوس کر رہ گیا! ادھر شیزہ' بانو پر برس رہی تھی۔
"جب تمہیں پتا ہے کہ میں ٹھیک گیارہ بجے بیڈ ٹی لیتی ہوں تو تم چائے لے کر کیوں نہیں آئیں ایڈیٹ! ڈیڈی نے بھی اس گھر کو چڑیا گھر بنا رکھا ہے' بھانت

بھانت کے ملازم بھرتی کر رکھے ہیں، جنہیں وقت کی پابندی کا کچھ احساس ہی نہیں، نان سینس۔" اس نے غصے سے پاؤں پٹخے اور پھر بکتی جھکتی واپس اپنے بیڈ روم کی طرف چلی گئی، بانو نے زمین پر بکھرے ہوئے وجود کو سمیٹا اور پھر کپڑے جھاڑتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی، اب وہ فرش پر بکھرے ہوئے کپ کی کرچیاں اکٹھی کر رہی تھی جو شیزہ کا تھپڑ وصول کرنے سے قبل اس کے ہاتھ میں تھا اور اب ٹکڑوں کی شکل میں بٹ چکا تھا۔

"زیادہ چوٹ تو نہیں آئی بانو؟" شرفو نے ہمدردی سے پوچھا۔

"چوٹ تو دل پر لگی ہے شرفو! گاؤں میں میری بیٹی کے گھر والے نے اُسے مار مار کر ادھ موا کر دیا ہے، نشہ کر کے آتا ہے اور میری پھول سی معصوم زبیدہ کو دھنک کر رکھ دیتا ہے۔ بے چاری مار کھا کھا کر اب تو جینے کے لائق ہی نہیں رہی، اسی کا فون آگیا تھا، جس کے دکھڑے سنتی میں بدنصیب آج چائے دینے میں دس منٹ کی دیر کر بیٹھی اور شیزہ بی بی نے۔۔۔" بانو سسکیاں لیتے ہوئے رونے لگی۔

"رومت پگلی! غریب تو پیدا ہی مار کھانے کے لیے ہوتا ہے، کبھی غربت کی، کبھی تقدیر کی، تو کبھی ان صاحب لوگوں کی، یہ ساری مقدروں کی کھیل ہے، تو دل چھوٹا نہ کر، جا، جا کے اور چائے بنا کر شیزہ کو دے۔" بانو اپنی آستین سے آنسو پونچھتی ہوئی کچن کی طرف بڑھ گئی، شرفو اپنا کام ختم کر چکا تھا۔ اور اب اسے حسب دستور چوکیدار زمان خان سے گپیں لگانے کے علاوہ اور کوئی کام نہ تھا۔

"یار زمان خان! یہ اپنی شیزہ بی بی بہت ہاتھ چھٹ ہیں، ابھی اپنی ماں کی عمر کی بے چاری بانو کو ایسا زناٹے دار تھپڑ رسید کیا کہ وہ بے چاری کتنی دیر تک زمین سے اٹھ ہی نہ سکی۔" شرفو کے لہجے میں دکھ ہی دکھ جیسے کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا، زمان خان نے اپنے مخصوص انداز میں شرفو کی طرف دیکھا اور پھر مونچھوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے گویا ہوا۔

"اوئے خوچے تم تو ابی دو سال سے اور نوکری موکری کرتی ہے، ام پچھلا آٹھ سال سے اور نوکری کرتی ہے، شیزہ میم صاب سب کا ساتھ یہ ہی سلوک کرتا ہے، تین سال پہلے اس نے رشید بٹلر کو اتنا مارا تھا کہ بے چاری کا ایک آنکھ ضائع ہو گیا، پھر اس کے بعد کھانساماں انور علی بھی دو تین بار شیزہ میم صاب سے تھپڑ کھا چکی ہے، ام تو میم صاب کا سامنے ہی نہیں جاتا۔" چوکیدار زمان خان نے شرفو کی معلومات میں اضافہ کیا۔ تو وہ حیران نظروں سے اس کی طرف دیکھتا رہ گیا۔ پھر ایک لمحہ توقف کے بعد شرفو دوبارہ گویا ہوا۔

"یہ تو ظلم ہے یار، بڑے صاحب بھی کچھ نہیں کہتے؟"

زمان خان نے پوری توجہ سے اس کے الفاظ کو سنا، ایک مرتبہ پھر مونچھوں کو سہلایا، شاید بار بار ہاتھ لگا کر وہ یہ محسوس کرنے کی کوشش کرتا تھا کہ مونچھیں ابھی تک اس کے چہرے پر ہی موجود ہیں یا کہیں فرار ہو گئیں، پھر مطمئن ہو کر جیب سے نسوار کی ڈبیا نکالی اور پھر نسوار کا گولا سا بنا کر اپنے نچلے ہونٹ کے نیچے دباتے ہوئے مفکرانہ انداز میں بولا۔

"یار! شرفو خاناں یہ صاب لوگ اپنی عورتوں سے بہت ڈرتی ہے، وہ کچھ نہیں بولتی، ام لوگو کو اپنا حفاظت خود کرنا پڑتا ہے، سمجھا؟" اور شرفو محض سر ہلا کر رہ گیا۔ اس بات سے بے خبر کہ ان سے کچھ ہی فاصلے پر کھڑے سیٹھ راشد ان کی گفتگو سن چکے تھے۔

☼ ☼ ☼

اکانومی کلاس کا یہ اپارٹمنٹ اس وقت کھچا کھچ بھرا ہوا تھا، ٹرین اپنی پوری رفتار سے دوڑی چلی جا رہی تھی، جینز اور جیکٹ میں ملبوس وہ خوب صورت لڑکی چار سواریوں کے لیے مخصوص اس سیٹ کی کھڑکی والی سائیڈ پر بیٹھی ہوئی تھی، اس کے لمبے کھلے لائٹ براؤن بال کھڑکی سے آنے والی ہوا کی وجہ سے بار بار بکھر کر اس کے سرخ سپید چہرے پر پروانہ وار نثار ہو رہے تھے۔ لیکن وہ بار بار خفگی کے انداز میں انہیں واپس سمیٹ لیتی، برابر کی سیٹوں پر بہت سے لوگوں کا

ایک جم غفیر تھا، اس کی سیٹ پر بھی اس کے قریب ایک دھان پان اور منحنی سے وجود والی عورت براجمان تھی جس کے ساتھ آٹھ نو بچے بھی تھے جن کو اس نے زبردستی وہاں پھنسا رکھا تھا۔

برتھ کے اوپر بھی تین بچے موجود تھے۔ دو تین اس کے ساتھ ہی سیٹ پر بیٹھے ہوئے تھے اور ایک ننھا سا بچہ اس کی گود میں بھی تھا۔ اس کی نظر اس قافلے سے ٹکرائی تو وہ حیران رہ گئی، نو کے نو بچے سال سال کی درجہ بندی کے مطابق تھے۔ وہ دل ہی دل میں اس عورت کی ہمت و استقامت کی داد دیے بغیر نہ رہ سکی اور پھر اتنے سارے بچوں کی نگہداشت بھی تو مسئلہ کشمیر سے کم نہ تھی؟ لیکن بہرحال ایسا ہوتا تو تھا! نہ جانے اور کتنی عورتیں اسی طرح کی زندگی گزار رہی تھیں، جن میں سے ایک شاید وہ بھی تھی اور سب سے حیرت کی بات یہ تھی کہ سارے کے سارے بچے بالکل پرسکون تھے اور بچے تو بچے اور موصوفہ خود بھی خاصی مطمئن دکھائی دیتی تھیں۔ وہ بار بار شاید غنودگی کے عالم میں جھکولے کھاتے ہوئے اس کے وجود سے ٹکراتی اور پھر یک دم ہڑبڑا کر سیدھی ہو جاتی، لیکن زیادہ دیر تک سیدھی بیٹھی نہ رہ سکتی اور آہستہ آہستہ جھکولے لیتے ہوئے پھر اس کے وجود سے ٹکراتی لڑکی شاید اس صورت حال سے کچھ زیادہ خوش نہیں تھی، کیونکہ جوں ہی منحنی وجود کی اس عورت کا سر جھکولا کھا کر اس کے کندھے سے ٹکراتا اس کے ہونٹ سکڑ جاتے، وہ ناپسندیدہ نظروں سے اس کمزور عورت کی طرف گھورتی، لیکن اس اثنا میں وہ عورت سیدھی ہو جاتی۔ لیکن بہرحال لڑکی خاصی کوفت محسوس کر رہی تھی۔

عورت کا سر ایک مرتبہ پھر اس کے کندھے پر آ ٹکا تھا۔ اس نے غصیلی نظروں سے اسے گھورا، لیکن عورت اس مرتبہ شاید ہڑبڑانا بھول گئی تھی وہ مزے سے اس کے کندھے پر سر ٹکائے یوں آرام فرما رہی تھی جیسے شاید اپنے بیڈ روم میں نرم و گداز بستر پر لیٹی مخملیں تکیے پر سر ٹکائے محو استراحت ہو، اور اس کی آسودگی کا یہ عالم تھا کہ وہ باقاعدگی سے ہلکے ہلکے خراٹے

بھی نشر کر رہی تھی چند لمحوں کے انتظار کے بعد شاید لڑکی کا پیمانہ صبر لبریز ہو گیا اس نے غصیلے انداز میں عورت کو بری طرح جھنجوڑ ڈالا! عورت ہڑبڑا کر بدحواس انداز میں سیدھی ہوئی اور اس کے حلق سے بے ربط سے جملے برآمد ہوئے۔

"کک... کک... کون... کون ہے؟ کون ہے؟"

"میڈم! یہ کندھا میرا ہے' آپ کے اس محبوب شوہر کا نہیں جس کی یاد میں آپ ان بچوں کو تمغوں کی صورت میں سجائے پھر رہی ہیں۔" لڑکی نے اپنا کندھا جھٹکتے ہوئے دانت پیس کر کہا اور وہ عورت ہونقوں کی طرح منہ کھولے اسے دیکھ کر رہ گئی پھر شاید بات پوری طرح اس کی سمجھ میں آ گئی۔

"اے ہائے کیسی باتیں کر رہی ہو؟ یاد میں کیوں اللہ تندرستی دے میں تو ان کی محبت میں لیے پھر رہی ہوں ان معصوموں کو' اگر میرے اجمل کی طرح تمہارا بھی کوئی اتنی محبت کرنے والا شوہر ہوتا تو تم بھی آٹھ دس تمغے تو ضرور لیے پھرتیں پھر پوچھتی میں تم سے۔" عورت نے تنتناتے ہوئے جواب دیا اور لڑکی اس منہ پھٹ عورت کی اس بے ہودہ گوئی پر گڑبڑا کر رہ گئی لیکن دوسرے ہی لمحے اس کی پیشانی پر بل نمودار ہو گئے وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی اور بھڑکتے ہوئے بولی۔

"زبان سنبھال کر بات کرو بڑی بی اپنے تمغے اور اپنا اجمل اپنے پاس رکھو مجھ سے زبان چلانے کی کوشش کی تو تمغوں سمیت اٹھا کر گاڑی سے باہر پھینک دوں گی اور اجمل کو تمہارے مزار پر دیا جلانے کی حسرت ہی رہ جائے گی بلیک بیلٹ ہوں میں کراٹے میں' سمجھیں؟" لڑکی جیسے ہتھے سے اکھڑ گئی تھی اور اس کے تیور بتا رہے تھے کہ اگر عورت مزید کچھ بولی تو وہ واقعی اسے اٹھا کر گاڑی سے باہر پھینک دے گی عورت منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑاتے ہوئے اپنی جگہ دبک کر رہ گئی تھی۔ چند لمحوں تک لڑکی نے وہیں کھڑے ہو کر انتظار کیا لیکن جب عورت کی طرف سے کوئی جواب نہ آیا تو وہ دوبارہ اپنی سیٹ پر بیٹھ کر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔

☼ ☼ ☼

کارنس پر رکھا ہوا تاج محل کا وہ خوب صورت ماڈل جو شاید سنگ مرمر کا بنا ہوا تھا ایک دھماکے کی آواز کے ساتھ نیچے گرا اور ٹوٹ کر کئی ٹکڑوں میں بٹ گیا دھماکے کی اس آواز پر وہ بیڈ پر سے یوں اچھلی تھی جیسے اس کے نیچے اسپرنگ لگے ہوئے ہوں اس نے حیرت اور دکھ کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ ٹکڑوں کی شکل میں بکھرے ہوئے اس حسین تاج محل کی طرف دیکھا جو اب وجود سے عدم وجود میں تبدیل ہو چکا تھا۔

اسے اس تاج محل سے بہت لگاؤ تھا جو تین سال پہلے اس کی کلاس فیلو اور سب سے عزیز دوست حنا نے اسے اس کی برتھ ڈے کے موقع پر گفٹ کیا تھا کچھ عرصہ پہلے حنا کی شادی ہو گئی تھی اور وہ اپنے شوہر اللہ بخش فریدی کے ساتھ اس کا شہر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر اپنے اللہ بخش فریدی کے آبائی شہر اوکاڑہ سیٹل ہو گئی تھی اور ایک دفعہ اوکاڑہ کیا گئی یوں لگا کہ دنیا ہی چھوڑ گئی! کیونکہ اس دن کے بعد سے لے کر آج تک وہ دوبارہ اس کی شکل نہیں دیکھ پائی تھی صرف تاج محل کا خوب صورت ماڈل ہی اس کی ایک واحد یادگار تھا' جو نہیں رہا تھا۔ کیونکہ وہ تو ٹکڑوں کی شکل میں فرش پر بکھرا اس کا منہ چڑا رہا تھا حیرت' افسوس' دکھ جیسی کیفیات سے گزرنے کے بعد اب اس پر ایک ہی کیفیت باقی رہ گئی تھی غصے کی...

شدید غصے کی حالت میں اس نے اس کے ٹوٹنے کا سبب جاننے کے لیے ارد گرد نظریں دوڑائیں تو وہ سبب جلد ہی اس کی سمجھ میں آ گیا کیونکہ کمرے کے ایک کونے میں سکڑی' سمٹی اور سہمی ہوئی ثریا اسے نظر آ گئی تھی جو ہاتھ میں کپڑا تھامے ڈری ڈری نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی' وہ ایک جنون کے عالم میں اس پر جھپٹی اور اسے بری طرح زدوکوب کرنے لگی۔ تھپڑ' لاتیں' گھونسے وہ بے تحاشا اسے پیٹ رہی تھی اور سولہ سترہ سالہ وہ کمزور ملازمہ ثریا اپنے دونوں

ہاتھوں سے اپنے بچاؤ کی ناکام کوشش کرتے ہوئے فریاد کناں تھی۔

"بی بی جی میں نے جان بوجھ کر نہیں توڑا میں... وہ صفائی کر رہی تھی جی... وہ کپڑا اس سے الجھ گیا' مت ماریں بی بی جی یقین کریں میں نے جان بوجھ کر نہیں توڑا۔" لیکن وہ تو جیسے بہری ہو چکی تھی اور ہوتا بھی ایسا ہی تھا غصے کی شدید کیفیت کے وقت اسے اپنے آپ پر قابو ہی کہاں رہتا تھا؟ اور اس وقت بھی غصے کی زیادتی نے اس کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں سلب کر لی تھیں۔

وہ دیوانہ وار اسے مار رہی تھی اور بے چاری ثریا واویلا مچاتے ہوئے کسی فٹ بال کی طرح کمرے میں ادھر سے ادھر لڑھکتی پھر رہی تھی اس کی چیخ و پکار کی آوازیں سن کر شرفو' بانو اور انور علی بھی کھلے ہوئے دروازے تک آن پہنچے تھے اور وہیں کھڑے ہوئے بے چاری ثریا کی درگت بنتے ہوئے دیکھ رہے تھے اتنی جرأت ان میں سے کسی میں بھی نہ تھی کہ وہ کھلے ہوئے دروازے کو کراس کر کے شیزہ کے کمرے میں داخل ہوتے اور اسے اس کی اس دیوانگی سے باز رکھ سکتے...

شیزہ نے اپنے گھٹنے کو موڑ کر پوری قوت سے ثریا کی کمر میں رسید کیا تو وہ بری طرح اچھل کر بیڈ سے ٹکرائی اور نیچے زمین پر آ رہی ٹھیک اسی لمحے دروازے پر کھڑے نظارہ کرتے ملازموں میں ہلچل سی پیدا ہوئی' انہوں نے بے اختیار ایک سمت ہٹتے ہوئے کسی کو راستہ دیا تھا خوب صورت تراش کے ہلکے گرے کلر کے ٹو پیس سوٹ میں ملبوس پچاس پچپن سالہ بارعب شخصیت سیٹھ راشد کے علاوہ اور کسی کی نہ تھی جو شیزہ کے والد تھے' وہ جیسے بھاگتے ہوئے سے کمرے میں داخل ہوئے تھے ٹھیک اسی وقت شیزہ نے ڈریسنگ ٹیبل پر رکھا ہوا سنگ مرمر کا بنا ہوا وہ خوب صورت مجسمہ اٹھایا اور اس کا ہاتھ ہوا میں بلند ہوتا چلا گیا۔

"رک جاؤ..." سیٹھ راشد بلند آواز میں دھاڑے تھے لیکن تب تک تیر کمان سے نکل چکا تھا شیزہ نے وہ چھوٹا سا خوب صورت نیلین ورنلی شکل مجسمہ زمین پر پڑی ثریا کے سر میں دے مارا تھا اور اس کے سر میں روشن دان کھل گیا تھا اس کے سر سے خون بھل بھل بہہ رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

لڑکیوں کا ایک جم غفیر تھا جو اس وقت اس بڑے ہال نما کمرے میں موجود تھا سب اپنی نشستوں پر براجمان ایک دوسرے سے خوش گپیوں میں مصروف تھیں جب جینز اور جیکٹ میں ملبوس کھلے بالوں کے ساتھ وہ خوب صورت الٹرا ماڈرن لڑکی وہاں داخل ہوئی اور ہال میں یکدم سناٹا سا پھیل گیا آپس میں گفتگو کرتی سبھی لڑکیاں چونک کر اس کی طرف متوجہ ہو گئی تھیں۔

آنے والی نے ایک طائرانہ سی نظر وہاں موجود کم و بیش سولہ سترہ لڑکیوں پر ڈالی جو سب کی سب عجیب سی نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھیں اس نے لاپروائی سے کندھے اچکائے اور ایک کونے میں موجود خالی نشست کی طرف بڑھ گئی اور پھر آرام سے اس پر قبضہ جماتے ہوئے ٹانگ پر ٹانگ چڑھا کر بیٹھ گئی اس نے وہاں موجود لڑکیوں کو یوں نظرانداز کر دیا تھا جیسے وہ اس کے نزدیک کیڑے مکوڑوں سے زیادہ اہمیت نہ رکھتی ہوں۔

لڑکیوں نے بھی اس کی اس بے اعتنائی کو محسوس کر لیا تھا اور اب وہ اس کی طرف کن انکھیوں سے دیکھتے ہوئے آپس میں کھسر پھسر کر رہی تھیں شاید انہیں یہ لڑکی بہت عجیب لگی تھی اور تھا بھی ایسا ہی کیوں کہ وہاں موجود سبھی لڑکیوں نے بھڑکیلے اور شوخ کلر کے لباس پہنے ہوئے تھے لیکن ظاہر ہے کہ ان میں سے کسی نے بھی جینز اور جیکٹ زیب تن نہیں کی ہوئی تھی میک اپ اور بناؤ سنگھار پر خصوصی توجہ دی گئی تھی بلکہ ان میں سے بعض تو شاید سیدھی بیوٹی پارلر سے ہو کر آ رہی تھیں لیکن اس کا چہرہ میک اپ سے یکسر بے نیاز تھا اس کا لباس سادہ لیکن ان سب سے بہت مختلف تھا' اس کے باوجود وہ لڑکی ان سب میں

نمایاں اور خوب صورت نظر آرہی تھی۔

لیڈی سیکرٹری کی جاب تھی جس کا اشتہار اخبار میں چھپا تھا انٹرویو کی ڈیٹ اور ٹائم کے مطابق وہ سب کی سب ایک سے بڑھ کر ایک تیاری کے ساتھ آئی تھیں پھران کی کھسر پھسر کو اس وقت یکدم بریک لگ گیا جب ایک چپڑاسی نما آدمی نے آکر انہیں انٹرویو شروع ہونے کی اطلاع دی اور پھر اس کے بعد ایک کے بعد ایک تمام کی تمام لڑکیاں کمرہ امتحان کی طرف جاتیں اور ایک مخصوص وقت کے بعد واپس نمودار ہو کر ہال کمرے سے باہر نکلتی گئیں لڑکیوں کی تعداد تیزی سے کم ہوتی چلی گئی پھر تقریباً گیارہویں نمبر پر اس کی باری آئی۔ اور وہ اٹھ کر اندرونی حصے کی سمت بڑھ گئی اس کی واپسی مقررہ وقت کی نسبت کچھ تاخیر سے ہوئی تھی اس نے ایک نظر رک کر باقی ماندہ لڑکیوں کی طرف دیکھا اور پھر پر اعتماد لہجے میں ان سے مخاطب ہوئی۔

"فیصلہ ہو چکا ہے تم لوگ یہاں بیٹھ کر وقت ضائع نہ کرو بہتر ہے کہ واپسی کا راستہ ناپو۔" لڑکیوں نے حیرت سے اس کے ان الفاظ کو سنا لیکن وہ اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہیں ہوئی تھیں انہیں اس کا یہ جملہ ایک دیوانے کی بڑ سے زیادہ حیثیت کا حامل نہیں لگا تھا وہ رک کر چند لمحے ان کی طرف دیکھتی رہی لیکن جب کوئی رد عمل ظاہر نہ ہوا تو بے نیازی سے کندھے اچکاتے ہوئے بیرونی دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

لڑکیاں یہ بات محسوس کیے بغیر نہ رہ سکیں کہ اس کی چال میں ایک عجیب سی تمکنت اور وقار تھا ایک انوکھا سا احساس تفاخر تھا وہ نپے تلے قدم اٹھاتی ہال کمرے سے باہر نکل گئی اس کے ہونٹوں پر ایک عجیب سی مسکراہٹ کھیل رہی تھی وہ جانتی تھی کہ یہ نوکری اسے مل چکی ہے۔

☼ ☼ ☼
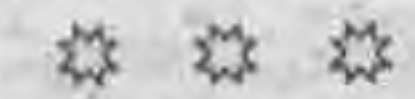
شیزہ کی حالت اس وقت کسی زخمی شیر سے کم نہ تھی وہ غصے سے ہونٹ کاٹتے ہوئے تیزی سے دائیں سے بائیں اور بائیں سے دائیں اپنے کمرے میں چکر کاٹ رہی تھی۔ اسے اپنے ڈیڈی پر شدید غصہ آرہا تھا انہوں نے زندگی میں پہلی مرتبہ اسے تھپڑ مارا تھا! ثریا کی حالت ابھی تک خطرے سے باہر نہیں تھی اور وہ اسپتال کے انتہائی نگہداشت وارڈ میں زندگی اور موت کی جنگ لڑ رہی تھی لیکن اسے اس بات کی کوئی فکر نہیں تھی کوئی پروا نہیں تھی کیونکہ اسے اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا کہ ثریا مرے یا جیے..... فرق پڑا تھا تو یہ کہ اس کے ڈیڈی نے زندگی میں پہلی بار اس پر ہاتھ اٹھایا تھا اسے تھپڑ مارا تھا! اور یہ سب اس بدذات ثریا کی وجہ سے ہوا یہ سوچتے ہی اس کا خون کھول اٹھا نوکروں کا کیا ہے ایک نہیں تو دوسرا سہی اگر ثریا نہیں رہتی تو کوئی بشریٰ، جمیلہ یا ہاجرہ اس کی جگہ لے لیتی بھلا ان کی حیثیت ہی کیا ہے؟

"ہونہہ..... غریب اور بے کار لوگ۔" اس نے نفرت سے سوچا اور اس کے ہونٹ نیم دائرے کے انداز میں سکڑتے گئے۔

"بھلا میرا اور ان کا مقابلہ؟ ہمارے اسٹیٹس اور ان کے اسٹیٹس میں زمین آسمان کا فرق ہے ہم لوگ پیسہ پھینکتے ہیں اور یہ لوگ دم ہلاتے ہیں پھر کیوں؟..... آخر کیوں؟ اس کے ڈیڈی نے ایک ملازمہ کی فیور کرتے ہوئے اسے تھپڑ مارا تھا آخر انہوں نے ایسا کیوں کیا؟" اس نے حیرت سے سوچا۔

"اس عورت نے میرا اتنا قیمتی ڈیکوریشن پیس توڑا اگر میں نے اس کا سر توڑ دیا تو کیا غلط کیا؟" وہ آپ ہی آپ سوچتی اور الجھتی رہی اسے بار بار اپنے ڈیڈی پر غصہ آرہا تھا جب جب وہ اس سچویشن کو یاد کرتی اسے اپنے ڈیڈی کے اس تھپڑ کی گونج اپنے پورے وجود میں سنائی دیتی اور اس کے ساتھ ہی اسے ثریا پر بھی شدید غصہ آتا! اس کی وجہ سے تو ایسا ہوا تھا۔

"تڑاخ۔" سیٹھ راشد کا ہاتھ گھوما تھا اور ان کے ہاتھ کی انگلیاں شیزہ کے چہرے پر نقش ہو گئی تھیں آج تک وہ ملازموں پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑتی آئی تھی! انہیں مار پیٹ کر اور اذیت دے کر اسے ایک عجیب سی خوشی ملتی تھی احساس برتری کا ایک انوکھا سا نشہ اور

حکمرانی کا ایک عجیب لذت آمیز خمار اس کے پورے وجود میں، رگ رگ میں سرائیت کر جاتا تھا۔ اور ایسا آج سے نہیں وہ تو بچپن سے ہی یہ احساس لے کر جوان ہوئی تھی کہ ملازمین ان کی رعایا ہیں اور وہ ان کی حکمران! ان زرخرید غلاموں کے ساتھ ہر طرح کا سلوک اس کے نزدیک جائز ٹھہرا تھا۔

اپنی ماما کی ڈیتھ کے بعد وہ روئی نہیں تھی شاید اسے دکھ بھی نہیں ہوا تھا! لیکن اس کے مزاج میں ایک عجیب سی تبدیلی ضرور رونما ہو گئی تھی اب وہ کھلونوں سے نہیں کھیلتی تھی بلکہ اب وہ لان میں موجود پھولوں کے پودوں پر بیٹھی تتلیوں سے کھیلتی تھی وہ گھنٹوں وہیں بیٹھی رہتی رنگ برنگی خوشنما تتلیوں کو پکڑنا ان کے پر نوچنا اور پھر ان کو تڑپا تڑپا کر مار دینا اس کا دل پسند مشغلہ تھا ایسا کیوں تھا؟ یہ تبدیلی اس میں کیوں آئی تھی؟ نہ کبھی اس نے سوچا تھا اور نہ کبھی اسے اس کی ضرورت پیش آئی تھی۔

اپنی اسی فطرت کے ساتھ اس نے بچپن کی سرحدیں عبور کرتے ہوئے جوانی کی دہلیز پر قدم رکھا لیکن اب اس مشق ستم کا شکار ہونے والے پرندے اور تتلیاں نہیں تھے بلکہ اب اپنی اذیت پسند فطرت کی تسکین کے لیے ملازم تختہ ستم ٹھہرتے تھے اور آج تک کسی نے اف تک نہیں کی تھی، کسی قسم کا کوئی احتجاج تو درکنار کبھی کسی نے اس کے سامنے بولنے کی بھی جرات نہیں کی تھی لیکن آج اسے اپنے ڈیڈی کا تھپڑ برداشت کرنا پڑا تھا۔

"اُف اُز اُف! اب تم بچی نہیں رہیں تمہیں اپنے آپ کو بدلنا ہوگا۔" سیٹھ راشد غصیلے انداز میں دہاڑے تھے۔ اس کے وجود کو جیسے ایک جھٹکا سا لگا اس نے کمرے میں ٹہلنا بند کر دیا اب وہ ایک جگہ کھڑی ہو چکی تھی، شاید وہ کسی نتیجے پر پہنچ چکی تھی پھر اس کے ہونٹوں پر ایک طنزیہ سی مسکراہٹ نمودار ہو گئی۔

"ہاں! مجھے بدلنا ہوگا..... لیکن ڈیڈی! اس کے لیے آپ کو بہت کچھ کھونا پڑے گا..... میں اپنے آپ کو ضرور بدلوں گی ڈیڈی لیکن اس کے لیے آپ کو بہت کچھ بدلنا پڑے گا..... بہت کچھ۔" وہ بڑبڑائی اس کے ہونٹوں پر وہی مخصوص اور طنزیہ مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ پھر وہ آرام سے ایزی چیئر پر بیٹھتے ہوئے یک لخت چلائی۔

"بانو....." اور بانو چند ہی لمحوں میں آموجود ہوئی۔

"جی بی بی جی!" اس نے مودبانہ انداز سے پوچھا۔

"ڈیڈی کہاں ہیں؟" شیزہ نے سوالیہ انداز میں پوچھا۔

"جی وہ تو آفس چلے گئے۔" بانو منمنائی تھی۔

"اچھا ٹھیک ہے تم جاؤ۔" اس نے جھٹکے دار آواز میں کہا۔

بانو خاموشی سے مڑی اور کمرے سے باہر نکل گئی چند لمحوں تک وہ ایزی چیئر پر سر ٹکائے پر خیال انداز میں جیسے کچھ سوچتی رہی پھر آہستہ سے اٹھی اور وارڈ روب کی جانب بڑھ گئی اپنے لیے اس نے جینز اور جیکٹ کا انتخاب کیا تھا پھر اس نے ایجوکیشن سے متعلق اپنے ڈاکومنٹس نکالے انہیں چھوٹے سے ہینڈ بیگ میں احتیاط سے رکھا! جس میں اس کے ایک دو سوٹ پہلے سے موجود تھے پھر وہ لان میں سے ہوتی ہوئی گھر کے بیرونی دروازے تک جا پہنچی ہینڈ بیگ اس کے ہاتھ میں تھا۔

"زمان خان! گیٹ کھولو؟" یک لخت اس کی آواز بلند ہوئی اور زمان خان نے۔

"جی میم صاب۔" کا نعرہ بلند کرتے ہوئے مستعدی سے گیٹ کھول دیا۔ شیزہ نے آرام سے گیٹ کراس کیا اور ایک جانب پیدل روانہ ہو گئی اس نے گاڑی لینے یا ڈرائیور کو زحمت دینے کے بارے میں نہیں سوچا تھا۔ کچھ دور تک وہ پیدل ہی چلتی چلی گئی جب کوٹھی سے اس کا فاصلہ کافی حد تک مناسب ہو گیا تو وہ رک گئی، اس نے گزرتے ہوئے ایک رکشا کو روکا اور پھر اس میں براجمان ہوتے ہوئے بولی۔

"اسٹیشن چلو....."

☼ ☼ ☼

خالد گجر ان دنوں بہت خوش تھا اور کیوں نہ ہوتا اس نے مدتوں سے جاری اپنے خاندانی کام سے بغاوت کی تھی..... دودھ بیچنا ان کا آبائی پیشہ تھا اور بھینس ان کا مونو گرام لیکن اسے یہ پسند نہیں تھا گاؤں میں رہنے کے باوجود اس نے تعلیم حاصل کرنے پر پوری توجہ دی تھی میٹرک کے بعد اس نے شہر جاکر مزید تعلیمی سلسلہ پوری تندہی سے جاری رکھا بزنس ایڈمنسٹریشن میں ماسٹر کرنے کے بعد اس نے اپنے بوڑھے ماں باپ کے احتجاج کے باوجود ساری بھینسیں بیچ ڈالی تھیں اور ان سے حاصل ہونے والی رقم سے شہر آکر اس نے امپوٹ ایکسپورٹ کا بزنس شروع کیا تھا اور حیرت کی بات یہ تھی کہ گجر ہونے کے باوجود اس کا بزنس چل نکلا تھا شاید یہ اس کی ڈگری کا کمال تھا جو اس نے پوری محنت اور جاں فشانی کے ساتھ بزنس ایڈمنسٹریشن کے نام سے حاصل کی تھی۔

اب اس کا باقاعدہ ایک دفتر تھا اسٹاف تھا اور وہ باقاعدگی سے آفس جاتا تھا گاؤں سے اس نے اپنا تعلق بالکل ختم کرلیا تھا پھر اس نے مزید ترقی کی اب اس نے ایک سیکنڈ ہینڈ کار خرید لی تھی اسے بہت خوشی ہوئی شاید اس سے بھی زیادہ جتنی کہ اس کے ابا کو ایک نئی "بھینس" خرید کر ہوتی تھی اب اس نے ڈرائیونگ سیکھنا بھی شروع کردی تھی لیکن صاف ظاہر ہے کہ ہر کام میں کچھ نہ کچھ وقت تو ضرور لگتا ہے اس کی خواہش یہی تھی کہ وہ جلد سے جلد اس قابل ہوجائے کہ گاڑی خود ڈرائیو کرکے گاؤں جاسکے اور ان سے کہے کہ "بھینس کے ساتھ بھینس ہو کر رہنے والو دیکھو' زندگی اسے کہتے ہیں۔" دو تین دن سے وہ اپنی پوری کوشش کررہا تھا لیکن ظاہر ہے کہ دو تین دن میں کوئی ایکسپرٹ ڈرائیور تو نہیں بن سکتا نا؟ ادھر آفس میں بھی اسے پورا وقت دینا پڑتا تھا اور آفس کے بعد جتنا وقت اسے مل پاتا وہ ڈرائیونگ اسکول کی نذر ہوتا ان دنوں وہ سخت مصروف تھا آج بھی وہ آفس پہنچا اور تمام اسٹاف کے سلام کا جواب دیتے ہوئے اپنے کمرے میں آبیٹھا پھر اس نے بیل بجائی تو چپڑاسی آن وارد ہوا اس نے چپڑاسی کی طرف گھورتے ہوئے سوال کیا۔

"مس شیزہ آج بھی ابھی تک نہیں پہنچیں؟" اس کے انداز سے یہ ظاہر ہو رہا تھا جیسے شیزہ کے دیر سے آنے میں سارا قصور چپڑاسی ہی کا ہو لیکن وہ بے چارہ کر ہی کیا سکتا تھا؟ وہ تو شیزہ کے سامنے بولنے کی جرات بھی نہ پاتا تھا۔ اس کا انداز تھا ہی ایسا انوکھا ایک عجیب شان اور وقار کے ساتھ وہ آفس میں داخل ہوتی تمام اسٹاف کے ساتھ اس کا رویہ ایسے ہوتا جیسے وہ اس آفس کی ملازم نہیں بلکہ مالکن ہو جس کو جی چاہتا جھاڑ دیتی' دل چاہتا تو کسی کی بات کا جواب دیا ورنہ ڈانٹ دیا اور کس کی مجال تھی کہ اس کے سامنے دم مارنے کی جرات کرتا؟ مرضی سے آتی تھی اور مرضی سے جاتی تھی وہ ہر کام آفس کے ٹائم ٹیبل کی بجائے اپنے ٹائم ٹیبل کے مطابق کرتی تھی' چپڑاسی بے چارا کس کھیت کی مولی تھا؟

"لیس سر! وہ تو ابھی ایک گھنٹے بعد آئیں گی۔" چپڑاسی نے مودبانہ انداز میں جواب دیا۔

"دفع ہو جاؤ۔" خالد دھاڑا اس کا دماغ گھوم گیا تھا گجر تو وہ پہلے ہی تھا بس سنک گئی آج اسے شیزہ پر شدید غصہ آرہا تھا اس نے بلاوجہ فائلیں اٹھا کر ان سے سر کھپائی شروع کردی کافی دیر کے بعد دروازہ کھلا اور شیزہ نمودار ہوئی۔

"گڈ مارننگ سر۔" اس کی آواز بلند ہوئی۔

"مارننگ۔" اس نے فائل سے نظریں اٹھاتے ہوئے پھاڑ کھانے والے انداز میں جواب دیا شیزہ آرام سے اپنی نشست پر براجمان ہو گئی اس نے خالد کے لہجے یا رویے کو ذرا بھی درخور اعتنا نہیں سمجھا تھا اور خالد کو مزید تپ چڑھ گئی سوئی تو پہلے ہی ہٹی ہوئی تھی یکلخت اس کی آواز بلند ہوئی۔

"شیزہ! تم اپنے آپ کو سمجھتی کیا ہو؟ اس آفس کا مالک میں ہوں یا تم؟ جب میں اور میرا پورا اسٹاف ٹھیک نو بجے آفس میں موجود ہوتے ہیں تو تمہارا دیر سے آنے کا مقصد؟" شیزہ نے اطمینان سے اس کی جانب دیکھا اور پھر گویا ہوئی۔

"میں ہر کام اپنی مرضی سے کرنے کی عادی ہوں اور یہ میری عادت ہے آپ نے وہ شعر تو سنا ہوگا۔"
تم ہی کو چاہتے ہیں ہم تمہی سے پیار کرتے ہیں
یہی برسوں سے عادت ہے اور عادت کب بدلتی ہے
اس کے لہجے میں سکون ہی سکون تھا۔

"دیکھو میڈم! یہاں جاب کرنی ہے تو آپ کو اپنی یہ عادتیں بدلنا ہوں گی اس آفس کے اصولوں کے مطابق چلنا ہوگا سمجھیں آپ؟" خالد نے بھناتے ہوئے لہجے میں کہا اور شیزہ کے ہونٹوں پر وہی مخصوص طنزیہ مسکراہٹ پھیل گئی جو بعض اوقات اس کی شخصیت کا حصہ معلوم ہوتی تھی۔

"یس سر!" اس نے مختصر جواب دیا اب وہ سوچ رہی تھی "عادتیں تو میں بدل لوں گی..... لیکن اس کے لیے بہت کچھ بدلنا پڑے گا..... بہت کچھ۔"

☼ ☼ ☼

آف وائیٹ کلر کی ٹوڈی کرولا کار سڑک پر پوری رفتار سے بھاگی چلی جارہی تھی ڈرائیونگ سیٹ پر جینز اور جیکٹ میں ملبوس سنہرے بالوں والی ایک خوب صورت لڑکی تھی جبکہ عقبی سیٹ پر کاٹن کے کلف زدہ بوسکی کلر کے سوٹ میں ملبوس ایک خوب صورت جوان پورے کروفر کے ساتھ براجمان تھا وہ کافی دیر سے سفر میں تھے لاہور سے چلے ہوئے انہیں تقریباً" چار گھنٹے ہوچکے تھے کیونکہ ان کی گاڑی ٹھیک نو بجے لاہور سے نکلی تھی اور اب تقریباً" ایک بجنے والا تھا۔

سنہری بالوں والی لڑکی بڑی مہارت سے گاڑی ڈرائیو کررہی تھی اور ان کا اپنی منزل سے فاصلہ تیزی سے کم ہوتا چلا جارہا تھا پھر لڑکی نے ایک سائیڈ پر اچانک گاڑی سڑک سے نیچے اتارلی اور اطمینان سے سامنے نظر آنے والے ڈرائیور ہوٹل کی پارکنگ میں جاروکی۔

"کیا ہوا؟ یہاں کیوں رک گئیں۔" کاٹن کے سوٹ والا جو یقیناً" خالد گجر تھا اور سنہرے بالوں والی لڑکی شیزہ کے علاوہ اور کوئی نہیں تھی اس سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔

"سر پیٹ میں چوہے دوڑ رہے ہیں اور لنچ کا وقت بھی ہوگیا ہے تو میں نے سوچا کچھ کھا ہی لیا جائے۔" وہ اطمینان بھرے انداز میں دروازہ کھول کر نیچے اترتے ہوئے بولی تو خالد بھی دروازہ کھول کر نیچے اتر آیا اور وہ دونوں ہوٹل میں جا بیٹھے جلد ہی ان کی مرضی کا کھانا سرو ہوگیا اور وہ کھانا کھانے لگے۔

"سر بھوک بھی لگ رہی تھی لیکن اصل بات یہ ہے کہ میں مسلسل ڈرائیونگ کرتے کرتے تھک بھی گئی تھی سوچا کھانا بھی کھالیں اور کچھ ریسٹ بھی مل جائے گا۔" شیزہ نے وضاحت آمیز انداز میں کہا تو خالد نے جواب دیا۔

"ہاں ہاں کوئی بات نہیں آرام سے کھانا کھاؤ۔"

"سر آپ خود ڈرائیونگ کیوں نہیں کرتے؟" شیزہ نے اچانک سوال کیا۔

"نا بھئی نا! میں ابھی اتنا ایکسپرٹ کہاں ہوا ہوں کہ مین روڈ پر ڈرائیو کرسکوں۔" خالد نے گھبرا کر کہا۔

"لیکن سر اس طرح تو آپ کی جھجک کبھی نہیں دور ہوگی آپ گاڑی چلائیں گے تو ہی اعتماد پیدا ہوگا نا؟" شیزہ نے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے کہا۔

"ہاں بات تو تمہاری بھی ٹھیک ہے لیکن مین روڈ پر تو یہ رسک نہیں لیا جاسکتا نا؟" خالد نے کمزور سے لہجے میں اپنا دفاع کیا تو شیزہ دوبارہ گویا ہوئی۔

"کچھ نہیں ہوتا آپ چلا سکتے ہیں گاڑی میں ہوں نا آپ کے ساتھ' بس اب گاڑی آپ ہی ڈرائیو کریں گے۔"

اس کا انداز فیصلہ کن تھا پھر اس نے چابی خالد کی طرف بڑھائی تو خالد نے جیسے ہتھیار ڈال دیے اور بادل ناخواستہ چابی پکڑلی کھانا کھا کر وہ اٹھے تو کاؤنٹر پر بل ادا کرتے وقت شیزہ نے اپنا موبائل کاؤنٹر پر رکھ دیا' بل ادا کرنے کے بعد دونوں گاڑی تک آئے۔

خالد نے ڈرائیونگ سیٹ کا دروازہ کھولا اور سیٹ پر بیٹھ گیا۔

"اوہ! سر میں اپنا موبائل تو وہیں بھول آئی' آپ

بیٹھیں میں موبائل لے کر ابھی واپس آئی۔" اور پھر وہ پلٹ کر تیزی سے کاؤنٹر کی طرف بڑھ گئی اور پھر کاؤنٹر سے موبائل اٹھاتے ہوئے کاؤنٹر کلرک سے بولی۔

"یہ ہمارے سر بھی نا! آدھے پاگل ہیں ڈرائیونگ آتی نہیں اور ضد کر رہے ہیں گاڑی میں چلاؤں گا کیا کریں؟ نوکری تو کرنی ہی ہے؟" اور بے چارہ کاؤنٹر کلرک کوئی جواب دیے بغیر خوش اخلاقی سے مسکرا کر رہ گیا۔ وہ موبائل اٹھانے کے بعد واپس گاڑی میں آبیٹھی خالد نے گاڑی اسٹارٹ کر کے آگے بڑھائی تو شاید کلچ یکدم چھوڑ دیا گاڑی کسی بدمست ہاتھی کی طرح ایک جھٹکے سے آگے بڑھی اور بری طرح لہراتے ہوئے تیزی سے سڑک کی جانب چلتی چلی گئی' ہوٹل کے ملازمین بمعہ کاؤنٹر کلرک حیرت سے ڈرائیونگ کے اس عالی شان مظاہرے کو دیکھ رہے تھے۔

گاڑی سڑک پر آچکی تھی اور تیزی سے سامنے سے آتے ہوئے ٹرک کی طرف بڑھ رہی تھی ٹرک اور گاڑی کے درمیان فاصلہ تیزی سے کم ہوتا چلا جا رہا تھا جونہی گاڑی ٹرک کے قریب پہنچی خالد نے تیزی سے اسٹیرنگ گھما دیا اور گاڑی بمشکل چند انچ کے فاصلے سے بائیں سمت ہوئی اور زن کی آواز کے ساتھ ٹرک کے قریب سے آگے نکلتی چلی گئی۔

"بس سر! سائیڈ پر کر کے بریک لگا دیں میں خود ہی ڈرائیو کرتی ہوں۔" عقبی سیٹ سے شیزہ کی آواز بلند ہوئی تو خالد نے اس کی ہدایات پر عمل کرتے ہوئے گاڑی ایک سائیڈ پر روک دی پھر گاڑی دوبارہ آگے بڑھی لیکن اب ان کی نشستیں تبدیل ہو چکی تھیں ڈرائیونگ سیٹ پر شیزہ اور عقبی سیٹ پر خالد براجمان تھے گاڑی اپنی پوری رفتار سے بھاگتی چلی جا رہی تھی اور اس کے عمل کا وقت شروع ہونے میں زیادہ دیر باقی نہیں تھی کیونکہ جلد ہی اسے پل کے آثار نظر آنے لگے تھے اس کے ہونٹوں سے چپکی وہ مخصوص طنزیہ مسکراہٹ مزید گہری ہو گئی اس کے ہاتھ اسٹیرنگ وہیل پر مضبوطی سے جم گئے۔

شیزہ اچھی طرح جانتی تھی کہ یہ نہر بہت چوڑی اور گہری ہے جونہی گاڑی پل کے قریب پہنچی شیزہ نے یکلخت اسٹیرنگ وہیل گھما دیا اور گاڑی کمان سے نکلے ہوئے تیر کی مانند تیزی کے ساتھ سڑک سے اتری اور نہر کی پٹڑی پر چڑھ کر نہر کے متوازی دوڑنے لگی گاڑی نے بری طرح جھٹکے اور ہچکولے کھائے تھے اور عقبی نشست پر بیٹھا خالد گڑبڑا کر رہ گیا تھا۔

"ک... کک کیا کر رہی ہو؟ ادھر کہاں جا رہی ہو۔" خالد نے گھبراہٹ آمیز آواز میں پوچھا۔ لیکن شیزہ خاموش رہی بس اس کے ہونٹوں پر پھیلی ہوئی مسکراہٹ کچھ مزید گہری ہو گئی۔

اس دوران گاڑی نہر کے ساتھ ساتھ کافی فاصلے تک آ پہنچی تھی۔ شیزہ نے ایک مرتبہ پھر یکلخت اسٹیرنگ گھما دیا لیکن اس دوران وہ اپنی سائیڈ کا دروازہ کھولنا نہیں بھولی تھی۔ گاڑی ہوا میں بلند ہوئی اور ایک چھپاکے کی آواز کے ساتھ نہر میں جا گری اور پھر تیزی سے پانی میں ڈوبتی چلی گئی... جبکہ گاڑی سے کچھ ہی فاصلے پر ایک نسوانی وجود تیرتا ہوا نہر کے کنارے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ کنارے پر چڑھنے کے بعد اس نے پلٹ کر نہر کی طرف دیکھا۔ گاڑی ڈوب چکی تھی اور اب اس کا نام و نشان تک نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی وہی مخصوص اور طنزیہ مسکراہٹ پھر وہ آہستہ سے بڑبڑائی۔

"سر! عادتیں تو میں نے اپنی بدل لیں... لیکن اس کے لیے بہت کچھ بدلنا ضروری تھا... بہت کچھ۔"

☼ ☼ ☼

خالد گجر کے آفس میں اس وقت کھلبلی مچی ہوئی تھی خالد گجر کی لاش دریافت کی گئی تھی اور ویسے بھی جہاں گاڑی گری تھی شیزہ نے اس جگہ کی مکمل نشاندہی کر دی تھی لہٰذا دوسرے ہی دن خالد کی لاش برآمد کر لی گئی پولیس مصروف تفتیش تھی گاڑی گرنے کے حادثے کے بعد شیزہ انتہائی ناگفتہ بہ حالت میں اسی ہوٹل پہنچی تھی جہاں سے انہوں نے کھانا کھایا تھا۔

شام کے سائے اپنے پر پھیلا چکے تھے اور سورج اپنا سفر تمام کرنے کے بعد دن بھر کی تھکن اوڑھے افق کی گود میں محو خواب ہو چکا تھا شیزہ کا لباس بری طرح پانی اور کیچڑ میں لتھڑا ہوا تھا بال بکھرے ہوئے تھے اور پاؤں میں جوتے تک نہیں تھے وہ شاید پیدل چلتی ہوئی وہاں تک واپس پہنچی تھی ہوٹل کے تمام ملازمین اور کاؤنٹر کلرک حیرت اور استعجاب کی حالت میں اس کی طرف دیکھ رہے تھے وہ لڑکھڑاتی ہوئی سیدھی کاؤنٹر کی طرف بڑھی اور پھر دونوں ہاتھ کاؤنٹر پر ٹکا کر جیسے اپنے پورے وجود کا بوجھ کاؤنٹر پر منتقل کرتے ہوئے لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں بولی۔

"آپ گواہ ہیں اس کے میں نے سر کو منع کیا تھا کہ اگر آپ کو ڈرائیونگ نہیں کرنا آتی تو آپ گاڑی مت چلائیں لیکن انہوں نے میری ایک نہیں سنی اور وہ یہیں سے انتہائی رف ڈرائیونگ کرتے ہوئے نکلے تھے اور... گاڑی نہر میں جا گری۔" اس نے سسکیاں لیتے ہوئے اپنا جملہ مکمل کیا اور پھر لڑکھڑا کر دھڑام سے نیچے جا گری وہ بے ہوش ہو چکی تھی۔

ہوٹل انتظامیہ میں بھگدڑ سی مچ گئی اور کاؤنٹر کلرک اس کی ساری بات سننے کے بعد حیرت سے منہ کھولے کھڑا تھا جلد ہی پولیس کو اطلاع کر دی گئی اور شیزہ کو ایک چارپائی پر منتقل کر دیا گیا پولیس آئی تو ہوٹل والوں کے بیان شیزہ کو بے گناہ ثابت کرنے کے لیے کافی تھے شیزہ نے بھی یہی کہا!

"انہیں ڈرائیونگ نہیں آتی تھی لیکن انہوں نے ضد کر کے گاڑی چلائی اور نتیجتاً" گاڑی نہر میں جا گری وہ بمشکل تمام نہر سے اپنی جان بچا کر نکلنے میں کامیاب ہوئی۔" شیزہ کی معصومیت اس کے صنف نازک ہونے کی رعایت اور ہوٹل والوں کے بیان کی روشنی میں پولیس والے اس کی باتوں پر ایمان لے آئے۔

وہ اس بات سے قطعی بے خبر تھے شیزہ نے نہر کے کنارے پر بیٹھ کر پورے دو گھنٹے انتظار کیا تھا اور اس کی نظریں بہتے پانی پر جمی رہی تھیں دو گھنٹے بعد وہ دوبارہ پانی میں داخل ہوئی تھی کسی ماہر تیراک اور غوطہ زن کی مانند وہ سیدھی گاڑی تک پہنچی اور پھر دوبارہ گاڑی کے اندر داخل ہوئی تھی اس نے عقبی نشستوں کے درمیان میں پھنسی ہوئی خالد کی لاش کو جیسے تیسے کھینچ کر ڈرائیونگ سیٹ پر بٹھایا پانی کے اندر زور لگا کر ڈرائیونگ سیٹ کا دروازہ بند کیا اور پچھلا دروازہ جہاں سے اس نے خالد کو باہر نکالا تھا بدستور کھلا رہنے دیا اس تمام کارروائی کے دوران اس کا سانس بری طرح پھول چکا تھا وہ جلدی سطح آب پر بلند ہوئی اور لمبے لمبے سانس لینے لگی آکسیجن کی مناسب مقدار پھیپھڑوں تک پہنچی تو اس کے اوسان قدرے بحال ہو گئے۔

اب وہ تیرتی ہوئی کنارے کی طرف جا رہی تھی کنارے پر پہنچ کر اس نے خود کو اچھی طرح کیچڑ میں لت پت کیا چند لمحے سانس درست ہونے کا انتظار کیا پھر ہوٹل کی طرف روانہ ہو گئی تھی اور اب وہ چہرے پر معصومیت سجائے بے بسی کی تصویر بنی کھڑی تھی وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ اس کے سامنے پنجاب پولیس کا ایک سب انسپکٹر ہے کوئی شرلاک ہومز نہیں سو وہ اپنی کارروائی پر مطمئن تھی۔

اس وقت پولیس پارٹی ان کے آفس میں موجود تھی اور تمام اسٹاف کے بیانات قلم بند کیے جا رہے تھے جن کی روشنی میں پولیس کو پتا چلا کہ تین چار دن پہلے خالد اپنا امپورٹ ایکسپورٹ کا جما جمایا بزنس لاہور کے کسی بزنس مین سعید جمالی کو فروخت کر چکا تھا پیمنٹ اس کے اکاؤنٹ میں منتقل ہو چکی تھی ایگریمنٹ سائن کرنے کے لیے اسے لاہور جانا تھا اور وہاں سے واپسی پر اپنا یہ دفتر بمعہ اسٹاف کے سعید جمالی کو ہینڈ اوور کرنا تھا لاہور روانہ ہونے سے قبل خالد نے تمام اسٹاف کو جمع کر کے تفصیل سے ہر بات بتائی تھی اور پھر سب سے دریافت کیا تھا کہ کسی کو ڈرائیونگ آتی ہے لیکن ڈرائیونگ سوائے شیزہ کے کسی کو نہ آتی تھی لہٰذا شیزہ اس کے ہمراہ گئی تھی اسٹاف کے کسی ممبر نے ایسا کوئی اشارہ نہیں دیا تھا جس سے شیزہ پر کسی قسم کا کوئی شبہ کیا جا سکتا لہٰذا وہ پولیس کی گرفت میں آنے سے محفوظ رہی۔

☼ ☼ ☼

سرخ و سپید رنگت، کن پٹیوں پر سفید بال بھاری بھر کم وجود موٹی موٹی آنکھیں جن میں ذہانت کی چمک اور کشادہ پیشانی والے یہ شخص سعید جمالی تھے آفس جوائن کیے ہوئے آج انہیں تقریباً" ایک ہفتہ ہو چکا تھا انہوں نے اپنے دفتر کے فرنیچر میں اور اس کی ترتیب میں کافی تبدیلیاں کروائی تھیں لیکن خالد گجر کی تصویر کو وہاں سے نہیں ہٹایا گیا تھا اس دوران وہ پولیس کی تمام تر کارروائی سے باخبر رہے تھے اور اس حادثے کی پوری تفصیل سے واقف ہو چکے تھے، وہ اپنے اسٹاف سے بہت جلد گھل مل گئے تھے، اپنے اسٹاف سے انہیں شیزہ کے بارے میں کافی عجیب اور مختلف قسم کی معلومات ملی تھیں، انہوں نے خود بھی شیزہ پر توجہ دی تو محسوس کیا کہ اس لڑکی میں کچھ نہ کچھ اسرار ضرور تھا اس کی روٹین اب بھی وہی تھی وہ اب بھی اپنی مرضی سے آفس آتی تھی اور ہمیشہ دیر سے آتی تھی۔

آج بھی جب سعید جمالی اپنی مخصوص نشست تک پہنچے تو شیزہ حسب معمول اپنی سیٹ پر موجود نہیں تھی کیوں کہ ابھی اس کے آنے کا وقت نہیں ہوا تھا، انہوں نے بیل بجائی تو چپڑاسی چراغ کے جن کی طرح نمودار ہو گیا۔

"یس سر۔" اس نے بے اختیار پوچھا تھا اور انداز بالکل الہ دین کے چراغ کے جن کا سا تھا! جیسے کہہ رہا ہو "کیا حکم ہے میرے آقا؟"

"چیف اکاؤنٹنٹ اشرف خان کو بلاؤ۔" سعید جمالی گویا ہوئے تھے اور چپڑاسی پلٹ کر باہر نکل گیا، چند لمحوں میں ہی اشرف خان آن پہنچا وہ دبلا پتلا اور کھچڑی بالوں والا مرنجان مرنج قسم کا آدمی تھا لیکن سعید جمالی کو آفس کے پہلے دن ہی وہ شخص پسند آ گیا تھا پڑھا لکھا حاضر جواب مگر اپنے کام سے کام رکھنے والا شخص تھا۔

"تشریف رکھیے اشرف صاحب۔" سعید جمالی نے سامنے موجود نشست کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تو اشرف خان ان کی ٹیبل کی دوسری طرف موجود کرسی گھسیٹ کر اس پر بیٹھ گئے اپنے ہاتھوں میں موجود فائلوں کا پلندہ وہ ٹیبل پر منتقل کر چکا تھا سعید جمالی کی تجربہ کار نگاہیں اشرف خان کی سوالیہ نظروں سے ٹکرائیں تو ان کے ہونٹوں نے حرکت کی اور سرسراتی ہوئی آواز میں ایک سوال ان کے لبوں سے آزاد ہو گیا۔

"مس شیزہ کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟"

اشرف خان ایک ذرا اپنی سیٹ پر کسمسایا اور پھر اس کے ہونٹوں سے چار مصرعے آزاد ہوئے۔

خوابوں کی طرح تھا نہ خیالوں کی طرح تھا
وہ شخص ریاضی کے سوالوں کی طرح تھا
الجھا ہوا ایسا کہ کبھی کھل ہی نہ پایا
سلجھا ہوا ایسا کہ مثالوں کی طرح تھا

"ہونہہ۔" سعید جمالی ہنکارا بھر کر رہ گئے! پھر وہ دوبارہ گویا ہوئے۔

"کہاں سے آئی ہے؟ کہاں رہتی ہے؟ کچھ اتا پتا؟ کچھ تو معلومات ہوں گی اس کے بارے میں؟" ان کے انداز میں تجسس ہی تجسس تھا اشرف خان نے چند لمحے توقف کیا جیسے ان کے سوال کو سمجھنے کی کوشش کر رہا ہو پھر ٹھہرے ہوئے انداز میں بولا۔

"نہیں سر! اس کے بارے میں کوئی کچھ نہیں جانتا وہ اچانک آئی اور پتا نہیں کیسے خالد صاحب نے اسے نوکری پر رکھ لیا خالد صاحب کے علاوہ کسی کو اس کے بارے میں کچھ معلومات نہیں کیوں کہ اس سے ہم کلام ہونے کی جرات ہی کسی میں نہ تھی شاید خالد صاحب میں بھی نہیں ... اس بارے میں آفس اسٹاف کا کوئی بھی بندہ آپ کے کسی کام نہیں آ سکے گا بہت ہی پراسراری لڑکی ہے وہ سر۔"

"ہونہہ۔" کمرے میں ایک مرتبہ پھر سعید جمالی کا ہنکارا بلند ہوا، چند لمحوں تک وہ کرسی کی پشت پر سر ٹکائے پرخیال انداز میں جیسے کچھ سوچتے رہے پھر ان کی آواز بلند ہوئی۔

"ٹھیک ہے آپ جا سکتے ہیں؟" اور اشرف خان ٹیبل پر سے اپنی فائلیں اٹھاتا ہوا کمرے سے باہر نکل

گیا کچھ دیر تک وہ خواہ مخواہ ادھر ادھر کی فائلیں کھنگالتے رہے ان کی پیشانی پر جیسے ان گنت شکنوں کا ایک جال سا بچھ گیا تھا ٹھیک اسی لمحے لیڈیز ہیل کی ٹھک ٹھک کرتی آواز کے ساتھ شیزہ کمرے میں داخل ہوئی اور اطمینان سے اپنی سیٹ کی جانب بڑھ گئی ابھی وہ پوری طرح بیٹھ نہیں پائی تھی کہ سعید جمالی کی آواز بلند ہوئی۔

"مس شیزہ یہ آفس ہے، آپ کا گھر نہیں، جہاں آپ سب کچھ اپنی مرضی سے کر سکیں! ہمارے آفس کا باقاعدہ ایک ٹائم ٹیبل ہے اگر آپ نے جاب کرنی ہے تو آپ کو اسے فالو کرنا پڑے گا، اگر آپ نے اپنی عادتیں ترک نہ کیں تو آئی ایم سوری! کہ مجھے آپ کی یہ سیٹ کسی اور کو دینا پڑے گی۔" شیزہ نے اطمینان بھرے انداز میں سعید جمالی کی پوری بات سنی تھی پھر وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔

"مسٹر جمالی! میں اپنی مرضی کی مالک ہوں میں یہاں جاب کرتی ہوں آپ کی زر خرید غلام نہیں ہوں کہ آپ کی اس لہجے میں کی گئی باتیں سنوں میرا خیال ہے کہ مجھے آپ کے بارے میں بھی کچھ سوچنا پڑے گا۔"

سعید جمالی نے چونک کر اس کی طرف دیکھا لیکن وہ اپنے کام میں منہمک ہو چکی تھی سعید کے چہرے پر نمودار ہونے والے زلزلے کے سے تاثرات وہ نہیں دیکھ پائی تھی اور سعید جمالی کے دماغ میں جیسے دھماکے ہو رہے تھے ان کے ذہن میں بار بار اس کا یہ جملہ صدائے بازگشت کی طرح گونج رہا تھا۔

"میرا خیال ہے کہ مجھے آپ کے بارے میں کچھ سوچنا پڑے گا۔" پھر وہ اپنی سیٹ سے اٹھ گئے، وہ سیدھے چیف اکاؤنٹنٹ اشرف خان کے کمرے میں پہنچے اور پھر اس کے کمرے میں رکھے ہوئے فون پر ایک نمبر پش کرنے کے بعد ریسیور کان سے لگاتے ہوئے بولے۔

"ہیلو۔ ڈی ایس پی ریحان! میں سعید جمالی بول رہا ہوں۔" اور پھر وہ پوری تفصیل سے بات کرتے چلے گئے اور چیف اکاؤنٹنٹ اشرف خان حیرت سے منہ کھولے سنتا رہ گیا! کچھ ہی دیر کے بعد پولیس کی سائرن بجاتی ہوئی تین چار جیپیں آن پہنچی تھیں شیزہ کو گرفتار کر لیا گیا اور دوران تفتیش اس نے قبول کر لیا کہ خالد گجر کو اسی نے قتل کیا تھا! اسپتال میں کئی دن تک موت و حیات کی جنگ لڑنے کے بعد ہلاک ہونے والی ثریا کی موت کی ذمہ داری بھی اسی نے قبول کر لی تھی لیکن سعید جمالی کے ساتھ ساتھ آفس کے تمام افراد کے لیے یہ انکشاف حد سے زیادہ حیران کن تھا کہ کل تک ان کے ساتھ کام کرنے والی لڑکی ملک کے بہت بڑے صنعت کار اور ارب پتی سیٹھ راشد کی اکلوتی بیٹی تھی۔

☼ ☼

صباحت یاسمین

ہو وفا میری دسترس میں

"سر، مسٹر نیازی۔۔۔" جونہی شارق ایشان نے ریسیور کان سے لگایا اس کے پرسنل سیکریٹری کی آواز سنائی دی۔

"ہاں ہاں بات کراؤ۔" شارق نے اس کی بات پوری بھی نہ ہونے دی اور فوراً "بات کرانے کا عندیہ دے دیا۔

"جی نیازی صاحب اتنی دیر کیوں کردی خوشخبری سنانے میں۔" نیازی صاحب کے ہیلو کہتے ہی اس نے بے تابی سے کہا اس کے لبوں پہ بڑی جاندار مسکراہٹ رقصاں تھی۔

"ارے دیر تو جو ہوئی سو ہوئی۔ برا یہ ہوا کہ آپ کا کام مجھ سے نہیں ہوسکا۔"

"جی۔" اس کی مسکراہٹ معدوم ہوگئی۔

"اتنا چھوٹا سا کام نیازی صاحب اور آپ۔" وہ اچنبھے سے کہہ رہا تھا۔

"ہاؤ از اٹ پاسبل؟" اس نے غصہ ضبط کرنے کی کوشش کی مگر پھر بھی اس کی آواز میں درشتی، لہجے میں سختی آگئی۔

"آئی ایم ایکسٹریملی سوری پلیز۔" نیازی صاحب مہذب طریقے سے معذرت کررہے تھے۔

"دٹس اوکے تھینکس فار یور کوپریشن۔" شارق نے تیزی سے کہہ کرنا جواب سنے ریسیور کریڈل پر پنخ دیا۔

☼ ☼ ☼

"حیرت ہے، اتنی بڑی تو بات نہیں جتنا یہ معاملہ لٹک گیا ہے۔" رحمہ شارق اور شارق ایشان اس وقت ناشتے کی ٹیبل پر موجود تھے جب شارق کی زبانی مختصر سی روداد سن کر رحمہ نے تبصرہ کیا تھا۔

"ہاں میں سوچ رہا تھا تم اپنے کلاس فیلو سہیل سے بات کرو۔" شارق نے اپنے سلائس پہ جیم لگاتے ہوئے کہا۔

"اس کا کیا لنک ہے اس بات سے۔" نفاست سے سیب کی قاشیں کاٹتی رحمہ نے گھڑی بھر کے لیے سر اٹھا کر پوچھا۔

"اس کی مدر ان لاء اسکول کے بورڈ آف ڈائریکٹرز میں سے ہیں۔"

"ہوں۔" رحمہ نے پرسوچ انداز میں کہا اور پھر ٹیبل پر پڑا۔ موبائل اٹھا کر سہیل کو میسج کرنے لگی۔

☼ ☼ ☼

"یار نہیں ہو رہا تو چھوڑ دو اتنا ایموشنل کیوں ہو رہے ہو تم لوگ اس بات کو لے کر۔" سہیل چائے کا سپ لیتے ہوئے لاپروا سے انداز میں کہہ رہا تھا وہ اور رحمہ اس وقت ایک فائیو اسٹار ہوٹل میں موجود تھے۔

"اتنا تو تم بھی جانتے ہو شارق کو کہ جس کام کی وہ ٹھان لے وہ پھر اسے کرنا ہی ہوتا ہے اور یہ صرف اس کی نہیں، ایشان انکل کی، میرے پاپا کی، ہمارے گرینڈ پا کی، سب کی مشترکہ خواہش ہے۔"

رحمہ کا لہجہ تھوڑی خفگی لیے ہوئے تھا گویا وہ سہیل کے لاپروا سے انداز پر اسے سرزنش کر رہی ہو۔

"بھئی تم سب لوگ باجماعت ہو کے ایک ہی بات کے پیچھے کیوں پڑ گئے ہو؟" وہ ہنوز ہلکے پھلکے انداز میں کہہ رہا تھا۔

"اس لیے کہ پاپا، انکل، گرینڈ پا، شارق سب کی اسکولنگ یہیں اسی اسکول سے اسٹارٹ ہوئی، سب ہی اسکول کے اسٹار اسٹوڈنٹس میں شمار ہوتے تھے۔ ہم سب ایسا اس لیے چاہ رہے ہیں کہ ریکارڈ بن جائے گا۔ ایک ہی خاندان کی چار نسلیں اسی اسکول میں پڑھیں۔" رحمہ نے اسے رسانیت سے سمجھایا۔

"نہایت فضول ہو تم سب، ایک چھوٹی سی بات کے لیے تم لوگ کئی اچھے اسکولز کو نظر انداز کررہے ہو۔" سہیل نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

"سہیل پہلی بات تو یہ کہ جو چیز ہماری خواہش ہو وہ کبھی بھی ہمیں چھوٹی سی یا عام سی نہیں لگ سکتی اور دوسری بات یہ کہ یہ کوئی برا اسکول نہیں ہے۔ شہر کے بہترین اسکولز میں سے ہے۔"

"لیکن شہر کا بہترین اسکول نہیں ہے۔" سہیل نے بڑی سہولت سے اس کی بات میں سے اپنے مطلب کا نکتہ اچک لیا۔

"لیکن ہمیں یہی سب سے بہترین لگ رہا ہے۔" اس نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا تھا۔

"ایسا ہی تھا تو ایڈمیشن کی لاسٹ ڈیٹ سے پہلے واپس آجاتے نا تم لوگ سیرو تفریح سے۔" وہ اس کے زچ ہونے سے محظوظ ہو رہا تھا۔

"تم اپنی ساس سے کہہ کر میرے بچے کا ایڈمیشن بھی نہیں کرا سکتے۔" وہ بری طرح تپ گئی تھی۔

"نا بابا نا۔ تم اپر کلاس کے لوگوں کا کوئی پتا نہیں، اسی بات کو ایشو بنا لو کہ یونیورسٹی کی فرینڈ سے کیوں ملا؟ اس کے بیٹے کے لیے اتنا فکر مند کیوں ہو رہا ہے وغیرہ وغیرہ۔" وہ محض اس کو زچ کررہا تھا۔

"تم بھی اب اپر کلاس کا حصہ ہو۔" اس نے اسے جتایا۔

"حصہ نہیں، داماد۔" سہیل نے تصحیح کرنا ضروری جانا۔

"اپنے کمپلیکسز سے بھی باہر نہ آنا۔" رحمہ نے چوٹ کرنے کا موقع گنوانا مناسب نہ سمجھا۔

"بھئی تم لوگ میرے ساتھ تھرڈ ورلڈ کنٹریز والا برتاؤ کرنا چھوڑو تو میں بھی خود کو مس فٹ نہ فیل کروں۔" وہ معصوم سی شکل بنائے کہہ رہا تھا۔

"کام کی بات بھی کرلو اب۔" رحمہ پھر سے مطلب کی بات پہ آگئی۔

"یار آنٹی سے آج ہی کہوں گا۔ لیکن کوئی یقین دہانی نہیں کرا سکتا کیونکہ آئی رئیلی ہو نو آئیڈیا کہ وہ اسکول کے معاملات کیسے ہینڈل کرتی ہیں اور کتنی اتھارٹی ہے ان کے پاس۔"

"صرف کہو گے۔" رحمہ نے شکوہ کناں انداز میں کہا۔

"نہیں بابا تاکید کروں گا۔ اب خوش؟" اس نے یقین دلاتے ہوئے کہا تو رحمہ نے مسکراتے ہوئے اثبات میں سر ہلا دیا۔

☼ ☼ ☼

شارق ایشان مسٹر ایشان فضل کی اکلوتی اولاد تھی۔ جس کی شادی اپنی چچازاد رحمہ سے ہوئی تھی۔ ایان ان دونوں کا اکلوتا بیٹا تھا اسی لیے خاندان بھر کی محبت و توجہ کا مرکز و محور تھا ایان کے ماما' پاپا اور دونوں گرینڈ پا کی خواہش تھی کہ وہ اپنی اسکولنگ کا آغاز اس اسکول سے کرے جہاں سے اس کے ماں' باپ' نانا' دادا نے کیا تھا۔ خواہش پوری ہو جائے تو شاید اس کے متعلق ہماری جذباتیت میں کمی آجاتی ہے۔ مگر ایشان اینڈ فیملی کی بے ضرر سی عام سی خواہش کسی طور پوری نہ ہو پا رہی تھی اور اسی لیے یہ ان کی ضد بن چکی تھی۔

یہ ایک معیاری تعلیمی ادارہ تھا اور اپنے لیے بنائے گئے قواعد و ضوابط پر حیران کن حد تک کاربند تھا مگر پھر بھی سہیل کی بدولت شارق پرنسپل سے اپائنٹمنٹ لینے میں کامیاب ہو گیا اور اب اس قوی امید کے ساتھ پرنسپل کے سامنے براجمان تھا کہ جب وقت مل سکتا ہے۔ تو اتنا فیور بھی وہ ضرور دیں گے کہ داخلہ ممکن ہو سکے۔

"اسکول کے کسی بھی پروجیکٹ کے لیے فنڈز کی ضرورت ہو تو میری خدمات حاضر ہیں۔" شارق نے رسمی علیک سلیک کے بعد آفر کی۔

"شارق صاحب آپ کی صورت اس اسکول سے ایک خاندان کی تیسری نسل کا ناتا جڑا رہا۔ میرے خیال میں آپ سے بہتر تو کوئی نہیں جانتا ہو گا کہ یہ ادارہ پورے ملک کے ٹاپ ٹوئنٹی اسکولز میں سے ہے تو کس وجہ سے ہے۔" سونڈ ٹو دی پرنسپل نے بہت غیر محسوس انداز میں اس کی پیشکش کو مسترد کر دیا۔

"بالکل۔ میں نے تو صرف اس لیے کہا کہ میرے لیے بہت فخر کی بات ہو گی اگر میں اس کی کسی مثبت سرگرمی میں حصہ ڈالوں۔"

"آپ کو پتا ہے مسٹر شارق نصف صدی سے زائد عمر والا یہ اسکول عصر حاضر کے جدید ترین اسکولوں کے مقابلے میں صرف اس لیے بنا ڈگمگائے کھڑا ہے کہ ہم اس کو ایک بزنس مائنڈڈ اپروچ سے چلاتے ہیں ہمارے رولز اینڈ ریگولیشنز ہمارے لیے سرمایہ کاری کی مانند ہیں اور ہم صرف اس وجہ سے ان کی پیروی کرتے ہیں کہ یہ ہمیں ہماری توقعات سے زیادہ منافع دیتے ہیں۔" پرنسپل نے حقیقتاً شارق کی بولتی بند کر دی۔

"مگر آپ کا معاملہ مختلف ہے اگر آپ اتنے انٹرسٹڈ تھے تو ایڈمیشن کی ڈیٹ مس نہ کرتے۔" شارق کو خاموش پا کر پرنسپل خود ہی گویا ہوا تھا۔ شارق کو اس کی یہ بات ذرا سی حوصلہ افزا لگی جبھی اس نے پوچھا۔

"سر کیا لیٹ فیس کے ساتھ ایڈمیشن نہیں ہو سکتا؟"

"ہو سکتا ہے بالکل ہو سکتا ہے لیکن اگر کلاس انچارج چاہے تو۔" پرنسپل نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔

"کلاس انچارج کے پاس اتنا اختیار۔؟" شارق نے اچنبھے سے کہا۔

"صرف کلاس انچارج ہی نہیں اس کی دونوں

...ٹیچرز کی رائے کو بھی بہت اہمیت دی جاتی ہے۔ لیکن حتمی فیصلہ انچارج کا ہوتا ہے۔"

"سر کیا میں پوچھ سکتا ہوں ایسا کیوں؟ آپ کے اس رول سے کیا نفع حاصل ہوتا ہے آپ کو۔" شارق نے یوں طنزیہ انداز اپنایا جیسے اسے پختہ یقین ہو کہ ان کے پاس جواباً "کسی قابل ذکر نفع کا حوالہ نہیں ہو گا۔

"بالکل! میں بتاتا چلوں تعلیمی سال کے اختتام پر جب ہم نے تمام تر نتائج کا ذمہ دار کلاس انچارج کو ٹھہرا کر کٹہرے میں کھڑا کرنا ہوتا ہے۔ تو وہ یہ جسٹی فیکیشن نہ دے سکے کہ انتظامیہ کے کسی عمل کی وجہ سے ٹیچرز کے پڑھانے کا انداز متاثر ہوا۔"

"گویا آپ کی ٹیچرز بس اتنی ہی صلاحیت رکھتی ہیں کہ ذرا سی اونچ نیچ ان سے ہینڈل نہیں ہو پاتی اور وہ اس کو اپنے لیے ڈھال بنا لیتی ہیں۔"

"ایسی بات ہرگز نہیں۔" پرنسپل نے فوراً" تردید کی۔

"ہماری تمام تر ایمپلائز اتنی قابل ہیں کہ جہاں اسٹیمنا ختم ہو وہاں پوٹینشل شو کر سکیں مگر لیٹ آنے والے بچے کو اسپیشل توجہ کی ضرورت ہوتی ہے جو اگر نہ دی جائے تو ہمیں خسارہ ہوتا ہے کیونکہ کسی ایک پہ اتنے دن فوکس کیے رکھنے سے باقی بچوں کی حق تلفی ہوتی ہے اور نئے ایک کسٹمر کے لیے پرانے تمام کسٹمر کو نظر انداز کرنا ہمارے رولز کا حصہ نہیں۔" پرنسپل کی لمبی چوڑی وضاحتوں سے شارق بے زار ہونے لگا۔ اسی لیے ٹھنڈی سانس خارج کر کے بولا۔

"آپ بالکل پریشان مت ہوں آپ کو ذرا بھی اسپیشل اٹینشن نہیں دینی پڑے گی نہ آپ کے بچے متاثر ہوں گے نہ ٹیچر ہوں گی یہ میں آپ کو گارنٹی دیتا ہوں۔"

"آپ کے الفاظ ـــ مجھے گارنٹی نہیں' پدرانہ شفقت دکھ رہے ہیں۔" پرنسپل نے ایک بار پھر اس کے لفظوں کو بے مول کر دیا تھا۔ شارق دانت پیس کر رہ گیا۔

"او کے فائن۔ میرے پاس آپ کے بورڈ آف ڈائریکٹرز میں سے کسی ایک کا ریفرنس ہے۔ آپ مجھے کیا فیور دے سکتے ہیں۔" شارق نے براہ راست اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا پہلی بار وہ ذرا گڑبڑا سا گیا پھر اپنے ٹیبل کی دراز سے ایک وزیٹنگ کارڈ نکال کر اس کے سامنے رکھتے ہوئے بولا۔

"اگر آپ کلاس ٹیچر کو اپنے حق میں ہموار کر لیں تو بہت جلد آپ کا بچہ اسکول کا حصہ ہو گا۔"

☼ ☼ ☼

دائیں ہاتھ میں کافی کا مگ تھامے گلاس ونڈو کے پاس کھڑی وہ کسی غیر مرئی نقطے کو گھور رہی تھی۔ چند منٹوں قبل بجنے والا اس کا موبائل ابھی تک اس کے بائیں ہاتھ میں موجود تھا اس نے دروازہ کھلا چھوڑا ہوا تھا۔ اور ایسی جگہ کھڑی تھی کہ گھر کے اندر داخل ہونے والے کو اسے ڈھونڈنے میں کسی دقت کا سامنا نہ کرنا پڑے۔

شارق نے ادھ کھلا دروازہ دیکھ کر بھی از راہ اظہار تہذیب ڈور بیل بجائی پھر کوئی جواب نہ پا کر دروازے کو دھکیل دیا ہلکی سی چرچراہٹ کے ساتھ وہ کھلتا چلا گیا۔ اپارٹمنٹ کے اندرونی حصے پہ پہلی نظر پڑتے ہی اسے احساس ہو گیا کہ وہ مالی طور پر اتنی مستحکم ضرور ہے کہ شارق ایشان نے دانہ ڈالا تو تبھی وہ اس کے لیے ندیدہ پن نہیں دکھائے گی۔ بلیک جینز اور کریم کلر کی لانگ شرٹ جس کے برائے نام بازو تھے۔ پہنے ہوئے وہ بظاہر بہت مگن انداز میں کھڑکی کے پار دیکھ رہی تھی مگر اس نے شارق کو زیادہ انتظار نہیں کروایا تھا۔ اس کے مڑنے پہ شارق بے اختیار ایک قدم پیچھے ہٹا۔

"تم۔" اس کے دل نے بے آواز کہا اور ہاتھ میں تھامے للی کے پھولوں کے بکے پہ اس کی گرفت کمزور پڑ گئی۔

☼ ☼ ☼

وہ یتیم تھی مگر بہت خوبصورت نہ بہت ذہین نہ ہی فرشتہ صفت عادات کی مالک' پانچ سال کی عمر میں اسے یتیم خانے سے ایک چالیس پینتالیس سالہ تنہا عورت نے گود لیا۔ مگر یہ کوئی امیر کبیر بیوہ نہیں تھی

ایک بانجھ عورت تھی جس کی پہلی شادی بے اولاد ہونے کی وجہ سے نہ چل سکی۔

پھر اس کے بیمار باپ نے مرنے سے پہلے پانچ بچوں کے باپ کے ساتھ بیاہ دیا یہی پانچ بچے جب جوان ہوئے تو انہوں نے اسے اضافی خرچ اور بے کار مال سمجھتے ہوئے نکال باہر کیا۔

اسے بیٹی بنانے والی سادہ طبیعت سی زینب بی بی پرائمری پاس تھیں اور بہت فخر تھا انہیں اپنے خواندہ ہونے پہ جب وہ ان کے ساتھ آئی تھی تو وہ ایک مکتب اسکول میں باورچن تھیں وہیں سے اس نے آٹھ جماعتیں پاس کیں پھر وہ اور زینب بی بی پانچ سال ایک بریگیڈیئر کے ہاں رہے جہاں بریگیڈیئر کی بیٹی کھینچ تان کر اسے بی اے تک لے ہی آئی پھر جب بریگیڈیئر صاحب اپنی بیٹی کی شادی کے بعد اس کے ساتھ بیرون ملک شفٹ ہو گئے تو زینب بی بی نے ان کے ہمسایوں کے ہاں ملازمت کر لی یہ ایشان فقل کا گھر تھا۔

☼ ☼ ☼

"ہاہاہا!" اس نے فلک شگاف قہقہہ لگایا تھا۔ نیم النساء نے نہ سمجھنے والے انداز میں اس کی طرف دیکھا۔

"تم....." اس نے انگشت شہادت کی مدد سے نیم النساء کی طرف اشارہ کیا مگر کچھ کہہ نہ پایا کیونکہ بے انتہا کوشش کے باوجود وہ قہقہے کا گلا نہ گھونٹ سکا وہ ہنس ہنس کے لوٹ پوٹ ہو گیا تھا اور اب گھٹنوں پہ ہاتھ رکھے ہانپ رہا تھا۔ اس نے وہیں جھکے جھکے سر اٹھا کر زیمی کی طرف دیکھا' زیمی نے دیکھا کہ اس کی غلافی آنکھیں بے تحاشا ہنسنے کی وجہ پانیوں سے بھر گئی تھیں۔ وہ محبت پاش نظروں سے اس کے دائیں گال پہ پڑنے والے ڈمپل کو دیکھتی رہی۔

☼ ☼ ☼

"یہ تو جوک آف دی سنچری ہو گیا۔" وہ چائے کا کپ ٹرے میں سجائے شارق کے کمرے کی طرف آئی تھی جب اسے اس کے کسی دوست کی آواز سن کر پلٹنا پڑا کیونکہ اس نے تاکید کر رکھی تھی کہ فرینڈز کی موجودگی میں اسے ڈسٹرب نہ کیا جائے۔

"تو پھر کیا رسپانس تھا تمہارا ملکہ خوش فہمی کے پرپوزل پہ۔" ایک اور مردانہ آواز سنائی دی تھی اور اس کے قدم تھم گئے اور وہ رخ موڑ کر بے تاب سی دھڑکنوں کے ساتھ شارق کا جواب سننے کے لیے رک گئی۔

"خوش فہمی نہیں غلط فہمی کہو۔" شارق کی بجائے پہلی والی نامانوس مردانہ آواز سنائی دی اگلے ہی لمحے شارق بھی کچھ کہہ رہا تھا۔

"بالکل' وہ باورچن کی بیٹی تو وے' چہرہ دیکھا ہے کبھی اس کا مہاسوں سے بھرا ہوا' گھن آتی ہے دیکھ کر۔" زیمی کا ہاتھ بے اختیار اپنے گال پہ آر کا تھا۔

"اتنی موٹو' ہونہہ انڈے کی طرح پھیلی ہوئی۔" اس کے انداز میں حقارت ہی حقارت تھی زیمی کی نظریں جھک گئی تھیں۔ اس نے اضطراری انداز میں کپ کی ساسر پہ گرفت مضبوط کر لی گویا وہ اسی کے سہارے کھڑی ہو چھوڑا تو گر جائے گی۔

"ویسے بڑی جرات والی ہے جو شارق ایشان کو اپروچ کیا۔" کسی نے تبصرہ کیا تھا۔

"ہاں' بڑی توپ سمجھتی ہے خود کو۔" شارق نے فوراً" تائید کی۔

"اسی بات کا گھمنڈ بہت ہے اس کو کہ کلاس فور سے تعلق ہونے باوجود وہ چودہ جماعتیں پاس کر لیں۔"

"رنگت کے متعلق بھی یہی گمان ہو گا کہ وہ کسی بیوٹی کریم کا اشتہار ہے۔" کوئی اور پھر سے ہتک آمیز انداز میں گویا ہوا زیمی نے بے بسی سے اپنے پیروں کو دیکھا جو حرکت کرنے سے انکاری تھے۔ سماعتیں بہرحال کچھ کچھ حق نسبت ادا کر ہی گئیں شاید جان گئیں کہ کسی کے الفاظ کی ترسیل اس کے دماغ تک جاری رکھی تو وہ سہہ نہ پائے گی اسی لیے مفلوج سی ہو گئیں۔

☼ ☼ ☼

"باؤ آر یو؟" زیمی نے بہت عام سے انداز میں پوچھا۔

اس کے سہ لفظی سوالیہ فقرے سے ہی شارق کو اندازہ ہو گیا کہ برٹش لب و لہجے پہ عبور حاصل کر چکی ہے۔

"فائن۔" وہ خواہ مخواہ ہی ہکلانے لگا۔

"بیٹھیے پلیز۔" اس نے کھڑکی والی دیوار کے ساتھ رکھے صوفے کی طرف اشارہ کیا۔ وہ گھسیٹ گھسیٹ کر قدم اٹھاتا ہوا بمشکل ہی صوفے تک پہنچا اور سر جھکا کر بیٹھ گیا۔

"اماں بی بی کا پہلا شوہر مرتے وقت ایک کنال زمین ان کے نام کر گیا تھا ناہموار سی بنجر زمین گاؤں کی آبادی سے بھی ذرا ہٹ کے تھی مگر اماں بی بی نے تب ہی سوچ لیا کہ میری شادی پہ آدھی زمین بیچ کر بقیہ پہ مجھے مکان تعمیر کروا دیں گی حالانکہ تب میں فرسٹ ایئر میں تھی۔" وہ بڑے جوش و خروش سے اسے بتا رہی تھی جبکہ شارق سوچ رہا تھا یہ سب باتیں مجھ سے کہنے کا کیا مقصد ہو سکتا ہے؟ زیمی کچھ دیر کے لیے خاموش ہوئی اور پھر بولی۔

"اس شام جس طرح میں آٹا گوندھتی اماں بی بی کو مجبور کر کے اس گھر سے لے آئی وہ جان گئیں کہ میں اب عمر بھر شادی نہیں کروں گی۔"

زیمی کی آواز میں اداسی گھل گئی تھی۔ شارق ابھی بھی اپنے چمکتے بوٹوں کو گھور رہا تھا۔

"پہلی فرصت میں ہم نے وہ جگہ بیچ کر یہ تین مرلے کا پلاٹ لے لیا اور باقی رقم بینک میں رکھوا دی۔ میری گڈ لک کہ انہی دنوں ایک اچھے اسکول کو جونیئر سیکشن کے لیے ہیلپر ٹیچر کی ضرورت تھی جس کے لیے کم از کم تعلیم بی اے بتائی گئی' تجربے وغیرہ کی ضرورت نہیں تھی اور یوں مجھے میری پہلی جاب مل گئی۔"

شارق بے توجہی سے اس کی باتیں سن رہا تھا اور اس خواہش کو کوس رہا تھا جس کی وجہ سے آج وہ اپنی ایک ملازمہ کے در پہ ہاتھ پھیلانے آیا تھا۔ اس نے سوچا تک نہ تھا کہ وہ حقیر سی لڑکی اسے یوں ملنے والی ہے۔ ذلت اور شرمندگی کے احساس نے اس کے بدن سے ساری قوت نچوڑ لی تھی۔ دو ٹکے کی نیم النساء دو ٹکے کی نہیں رہی تھی آج وہ بے مول ہوا گردن جھکائے بیٹھا تھا۔

"اس جگہ میں نے دو سال جاب کی' اسی دوران ایک یونیورسٹی سے ایوننگ کلاسز لے کر جیسے تیسے ایم اے انگلش کر لیا۔

بڑے ہی جتن کیے میں نے یادوں سے فرار کے لیے کمپیوٹر کورسز' لینگویج کورسز' آرٹ اینڈ ڈرائنگ کلاسز' ایوننگ میں ایم اے انگلش کی کلاسز لیتی رات دیر تک جاگ کر اوپن یونیورسٹی کی ماسٹرز ان ایجوکیشن کی اسائنمنٹس بناتی۔"

زیمی کی اعصاب شکن مسافت کی تھکن اس کے لہجے میں گھلنے لگی۔ اس کی آنکھوں میں نمی اتر آئی۔ اس نے نظر بھر کر سامنے بیٹھے شخص کو دیکھا اور فیصلہ کر لیا کہ آج وہ اسے تم کہہ کر مخاطب کرے گی۔

"تم تو جوں کے توں از بر رہے شارق۔" اس نے بے بسی سے کہا پھر چند لمحے زیر لب دانتوں تلے چباتی رہی اور بولی۔

"مگر یہ ضرور ہوا کہ دو سال بعد جب میں نے وہ اسکول چھوڑا تو ماسٹرز کی دو ڈگریوں' experience سرٹیفکیٹ' لینگویج' کمپیوٹر اور آرٹ سے متعلقہ کئی ڈپلومے مل کر میری سی وی کو اتنا جاندار بنا چکے تھے کہ مجھے اپنی توقع سے بھی اچھے اسکول میں جاب مل گئی۔ اور کچھ ہی عرصے بعد مجھے اس اسکول سے' تمہارے اسکول سے کال آ گئی اور وہاں میری روح کو قرار آ گیا۔ میں بار بار اسکول کا نام دہراتی' کیونکہ میں نے کئی ایک بار تمہاری زبان سے یہ سنا تھا۔ میرے لیے وہ اہم ہو گیا کیونکہ وہاں تم ہوتے تھے۔ چلتے پھرتے' دوڑتے بھاگتے' روتے' منہ بسورتے' لڑتے جھگڑتے' لکھتے پڑھتے' ہنستے مسکراتے۔ تم مجھے وہاں ہر روپ میں نظر آتے اور میں وہاں بندھ گئی۔" وہ اتنا کہہ کر خاموش ہو گئی شارق ہنوز سپاٹ چہرہ لیے سر جھکائے بیٹھا تھا۔ وہ اکیلے بولتے بولتے تھک گئی تھی جبھی اس نے اسے بھی

باقاعدہ طور پر شریک گفتگو کرنے کا فیصلہ کیا ورنہ اب تک وہ محض ایک سامع تھا۔

"شارق۔" وہ اسے مخاطب کر رہی تھی اس کا سر اٹھانا ناگزیر ہو گیا لیکن وہ کچھ بول نہیں سکا محض ایک نظر ڈال کر رہ گیا۔ وہ صوفے کی پشت سے ٹیک لگائے ٹانگ پہ ٹانگ چڑھائے بیٹھی تھی اور گلے میں موجود نفیس سی چین کو انگلی پہ چڑھائے ہوئے تھی۔ شارق کو اس سمے وہ بہت مغرور سی لگی۔ وہ اداسی اور تھکن جو شارق کو اس کے لہجے اور باتوں سے گاہے بگاہے محسوس ہوتی رہی اس وقت اس کا شائبہ تک نہ تھا۔

"تم یقیناً" یہ سوچ رہے ہو گے کہ میں نے آتے ہی تمہیں یہ رام کہانی کیوں سنائی؟ ایکچولی تم امیر لوگوں کے بھی نا عجیب ہی چونچلے ہوتے ہیں ذرا ذرا سی بات پہ اسٹریس لے کر فرسٹریشن کا شکار ہو جاتے ہو اور نفسیاتی مریض بن بیٹھتے ہو۔" وہ بے زار سے لہجے میں تبصرہ کر رہی تھی۔ شارق حیران سا اس کے پل میں تولہ پل میں ماشہ سے مزاج کا جائزہ لے رہا تھا کبھی وہ دکھی لگتی کبھی تھکن زدہ، کبھی بڑے جذب سے محبت کا ذکر کرتی اور کبھی مغرور سی۔

"میں نے جان بوجھ کر آتے ہی اپنے متعلق تمہارا تجسس ختم کر دیا۔ آئی کین فیل کہ جب تم آئے تو تمہیں دھچکا لگا ہو گا کہ تم بھکاری بن کے آئے بھی تو کس کے سامنے؟؟"

اس نے اپنے تراشیدہ بالوں کو ہاتھ سے پیچھے کی طرف کرتے ہوئے کہا۔ شارق کی نظریں خود بخود ہی زمین میں گڑ گئیں۔

"ویسے بھی تمہیں تمہارے سیکریٹری نے بتایا ہی ہو گا کہ میں نے کتنی مشکل سے پچیس منٹ کا اپائنٹمنٹ دیا ہے۔" مارے تذلیل کے شارق کے کان کی لویں سرخ ہو گئیں زیم النساء جی بھر کے محظوظ ہوئی اور پھر کچھ یاد آنے پہ بولی۔

"اچھا ہاں سنو، ایسا کوئی خاص مسئلہ نہیں تھا ایڈیشن کا۔" وہ ہلکے پھلکے انداز میں کہہ رہی تھی۔

"ہاں لیکن جب ایڈیشن ڈیٹ کے سترہ دن بعد تم اور رحمہ آئے تو میں نے تمہیں دیکھ لیا تھا۔ پھر بڑے ہی پاپڑ بیلنے پڑے مجھے آج کے دن کے لیے۔ جاب چھوڑنے کی دھمکی دی۔ پریس میں بدنام کرنے کا کہا۔ کچھ کولیگز کے ساتھ مل کر لابنگ کر لی انتظامیہ کے خلاف۔"

وہ بڑی وضاحت سے اسے بتا رہی تھی اس کے نتھنے پھول گئے۔

"کئی ایک جگہ پیسوں سے بھی کام چلایا۔ ارے ہاں وہ اسکرپٹ کیسا تھا؟"

زیمی کے سوال پہ شارق نے نا سمجھنے والے انداز میں اس کی طرف دیکھا۔

"پرنسپل والا۔ اگر تمہیں لگتا ہے کہ اس ملک میں کوئی ادارہ صاحب ثروت لوگوں کو ناخوش رکھ کر اتنا کامیاب ہو سکتا ہے تو پھر میں تمہاری سوچ کے متعلق یہی کہوں گی ہاؤ ڈ سکٹنگ۔"

آخری لفظ اس نے خوب چبا کر کہا تھا شارق نے مٹھیاں بھینچ لیں۔

"تمہارے جیسے ہی لوگ ہوتے ہیں جنہیں اسکول ذرا سا خوش رکھتا ہے اور اصولوں کا ڈھول ڈالتا ہے ان کے گلے میں، اور وہ اسے بڑی خوشی سے پیٹتے ہیں۔" وہ اسے مزے لے لے کر بتا رہی تھی۔

"اور ہاں وہ بھی تم جیسے ہی ہوتے ہیں جن کی وجہ سے ہم کبھی ٹاپ ٹوئنٹی میں کبھی ٹاپ ٹین میں اور کبھی ٹاپ تھری میں۔ اس وقت تو تم غصے میں ہو مگر تم جب بھی اس ساری صورت حال کا غیر جانبدارانہ تجزیہ کرو گے تو مجھے داد ضرور دو گے کہ میں نے کتنی effort کی اور کتنی مشکل سے آج کا دن اپنے نصیب میں لکھوایا۔"

وہ صرف اسے تاؤ دلا رہی تھی۔ پھر اچانک اٹھ کھڑی ہوئی اور حیران ہوتے ہوئے بولی۔

"اوہ اتنا وقت ہو گیا مگر خیر تم کون سا روز روز ملنے آتے ہو۔" اس نے گویا بڑی فیاضی کا مظاہرہ کیا۔ شارق زبان کی نوک تک آئے خرافات کو بمشکل جیب کی زنبیل سے باہر آنے سے روکتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ اب اسی انداز میں کھڑکی کے پاس کھڑی تھی جس طرح اس کی آمد کے وقت کھڑی تھی۔

"سنو۔" وہ گردن موڑے اسے مخاطب کر رہی تھی شارق بلاوجہ ہی رک گیا۔

"رحمہ سے کہنا اپنا خیال رکھا کرے، بڑی ڈس فگر سی ہو رہی ہے۔"

بات مکمل کر کے وہ فوراً" گردن موڑ کر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی مگر اسے یقین تھا شارق نے بڑی دقت سے اس کی بات کو ہضم کیا ہو گا اور اس کے متناسب سراپے پہ نگاہ غلط ڈالنا تو بالکل نہیں بھولا ہو گا۔

☼ ☼ ☼

کھڑکی کے اس پار سڑک پہ رواں دواں ٹریفک میں سے اس نے شارق کی گاڑی کو تب تک نظروں کی زد میں رکھا جب تک ________ رکھنا ممکن تھا کوئی ڈیڑھ ماہ قبل اس نے شارق اور رحمہ کو اسکول کی پارکنگ میں دیکھا تھا اگلے ہی دن اس پہ ان کی آمد کا عقدہ کھل گیا تھا اور تب اس کے دل نے جس کام کا سوچا تھا۔ اس کی تکمیل کے صرف دس فیصد امکانات تھے۔ مگر اس نے صرف سوچا نہیں تھا ٹھان لی تھی اور آج شارق خود چل کر اس تک آیا تھا۔ بھلے ہی ضرورت کی نوعیت کیا تھی بھلے ہی کام کتنا معمولی تھا۔ اس کے لیے یہ ایک اچیومنٹ تھی کہ وہ سائل بن کر آیا تھا۔ مگر جس انا کی تسکین کے لیے اس نے یہ سب کیا تھا وہ اس کے آنے پہ نہ جانے کہاں جا سوئی تھی۔ اس کا دل شاداں نہیں تھا وہ تو اسے دیکھتے ہی ٹوٹنے لگی تھی بکھرنے لگی تھی آتے ہی اپنی داستان سنانے کا قصد تو اس نے بہت پہلے سے کر رکھا تھا مگر اس لیے کہ اس کو یہ بتا سکے کہ کس طرح اس کو نیچا دکھانے کے لیے قدرت اس کی راہیں ہموار کرتی رہی۔

مگر سب کچھ ہی تو الٹ ہو گیا اس نے تو یوں اپنی روداد بیان کی گویا اپنی تھکن کا حال بتا رہی ہو۔ سسکیاں سنا رہی ہو، بے خوابی کے باعث آنکھوں میں ہلکورے لیتی سرخی دکھا رہی ہو۔ اتنے دنوں کی وہ خواہش کہ وہ جھکے سر کے ساتھ بیٹھا رہے، وہ کیوں پس منظر میں چلی گئی تھی اس کا کیوں دل چاہ رہا تھا وہ اسے دیکھے، نگاہ بھر کے دیکھے اور دیکھتا ہی رہے وہ جو اس خیال سے خوش تھی کہ اس کی بولتی بند کر دے گی آج کیوں یہ چاہ رہی تھی کہ وہ اس سے کلام کرے، کچھ تو کہے، چاہے کچھ بھی کہہ دے۔ پھر اس نے پینترا بدلا۔

یہ اس کا دل ہی تھا جس نے اسے سمجھایا کہ کوئی تو چارہ ہو کہ وہ نظر بھر کر دیکھے۔ وہ حیران سا اسے تکنے لگا اور وہ اضطراری کیفیت میں کبھی گلے میں پڑی چین سے کھیلتی، کبھی بالوں کو جھٹکا دیتی، کبھی خوا مخواہ ہی ٹانگ جھلانے لگتی۔ اس کا دل ہمک رہا تھا کیونکہ وہ جانتی تھی کہ شارق ایشان کی آنکھوں میں حیرانی کے ساتھ ساتھ کچھ اور بھی تھا۔ نہ جانے کیوں اس کے پاگل دل نے فرض کر لیا کہ وہ "کچھ اور" ستائش ہو گی۔ پھر اس نے سوچا کیوں نہ ٹرائل ہو جائے۔ (دونوں ہی شارق اس نے آزمانے تھے ایک وہ جو ست روی سے چلتا واپس جا رہا تھا ایک وہ شارق جو ننھے سے لوتھڑے کی صورت اس کے سینے میں دھڑکتا تھا۔) اس نے بلا وجہ اس کو پکارا تھا اور وہ بلاوجہ رک گیا تھا۔ وہ فوراً" اپنا دھیان ہٹانے لگی مگر اس سوچ نے اسے لتاڑ کے ہی چھوڑا کہ وہ ساری رات روتی رہی ہے مگر موت کسی کی نہ ہوئی تھی۔

اس نے محبت کی قبر پہ تسکین انا کی عمارت استوار کرنا چاہی تھی مگر محبت کسی ناگن کی طرح پھن پھیلائے موت کی طرح طاقتور ضرور نظر آئی مگر وہ زندہ تھی اور شاید اس نے آب حیات والی زندگی جینا تھی انا کا وہ زور اور تخیل جس نے اسے تسکین انا کے حصول کے لیے اکسایا، ٹوٹ چکا تھا۔ حقیقت اس کے سامنے سینہ تان کر کھڑی مسکرا رہی تھی۔

میرے احساس کو نہ جھٹلانا
ہے وفا میری سرشت کا حصہ
میری مرگ کا یقین نہ رکھنا
آبِ حیات والی زندگی ہے میرا شیوہ

☼ ☼

فوزیہ یاسمین

دستِ کوزہ گر

زوبیہ کو اپنے گھر میں اپنی خالہ شائستہ کی روح نظر آتی ہے۔ لیکن وہ اس سے بات نہیں کرتی، جبکہ زوبیہ ان سے بات کرنے کے لیے بے چین ہے۔ اس کی ملاقات رخسار سے ہوتی ہے۔ جو کالج میں اس کے ساتھ پڑھتی ہے اور روحوں سے بات کرنے کا دعویٰ بھی کرتی ہے۔۔۔ زوبیہ اسے رات کے دو بجے اپنے گھر کی چھت پر لے جاتی ہے اور اس سے کہتی ہے کہ وہ اس کی خالہ کی روح کو بلائے۔۔۔ وہ روح کو بلانے کی کوشش کرتی ہے۔

رومیلہ، سنبل اور نمل کو یونیورسٹی میں ایڈمیشن مل جاتا ہے۔ اور اسی خوشی میں نمل ان دونوں کو لنچ کی دعوت دیتی ہے۔۔۔ اس آفر پر دونوں حیران رہ جاتی ہیں۔ جبکہ دوسری طرف خرم، ذکی سے شرط ہارنے کے بعد اس کی عجیب و غریب شرط کو قبول کرلیتا ہے، اور انہیں لنچ کے لیے کہہ دیتا ہے۔

زوبیہ اپنی خالہ سے بات کرنے کے بعد بہت مطمئن ہوتی ہے جبکہ رخسار اس کے بے وقوف بن جانے پر خوش ہے۔ وہ دونوں واپس جانے کے لیے سیڑھیوں کی طرف بڑھتی ہیں کہ اچانک لائٹ چلی جاتی ہے؟ اور کوئی رخسار کو اندھیرے میں زخمی کردیتا ہے۔

۲۱

اکیسویں قسط
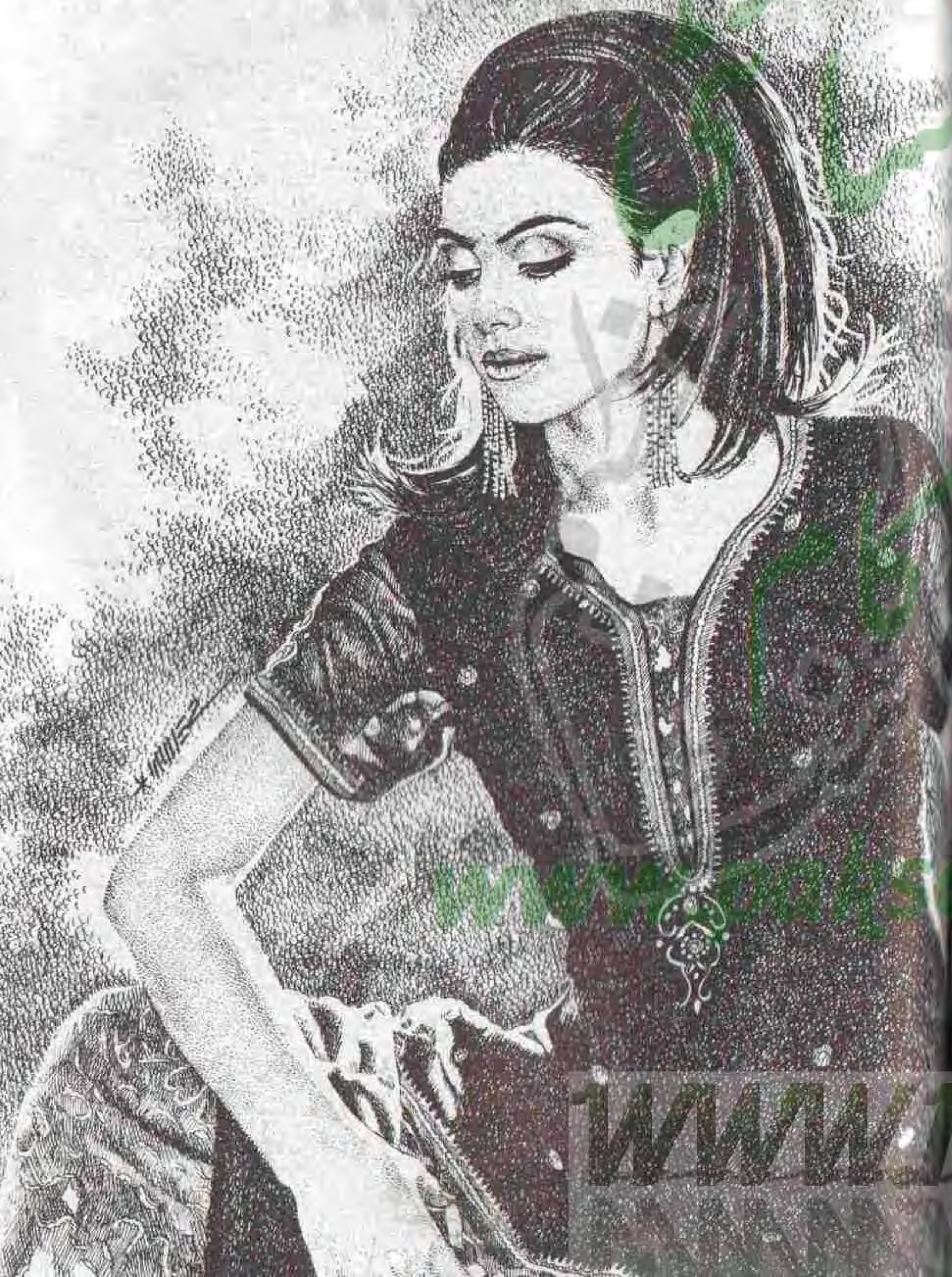
نمل نے سرہلا کر جیسے ہی اسے پوچھنے کی اجازت دی وہ بڑے ہمدردانہ انداز میں بولا۔

"آپ نے خرم جیسے تھرڈ کلاس انسان سے منگنی کر کیسے لی اور اگر کسی وجہ سے کرنی ہی پڑی تھی تو اب آپ اسے توڑ کیوں نہیں دیتیں؟" سنبل جو بڑی بے یقینی سے نمل کو دیکھ رہی تھی سمیر کا سوال سن کر اس کے انداز میں خفگی چھلکنے لگی۔

اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا وہ کیوں ایک انجان شخص کو اتنا بڑھاوا دے رہی تھی کہ وہ اتنے ذاتی سوال پر اتر آیا۔

دوسری طرف نمل، سنبل کے احساسات کی پروا کیے بغیر ٹھنڈی سانس کھینچتے ہوئے بولی۔

"یہ سوال آپ کو مجھ سے نہیں ہمارے معاشرے سے پوچھنا چاہیے جس نے شریعت میں دی گئی آزادی کو سلب کرتے ہوئے لڑکی کو اپنی شادی کے فیصلے میں رائے دینے کے حق سے محروم کر دیا ہے۔

میرا گھر بھی ان اسی فیصد گھرانوں کی طرح ہے جہاں لڑکی سے پوچھ کر اس کا رشتہ طے کرنا ضروری نہیں سمجھا جاتا۔" نمل کے افسردہ سے لہجے پر سمیر کی نظروں میں اس کے لیے ہمدردی کے تاثرات ابھر آئے جیسے نمل کی بات سن کر اسے نمل پر ترس آنے لگا ہو۔

اس کی یہ ترحم بھری نظر سنبل کو سلگا گئی تھی اس پر اس کا اگلا جملہ تو جلتی پر تیل کا کام کر گیا۔

"مگر تم جیسی حسین و جمیل لڑکی کا خرم کے ساتھ کوئی جوڑ نہیں ہے اور پھر تم اتنی خود اعتماد اور بولڈ ہو کہ ایک زبردستی کے فیصلے پر تمہارا سر جھکا دینا ہمارے جیسے لوگوں کے لیے بہت بڑا دھچکا ہے جو تمہاری بولڈنیس کے شیدائی ہیں۔" اس کا اس قدر خوشامدی انداز پل بھر کے لیے نمل کو بھی کوفت میں مبتلا کر گیا مگر وہ اس وقت سب کچھ نظر انداز کرنے کے لیے تیار تھی۔

کیونکہ اس وقت اس کی نظر میں صرف ایک چیز سمائی تھی اور وہ تھی خرم کو کسی بھی طرح اذیت پہنچانا اور اس کے لیے سمیر سے بہتر اور کیا ہو سکتا تھا۔

سمیر جو کہ خرم کا سب سے بڑا حریف تھا جب نمل اس کی منگیتر ہوتے ہوئے سمیر کے ساتھ یونیورسٹی میں نظر آئے گی تو خرم کے سینے پر تو سانپ لوٹیں گے ہی ساتھ ہی ساتھ اسٹوڈنٹس کی چہ مگوئیاں خرم کے زخم پر نمک پاشی میں بڑی مددگار ثابت ہوں گی۔

یہ سب کچھ سوچتے سمے نمل نے اپنے لیے اور اپنے کردار کے لیے اٹھنے والے ہر سوال کو نظر انداز کر دیا تھا۔ اسے صرف خرم کو تکلیف پہنچانی تھی اور اس کے لیے وہ کچھ بھی کرنے کے لیے تیار تھی خود کو اسکینڈلائز کرنے کے لیے بھی۔

"بس کرو سمیر! میری تعریف کر کے تم مجھے اور ڈی گریڈ کر رہے ہو تمہارے الفاظ مجھے ٹارچر کر رہے ہیں۔"

جس طرح سمیر ایک دم آپ سے تم پر اتر آیا تھا اسی طرح نمل نے بھی طرز تخاطب بدل دیا تھا۔

اس کا بدلا ہوا ہر انداز سنبل کو پہلے سے زیادہ زہر لگ رہا تھا مگر وہ سمیر کے سامنے کچھ کہنا نہیں چاہتی تھی۔ خود نمل کو بھی یقین تھا ابھی سنبل کچھ نہیں کہے گی اور بعد میں وہ سنبل کو سمجھا لے گی سنبل کو قائل کرنا کوئی خاص ضروری نہیں تھا وہ صرف زبان سے غصہ کرنے کے علاوہ کچھ نہیں کر سکتی تھی اس کے ناراض ہو جانے کا کوئی خطرہ نہیں تھا وہ اس سے خفا نہیں ہو سکتی تھی اسی لیے نمل اس کے گھورنے یا موڈ آف کرنے کی پروا کیے بغیر سمیر سے مخاطب رہی یہاں تک کہ سمیر نے اسے ساتھ کینٹین چل کر کولڈ ڈرنک پینے کی آفر کر دی۔

مگر اب کی بار سنبل چپ نہ رہ سکی اور تڑخ کر بولی۔

"جی بہت بہت شکریہ! ہماری کلاس مس ہو جائے گی ہم پہلے ہی لیٹ ہو گئے ہیں۔" سمیر نے ایک بے زاری

سنبل بڑبڑائی وہ اسے ابھی کچھ کہنے ہی والا تھا کہ نمل بول پڑی وہ نہیں چاہتی تھی کہ سمیر، سنبل کو کوئی سخت بات کہے اور نمل جواب میں اسے کچھ نہ کہہ سکے تو خوامخواہ سنبل کو ہتک کا احساس ہو۔

ویسے بھی نمل اس کے ساتھ کینٹین جا کر بیٹھنا چاہتی تھی تاکہ خرم سمیت پوری یونیورسٹی کو علم ہو جائے کہ وہ خرم کی منگیتر ہونے کے باوجود اس کے دشمن کے ساتھ بیٹھی کولڈ ڈرنک پی رہی ہے۔

"نہیں سنبل آج کی کلاس لینے کا بالکل موڈ نہیں ہے چلو چل کر پہلے کچھ کھا پی لیں تھوڑا مائنڈ فریش ہو جائے گا۔" نمل کے فوری طور پر بول دینے کے باوجود سنبل کو نا صرف بے عزتی کا احساس ہوا تھا بلکہ اس کی برداشت بھی جواب دے گئی تھی۔

"نمل تم اپنے حواسوں میں تو ہو نا۔" سنبل کا جلا بھنا انداز دیکھ کر نمل نے فوراً" اس کا ہاتھ تھام لیا۔

"میں جانتی ہوں وہ پریڈ تمہارے لیے بہت اہم ہے لیکن پلیز میری خاطر آج اسے چھوڑ دو۔" نمل کے التجائیہ انداز میں ایک محسوس کی جانے والی تلقین چھپی تھی۔

مگر سنبل نے بھی نمل کے لہجے اور نظروں کو ویسے ہی نظر انداز کر دیا جیسے اب تک نمل، سنبل کو کر رہی تھی وہ اپنا ہاتھ چھڑوا کر تنک کر بولی۔

"ہرگز نہیں! تم اگر میری خاطر کولڈ ڈرنک کا ارادہ ملتوی کر سکتی ہو تو چلو ورنہ میں تو جا رہی ہوں۔" سنبل رکھائی سے کہتی واقعی آگے بڑھنے لگی نمل نے اسے روکنا چاہا مگر اسے پتا تھا سنبل سخت ناراض ہو چکی ہے اس وقت وہ اس کی کسی بات پر بھی نہیں رکے گی جبکہ نمل اس کے بغیر یوں تن تنہا جانا نہیں چاہتی تھی۔

خرم کو جلانے کی خواہش اپنی جگہ مگر وہ فطرتاً" اس قسم کی نہیں تھی ایسے میں اچانک اپنے مزاج کے برخلاف یوں کوئی قدم اٹھانا اتنا آسان نہیں ہوتا اسے سنبل کی موجودگی کی سخت ضرورت تھی۔

اور تبھی قدرت کا کرنا ایسا ہوا کہ سمیر جو سنبل کو جاتا دیکھ کر خوش ہو گیا تھا بے ساختہ بولا۔

"جانے دو اسے' اچھا ہی ہے۔ ہم دونوں چلتے ہیں۔" سنبل کے آگے بڑھتے قدم ایک دم رک گئے اس نے پلٹ کر ایک سلگتی نظر سمیر پر اور دوسری خفگی بھری نمل پر ڈالتے ہوئے نروٹھے انداز میں کہا۔

"چلو میں بھی چلتی ہوں تمہارے ساتھ۔" وہ اس کی بات پر سمیر کا واضح طور پر منہ بن گیا البتہ نمل نے اپنی بے ساختہ مسکراہٹ کو بمشکل چھپایا کیونکہ اگر سنبل اسے دیکھ لیتی تو خوامخواہ ہی چڑ جاتی۔

یہ اور بات تھی کہ سنبل اس کے باوجود چڑی ہی رہی۔

وہ تینوں پندرہ منٹ ہی کینٹین میں بیٹھے تھے مگر ان پندرہ منٹ میں جس جس کی نظر ان پر پڑی اس کی نظر کچھ لمحوں کے لیے پلٹنا بھول گئی۔

سمیر اور خرم کی دشمنی کسی سے ڈھکی چھپی نہیں تھی اور نہ ہی نمل اور خرم کی منگنی کوئی خفیہ انداز میں ہوئی تھی ایسے میں لوگوں کی حیرت ہرگز بھی حیران کن نہیں تھی۔

سب کی یہ حیرانی سمیر کو خوامخواہ ہی مغرور بنا رہی تھی ایسا لگ رہا تھا اس کی تنی ہوئی گردن کو دیکھ کر جیسے وہ کوئی قلعہ فتح کیے بیٹھا ہو اور کیوں نہ ہوتا دشمن کی منگیتر کے ساتھ ایسی جگہ پر بیٹھ کر کوک پینا جہاں سب ہی اس لڑکی کی حیثیت و مقام سے بخوبی واقف ہوں کہ وہ کسی کی ہونے والی شریک حیات ہے اور اسی کے حریف کے ساتھ بیٹھی ہے یہ احساس کسی تمغہ امتیاز سے کم تو نہیں تھا۔ (کم از کم سمیر جیسے لوگوں کے لیے)

سنبل کچھ بے زاری اور کچھ اس خوف کے ساتھ بیٹھی رہی کہ کہیں کوئی خرم کو اطلاع نہ دے دے اور وہ یہاں وارد ہو جائے۔

وہ اس وقت کا سوچ کر ہی پریشان ہو رہی تھی جب خرم، نمل کو اپنے دشمن کے ساتھ بیٹھا دیکھے گا۔

جانے اس وقت اس کا کیا ردعمل ہو گا یہ بات نہیں تھی کہ وہ خرم کو نمل کا منگیتر ہونے کی وجہ سے کوئی عزت دے رہی تھی یا اس کے مرتبے کو دھیان میں رکھتے ہوئے اس کے ناراض ہونے کی فکر کر رہی تھی بلکہ وہ تو ایک نیا بکھیرا کھڑے ہونے کے خیال سے پریشان تھی۔

چنانچہ وہ جلد از جلد یہاں سے بھاگ جانا چاہتی تھی اور نمل بھی محض پندرہ منٹ میں سمیر کو اللہ حافظ کہنے پر سنبل کی وجہ سے ہی مجبور ہوئی تھی جو اسے بار بار گھورے جا رہی تھی بلکہ آخر میں تنگ آکر وہ خود کھڑی ہونے لگی تھی تو نمل کو اٹھنا پڑا۔

وہاں سے نکلتے ہی سنبل اس پر برس پڑی نمل ان تمام سوالوں کے لیے پہلے سے تیار تھی اس نے بڑے آرام سے کہہ دیا۔

"خرم جیسے گھٹیا انسان سے نبٹنے کے لیے کوئی گھٹیا طریقہ ہی اپنایا جا سکتا ہے جو میں نے اپنا لیا۔"

"تم پاگل تو نہیں ہو گئی جو تم کرنے کا سوچ رہی ہو اس میں دونوں طرف سے نقصان تمہارا ہے خرم اشتعال میں آکر کچھ بھی کر سکتا ہے سمیر کے ساتھ مفت کی بدنامی کے بعد سمیر تو پیچھے ہٹ جائے گا اور تم خرم کی نفرت سہتی رہو گی۔" سنبل غصے سے تلملا اٹھی۔

"میں کیا اس کی نفرت سہوں گی۔ نفرت تو وہ میری دیکھے گا اور رہا سوال بدنامی کا تو اس کی مجھے پروا نہیں۔ خرم کو سبق سکھانے کے لیے اتنی بدنامی تو میں برداشت کر سکتی ہوں۔" نمل کے لہجے میں خودسری تھی سنبل غصے کے مارے کچھ بول ہی نہ سکی۔

بلکہ ایک طرح سے اسے سمجھانا بے کار سمجھتے ہوئے سنبل نے ناراضی کے طور پر بات چیت بند کر دی نمل نے بھی اسے منانے کی کوئی کوشش نہیں کی کیونکہ اسے معلوم تھا جب تک نمل اس کی بات نہیں مانے گی وہ ناراض ہی رہے گی اور نمل اس کی بات ماننے کو کسی طور تیار نہیں تھی۔

پھر اسے یہ بھی پتا تھا کہ سنبل چاہے جتنا بھی ناراض ہو جائے وہ اس سے دوستی ختم نہیں کرے گی نمل سے قطع تعلق کرنا تو بہت دور کی بات تھی وہ تو زیادہ دیر اپنا موڈ بھی خراب نہیں رکھ سکتی تھی ایک یا دو دن کی ناراضی کے بعد اسے نارمل ہو ہی جانا تھا اس لیے نمل نے اس کے بگڑے ہوئے موڈ کی چنداں پروا نہ کی اور اپنے فیصلے پر ڈٹی رہی اسے کسی بھی طرح خرم کو تکلیف پہنچانی تھی اور اسے یقین تھا کہ سمیر کے ساتھ پندرہ منٹ کی یہ نشست خوب مرچ مسالے کے ساتھ خرم تک پہنچے گی البتہ اس کا ردعمل کیا ہو گا اس کے متعلق نمل فی الحال کچھ بھی کہنے سے قاصر تھی۔

اور اس کے یقین کے عین مطابق ایک گھنٹے بعد ہی حمید اسے تازہ ترین سے مطلع کر رہا تھا۔

خرم اسی وقت کلاس اٹینڈ کر کے باہر نکلا تھا جب حمید نے تیزی سے پیچھے سے آکر اسے جا لیا۔

"یار میں نے ابھی ابھی کچھ سنا ہے اور اتنے پکے ذرائع سے سنا ہے کہ خبر کے جھوٹے ہونے کے امکان ہی نہیں ہیں۔" حمید نے حسبِ عادت اپنے لہجے میں تجسس پیدا کرتے ہوئے کہا تو حسبِ سابق اور حسبِ معمول خرم بور ہو کر اس کی شکل دیکھنے لگا۔

"فار گاڈ سیک حمید! سر مجاہد کا اس قدر بورنگ لیکچر سن کر نکل رہا ہوں کہ اب مزید کسی قسم کی بکواس سننے کی گنجائش نہیں ہے۔"

"ارے بکواس نہیں کر رہا سچ بتا رہا ہوں گیس کرو کیا بات ہو سکتی ہے چلو تھوڑا سا گائیڈ کر دیتا ہوں تمہارے لیے ایک ہنٹ ہے کہ بات نمل سے متعلق ہے۔" خرم جو اسے نظرانداز کرتے ہوئے آگے بڑھنے لگا تھا بغیر رکے قدم بڑھاتے ہوئے بولا۔

"وہ بھلے کسی سے بھی تعلق رکھتی ہے میں ایک کولڈ ڈرنک پیے بغیر کسی ہنٹ سے کوئی گیس نہیں کرنا چاہتا۔"

"چلو ایک کلو اور دے دیتا ہوں سمیر بھی اس خبر میں انوالو ہے۔" حمید نے اپنے لہجے کو مزید سنسنی خیز بناتے ہوئے کہا مگر خرم نے سنی ان سنی کرتے ہوئے آگے کی طرف بڑھنا جاری رکھا۔

اسے ہمیشہ سے حمید کا سسپنس پھیلانا زہر لگتا تھا اور اس وقت نمل اور سمیر کے متعلق کوئی بات کرنے کے لیے اتنا وقت لینا تو اور بھی گراں گزر رہا تھا۔

یہی وجہ تھی کہ وہ اسے یا اس کی بات کو اہمیت دینے کی بجائے اپنے چہرے سے مکمل بے زاری ظاہر کرتا آگے بڑھتا رہا مگر حمید کے کان پر جوں تک نہ رینگی الٹا وہ خوش ہو کر کہنے لگا۔

"دیکھا دو اتنے اہم کلو ملنے کے باوجود تم کچھ گیس نہیں کر سکے اور بھلا کرتے بھی کیسے۔ ارے جو میں سن کر آرہا ہوں وہاں تک تمہارا ذہن سوچ بھی نہیں سکتا۔"

"تو جب سوچ ہی نہیں سکتا تو کیا ضرورت ہے میرے ذہن کو پریشان کرنے کی خود ہی سیدھے طریقے سے بتا دو کہ کیا ہوا ہے جو تمہارے پیٹ میں اتنا درد ہے۔ کہ مچلے جا رہے ہو۔" خرم بری طرح چڑ گیا۔

یہی حمید چاہتا تھا کہ خرم کو تھوڑا تنگ کر لے پھر سب بتا دے گا اپنے مقصد میں کامیابی حاصل کر لینے کے بعد حمید نے بتانے میں ذرا دیر نہیں کی آخر اتنی دیر سے پیٹ میں مروڑ اٹھ رہے تھے اس سے بھی تو نجات حاصل کرنی تھی۔

"آج نمل سمیر کے ساتھ کینٹین میں دیکھی گئی ہے دونوں ایک ہی ٹیبل پر بیٹھ کر خوش گپیوں کے دوران کولڈ ڈرنکس اڑا رہے تھے۔" خرم کے بڑھتے قدم یک لخت تھم گئے وہ گہری نظروں سے حمید کو دیکھنے لگا جیسے اس کے چہرے سے اس کی بات کی سچائی کو پرکھ رہا ہو۔

حمید کا چہرہ ایک دم مطمئن تھا جھوٹ بولنے والی کوئی گھبراہٹ اس کے چہرے پر نہیں تھی بلکہ خرم کو اپنی طرف اتنے غور سے دیکھتا پا کر وہ ایک دم کھل اٹھا تھا۔

گویا وہ خرم کو حسبِ خواہش چونکانے اور الجھنے پر مجبور کر گیا ہے یہ احساس بڑا طمانیت خیز تھا وہ کوئی سچے اور مخلص دوست نہیں تھے جو ایک دوسرے کی تکلیف پر تڑپ اٹھتے وہ تو ایک دوسرے کو چھیڑ کر اور تنگ کر کے مزا لیتے تھے۔

اس حقیقت سے وہ سب بھی واقف تھے چنانچہ کوئی کسی کو کتنا بھی تنگ کرتا دوسرا اپنے احساسات سامنے والے پر ظاہر نہیں ہونے دیتا مبادا دوسرے کو ذرا سی دیر کے لیے بھی کوئی ذہنی و جذباتی تسکین نہ مل جائے۔

مگر اس وقت کی بات الگ تھی خرم نے جو سنا تھا وہ اسے ٹھٹکنے پر مجبور کر گیا تھا پھر بھی اس نے اگلے ہی پل اپنے احساسات پر قابو پاتے ہوئے ایک بار پھر اپنے انداز میں لاپروائی بھر لی۔

"بکواس ٹوٹل بکواس ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔"

"ارے ایسا ہی ہوا ہے بالکل ایسا ہی۔ تم چاہو تو کینٹین والوں سے پوچھ لو ان دونوں نے ساتھ بیٹھ کر کولڈ ڈرنکس پی ہیں اور کافی دیر باتیں بھی کی ہیں۔" حمید بڑے جوش و خروش کے ساتھ بولا۔

"مجھے کیا ضرورت ہے کسی سے پوچھنے کی جبکہ مجھے پتا ہے کہ ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔ سمیر تو کیا اس کے ساتھ کوئی بھی نہیں ہو سکتا۔ نمل اس قسم کی لڑکی نہیں ہے۔" خرم بے زاری سے بولا تو حمید آنکھیں نچاتے ہوئے کہنے لگا۔

"کیا بات ہے؟ بڑا یقین ہے اپنی منگیتر پر۔"

"اس میں یقین کی کیا بات ہے؟" خرم کی کوفت میں لحظہ بہ لحظہ اضافہ ہو رہا تھا۔

"یقین نہیں تو اور کیا۔ تم تو ایسے بات کر رہے ہو جیسے تم دونوں کی منگنی باہمی رضامندی سے ہوئی ہو اور نمل تمہارے ساتھ بے وفائی کرنے کا سوچ بھی نہ سکتی ہو یار اول تو وہ تمہارے ساتھ شادی کرنا نہیں چاہتی دوئم سمیر اتنا کوئی برا بھی نہیں ہے اچھا خاصا ہے سوئم! وہ چاہے جتنا بھی برا ہوتا نمل کا اس کی جانب راغب ہونا کوئی انوکھی بات نہیں ہے۔

وہ تمہارا دشمن ہے وہ تمہیں نقصان پہنچانے کے لیے ہر وقت بے چین رہتا ہے وہ تو تمہاری منگیتر پر لائن مارنے کی کوشش کر سکتا ہے۔ مگر افسوس کی بات تو یہ ہے کہ تمہاری اپنی منگیتر اس کا اس گھٹیا کھیل میں ساتھ دے رہی ہے۔

سمیر کی تو شکل دیکھنے سے تعلق رکھتی ہوگی کس قدر پراؤڈ فیل کر رہا ہوگا وہ سب کے بیچ تمہاری منگیتر کو اپنی طرف کھینچ کر۔" بے اختیار خرم نے اپنی مٹھیاں بھینچ لیں۔

دل تو چاہ رہا تھا حمید کا منہ توڑ دے مگر اس کے منہ لگنا بے کار تھا۔ جو کچھ وہ کہہ رہا تھا اگر وہ سچ تھا تو یہ تمام گفتگو کل کو دوسرے لوگ بھی کر رہے ہوں گے۔

وہ کہاں تک سب کا منہ توڑ کر ان کی زبانیں بند کرے گا۔

حالانکہ اسے بالکل یقین نہیں آ رہا تھا۔ جو بھی حمید نے نمل کے متعلق بتایا تھا وہ سب اسے جھوٹ لگ رہا تھا۔

نمل اور اس قسم کی حرکتیں دو بالکل متضاد باتیں تھیں۔ مگر حمید کا اعتماد سے بھرپور لہجہ اسے الجھا رہا تھا وہ اس کے سامنے ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا مگر حقیقت کیا تھی یہ جاننے کے لیے متجسس ضرور ہو گیا تھا اس نے فیصلہ کر لیا تھا وہ اپنے طور پر سب کچھ پتا ضرور کرے گا مگر حسب عادت اپنی سوچ اور خواہش کو بڑی کامیابی سے چھپاتے ہوئے اس نے بڑی بے نیازی سے کہا۔

"میں نے کون سا نمل کی محبت میں گرفتار ہو کر اس سے منگنی کی ہے وہ کسی کے بھی ساتھ بیٹھ کر باتیں کرے مجھے کیا؟ who cares۔" خرم حمید کو بتانے کے انداز میں کہتا آگے بڑھ گیا تو وہ واقعی بور ہو کر رہ گیا۔

یہ اور بات تھی کہ تپنے کے بعد اس کا رخ دوسرے دوستوں کی جانب تھا آخر پیٹ میں اٹھتے مروڑ بھی تو ٹھیک کرنے تھے۔

خرم کو خود بھی اندازہ تھا حمید نے اگر اس کی جان چھوڑ دی تھی تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا کہ وہ اس موضوع پر مزید بات نہیں کرنے والا بلکہ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ اب اس کا ڈھنڈورا پیٹنے دوسرے لوگوں کے پاس جانے لگا تھا۔

خرم کو اس کی اس عادت سے سخت چڑ تھی دل تو چاہ رہا تھا کہ اسے روک کر ٹوک دے کہ خبردار جو کسی کو کچھ بھی بتایا۔

مگر خرم اس کی رگ رگ سے واقف تھا وہ اگر اسے منع کرے گا تب بھی حمید کو کہے بغیر چین نہیں آئے گا الٹا وہ جسے بھی بتائے گا ساتھ میں یہ بھی کہے گا کہ خرم اس قدر شرمندہ ہے نمل کی اس حرکت کی وجہ سے کہ وہ سب کو منع کر رہا تھا کہ اس بارے میں کوئی بات نہ کرے۔

حالانکہ مثل مشہور ہے چاند چڑھے گا تو سبھی دیکھیں گے ایسی باتیں بھی بھلا کبھی چھپتی ہیں۔

☼ ☼ ☼

الیان نے صرف ایک فون گھمایا تھا اور ایک گھنٹے بعد اسے اپنی تمام مطلوبہ معلومات مل گئی تھیں۔

"سر آپ نے پیلس ہوٹل کے ہال روم میں منعقدہ فنکشن کی تفصیل معلوم کرنے کو کہا تھا نا۔ وہ سب میں نے پتا کر لی ہے۔" الیان کے ذرائع سے بغیر کوئی سوال کیے تمام جوابات موصول ہو گئے تھے۔

"ہاں بولو۔" الیان ہمہ تن گوش ہو گیا۔

"کل وہاں رومیلہ نامی ایک لڑکی کی شادی ہونی ہے کسی گلفام نام کے لڑکے سے یہ ہوٹل لڑکی کے بھائی نے بک کرایا ہے جس کا نام ابرار ہے ہوٹل کے منیجر کے پاس اس نے جو گھر کا پتا اور فون نمبر لکھوایا ہے وہ میں آپ کو میسج کر دیتا ہوں اس سے پہلے میں یہ بتاتا چلوں کہ یہ شخص امپورٹ ایکسپورٹ کے بزنس سے منسلک ہے پہلے یہ کاروبار اس کے والد فیاض کرتے تھے مگر اب سب کچھ یہی سنبھالتا ہے۔

ان کا بزنس کافی اچھا چل رہا ہے مجموعی طور پر مالی حالات کافی اچھے ہیں سی ایل ٹریڈنگ کا نام آپ نے بھی سنا ہو گا وہ انہی کی ہے۔" الیان حیرت زدہ سا ساری تفصیل سن رہا تھا ان کی کمپنی کا نام سنتے ہی الیان تعجب سے بولا۔

"سی ایل ٹریڈنگ یعنی کہ یہ لوگ تو بہت سالوں سے مارکیٹ میں بیٹھے ہیں ان فیکٹ ابرار نام کے اس شخص سے تو میں ملا ہوا ہوں جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے وہ تو پڑھا لکھا بندہ ہے۔" الیان اتنا حیران تھا کہ وہ سب ایک ایسے شخص سے ڈسکس کر بیٹھا تھا جسے کچھ بھی بتایا ہوا نہیں تھا کہ وہ کس کے بارے میں پتا کر رہا ہے اور کیوں کر رہا ہے۔

"جی سر ہے تو پڑھا لکھا شخص مگر مارکیٹ میں اس کے بارے میں یہی مشہور ہے کہ بہت ہی خراب دماغ کا آدمی ہے اپنے مطلب کے لیے کچھ بھی کر سکتا ہے۔" الیان نے اس کی اس بات پر زیادہ غور نہیں کیا۔

وہ خود بزنس میں ماہر تھا بزنس کی یہ تمام باریکیاں وہ اچھی طرح جانتا تھا مارکیٹ میں استحکام کے ساتھ کھڑے رہنے کے لیے بہت سوں کے ساتھ سختی کرنی پڑتی ہے کچھ کام نرمی سے نکل ہی نہیں سکتے۔

اسی لیے اکثر ایسی سختی دکھاتے دکھاتے انسان کا تاثر لوگوں کی نظر میں کچھ سے کچھ ہو جاتا ہے۔

الیان اچھی طرح جانتا تھا کہ آفس میں تیوریاں چڑھائے بیٹھے ہونے کا یہ مطلب نہیں تھا کہ ان کا عام روزمرہ زندگی میں بھی یہی مزاج ہو گا۔

دوسری جو چیز الیان کو حیران کر رہی تھی وہ تھی رومیلہ نامی لڑکی کی شادی کسی گلفام نامی لڑکے کے ساتھ طے تھی۔

یہ آخر کیا ماجرہ تھا کون تھا یہ شخص جو یہ نہیں چاہتا تھا کہ ان دونوں کی شادی ہو اور ان کی شادی توڑنے کے لیے اس نے یہ سارا بکھیڑا پھیلایا تھا۔

"کیا گلفام کے بارے میں بھی کچھ پتا کیا ہے؟" الیان نے ایسی کوئی ہدایت جاری نہیں کی تھی صرف اتنا کہا تھا کہ اس ہوٹل میں ہونے والی شادی سے متعلق جتنی بھی چیزیں ہیں چھوٹی سے چھوٹی اور بڑی سے بڑی سب پتا کر کے بتاؤ۔

اسی لیے اسے امید تھی کہ اس نے لڑکے کے متعلق بھی کچھ نہ کچھ معلوم ضرور کیا ہو گا اور واقعی وہ الیان کی امیدوں پر پورا اترا تھا۔

"جی سر ہوٹل کی انتظامیہ تو لڑکے کے بارے میں کچھ نہیں جانتی البتہ جن لوگوں نے ابرار کے متعلق بتایا ہے وہ صرف اتنا جانتے ہیں کہ ابرار کی بہن کی شادی کسی مرزا نامی شخص کے بیٹے سے ہو رہی ہے۔

لوگ زیادہ جانتے نہیں ہیں اس مرزا کو بڑا ہی ان نون سا بندہ ہے ابرار نے ہی ایک دو بار اس کے ساتھ بزنس ڈیل کی ہیں۔

دراصل یہ کچھ عرصہ پہلے ہی کراچی آیا ہے پہلے یہ حیدر آباد میں ہوتا تھا اور اس کا بیٹا تو عرصہ دراز سے کینیڈا

میں مقیم ہے شادی سے بھی دو تین دن پہلے ہی آیا ہے ورنہ عام حالات میں تو وہ پاکستان آتا ہی نہیں اسی لیے کسی نے اسے دیکھا ہوا بھی نہیں ہے۔" الیان عجیب الجھن کے عالم میں اس کی بات سنتا رہا۔

اسے لگ رہا تھا اس کی بہن کے اغوا کے پیچھے یہ مرزا صاحب کا ہی ہاتھ ہے حالانکہ خود اپنے ہی بیٹے کی شادی وہ بھلا کیوں توڑنا چاہیں گے یہ سوچتے ہوئے الیان اپنے اندازے کو یقین کی سند نہیں دے پا رہا تھا مگر اسے یہ یقین ضرور تھا کہ مرزا صاحب کا کہیں نہ کہیں کوئی دخل ضرور ہے بریرہ کے اغوا کے پیچھے۔

"مجھے ابرار کا نمبر دو۔" الیان نے وقتی طور پر سارے اندازوں کو جھٹکتے ہوئے فی الحال صرف حالات پر نظر جماتے ہوئے کہا تو دوسری طرف موجود شخص نے ابرار کا نمبر نوٹ کرا دیا۔

الیان کچھ دیر تو موبائل میں فیڈ کیے نمبر کو دیکھتا رہا ایسے جیسے اپنے ذہن میں الفاظ ترتیب دے رہا ہو کہ اس شخص سے جو بات کرنی ہے وہ اسے مناسب طریقے سے سمجھا سکے۔

پتا نہیں اس کا کیا ردعمل ہونے والا تھا پہلے تو الیان' رومیلہ اور اس کے گھر والوں کو اس پلان کا حصہ سمجھ رہا تھا لیکن اب اسے یہ سب کوئی اور ہی سازش لگ رہی تھی۔

ابرار کو جب وہ یہ کہے گا کہ وہ اس کی بہن کے لیے بارات لے کر آ رہا ہے تو نہ جانے وہ اس کے ساتھ کیسے پیش آئے گا تو الیان کو کیا کرنا ہو گا وہ اسے کیسے قائل کرے گا۔

کسی بھی شریف گھرانے میں ایسی شادی کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہو سکتی جو کاروباری انداز میں طے کی گئی ہو اور وہ بھی ان حالات میں جبکہ وہ اپنی بہن کی شادی کہیں اور طے کر چکا ہو اور شادی میں محض ایک دن باقی ہو۔

آخر دس منٹ بعد الیان نے ابرار کا نمبر ملایا مگر شاید حالات بھی اس کی طرح بات کرنے کے لیے رضامند نہیں تھے جبھی محض بیل بجتی رہی اور فون ریسیو نہیں کیا گیا۔

الیان نے تین بار کوشش کر کے موبائل جیب میں رکھ لیا اس نے کچھ دیر بعد ٹرائی کرنے کا فیصلہ کرتے ہوئے جیسے اپنے تنے ہوئے اعصاب کو تھوڑا ڈھیلا کیا تھا۔

مگر اسے یہ نہیں پتا تھا کہ اپنے موبائل پر تین بار اس کی کال دیکھ کر ابرار کی کیا حالت ہو گئی تھی۔

اسے یہ تو یقین تھا کہ جو وہ کر رہا ہے اسے راز رکھنا آسان نہیں یہ سب ایک نہ ایک دن کھل جائے گا۔ لیکن الیان اتنی جلدی اس تک پہنچ جائے گا یہ امید اسے ہرگز نہیں تھی اپنے پکڑے جانے کے علاوہ اپنے ہار جانے کا احساس اسے ہراساں کیے جا رہا تھا۔

اسے کسی بھی طرح گلفام اور مرزا صاحب کو نیچا دکھانا تھا ان کے سامنے اپنے الفاظ کا بھرم رکھنا تھا اپنے دعوے کو سچ کر دکھانا تھا یہ دھن اس پر اتنی سوار تھی کہ وہ یہ سوچنے سے بھی قاصر تھا کہ ایک لڑکی کو اغوا کرنے کے الزام میں اگر وہ پکڑا گیا تو کتنی بدنامی ہو گی۔ کیا عزت رہ جائے گی اس کی سماج میں اور پولیس کیس بننے کی صورت میں جانے کتنے عرصے کی سزا ہو جائے۔

ابرار نے اس کی کال تو ریسیو نہیں کی لیکن وہ یہ ضرور جاننا چاہتا تھا کہ وہ کیا بات کرنا چاہتا ہے تبھی اس نے وہی سم لگا کر ایک بار پھر الیان کو فون کیا جو کہ الیان نے "فوراً" ہی ریسیو کر لیا۔

ابرار ساری باتیں تو اس سے کر ہی چکا تھا اس وقت تو وہ یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ الیان کیا کہنے والا ہے تبھی فون ملا کر محض ڈائیلاگ بازی کرنے لگا۔

"کسی قسم کی ہوشیاری کرنے کی کوشش مت کرنا الیان ورنہ ساری زندگی پچھتاؤ گے۔" دوسری طرف الیان سابقہ انداز میں یقین دہانی کرانے لگا کہ وہ ایسا کچھ نہیں کرے گا۔ بس اس کی بہن کو کوئی تکلیف نہ پہنچائی جائے اور ایک بار اس کی بریرہ سے بات کرا دی جائے۔

ابرار کو اس کے لب و لہجے سے یقین ہو گیا کہ وہ اپنے مجرم کو پہچانتا نہیں ہے۔ یہ اندازہ لگا کر اسے ڈھیروں اطمینان ہوا تھا اس نے مزید دو چار دھمکیاں دے کر فون بند کر دیا۔

ایک طرف اگر اسے تھوڑا سکون ہوا تھا تو دوسری طرف اس کی الجھن بھی بڑھ گئی تھی۔ اگر الیان نے اس کا پتا نہیں لگایا ہے تو اسے فون کیوں کر رہا ہے آخر وہ اس سے کیا چاہتا ہے۔

ایک بے چینی نے ابرار کے وجود کا احاطہ کر لیا اس لیے اگلی بار جب الیان کے موبائل سے اس کے نمبر پر فون آیا تو اس نے فون لے جا کر بابا جانی کو تھما دیا۔

"بابا جانی کوئی انجان آدمی ہے آپ ذرا بات کریں۔"

ابرار نے کہنے کے ساتھ ہی موبائل ان کے کان سے لگا دیا تاکہ وہ کوئی سوال نہ کر سکیں البتہ ان کے چہرے پر حیرانی اور سوال پوچھنے کی بے چینی پھیل گئی تھی جو جلد ہی دور بھی ہو گئی کیونکہ وہ الیان کی طرف متوجہ ہو گئے تھے جو کہہ رہا تھا۔

"کیا میں ابرار سے بات کر سکتا ہوں۔"

"میں ابرار کا والد بول رہا ہوں آپ کون؟"

"السلام علیکم! سر میں الیان بات کر رہا ہوں آپ مجھے نہیں جانتے لیکن میں آپ سے ایک اہم مسئلے کی وجہ سے ملنا چاہتا ہوں۔" الیان کہہ کر خاموش ہو گیا تو بابا جانی نے حسب توقع پوچھا۔

"کیسا مسئلہ؟" فوری طور پر الیان کچھ کہہ نہ سکا اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیسے کہے کہ کسی نے اس کی بہن کو اغوا کر لیا ہے۔

یا اگر یہ بتا بھی دے تو یہ کیسے کہے کہ آپ اپنی جس بیٹی کی شادی کل گلفام نامی شخص سے کر رہے ہیں اس کی بجائے مجھ سے کر دیں۔

اگر اس کی بہن اغوا ہوئی ہے تو ان کی بلا سے' وہ بھلا اپنی بیٹی کی شادی کیوں توڑ دیں وہ بھی شادی سے ایک دن پہلے۔

"ہیلو؟ کیا ہوا بھئی تم کسی اہم مسئلہ کی بات کر رہے ہو؟" بابا جانی اسے ابرار کا کوئی دوست سمجھ رہے تھے جس سے ابرار کسی وجہ سے بات نہیں کرنا چاہ رہا تھا۔

"سر.... میں' دراصل میری.... میری ایک بہت بڑی پرابلم سولو ہو سکتی ہے اگر آپ کوپریٹ کریں کیا میں آپ کے گھر آ کر آپ سے مل سکتا ہوں فون پر اپنا مسئلہ سمجھانا ذرا مشکل ہے۔" الیان بہت چاہتے ہوئے بھی وہ سب نہ کہہ سکا جو اس نے سوچ رکھا تھا۔

اسے لگا ان سے روبرو بات کرنا زیادہ مناسب رہے گا وہ اسی لیے ابرار کی بجائے ان سے بات کرنے پر زیادہ خوش ہو گیا تھا کہ کسی جوان خون کو ٹھنڈا رکھ کر اپنا مدعا سمجھانا زیادہ مشکل تھا بانسبت ایک جہاں دیدہ نظر رکھنے والے تجربہ کار بزرگ کے۔

"تم ہو کون اور بات کیا ہے؟" بابا جانی اس کے گھر آنے کی اجازت مانگنے پر حیرانی سے بولے تو ابرار نے موبائل ان کے کان سے ہٹاتے ہوئے ایک بٹن دبا دیا جس سے موبائل کا اسپیکر آن ہو گیا۔

اب وہ بھی الیان کی آواز سن سکتا تھا اور اب بابا جانی کو اس سے بات کرنے کے لیے موبائل کان سے لگا کر رکھنے کی ضرورت نہیں تھی وہ موبائل سامنے کیے بات کر سکتے تھے۔

"سر وہ میں آپ کو آپ کے گھر آ کر ہی بتا سکتا ہوں۔" الیان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا وہ انہیں کیسے بتائے کہ اس کے گھر کی عزت داؤ پر لگی ہوئی تھی۔

"مگر تم ہو کون اور کس بارے میں بات کرنا چاہتے ہو؟" بابا جانی قدرے زچ ہوگئے تھے۔

ابرار بڑے غور سے اس کے لب و لہجے کو نوٹ کر رہا تھا الیان کے انداز میں، جو الجھن تھی اسے محسوس کرکے وہ کسی حد تک مطمئن ہوگیا تھا اس کا وجدان کہہ رہا تھا الیان نے اسے اس مقصد سے فون نہیں کیا وہ جو سمجھ رہا تھا بلکہ ایک خوشی سی ابرار کے وجود میں کسی برقی رو کی طرح گردش کرنے لگی تھی کیونکہ اسے یقین ہونے لگا تھا کہ اس کی ساری منصوبہ بندی کامیاب ہونے والی ہے۔

الیان اس شادی کے لیے تیار ہوگیا ہے اور اس وقت وہ ان سے یہی سب بات کرنے والا ہے۔

البتہ ایک پل کے لیے اسے یہ حیرانی ضرور ہوئی تھی کہ الیان نے اس کا نمبر کہاں سے حاصل کرلیا وہ بھی اتنے کم وقت میں۔

لیکن ابھی اس کے پاس ان فضولیات پر غور کرنے کی فرصت نہیں تھی وہ پوری طرح سے الیان کی طرف متوجہ تھا جو کہہ رہا تھا۔

"سر میں الیان غفار ہوں میرے فادر کا نام ریاض غفار ہے۔" یہ کہہ کر الیان اپنے بزنس اور خاندان کی تفصیل بتانے لگا۔

بابا جانی اسے سن تو رہے تھے مگر ان کے چہرے پر ایک سوالیہ نشان مستقل گھوم رہا تھا اگر ابرار اس شخص کی گفتگو میں اتنی دلچسپی نہ لے رہا ہوتا تو شاید وہ لائن ہی کاٹ دیتے وہ پہلے ہی اتنے پریشان تھے کہ یہ غیر ضروری کال اور ایک انجان شخص کا بائیو ڈیٹا سننے کے بالکل موڈ میں نہیں تھے۔

"سر آج شام میں میری بہن کو...... کسی نے اغوا کرلیا ہے۔" الیان کی آواز اتنی دھیمی ہوگئی تھی کہ بابا جانی موبائل کی جانب جھک گئے تھے اس کی بات سننے کے لیے۔

"اور...... جس شخص نے اسے اغوا کیا ہے...... اس نے میری بہن کو چھوڑنے پر تاوان میں...... سر آپ مجھے غلط مت سمجھیے گا۔ میں بہت شریف فیملی سے بلونگ کرتا ہوں۔

اگر اس شخص نے میری بہن کے بدلے پیسے مانگ لیے ہوتے تو میں آرام سے پے کردیتا۔ مگر...... مگر وہ چاہتا ہے کہ کل جب آپ کی بیٹی کی شادی ہونے والی ہے تو میں وہاں......" الیان جو کہ پہلے ہی بہت رک رک کر بول رہا تھا ایک دم خاموش ہوگیا۔

"ہیلو...... تم چپ کیوں ہوگئے بولو نا کیا بات ہے؟" بابا جانی قدرے بے چینی سے بولے ایک تو جو بات وہ کہہ رہا تھا وہ کوئی ایسی خوش کن نہیں تھی بابا جانی پہلے ہی پریشان ہوگئے تھے اس پر ان کی پریشانی میں اضافہ ابرار کے چہرے پر پھیلے خوشی کے تاثرات کر رہے تھے۔

وہ انتہا پر جوش ہو رہا تھا جیسے الیان کی اگلی بات سننے کے لیے بہت بے چین ہو۔

"سر۔ وہ شخص چاہتا ہے کہ...... میں کل آپ کی بیٹی سے شادی کرلوں۔"

"کیا؟" بابا جانی جو پوری طرح اس کی طرف ہمہ تن گوش تھے تقریباً "چیخ پڑے۔

"سر میری بات کو مذاق مت سمجھیے گا سر۔ میں بہت سیریس ہوں۔

مجھے معلوم ہے آپ کی بیٹی کی شادی کسی گلفام نامی شخص سے ہو رہی ہے مگر...... سر کچھ دن بعد میری اپنی بہن کی شادی ہے میں اس وقت کسی قسم کی کوئی بدنامی مول نہیں لے سکتا مجھے اس اغوا کرنے والے کی بات ہر حال میں ماننی ہے۔

میں جانتا ہوں یہ فیصلہ آپ کے لیے آسان نہیں ہے آپ اپنی بیٹی کا رشتہ کہیں اور طے کرچکے ہیں شادی سے ایک دن پہلے میرے کہنے پر اس رشتے کو ختم کرنا آپ کے لیے بہت مشکل ہے مگر میں خود بہت مجبور ہوں۔

آپ پلیز میری مجبوری کو سمجھیں آپ جو کہیں گے میں وہ کرنے کے لیے تیار ہوں لیکن پلیز آپ اس شادی کے لیے مان جائیں۔" الیان کا لہجہ اتنا التجائیہ تھا کہ ابرار کو اپنی سماعتوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔

اسے یہ تو معلوم تھا کہ بہن کی شادی سے چند دن پہلے اس کے اغوا ہوجانے پر کسی بھی گھر میں کہرام مچ جائے گا مگر اسے یہ اندازہ نہیں تھا کہ بریرہ اپنے گھر میں اتنی لاڈلی ہے کہ اس پر آنچ آنے کے خیال سے ہی اس گھر کے مکین کانپ اٹھیں گے۔

الیان نے بغیر چوں چرا کیے اتنی آسانی سے شادی کی ہامی بھرلی تھی کہ ابرار کا خوشی کے مارے ناچنے کا دل چاہ رہا تھا۔

کہاں تو گلفام نے اتنے غرور سے اس کی بہن کے گھر بیٹھے رہ جانے کا طعنہ دیا تھا۔

اور کہاں اس کی بہن کی شادی اسی دن اسی جگہ شہر کے سب سے بہترین گھرانے کے ہیرے جیسے لڑکے سے ہو رہی تھی جس کے لیے واقعی یہ کہا جاسکتا تھا کہ چراغ لے کر بھی ڈھونڈنے نکلو گے تو بھی ایسا لڑکا نہیں ملے گا اور یہاں تو وہ لڑکا خود دست سوال پھیلا رہا تھا۔

ابرار کو اپنی ہوشیاری اور چالاکی پر فخر ہو رہا تھا کتنی مہارت سے اس نے بازی پلٹی تھی مرزا صاحب اور گلفام کو جب رومیلہ کی شادی الیان کے ساتھ ہونے کا پتا چلے گا تو ان کے سینوں پر سانپ لوٹ جائیں گے تصور میں ان کے جلے بھنے چہروں کو دیکھ کر ابرار کو اتنا سکون مل رہا تھا کہ وہ اپنے چہرے کے تاثرات بھول ہی گیا جہاں سے خوشی سورج کی تیز چمکتی کرنوں کی طرح پھوٹ رہی تھی نہ ہی اسے اس بات کا احساس تھا کہ بابا جانی اس کا یہ بے قابو انداز دیکھ کر کیا کچھ اخذ کرچکے ہیں۔

وہ تو جب الیان دوسری طرف سے بولا تب ابرار چونکا۔

"سر آپ...... آپ خاموش کیوں ہیں میں آپ کی بیٹی کو پوری عزت کے ساتھ بیاہ کرلے جاؤں گا اس کا مستقبل ہر طرح سے محفوظ ہوگا پھر بھی آپ اپنے اطمینان کے لیے جو کہیں وہ میں کرنے کے لیے تیار ہوں۔

جانے اس شخص نے ایسی شرط کیوں رکھی ہے پتا نہیں وہ آپ کا دشمن ہے یا میرا۔ بہرحال جو بھی ہو میرے پاس اس کے مطالبے پر سر جھکانے کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں ہے سر آپ میری بات سن رہے ہیں نا۔" ابرار نے چونک کر بابا جانی کی طرف دیکھا وہ واقعی الیان کی بات نہیں سن رہے تھے ان کی نظریں تو ابرار پر جمی تھیں اور جس طرح وہ اسے دیکھ رہے تھے وہ ابرار کو بہت کچھ سمجھا گیا تھا۔

اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتے اور الیان سن لیتا ابرار نے موبائل ان کے ہاتھ سے لے کر نا صرف لائن کاٹ دی بلکہ موبائل بھی آف کردیا۔

"آپ کچھ بولے کیوں نہیں بابا جانی۔ وہ ملنے کے لیے گھر آنا چاہتا ہے اسے ابھی بلالیں۔ بلکہ اس سے کہیں اپنے والدین کو لے کر آئے اس کی بہن کی زندگی کا سوال ہے۔ ہم اس کی شادی رومیلہ سے کرنے کے لیے تیار ہیں۔ آپ اس لڑکے کو جانتے نہیں ہیں یہ......"

"اس کی بہن کو تم نے اغوا کیا ہے نا۔" بابا جانی نے اس کی بات کاٹتے ہوئے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا تو ابرار بھائی کچھ چونک سے گئے۔

"یہ آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔ میں بھلا ایسا کیوں کروں گا؟"

"جھوٹ مت بولو ابرار۔ مجھے معلوم ہے یہ سب تمہاری ہی کارستانی ہے کتنا گر گئے ہو تم کسی کی بیٹی اٹھوالی تم نے اور اب اس کے گھر والوں کو دھمکا رہے ہو وہ لڑکا اس طرح بات کر رہا ہے جیسے اس کی وجہ سے ہمیں اپنی بیٹی کا رشتہ توڑنا پڑ رہا ہو حالانکہ یہ شادی تو ٹوٹ ہی چکی ہے۔

میری سمجھ میں تو یہ نہیں آرہا کہ ہم نے اس طرح خاموشی اختیار کر کے ٹھیک کیا ہے یا غلط۔ کل جب تمام مہمان ہوٹل پہنچیں گے تو ہمیں اور لڑکے والوں کو وہاں نہ موجود دیکھ کر کیسا تماشا بنے گا۔" بابا جانی فکر مندی سے بولے تو ابرار بھائی ایک دم چڑتے ہوئے کہنے لگے۔

"کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ۔ کل رومیلہ کی شادی ہے تو پھر ہمارے نہ جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ہاں البتہ لوگ گلفام کی جگہ الیان کو دیکھ کر باتیں ضرور بنائیں گے مگر اعتراض کا کوئی نکتہ نہیں نکال سکیں گے۔

الیان، گلفام سے لاکھ گنا بہتر ہے بلکہ بزنس کی دنیا میں جو شہرت اور نام اس کے پاس ہے اسے دیکھتے ہوئے ہمارے خاندان کے جو لوگ اس سے واقف ہیں وہ تو رومیلہ کی قسمت پر رشک کریں گے یا حسد میں مبتلا ہو جائیں گے۔" ابرار بھائی کے بھنائے ہوئے لہجے میں بابا جانی بھی تپ گئے۔

"تمہیں صرف دنیا پر امپریشن جمانا ہے۔ بہن کی زندگی کی فکر ہے نہ اپنی آخرت کی۔ کسی کی بیٹی کو اغوا کرتے ہوئے تمہیں شرم نہیں آئی۔ جاؤ ابھی اور اسی وقت اسے آزاد کر دو۔" بابا جانی حتمی انداز میں بولے۔

"اب جبکہ آپ سب سمجھ ہی گئے ہیں تو میں بھی بلاوجہ کا ڈرامہ نہیں کروں گا ہاں میں نے ہی اس کی بہن کو اغوا کیا ہے اور مجھے اپنے کیے پر کوئی شرمندگی نہیں۔ اس کی بہن کو میں صحیح سلامت اسے واپس کر دوں گا۔ اور رہا سوال زبردستی کی شادی کا تو یہ الیان کے لیے ایک وقتی صدمہ ضرور ہو گا مگر اس کی آئندہ زندگی کے لیے یہ فیصلہ بہت اچھا رہے گا۔

رومیلہ میں بھلا کس چیز کی کمی ہے؟ اس کا ساتھ کسی بھی لڑکے کے لیے خوش قسمتی کا باعث ہو گا۔ چند دن وہ اس رشتے پر واویلا مچائے گا اور پھر آخر ایڈجسٹ ہو جائے گا۔" ابرار اپنی ہٹ دھرمی اور سکون سے بول رہا تھا کہ بابا جانی زچ ہو گئے۔

"تمہارا تو دماغ خراب ہو گیا ہے گھر اس طرح نہیں بستے ہیں اگر......"

"کسی بھی اگر مگر کو منہ سے نکالنے سے پہلے وہ بھی سوچ لیں کہ رومیلہ کا اب نارمل طریقے سے گھر بسانا اب ویسے بھی ممکن نہیں رہا ہے کل جب مقررہ وقت پر بارات نہیں آئے گی تب ہم لوگوں کو کیا جواب دیں گے ہم لاکھ اپنے منہ سے گلفام کے فراڈ کے متعلق بتاتے رہیں لوگ رومیلہ کے کیریکٹر میں ہی خامیاں نکالیں گے گلفام نے غلط نہیں کہا تھا۔

رومیلہ کے لیے کسی اچھے گھرانے کے پڑھے لکھے لڑکے کا رشتہ نہیں آئے گا بلکہ جہیز کے لالچی کسی بے روزگار نوجوان کو ہی رومیلہ کو بیاہنا پڑے گا۔

رومیلہ وہاں کمپرومائز کرے یا یہاں سمجھوتہ کرلے ایک ہی بات ہے اور میرے خیال سے یہ رشتہ زیادہ بہتر ہے۔" ابرار لاپرواہی سے کہتا چلا گیا۔

"بس کرو ابرار! اپنی غلطی کو چھپانے کے لیے تم ان تمام غلط چیزوں کو صحیح کہہ رہے ہو جن کے صحیح نہ ہونے کا احساس خود تمہیں بھی ہے۔

تم نہیں چاہتے کہ گلفام کی اصلیت سب کے سامنے آئے اور کسی کو یہ کہنے کا موقع ملے کہ تم نے رومیلہ کی زندگی کا فیصلہ بڑی جلد بازی میں بالکل آنکھیں بند کر کے کیا ہے۔

اسی لیے تم نے زبردستی کا ایک ایسا گھرانہ تلاش کر لیا جس میں کوئی خامی نکالی ہی نہ جاسکے نہ ہی یہ سننے کی نوبت آئے کہ بے چاری رومیلہ کی زندگی تمہاری وجہ سے خراب ہو گئی۔

ورنہ سچ تو یہ ہے کہ جو تم نے اب کیا ہے وہ رومیلہ کے ساتھ انتہائی درجے کی زیادتی ہے میں تو کہتا ہوں ابھی اور

اسی وقت اس کی بہن کو چھوڑ دو اور......"

"وہ بات مت کہیں جو ممکن نہ ہو بلکہ آپ کچھ بھی نہ کہیں تو زیادہ بہتر ہے۔" بابا جانی نے کچھ کہنا چاہا تو ابرار نے نا صرف ان کی بات کاٹ دی بلکہ اپنا موبائل لے کر فوراً ہی وہاں سے نکل گیا۔

ان کی طرف سے اسے کوئی فکر نہیں تھی وہ چاہے جتنا بھی بگڑ لیتے ابرار کو اس کے ارادوں سے باز نہیں رکھ سکتے تھے۔

اسی لیے اپنے کمرے میں آکر ابرار نے اسی سم سے الیان کا نمبر ملایا جس سے اب تک ملا رہا تھا۔

دوسری طرف الیان نے پہلی ہی گھنٹی پر فون ریسیو کر لیا کیونکہ وہ بابا جانی سے بات کرنے کے بعد ابھی تک موبائل لیے کشمکش کے عالم میں کھڑا تھا کہ انہیں کس طرح قائل کرے۔ اسی لیے ابرار نے فون کر کے اس کی ساری الجھن سلجھا دی کیونکہ الیان نے اس کا نمبر دیکھ کر چھوٹتے ہی کہا تھا۔

"دیکھو تم شادی کی شرط کے بجائے جو چاہے مانگ لو میں دے دوں گا لیکن میں یہ شادی نہیں کر سکتا وہ رومیلہ کے گھر والے میرے کہنے سے بھلا کیوں شادی کے لیے راضی ہو جائیں گے اس کی شادی تو کسی گلفام نامی لڑکی سے ہو رہی ہے۔"

"ہوں، بڑی معلومات اکٹھی کر رکھی ہے، لگتا ہے سب کچھ پتا کر لیا ہے خیر مجھے تم سے سوائے اس شادی کے اور کچھ نہیں چاہیے اور رہا سوال اس لڑکی کے گھر والوں کا تو اس کی طرف سے تم بے فکر رہو وہ مان جائیں گے تم انہیں منانے کی کوشش کرنے کی بجائے ٹھیک ٹائم پر بارات لے کر آجاؤ بس۔" ابرار نے دوٹوک انداز میں کہہ کر فون بند کر دیا۔

الیان اپنی جگہ ٹھٹک کر رہ گیا ویسے تو ایسے مجرمانہ ذہنیت کے مالک لوگوں کے لیے کسی کو کسی بھی فعل کے لیے راضی کرنا کوئی مشکل امر نہیں تھا اس لیے اس شخص کا یہ کہنا کہ رومیلہ کے گھر والوں کو وہ تیار کر لے گا۔ کوئی اچنبھے کی بات نہیں تھی۔

بندوق کی نوک پر تو کچھ بھی منوایا جاسکتا ہے۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود کچھ ایسا تھا جو اسے سوچنے پر مجبور کر رہا تھا۔

ایک بار اپنی شرط بتانے کے بعد اس شخص کا بار بار فون کرنا ایک عجیب سی بات تھی خاص طور پر ایسی صورت میں کہ اس کا فون دونوں بار اس وقت آیا تھا جب اس نے رومیلہ کے بھائی کے نمبر پر بات کرنے کی کوشش کی یا بات کی تھی یہ محض اتفاق بھی ہو سکتا تھا مگر الیان تو پہلے ہی رومیلہ کی فیملی کی طرف سے مشکوک تھا۔

جب پہلی بار اسے اغوا کرنے والے نے فون کیا تھا تو الیان کو ایسا ہی لگا تھا کہ وہ رومیلہ کے گینگ کا کوئی شخص ہے جو اسے شادی پر مجبور کر رہا ہے۔

مگر ہوٹل کا نام جاننے کے بعد جب اس نے ساری تفصیلات حاصل کیں تو ایسے لگا کہ یہ تو کوئی شریف لوگ ہیں اور ان کی بیٹی کی شادی تو ہو ہی رہی ہے انہیں ایسی کوئی چال چلنے کی بھلا کیا ضرورت ہے۔

لیکن اب ایک بار پھر اسے ان سب کے پیچھے رومیلہ اور اس کے گھر والوں کی سازش لگ رہی تھی۔

یہ سب جس کسی کی بھی کارستانی تھی اس کے پیش نظر تو فی الحال بریرہ اہم تھی اسی لیے شگفتہ غفار کو جب ہاسپٹل سے گھر لے کر گئے اور اس کے اغوا کے متعلق بتایا تو وہ پہلے تو ان لوگوں کے لیے کوسنوں اور بددعاؤں میں لگ گئیں مگر جلد ہی انہیں بھی احساس ہو گیا کہ یہ وقت ان حرکتوں کا نہیں ہے تب وہ بھی سنجیدگی سے ریاض غفار کی بات سننے لگیں۔ جو بہت ہی مناسب الفاظ میں انہیں الیان کی شادی کے متعلق بتا رہے تھے۔

پہلے تو وہ شادی کا لفظ سنتے ہی سے اکھڑ گئیں لیکن اس بار ریاض غفار نے ان کی حالت اور حالات کی پروا

کیے بغیر انہیں اچھا خاصا ڈانٹ دیا تو انہیں مجبوراً چپ ہونا پڑا پھر بھی وہ دبی دبی زبان سے کہتی رہیں۔

"میرے لیے تو دونوں اولادیں برابر ہیں میں ایک کی خاطر دوسرے کو کیسے برباد کردوں؟" تب آخر الیان کو بھی بولنا پڑا۔

ورنہ تو اب تک وہ ان کے ہر رد عمل کو بالکل فطری اور جائز سمجھتے ہوئے بڑے صبر سے برداشت کررہا تھا۔

"میں کوئی برباد وبرباد نہیں ہو رہا ایک بار بریرہ اس کے چنگل سے نکل آئے میں فوراً" اس لڑکی سے چھٹکارا حاصل کرلوں گا۔" الیان نے جو بھی تفصیلات معلوم کی تھیں وہ سب ریاض غفار کے گوش گزار کردی تھیں وہ بھی اس کے ہم خیال تھے کہ یہ سب رومیلہ کے گھر والوں کا ہی کیا دھرا ہے۔

"یہ سب کہنے کی باتیں ہیں۔" شگفتہ غفار تلخی سے بولیں۔

"جب وہ ہمیں اس شادی پر مجبور کرسکتے ہیں تو پھر اسے نبھانے پر بھی مجبور کرسکتے ہیں تم اسے کبھی نہیں چھوڑ سکو گے۔" شگفتہ غفار شکست خوردہ لہجے میں بولیں تو اپنی بے بسی کو محسوس کرتے ہوئے الیان کا خون کھول اٹھا۔

"ایسے کیسے مجبور کرسکتے ہیں آپ جانتی ہیں میں کتنا ضدی ہوں میں صرف بریرہ کو واپس لانے کے لیے یہ شادی کررہا ہوں ایک بار وہ آجائے پھر میں اس نام نہاد رشتے کو ایک پل میں ختم کردوں گا۔" الیان چبا کر بولا۔

"مت کرو اتنی بڑی بڑی باتیں۔ ایسا کچھ نہیں ہوگا وہ لڑکی ساری زندگی اس گھر کی بہو کی حیثیت سے عیش کرے گی اور ہم سب تماشا دیکھیں گے۔" شگفتہ غفار کا غم کسی طور کم نہیں ہو رہا تھا۔

بریرہ کی طرف سے جو فکر تھی سو تھی اس پر یہ عجیب و غریب مطالبہ انہیں سرتاپا سلگا گیا تھا اور ان کا یہ انداز الیان کی غیرت و خودداری پر تازیانے کی طرح لگ رہا تھا اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ بریرہ کے دشمنوں کا ابھی اور اسی وقت گلا گھونٹ دے۔

"یہ وقت ان باتوں کا نہیں ہے اس لڑکی کے گھر والوں سے بعد میں بھی نبٹا جاسکتا ہے بس دعا کرو کہ بریرہ خیریت کے ساتھ واپس آجائے۔

اگر یہ اغوا ان ہی لوگوں نے کیا ہے تب بھی ہمیں بہت سوچ سمجھ کر ان سے ملنا ہے ہمارے رویے کی ذرا سی بدصورتی بریرہ سمیت ہم سب کے لیے ناقابلِ تلافی نقصان کا سبب بن سکتی ہے۔" ریاض غفار سنجیدگی سے بولے۔

شگفتہ غفار ان کی بات سن کر ایک بار پھر آنسو بہانے لگیں جبکہ الیان صرف ہونٹ چبا کر رہ گیا۔

☼ ☼ ☼

آج شام رومیلہ کی شادی تھی اور سنبل اور نمل ابھی تک یہ نہیں جان پائی تھیں کہ رومیلہ کی شادی ہو بھی رہی ہے یا نہیں۔

اور اگر ہو رہی ہے تو کس کے ساتھ ہو رہی ہے انہوں نے اب تک رومیلہ کو کچھ نہیں بتایا تھا حالانکہ انہیں موقع ملا تھا اس سے تنہائی میں بات کرنے کا' وہ کوئی ہر وقت لوگوں کے جمگھٹے میں گھری نہیں ہوتی تھی مگر ایک دوبار جب بھی انہیں موقع ملا وہ ان دونوں کو بہت خوش اور کھلا کھلاتی ہوئی لگی۔

اتنے دنوں سے وہ اپنی شادی کو لے کر فکر مند تھی اور وہ اسے کوئی تسلی نہیں دے پا رہی تھیں اب جبکہ وہ اس رشتے پر مطمئن ہوگئی تھی تو ان لوگوں کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی اس کے ارمانوں پر پانی پھیرنے کی۔

لیکن آخر کب تک رات کو اسے رخصت ہونا تھا وہ دونوں صبح گیارہ بجے اس کے گھر پہنچیں تو رومیلہ انہیں دیکھ کر بگڑ گئی۔

"یہ کوئی وقت ہے تم دونوں کے آنے کا۔ بالکل مہمانوں کی طرح شریک ہو رہی ہو تم دونوں میری شادی میں، دیکھ لینا اب میں بھی تم لوگوں کی شادی میں نہیں آؤں گی ویسے بھی کینیڈا سے آنا کون سا آسان ہوگا اب جاؤں گی تو جانے کب آسکوں گی جانے کب ملاقات ہوگی۔" رومیلہ گلوگیر لہجے میں بولی۔

"تم کینیڈا نہیں جا رہیں اس لیے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔" نمل نے بے ساختہ کہا تو سنبل چونک کر اسے دیکھنے لگی۔

"کیا مطلب؟" رومیلہ نے کچھ نہ سمجھنے والے انداز میں اسے دیکھا تو پل بھر کے لیے نمل خاموش سی ہو گئی جیسے اپنی ساری ہمتیں مجتمع کر رہی ہو۔

"تمہاری شادی گلفام سے نہیں ہو رہی۔" اس ایک جملے کو کہنے میں نمل کو اتنی دقت ہوئی تھی کہ اس میں رومیلہ کا چہرہ دیکھنے کی سکت ہی نہ رہی لیکن بغیر اس کی جانب دیکھے بھی وہ اس کے احساسات کو اچھی طرح سمجھ سکتی تھی۔

رومیلہ ٹھٹک کر کبھی اسے اور کبھی سنبل کو دیکھ رہی تھی سنبل بھی اس سے نظریں چرا رہی تھی اسے تو یہ شرمندگی بھی ہو رہی تھی کہ دو دن سے وہ سب کچھ جانتی تھیں پھر بھی انہوں نے اسے مطلع نہیں کیا۔

"کیا بات ہے آخر۔ مجھے تم دونوں بہت پریشان لگ رہی ہو کچھ ہوا ہے کیا۔" رومیلہ کے ازحد فکر مند لہجے پر نمل نے ایک گہرا سانس کھینچ کر اسے سب بتا دیا۔

رومیلہ فق چہرے کے ساتھ انہیں دیکھتی رہی جیسے اس کی سمجھ میں نہیں آرہا ہو کہ وہ کیا کرے اس نے ان سے یہ تک نہیں کہا کہ تم نے مجھے فوراً کیوں نہیں بتا دیا وہ تو بالکل ششدر رہ گئی تھی آخر نمل خود ہی اسے کندھوں سے تھامتے ہوئے بولی۔

"مجھے یہ سب پہلے ہی تمہیں بتا دینا چاہیے تھا مگر......"

"کیوں تم کیوں بتاتیں؟ آخر تم کیا کیا کرو گی نمل؟ کیا سب کچھ کرنا تمہاری ہی ذمہ داری ہے۔ اگر تم کینیڈا نہ گئی ہوتیں تو میں آج اس دھوکے باز فراڈیے کے ساتھ رخصت ہو کر چلی جاتی نہ جانے وہ مجھے وہاں لے جا کر میرے ساتھ کیا سلوک کرتا مجھ سے کون سے کام کراتا نمل اگر تم اتنا بڑا قدم نہ اٹھاتیں تو......" رومیلہ لڑکھڑاتی آواز میں اپنے کندھوں پر رکھے اس کے ہاتھ تھامتے ہوئے بولی اور ایک دم پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

انہیں تو ڈر تھا اسے اس شادی کے ٹوٹنے پر افسوس ہوگا گھر تک آئی بارات کے لوٹ جانے کا ملال ہوگا مگر اسے تو سکون کا احساس ہوا تھا۔

وہ اللہ تعالیٰ سے کوئی گلہ شکوہ کرنے کی بجائے اس کا شکر ادا کر رہی تھی کچھ دیر تو ان تینوں کے بیچ ہی گفتگو ہوتی رہی آخر سنبل نے کہا۔

"اب بھی پتا نہیں ابرار بھائی نے کسے تلاش کر لیا ہے جانے وہ کیا کرنے والے ہیں مجھے تو ان سے کسی اچھے اقدام کی امید نہیں۔" سنبل کی بات پر رومیلہ کچھ دیر نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبائے اسے دیکھتی رہی پھر ایک دم فیصلہ کن انداز میں بولی۔

"میں ابھی ابرار بھائی سے جا کر پوچھتی ہوں کہ وہ کون ہے اور کیا کرتا ہے اگر وہ مجھے تسلی بخش جواب نہ دے سکے تو میں شادی سے صاف انکار کر دوں گی۔" نمل کو اس کے جواب سے بڑی خوشی ہوئی تھی۔

"ہاں چلو ابھی چلتے ہیں۔" نمل فوراً بولی تو وہ تینوں ابرار بھائی کے کمرے کی طرف بڑھ گئیں۔

اتفاق سے وہ نا صرف کمرے میں موجود تھے بلکہ اکیلے بھی تھے بھابھی کو کمرے میں نہ پا کر رومیلہ نے فوراً کمرے میں داخل ہو کر دروازہ بند کر لیا۔

سنبل میں اس کے ساتھ اندر آنے کی ہمت نہیں تھی مگر نمل کو پتا تھا رومیلہ کہیں بھی کمزور پڑ سکتی ہے چنانچہ وہ اس کے ساتھ ہی کھڑی رہی۔

ابرار بھائی ان دونوں کو اس طرح اپنے سامنے کھڑا دیکھ کر چونک گئے وہ ایک نظر رومیلہ کو دیکھ کر پھر نمل کو دیکھنے لگے جیسے وہ بغیر پوچھے ہی سب سمجھ گئے ہوں۔

"مجھے معاف کر دو میری بہن! میں دھوکا کھا گیا بہت غلط فیصلہ کر لیا میں نے میں بہت سخت شرمندہ ہوں۔" ان کے لہجے میں دکھ ہی دکھ اور پچھتاوا ہی پچھتاوا تھا۔

"جب گلفام سے میری شادی نہیں ہو رہی تو کس سے ہو رہی ہے؟" رومیلہ نے ان کے طویل مکالموں کے بعد سپاٹ لہجے میں پوچھا۔

"میرے ایک دوست سے ہو رہی ہے۔ بہت اچھا لڑکا ہے۔ الیان غفار نام ہے اس کا۔ اگر تمہیں میری بات پر یقین نہ ہو تو نمل اپنے والد سے پوچھ لے وہ انہیں ضرور جانتے ہوں گے ریاض غفار کا بیٹا ہے وہ شہر کی جانی مانی ہستی ہے۔" ابرار بھائی اس کی تعریف میں رطب اللسان تھے۔

(باقی آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں)

☼ ☼

ستمگر

ندا ولی لطیف

آج اسے دیکھا تو اس کے چہرے پر نظر پڑتے ہی مجھے اس کے الفاظ یاد آگئے واقعی اس نے کتنا درست کہا تھا مجھے اب ہر لمحے احساس ہوتا ہے۔ کہ میں نے اُس لمحے کیا کھویا تھا۔ اور تب سے وہ لمحہ میری تلاش میں سرگرداں تھا اور آج اس لمحے نے مجھے جالیا تھا۔ وہ آج بھی ویسی ہی دلکش تھی بلکہ وقت نے اس پر بڑا اچھا اثر چھوڑا تھا۔ چہرہ اور جسم بھرا بھرا ہو کر مزید خوب صورت لگنے لگا تھا۔ اس کی مسکراہٹ میں اب بھی بہار رقص کرتی تھی۔ آنکھوں کے دیئے زیادہ آب و تاب سے روشن تھے۔ اور گالوں کی شفق کچھ مزید بڑھ گئی تھی مجموعی طور پر وہ پہلے سے زیادہ نکھر گئی تھی اور میں کیا تھا کہاں تھا میں نے بہت کم وقت میں عمر کا بہت سا سفر طے کر لیا تھا جوانی میں ہی بڑھاپا لادلیا تھا۔

☼ ☼ ☼

اس دن میں اور لامیہ کیمپس میں ایک بڑے سے املتاس کے درخت تلے اس کے موٹے سے تنے سے ٹیک لگائے دنیا جہان کے ٹاپکس ڈسکس کرنے کے بعد اب مستقبل کی پلاننگ میں مصروف تھے۔ لامیہ میری منگیتر اور پاپا کے بزنس پارٹنر کی اکلوتی بیٹی تھی۔ یوں تو اس منگنی کے ظاہری اسباب بزنس کی مضبوطی ہی تھے مگر ساتھ ہی ہم دونوں ایک دوسرے کو پسند یا شاید محبت کرتے تھے۔ یعنی کوئی ظالم سماج یا رقیب ٹائپ کی کوئی چیز ہماری لو اسٹوری میں قطعی موجود نہیں تھی پھر پتا نہیں لامیہ نے اس اسٹوری میں ویمپ بننا کیوں گوارا کر لیا مجھ سے باتیں کرتے کرتے اچانک اس نے سر اٹھا کر سامنے دیکھا۔

”سنو! شاہ میر ایک بیٹ لگاتے ہو میرے ساتھ۔“ اس نے سامنے دیکھتے ہوئے کہا مجھے معلوم تھا اسے بات بات پر بیٹ لگانے کی عادت تھی۔

”کس بات کی۔“ میں نے حیرت سے اسے دیکھا۔

”دیکھو وہ سامنے وہ جو پنک کلر کے سوٹ میں ملبوس لڑکی آرہی ہے تم جانتے ہو اسے؟“ اس نے سامنے کی طرف اشارہ کیا۔

”میں صرف تمہیں جانتا ہوں اور کسی کو جاننے کی ضرورت نہیں ہے مجھے۔“ میں نے کہا اور اس کی گردن ایک تفاخر سے اکڑ گئی۔

”بہر حال دیکھو اسے بہت کچھ سمجھتی ہے خود کو۔“ لامیہ نے نخوت سے کہا۔

”یار تو کچھ ہوگی اسی لیے خود کو سمجھتی ہوگی۔“ میں نے لاپروائی سے کہا۔

”کچھ نہیں ہے مڈل کلاس سے تعلق ہے۔ ایم بی اے ڈپارٹمنٹ میں ہے اور شاید اس کے ذریعے دنیا فتح کرنے نکلی ہے۔“ اس نے تمسخر سے کہا۔

”اوہو تم تو خاصی باخبر ہو میں تو خاصا لاعلم ہوں۔“ میں نے بھی اس کا تمسخر اڑایا۔

”طنز کرنے کی نہیں ہو رہی۔“ آج وہ خاصی کول تھی۔

”بہر حال واٹ ڈو یو وانٹ ڈیئر۔“ میں نے اکتا کر پوچھا۔

”گوڈیس آف لو کو اس پر مہربان کرنا ہے بہت بنتی ہے ناک پر مکھی نہیں بیٹھنے دیتی۔“ اس نے بڑے مزے سے کہا۔

”یار! صفائی پسند ہوگی اور میری ناقص اطلاعات کے مطابق محبت کی دیوی نہیں ہے۔ دیوتا ہے۔ معصوم بچہ اندھا اور تیر بردار۔“ میں نے پھر اسے چھیڑا مگر آج وہ کسی اور ہی جہان میں تھی۔

”ناقابل تسخیر سمجھتی ہے خود کو، بہت انا پرست ہے، سینکڑوں دل قدموں تلے روندتی چلی جاتی ہے۔ اور مڑ کر بھی نہیں دیکھتی۔“ وہ اپنی رو میں بولے چلی جارہی تھی۔

”چہ، اب اس راز سے پردہ اٹھا ہی دو کہ تم مجھ سے کیا چاہتی ہو۔“ میں نے تنگ آکر پوچھا۔

”بتایا تو ہے محبت کی دیوی کو مہربان کرنا ہے اس پر۔“ وہ بڑے مزے سے بولی۔

”دیوی نہیں دیوتا۔“ میں ٹوکنا نہیں بھولا۔

”لیکن میں اس سلسلے میں کیا کر سکتا ہوں۔“ اب میری بے زاری عروج پر پہنچ چکی تھی۔

"وہ تم ہی تو ہو جو محبت کو اس کے اوپر مہربان کرکے اس کے دل میں اترو گے۔" اس نے بڑی ادا سے مجھے دیکھا۔

"ہاں میں راجہ اندر ہوں نا! اور وہ میری داسی کہ میں محبت کو اس پر مہربان کرکے اس کے دل میں اتر جاؤں۔" میں اس کی بے پر کی اڑانے اور بے تکی ہانکنے پر تلملا اٹھا۔

"یہی تو بیٹ ہے میری مائی ڈیئر۔" اس نے ایسے کہا جیسے وہ اپنے فیانسی سے نہیں کسی اور کے فیانسی سے اس کو چھوڑ دینے کی بات کر رہی ہو۔

"ویسے آج صبح کسے دیکھا تھا۔ یا آپ ہمیشہ سے ہی برین لیس ہیں مجھ پر آج کھلی ہیں۔" میں نے تپ کر پوچھا۔

"لگاتے ہو دس دس ہزار کی۔" اس نے اپنی نازک سی گلابی ہتھیلی میرے سامنے پھیلا دی میری کوئی بات آج اسے مشتعل نہیں کر رہی تھی اور نہ ہی میری کوئی بات وہ سن رہی تھی اپنی ہانک رہی تھی۔

"چلو مجھے منظور ہے۔ اگر میں اس کی زلف گرہ گیر کا اسیر ہو گیا تو؟" میں نے اسے چھیڑا تو وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

"اس کے چانسز بہت زیادہ ہیں کیونکہ اس میں ہر وہ خوبی ہے جو لڑکوں کو اٹریکٹ کرتی ہے۔ لانبے بال و قد، گلابی رنگت، پرکشش سراپا، نازک سا دہانہ، ستواں ناک، فراخ پیشانی، بڑی بڑی غزالی آنکھیں، نازک ہونٹ، موتیوں سے دانت صراحی دار گردن اور......"

وہ بغیر کسی تجل کے جتاتی چلی گئی اور قریب آنے پر میں نے اندازہ لگایا کہ کچھ بھی تو غلط نہیں کہا تھا لامیہ نے اور پتا نہیں کیوں میری ایک تقابلی نظر لامیہ کی جانب اٹھ گئی اس کے گلابی آنچل نے اسے ایک حیا اور وقار عطا کی ہوئی تھی نگاہیں جھکی ہوئی اور چال میں ایک وقار تھا۔ جبکہ لامیہ گرے اسکن ٹائٹ جینز اور پنک سلولیس کرتے میں دوپٹے سے بے نیاز بھی بڑی اپنی اپنی سی لگ رہی تھی۔ اور میں سر جھٹک کر اٹھ کھڑا ہوا۔

* * *

ان ہی دنوں لامیہ کے سر میں اسٹیٹس جانے کا سودا سمایا میں نے اسے کتنا سمجھایا۔

"لامیہ یار! یہ کیا بے وقوفی ہے سمسٹرز کی ڈیٹ آنے ہی والی ہے۔" میں جھنجلا سا گیا۔

"اوہو! مریخ پر نہیں جا رہی آجاؤں گی سمسٹر تک۔" وہ ایسی ہی لاپروا تھی۔

"پھر بھی ایسی کیا ایمرجنسی نافذ ہو گئی جس کا تدارک بغیر اسٹیٹس جائے بغیر ممکن نہیں ہے۔" میں جل ہی گیا۔

"وہ روتھ اور اینی کی شادی ہے۔" اس نے بڑی بے نیازی سے کہا اور میں نے سر تھام لیا یہ دونوں اس کے نیٹ فرینڈز تھے اور وہ ان کی شادی اٹینڈ کرنے جا رہی تھی سمسٹرز ڈراپ کرکے۔

"تھوڑے دن رک جاتیں کم از کم سمسٹرز تک۔ پھر ان کی ڈائیورس کا افسوس کرنے چلی جاتیں۔" میں نے کہا اور اس نے مجھے مکا رسید کیا اور ہنسنے لگی۔

"ارے میں تو تمہیں موقع دے رہی تھی بیٹ جیتنے کا۔ جب تک تم اس مشن امپاسبل پر نکلو۔" اس نے اسی لاپروائی سے کہا۔

"تم جانتی ہو میں جب کسی مشن کا بیڑہ لوں تو وہ امپاسبل نہیں رہتا۔" میں نے ناک سے مکھی اڑائی۔

"دیکھیں گے وش یو بیسٹ آف لک۔" یہ کہہ کر وہ چل دی۔

اور میں نے اس پری وش کو واچ کرنا شروع کر دیا۔ اور جلد ہی مجھے اس سے متعلق معلومات ملتی چلی گئیں۔

اس کا نام یمنی علی تھا وہ ایم بی اے ڈپارٹمنٹ کی تھی۔ وہ مڈل کلاس سے تھی لیفٹنٹوں دل اس کی راہوں میں بچھے تھے مگر وہ بچ اور سنبھل کر چلنے کی عادی تھی اس کی شخصیت میں ایک وقار و تمکنت سی تھی وہ بہت روڈ یا بد مزاج نہیں تھی دوسرے الفاظ میں نہ اتنی نرم تھی کہ کوئی مروڑ دیتا نہ اتنی سخت تھی کہ

کوئی توڑنے کی ضد میں مبتلا ہو جاتا پتا نہیں کیوں لامیہ نے اس سے متعلق بیٹ لگائی تھی جیلس ہونے والوں میں سے وہ تھی نہیں؟ پھر کیا وجہ تھی میں سمجھ نہیں سکا تھا۔ لیکن وہ تو سدا کی ایسی ہی تھی۔ ورنہ کوئی اپنے منگیتر کو ایسا کھلا میدان دیتا ہے کھیل کھیلنے کو۔ لیکن وہ لامیہ حسام تھی جو جانتی تھی کہ اس کی زلفوں کے پیچ و خم میں الجھنے والے کم ہی سلجھ پاتے ہیں۔

* * *

یمنی علی سے ملاقات کے اسباب بھی خود بہ خود ہی پیدا ہو گئے۔ میرا ایک فرینڈ انگلش لٹریچر ڈپارٹمنٹ کا تھا۔ اور میں اس دن اس کے پاس بیٹھا باتوں میں مصروف تھا تبھی وہ آگئی۔

"پلیز، سمیر! مجھے گھر چھوڑ دو۔" اس نے آتے ہی کہا مجھے اس نے قطعی اگنور کر دیا مگر سمیر نے اسے گھور کر دیکھا اور میری طرف مڑا۔

"شاہ میر! میٹ ہر شی از مائی کزن یمنی علی۔" اس نے میری طرف دیکھ کر تعارف کی رسم نبھائی۔

"اوہ ہیلو گلیڈ ٹو میٹ یو۔" میں نے خوشدلی سے کہا۔

"اینڈ یمنی ہی از مائی کلوز فرینڈ شاہ میر عثمان۔" اس نے اس بار میری جانب سے تعارف کی رسم نبھائی۔

"سیم ہیئر۔" کہہ کر وہ پھر سمیر کی طرف پلٹ گئی حالانکہ اس کا لہجہ چیخ چیخ کر اس کی بات کی نفی کر رہا تھا اور سمیر اسے کھا جانے والی نظروں سے گھورنے لگا۔

"اب چلو بھی۔" وہ بے زاری سے بولی اس کا لہجہ تھکا ہوا اور آواز بھاری ہو رہی تھی چہرہ بھی سرخ ہو رہا تھا۔

"کیوں ایسی کیا ایمرجنسی نافذ ہو گئی۔" سمیر کا لہجہ بڑا کھردرا تھا۔

"سمیر! مجھے لاسٹ ٹو ڈیز سے فیور ہے مگر آج میری پریزنٹیشن تھی اس لیے آنا پڑا مگر لگتا ہے اس وقت بخار زیادہ ہو گیا ہے مجھ سے کھڑا نہیں ہوا جا رہا اور ناک سے اور آنکھوں سے پانی بھی بہت بہہ رہا ہے۔" اس نے اپنی مجبوری بتائی تو سمیر ایک دم سے نرم پڑ گیا۔

"اوہ! پہلے بتانا تھا نا تم بھی کہاں کہاں کی باتیں لے کر بیٹھی ہو کام کی بات نہیں بتاتیں۔" سمیر نے آرام سے سارا الزام اس کے سر ڈال دیا اور آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ پکڑ کر دیکھا اس کا ماتھا چھوا۔

"اوہو تمہیں تو بہت تیز بخار ہے۔" اس نے خاصی تشویش سے کہا تو وہ مسکرا دی مگر اس مسکراہٹ میں بھی تکلیف نمایاں تھی۔

"مگر ایک مسئلہ ہے یار! آج تو میری بائیک خراب تھی ورکشاپ میں کھڑی ہے۔" اس نے خاصی خجالت سے کہا تو اس کے چہرے کی تکلیف میں اضافہ ہو گیا۔

"ٹھیک ہے میں ٹیکسی سے چلی جاتی ہوں۔" اس نے آہستگی سے کہہ کر آگے کی طرف قدم بڑھائے۔

"ایکسکیوز می مس علی! اگر آپ مائنڈ نہ کریں تو میں آپ کو لے چلتا ہوں اب آپ ایسی حالت میں کہاں ٹرانسپورٹ کے لیے خوار ہوں گی۔" میں نے آفر کی تو اس نے متذبذب انداز میں سمیر کو دیکھا۔

"مس علی! اگر کوئی مسئلہ ہے تو میں سمیر کو گاڑی دے دیتا ہوں وہ آپ کو ڈراپ کر دے گا۔" میں نے اسے متذبذب دیکھ کر کہا۔

"اوہ نہیں یار میں ساتھ چل رہا ہوں تم ہم دونوں کو ڈراپ کر دو اگر تم برا نہ مانو تو۔" سمیر نے فوراً" سے پیشتر کہا۔

"سمیر پلیز، ڈونٹ فارمل ہماری دوستی ان تکلفات سے ماورا ہے۔" میں نے کہا اور وہ ہنس پڑا اور اس طرح سے میرے ایک زبردستی کے احسان نے اسے میرا زیر بار کر دیا اور نہ چاہتے ہوئے بھی اس کا رویہ میرے لیے نرم ہو گیا۔

اب دوسرے مرحلے میں میں نے اس کی پسند ناپسند کا حساب کتاب رکھنا شروع کیا وہ لٹریچر کی دیوانی تھی۔ میں نے چند ہی دنوں میں ملکی و غیر ملکی آتھرز کو رٹ ڈالا۔

اب اس کی ہر ادبی گفتگو پر اس سے زیادہ سیر حاصل گفتگو میری ہوتی بات بانو قدسیہ کے راجہ گدھ کی ہوتی

ممتاز مفتی کی الکھ نگری کی بانو قدسیہ کو اشفاق احمد سے بڑا رائٹر ماننے کی یا قدرت اللہ شہاب کی عظمت کی، کیٹس، بائرن، شیلے، ولی دکنی سے لے کر وصی شاہ، ڈپٹی نذیر سے لے کر اشفاق احمد تک میں نے ہر ایک کو اس سے ڈسکس کر ڈالا۔ منٹو، عصمت چغتائی، قرۃ العین حیدر، الطاف فاطمہ، مظہر الاسلام ہوں یا میکسم گورکی شیکسپئر، ورڈزورتھ، چارلس ڈکنز، پی ماروف میں سب کو گھول کر پی گیا تھا وہ جب مجھ سے بات کرتی تو حیران ہو جاتی۔

"آپ کا ادبی ذوق تو مجھے حیران کر دیتا ہے۔" اور میں دل میں سوچتا کہ تمہیں کیا حیران کرتا ہے۔ مجھے خود حیران کر دیتا ہے میں سب سے زیادہ لٹریچر سے بھاگنے والا بندہ۔ مگر یہ لامیہ کی بچی خود تو مزے سے شادی اٹینڈ کر رہی تھی اور مجھے پھنسا دیا تھا۔ پہلے ان رائٹرز کو رٹتا تھا پھر گرینڈپا سے ڈسکس کرتا تھا اور ان کا نقطہ نظر آ تھر کی تحریر کے بارے میں اس پر واضح کر دیتا تھا وہ خود بھی حیران تھے کہ ان کا گرینڈ سن اتنا با ادب کیسے ہو گیا ہے۔

اب میں انہیں کیا بتاتا کہ میرے با ادب ہونے کے پیچھے کسی بے ادب (لامیہ) کا ہاتھ تھا۔ جو وہاں اسٹیٹس میں روتھ اور اپنی کی محبت کو خراج تحسین پیش کر رہی تھی۔

اب دوسرے مرحلے میں، میں نے اس کی ہر پسند و ناپسند کو اون کرنا شروع کر دیا۔ وہ ساون کی دیوانی تھی۔

"پتا ہے۔ برستی بارش مجھے دیوانہ کر دیتی ہے۔ بارش میں بھیگنا اور موسمی پکوان ماما سے بنوا کر کھانا اور ڈانٹ کھا کر اپنے کمرے کی کھڑکی سے بارش کی کن من دیکھنا۔" اور میں نے اسے ایسے دیکھا جیسے کہ مجھے اس کی دماغی حالت پر شبہ ہو کراچی جیسے شہر میں جہاں دس منٹ بارش ہو جائے تو دس گھنٹوں تک لائٹ غائب ہو جاتی ہے۔ ٹریفک بدترین جام، گاڑیاں boats کی صورت میں سفر کرتی ہیں جگہ جگہ سے سڑکیں بیٹھ جاتی ہیں ایک دن کی بارش ایک ہفتے کی شہری زندگی کو ڈسٹرب کر دیتی ہے۔ کیچڑ اور گندگی الگ مگر پھر بھی یہ اس کی پسند تھی۔

"واقعی ساون رت تو دیوانہ کر دیتی ہے۔" میں نے بے دلی سے کہا۔

"ساون رت دیوانہ کر دیتی ہے۔ تو بات اتنی بے دلی سے کیوں کہہ رہے ہیں۔" اس نے حیرانی سے کہا۔

"نہیں نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ بس بارش کے بعد کی لوڈشیڈنگ اور سڑکوں کی حالت پر غصہ آتا ہے۔" میں نے کہا تو وہ کھلکھلا کر ہنس دی "یعنی آفٹر افیکٹس۔" اس نے کہا۔

"بالکل۔" میں نے ترت کہا۔

"تو یہ تو ارباب اختیار کا قصور ہے نا بارش کا تو نہیں۔" اس نے بے ساختہ کہا۔

"ہاں ہے تو۔ مگر یہ تو سچ ہے کہ معمولات زندگی تعطل کا شکار ہو جاتے ہیں۔" میں اپنے موقف پر قائم تھا میں اس سے کبھی کبھی اختلاف بھی کر لیا کرتا تھا مگر انتہائی جائز باتوں پر کیونکہ حد سے زیادہ بڑھی ہوئی ذہنی مطابقت بھی بے زاری کو جنم دیتی ہے۔

اب آہستہ آہستہ میرا گھیرا اس کے گرد تنگ ہوتا چلا جا رہا تھا۔ لاکھ محتاط سہی تھی تو لڑکی۔ پھول ہی پھول تھے اس کے اندر۔ ایک گھر، ایک در یچے، پھول سے بچے کی خواہش رکھنے والی۔ قصور اس کا نہیں تھا۔ میرا بھی نہیں تھا۔ قصور اس بیٹ کا تھا جو لامیہ نے مجھ سے لگائی تھی۔ اور خود آرام سے اسٹیٹس میں بیٹھی تھی۔

اور پھر وہ دن بھی آ گیا جب میں نے اس سے اظہار محبت کیا تو اس کی آنکھوں اور چہرے پر حیرت نہیں تھی گویا وہ اس کے لیے پہلے سے تیار تھی ذہنی طور پر مگر پھر بھی اس نے کہا۔

"شاہ میر! تمہارا اظہار میرے لیے Expected تھا۔ مگر پھر بھی میں نے ابھی اس بارے میں کچھ سوچا نہیں ہے۔" وہ آرام سے بولی اور میں بھنا گیا۔

"تو پھر کب سوچو گی۔ ایجوکیشن کمپلیٹ ہونے والی ہے۔ اور یہی آئیڈیل عمر اور وقت ہوتا ہے۔ مستقبل کے فیصلے کے لیے۔" میں نے اپنی بات میں وزن پیدا کرتے ہوئے کہا۔

"ہوتا ہے مگر میرے بابا مجھے بیٹا کہتے ہیں اور مجھے ان کا بیٹا بن کر دکھانا ہے۔ پتا ہے ہم پانچ بہنیں ہیں۔ بڑی دونوں بہنوں نے تعلیم مکمل کر کے جاب کی اور اپنا جہیز خود بنایا تو وہ اپنے گھر کی ہوئیں۔ بابا کا اپنے دوست کے ساتھ شراکت میں کاروبار تھا۔ ان کے دوست نے ان سے دھوکا کیا اور تمام کاروبار پر قبضہ کر لیا بابا کو بہت صدمہ ہوا اور ان کا جسم کا سیدھا حصہ پیرالائزڈ ہو گیا۔ ماما نے خاموشی اوڑھ لی۔

ایسے میں ہم پانچوں بہنوں نے بچے ہوئے اثاثے سے ایک کوچنگ سینٹر کھولا اس کی آمدنی سے ہم نے گھر بھی چلایا اور اپنی تعلیم بھی مکمل کی۔ اور جو بہن تعلیم مکمل کرتی جاتی۔ وہ پڑھانے کے ساتھ ساتھ جاب بھی کرتی۔۔۔ اس طرح سے دو بہنوں کی شادی ہو گئی میں تیسرے نمبر پر ہوں مجھ سے چھوٹی دو بہنیں اور ہیں۔ اور میرا اس وقت تک شادی کرنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ جب تک میری دونوں چھوٹی بہنوں کی شادی نہ ہو جائے اور میرے پیرنٹس کے لیے زندگی گزارنے کا کوئی باقاعدہ انتظام نہ ہو جائے۔ بابا کی مستقل فزیوتھراپی ہو رہی ہے اب وہ سہارے سے چل لیتے ہیں ان شاء اللہ وہ جلد ہی دوبارہ سے پہلے جیسے ہو جائیں گے۔ بابا کی حالت کی درستگی کے ساتھ ساتھ ماما کی خاموشی بھی ٹوٹتی جا رہی ہے۔ بس تھوڑی سی کٹھنائیاں اور ہیں اور ہم اللہ کی ذات سے مایوس کبھی نہیں ہوئے۔" وہ اپنی ساری کتھا کہانی سنا کر خاموش ہو گئی جو کہ میرے اظہار محبت کے جواب میں تھی اور ظاہر ہے جس سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں تھی مگر میں اس سب میں دلچسپی ظاہر کرنے پر مجبور تھا۔ میں نے سوچا۔

"تو یہ ہے۔ یہ مڈل کلاس سوچ ابھی اظہار محبت کیا ہے۔ اور بات پہنچا دی گئی شادی تک۔" مگر یہ سوچا تو جا سکتا ہے مگر کہا نہیں جا سکتا تھا سو میں نے کہا تو یہ کہا۔

"کیا تمہارے مسائل میرے نہیں ہو سکتے۔"

"نہیں! قطعی نہیں میں اپنی آئندہ زندگی کی ابتدا مسائل کے انبار کے ساتھ نہیں کرنا چاہتی۔" اس نے قطعی انداز میں کہا۔

"یعنی تم مجھے اپنا نہیں سمجھتیں۔" میں نے ناراضی سے کہا۔

"جن سے محبت ہو جنہیں اپنا سمجھا جائے انہیں تکلیف نہیں دی جاتی۔" اس نے آہستگی سے کہا۔

"یعنی میری محبت کو شرف قبولیت بخشا گیا ہے۔" میں نے شوخی سے کہا اور وہ آہستگی سے ہنس دی۔

☼ ☼ ☼

اب وہ مجھ پر کافی اعتبار کرنے لگی تھی۔ میں کبھی کبھی اسے گھر بھی چھوڑ دیا کرتا تھا۔ وہ مجھ سے اپنے مسائل بھی شیئر کر لیا کرتی تھی وہ اندر سے، بہت مشرقی لڑکی تھی۔ وہ شادی شدہ عورت کو گھر کی زینت سمجھتی تھی۔ اس کے خیالات بڑے پتنی ورتا قسم کی عورتوں والے تھے۔ گھر، شوہر اور بچے اور مجھے اس کے خیالات سے کوفت ہوتی تھی۔ ہمارے ہاں کسی عورت کی زندگی گھر شوہر اور بچوں کے گرد نہیں گھومتی تھی۔ ہر عورت کی گھر سے باہر کی مصروفیات زیادہ تھیں۔ اور بچوں کے لیے تو ایک یا دو سے آگے گنتی ہی کسی کو یاد نہیں تھی مگر ان باتوں سے مجھ کچھ لینا نہیں تھا مگر اس کی بات کے جواب میں میں نے کہا۔

"اگر تمہاری دنیا صرف گھر اور بچوں کے ہی گرد گھومتی ہے تو اتنی ہائر اینڈ لف اسٹڈیز کی ضرورت کیا ہے۔" میں نے خاصا اکتا کر اسے دیکھا۔

"خاصی پرانی بات ہے کہ تعلیم شعور عطا کرتی ہے۔ انسان کو انسان بناتی ہے۔ تعلیم صرف نوکری کے حصول کا ذریعہ نہیں ہے۔ اور فی الحال ابھی ہائر اینڈ لف اسٹڈی، میری اور میرے گھر والوں کی ضرورت ہے۔" اس نے مدلل و مفصل جواب دیا۔

☼ ☼ ☼

اور جب اس کا اعتبار مکمل ہوا تو لامیہ کا فون آ گیا۔

"اور کہاں تک پہنچا تمہارا مشن پرنس چارمنگ!" اس نے چھوٹتے ہی پوچھا۔

"مشن از سکسیس فل سوئیٹ ہارٹ۔" میں

سے ہوا تھا" کہا۔
"تو پھر ٹھیک ہے میں آرہی ہوں اگلے ہفتے پھر اس اسٹوری کا اینڈ کرتے ہیں۔" وہ خاصی پرجوش تھی۔
"ساحر کہتا ہے، جس کہانی کا انجام ممکن نہ ہو اسے ایک خوبصورت موڑ دے کر چھوڑنا اچھا ہوتا ہے۔" میں نے کہا۔
"ساحر کون ہے۔ تمہارا کوئی نیا فرینڈ ہے؟" اس نے چونکتے ہوئے پوچھا۔
"اور وہ ایسے فضول خیالات کا اظہار تمہارے سامنے کیوں کرتا ہے۔"
"اسٹوپڈ گرل! ساحر پوئٹ ہے گریٹ پوئٹ ساحر لدھیانوی۔" میں نے سر پیٹ لیا۔
"تم کب سے پوئٹس کو پڑھنے لگے؟" وہ شاکڈ ہوگئی۔
"یہ سب تمہاری بیٹ کا کمال ہے۔ جس نے ملکی و غیر ملکی پوئٹس کو ہی نہیں رائٹرز تک کو پڑھوا ڈالا۔" میں نے مسکینی سے کہا تو وہ خوشدلی سے ہنس دی۔
"تو گویا محترمہ لیٹریچر کی دیوانی ہیں۔" اس نے ہنستے ہوئے کہا اور پھر زیرِ لب بڑبڑائی۔
"پور مڈل کلاس شوق۔" مگر میں نے اس کی دوسری بات سنی ان سنی کردی۔
"دیوانی نہیں اچھی خاصی پاگل ہے۔" میں نے کہا۔
"اور تم پر۔" اس نے بے ساختہ پوچھا۔
"مجھ پر۔" میں نے ایک لمحہ لیا سوچنے میں۔
"مجھ پر پاگل نہیں ہے۔ ہاں اعتبار کرتی ہے پسند کرتی ہے۔ اور شاید محبت بھی کرتی ہے۔" میں نے پوری سچائی سے بتایا۔
"شاید کیوں یقیناً" "کیوں نہیں؟" اس کے لہجے میں حیرت تھی۔
"تم سی شاندار شخصیت اور بیک گراؤنڈ رکھنے والے کو بھی کوئی لڑکی نظر انداز کر سکتی ہے۔ ویسے تو تمہارا خیال ہے کہ تم آگے چلتے ہو اور امپورٹینس [illegible] لاتی ہے تمہارے حسن کی تاب نہ

لاکر۔ فلیٹ ہونے والی لڑکیوں کو ڈھونے کے لیے۔" اس نے بے ساختگی سے کہا اور میں ہنستا چلا گیا پھر ایک دم سے سنجیدہ ہوگیا۔
"وہ بہت محتاط ہے۔" میں نے کہا۔
"محتاط سہی مائل تو ہے نا تمہاری جانب۔" اس نے پوچھا میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔
"چلو پھر میں آرہی ہوں اس لو اسٹوری کو ٹریجک اسٹوری میں بدلنے کے لیے۔" اس نے بڑے اطمینان سے کہا۔
"ہنی! کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ تم دیکھ لو۔ اور بس مجھے بیٹ کی رقم بھی مت دو مگر دیکھو اس طرح سے مت کرو۔" میں نے جھجکتے ہوئے کہا تو وہ مجھ پر الٹ پڑی۔
"کیوں کیوں ایسا کیوں؟ کہیں تم بھی تو انوالو نہیں ہوگئے اس میں۔" اس نے تیز لہجے میں کہا۔
"ہنی! کیا فضول بات کر رہی ہو۔ بس بات یہ ہے کہ وہ بہت حساس ہے اور کچھ اس کے حالات بھی ایسے ہیں کہ میں اسے توڑنا نہیں چاہتا۔" میں نے اپنی طبیعت سے مجبور ہو کر کہا۔
"یہ تمہارا مسئلہ نہیں ہے۔ تمہارا پرابلم صرف اسے خود اپنی جانب مائل کرنا تھا بس۔ اور جہاں تک بات ہے اس کی حساس طبیعت کی تو اسے میں اچھی طرح جانتی ہوں، بہت غرور تھا اسے خود پر بڑا مان تھا یہی غرور تو توڑنا تھا مجھے اس کا۔" اس نے نخوت سے کہا۔
"تمہارا کوئی ذاتی کلیش ہے اس کے ساتھ۔" میں یہ سوال کرنے سے خود کو روک نہیں سکا۔
"نہیں کوئی کلیش نہیں ہے ایم بی اے ڈپارٹمنٹ ہی نہیں ہر ڈپارٹمنٹ میں اس کے حسن اور لیے دیے انداز کے چرچے ہیں بہت مشہور ہے وہ بہت سمجھتی ہے خود کو۔ اس کا یہی غرور توڑنا ہے مجھے۔" اس نے لاپروائی سے کہا گویا کسی کا دل نہیں کوئی کانچ کا گلاس ہو جسے توڑنا ہو۔
"تم جیلس ہونے والوں میں سے تو کبھی نہیں رہیں۔" میں نے بے ساختہ پوچھا اور وہ ہنس دی۔

"تو اصل بات جان گئے رہو گے میری تمہارے علاوہ کسی اور سے بھی بیٹ لگی ہوئی ہے۔" اس نے ہنستے ہوئے کہا اور میں نے ٹھنڈی سانس لی پتا نہیں کیوں دل اس سب پر راضی ہی نہیں تھا۔
"اچھا چھوڑو سب کو یہ بتاؤ سمسٹرز کی ڈیٹ آگئی۔" اس نے پوچھا۔
"نہیں بس ایک دو دن میں آجائے گی۔" میں نے کہا اور پھر اس نے ایک دو اچھی اچھی باتیں کیں اور فون بند کردیا۔

☼ ☼ ☼

لامیہ کے آنے تک کا عرصہ میں نے خاصے کرب میں گزارا میں نے سوچا کہ اسے کسی مجبوری کی داستان سنا کر اس سے علیحدہ ہوجاؤں مگر وہ جس مان سے مجھ سے بات کرتی تھی میری ہمت ہی نہیں ہوتی تھی۔
اور پھر لامیہ آگئی اس کے آنے کے بعد کا پورا دن ہم نے ساتھ گزارا اور ڈنر بھی باہر ہی کیا۔ رات جب میں نے اسے اس کے گھر چھوڑا تو اس نے پھر وہی ذکر چھیڑ دیا جس سے میں بچنا چاہ رہا تھا۔
"تو پھر میں کل آرہی ہوں۔ تمہاری یمنیٰ علی کی اسٹوری کا دی اینڈ کرنے۔" اس نے بڑے لاپروا انداز میں کہا۔
"میری ریکویسٹ ہے تم سے اس کہانی کو بے انجام ہی رہنے دو۔" میں نے مڑ کر اس کے دلکش سراپے کو دیکھا جو کہ اسٹیٹس کی صحت مند فضاؤں میں مزید دلکش ہوچکی تھی۔ پنک کلر کے ٹراؤزر اور شارٹ شرٹ میں وہ بے انتہا حسین لگ رہی تھی۔ اس پر نفاست سے کیا گیا میک اپ اور بیش قیمت جیولری لیئرز میں کٹے ہوئے بال جن میں اس نے گولڈن کلر کی اسٹریکنگ کروائی ہوئی تھی۔ وہ کسی اور ہی دنیا کی مخلوق لگ رہی تھی۔
"کیوں تم بہت اس کی سائیڈ لے رہے ہو کہیں تم بھی تو اس کے متاثرین میں شامل نہیں ہوگئے۔" اس نے شاکی انداز میں مجھے دیکھا۔

"میں نے تمہیں بتایا تھا نا کہ اس کے حالات ایسے ہیں کہ اگر وہ ٹوٹ گئی تو بہت برا ہوگا۔" میں نے اپنے آپ کو نارمل رکھتے ہوئے کہا۔
"یہ تمہارا پرابلم نہیں یہ اس کا پرابلم ہے۔ اور پلیز آج میرا موڈ بہت اچھا ہے۔ اسے خراب مت کرو۔" اس نے کہہ کر گویا بات ختم کردی۔

☼ ☼ ☼

دوسرے دن میں نے خود سے بہت کوشش کی کہ یمنیٰ علی سے سامنا نہ ہو مگر وہ خود ہی میرے پاس چلی آئی آج اس کا برتھ ڈے تھا۔ اور وہ اپنی برتھ ڈے میرے ساتھ سیلیبریٹ کرنا چاہتی تھی۔ وہ آج بہت خوش تھی۔ وہ اپنی چھوٹی چھوٹی باتیں مجھ سے شیئر کر رہی تھی۔ تب ہی لامیہ چلی آئی۔ بلیک جینز پر مسٹرڈ اور بلیک کامبینیشن کا سلولیس شرٹ اس کے حسن کو چار چاند لگا رہا تھا۔
"اوہ! شاہ میر تم یہاں ہو اور میں کہاں کہاں تمہیں ڈھونڈتی پھر رہی ہوں۔" اس نے مصنوعی حیرت سے کہا۔
"اوہ! یہاں تو مس یمنیٰ علی بھی موجود ہیں کیمپس کی موسٹ بیوٹی فل، موسٹ بریلینٹ اور ناقابلِ تسخیر۔"
اس نے تمسخرانہ انداز میں یمنیٰ کو دیکھا اتنی دیر میں صرف وہی بولتی رہی تھی میں اور یمنیٰ خاموشی سے اسے سن رہے تھے۔
"یمنیٰ علی کے تمہارے ساتھ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ تم بیٹ جیت چکے ہو کیوں آئی ایم رائٹ؟" اس نے کھنکتے ہوئے لہجے میں کہا اور اسی وقت یمنیٰ نے حیرت سے میری جانب دیکھا۔
"ارے مس یمنیٰ علی ایسی حیرت سے کیا دیکھ رہی ہیں شاہ میر از مائی فیانسی، اور ہماری بیٹ لگی تھی کہ وہ تمہیں تسخیر کر کے دکھائے گا اور اس نے ایسا کر کے دکھا دیا ہے۔" یہ کہتے ہوئے اس نے اپنا والٹ کھولا اور اس میں سے دس ہزار نکال کر میرے سامنے ڈال

دیئے اور یمنیٰ نے مجھے ایسی نگاہ سے دیکھا کہ بس میرا انکار اسے زندگی دے دے گا اور میرا اقرار اسے موت کی وادی تک پہنچا دے گا مگر میں نے اس کی نگاہوں کی تاب نہ لا کر ــــــ نگاہیں جھکالیں اور اسے جواب مل گیا۔

"شاہ میر! میں نے کبھی کسی کا برا نہیں چاہا خدا میرے ساتھ بھی برا نہیں کر سکتا۔ شاید میں خود کے ساتھ برا کرنے جا رہی تھی۔ سو اس نے راستے سے بچالیا۔ میں نے آج تک کسی کو بددعا نہیں دی انہیں بھی نہیں جنہوں نے ہمیں تباہ کر دیا اور آج بھی میں اپنی روایت نہیں توڑوں گی جب کسی کو بددعا نہیں دی تو تمہیں کیسے دے سکتی ہوں تم پر تو میں نے بڑے سچے جذبے لٹائے ہیں۔ لیکن ایک بات میں ضرور کہوں گی آج کے بعد تمہیں زندگی کے ہر لمحے میں احساس ہو کہ آج تم نے کیا کھویا ہے اور اس کے بدلے میں کتنا نقصان پایا ہے۔" اس کے چہرے پر زلزلے کے سے آثار تھے مگر لہجہ بڑا مضبوط و مستحکم تھا۔

"اگر آپ کی جذباتی تقریر ختم ہو گئی ہو تو میں کچھ کہوں۔" لامیہ نے تمسخر سے کہا تب اس نے نظر اٹھا کر لامیہ کو دیکھا۔

"جی ضرور اپنا زہر انڈیلے بغیر آپ کو چین کب پڑے گا آپ جیسے لوگ ذلالت کی جس پستی بلکہ پاتال میں اترے ہوتے ہیں اس میں دوسرے کو نیلا کیے بغیر سکون کب ملتا ہے۔" یمنیٰ نے بڑے ٹھہرے ٹھہرے انداز میں کہا اور لامیہ تلملا گئی۔

"ہونہہ ناقابل تسخیر سمجھتی تھیں نا تم خود کو۔" لامیہ نے جلبلا کر کہا۔

"نہیں میں نے خود کو کبھی ناقابل تسخیر نہیں سمجھا میں عام انسان اور زمین کی باسی ہوں اور عام انسانوں کی طرح زمین پر بستی ہوں میں کبھی آسمانوں پر اڑنے کے جنون میں مبتلا نہیں رہی میرے مذہب اور میرے معاشرے نے مجھ پر جو حدود مقرر کی ہیں میں نے انہیں کراس کرنے کی کبھی کوشش نہیں کی۔" اس نے اسی مضبوط لہجے میں کہا۔

"اور اب ان حدود پر آرڈیننس لاگو ہو گیا ہے۔ ہے نا!" لامیہ کے لہجے میں طنز اتر آیا۔

"قطعی نہیں وہ تم جیسے لوگوں پر لاگو ہوتا ہے۔ جو آزادی کو بے راہ روی کے طور پر استعمال کر کے اسے لبرل ازم کا نام دیتے ہیں غیر ملکیوں کی اندھی تقلید میں اپنی چال بھی بھول چکے ہیں۔ اور آپ۔ آپ خود کو کہاں پاتی ہیں لامیہ بی بی۔ آپ نے غیر ملکی چینلز سے اور کچھ سیکھا ہو نہ ہو یہ بڑا اچھا سیکھا ہے۔ انہیں بے کردار عورتوں کی طرح آپ بھی اسی پستی میں کھڑی ہیں کہ آپ نے اپنے منگیتر کو کسی اور کے سامنے پلیٹ میں سجا کر پیش کر دیا۔ اور آپ کا منگیتر کیونکہ وہ آپ کا منگیتر جو ٹھہرا ظاہر ہے۔ اسے آپ سے بھی زیادہ بے کردار اور پستی کا شکار ہونا ہے۔ جس نے محض چند کاغذ کے ٹکڑوں کی عیوض اتنا پستی میں گرنا منظور کر لیا کہ کسی لڑکی کے سامنے اپنا آپ ڈش میں سجا کر پیش کر دیا۔" یمنیٰ کے کڑوے الفاظ نے لامیہ کو جھنجلا کر رکھ دیا وہ تو سمجھ رہی تھی کہ یمنیٰ مڈل کلاس کی لڑکی ہے اس کے آگے روئے گی چلائے گی گڑگڑائے گی اور اس طرح اس کی انا کی تسکین ہو گی مگر یہاں تو معاملہ ہی الٹا تھا۔ یمنیٰ علی کے لہجے میں کہیں کوئی لرزش اس کو کمزور ثابت نہیں کر رہی تھی۔ وہ بڑی آن بان سے اس کے ہر حملے کو پسپا کر رہی تھی۔

"اور مسٹر شاہ میر! اب آپ اپنی فیانسی کی دلی تسکین کے لیے بتائیے کہ اس نے جو کچھ بتایا ہے۔ وہ بالکل درست ہے اور آپ کا آج کے بعد مجھ سے کوئی تعلق نہیں ہو گا۔" اس نے مجھے استہزائیہ انداز میں دیکھا۔

"شٹ اپ! ختم ہو گئی تمہاری اموشنل بلیک میلنگ اب چلتی پھرتی نظر آؤ۔" لامیہ کا لبریز پیمانہ چھلک اٹھا۔

"ہاں جانا تو ہے۔ جانا تو ہے۔" اس نے گویا خود کلامی کی اور زمین میں پڑی ایک سوکھی املتاس کی کھلی چند زرد پھول اور پتیاں اٹھالیں اور بغیر کسی جانب دیکھے اپنا بیگ اٹھا کر چل دی مجھے ملال نے گھیر سا لیا اس کی

تمام باتوں میں صرف آخری بات میں ٹوٹے کانچ کی سی صدا تھی۔

اور اسی لمحے شاید محبت نے مجھے بڑے دکھ سے دیکھا اور لامیہ کی جانب میری محبت کا پھیلا دامن ایک جھٹکے سے کھینچا اور اسے یمنیٰ علی کی جانب بڑی نرمی سے پھیلا دیا۔

☼ ☼ ☼

اس کے بعد میں اس سے کبھی نہیں مل سکا حالانکہ میرے اندر جو گلٹی فیلنگز تھیں اس کے سدباب کے لیے میں نے اس سے کانٹیکٹ کرنے کی بہت کوشش کی تھی۔ آخر کار میں اس کے جذبات سے کھیلنے کا سزاوار تھا میں اس کے سچے جذبات کا قاتل تھا۔ مگر اس واقعے کے بعد سے کیمپس آنا ہی چھوڑ دیا تھا۔ اس کے موبائل پر بھی میں نے کئی بار ٹرائی کیا مگر غالباً" اس نے سم تبدیل کر دی تھی۔

انہی دنوں سمسٹر کی ڈیٹ آگئی پیپرز کے دوران بھی وہ خاصی لیٹ آتی تھی اور پیپر ختم ہوتے ہی چلی جاتی گویا اس نے مجھ پر رابطے کا ہر راستہ بند کر دیا۔ اور یوں بھی کہا جاتا ہے۔ "لگن سچی ہو تو خدا بھی مل جاتا ہے۔" مگر شاید میری لگن سچی نہیں تھی۔

یہ ہمارا لاسٹ سمسٹر تھا اور اس کے بعد میرا اور لامیہ کا شادی کا پروگرام تھا۔ کیونکہ کوئی معاشی اور معاشرتی پرابلم تو تھی نہیں۔ ڈیڈ نے میرا الگ آفس سیٹ کر دیا تھا۔ میرے لیے الگ فیکٹری لگا دی تھی۔ اپنی ایجوکیشن مکمل کر کے میں نے باقاعدگی سے آفس جانا شروع کر دیا تھا۔ ہماری شادی کی ڈیٹ فکس ہو گئی تھی۔ دونوں طرف کی شاپنگ میں لامیہ پیش پیش تھی۔ ہر چیز اس کی پسند سے لی جا رہی تھی بہترین بوتیکس سے اس کے ڈریسز تیار ہو رہے تھے عروسی جوڑا اور ولیمہ کا جوڑا اس کی مرضی سے شہر کے مشہور ترین بوتیک سے آرڈر پر تیار کروائے جا رہے تھے۔ امپورٹڈ کاسمیٹکس اور شوز، بہترین جیولری، پرفیومز غرض ہر چیز میں لامیہ کی پسند کو اولیت دی جا رہی تھی۔

وہ جس چیز پر ہاتھ رکھ دیتی وہ آنکھیں بند کر کے خرید لی جاتی تھی۔ شہر کے بہترین شاپنگ پلازہ کھنگالے جاتے تھے مگر پتا نہیں میرا دل مر سا گیا تھا۔ میں بہت بے دلی سے اس کے ساتھ ہر شاپنگ میں شریک ہوتا تھا وہ بہت پرجوش تھی بہت خوش تھی۔ اور میری بے دلی کو محسوس بھی کر جاتی تھی۔ اور مجھ سے لڑ بھی پڑتی تھی۔ وہ لاڈ و پیار میں نازوں پلی تھی وہ کہاں کسی کی بے اعتنائی برداشت کر سکتی تھی۔

"کیا بات ہے کس کے خیالوں میں گم رہنے لگے ہو۔" وہ میری بے دلی محسوس کر کے میرے سامنے چٹکی بجا کر مجھے متوجہ کرتی۔

"آف کورس تمہارے۔" میں فوراً" خود کو سنبھال لیتا ظاہر ہے۔ لامیہ کو کھونا میرے لیے مشکل ہی نہیں ناممکن تھا۔

"لگتا تو نہیں ہے۔" وہ بے یقینی سے کہتی۔

"امیزنگ! مس لامیہ گردیزی اپنی زبردست شخصیت سے ایسی بے یقین۔" میں لفظوں اور لہجے میں حیرت سمو کر کہتا۔

"میں بے یقین نہیں ہوں پتا نہیں کیوں یمنیٰ علی والے واقعے کے بعد سے مجھے لگتا ہے وہ ہمارے درمیان آگئی ہے۔" اس نے پر یقین لہجے میں کہا۔

"اوہو لامیہ! کیا بے وقوفی ہے۔ وہ ہمارے درمیان سے جا چکی ہے۔" میں نے چڑ کر کہا۔

"نہیں یہی تو اصل بات ہے۔ وہ جا کر بھی نہیں گئی۔" اس نے بڑے پر یقین انداز میں مجھ پر نظریں جما کر کہا۔

"لامیہ! کیا ہے بھئی تم اتنے خوب صورت وقت کو ایک فضول سے ذکر سے ضائع کر رہی ہو۔" میں حقیقتاً" جھنجلا گیا جس ذکر سے میں بچنا چاہتا تھا جن تکلیف دہ یادوں کو میں بھول جانا چاہتا تھا۔ وہ اپنی باتوں کا رخ ہر بار اسی طرف موڑ لیتی اور ہماری جھڑپ ہو جاتی۔

انہی دنوں اس کے سر میں سودا سمایا کہ اسے باقی شاپنگ فرانس سے کرنی ہے اس سلسلے میں میری سسٹر

علینہ اور مما بھی اس کی ہمنوا تھیں وہ مجھے بھی ساتھ لے جانے کے چکر میں تھی۔ مگر میں نے نئے سیٹل آفس اور فیکٹری اور ـــــ مصروفیات کا بہانہ بنا کر معذرت کرلی مگر وہ اس پر بھی ناراض ہو گئی۔

"اتنی ہی مصروفیات تھیں تو شادی کی ڈیٹ اتنی جلدی رکھوانے کی کیا ضرور تھی۔" وہ جل گئی۔

"اسی لیے تو نہیں جارہا سوئیٹ ہارٹ! کہ شادی تک تمام مصروفیات سے فارغ ہو جاؤں۔" میں نے نرمی سے کہا مگر اس کا منہ پھولا ہی رہا پھر وہ مما اور علینہ چلی گئی۔ اور اسی طرح کی نرمی گرمی میں ہماری شادی کا دن آپہنچا۔

☼ ☼ ☼

شادی کے بعد تو ہمارے اختلافات کھل کے سامنے آگئے اسے میری ہر بات سے اختلاف تھا ہم ایک دوسرے کی ضد تھے پہلے جو باتیں محبت کی وجہ سے نظر نہیں آتی تھیں وہ اب نا سور بن گئی تھیں۔ اس کی گھر سے دلچسپی برائے نام بھی نہیں تھی۔ خیر یہ کوئی ایسا مسئلہ نہیں تھا یہاں کس عورت کو گھر سے دوستی تھی۔ مگر اب اس نے نت نئی دوستیاں بھی پالنی شروع کردی تھیں اس کے آئے دن اسکینڈلز سامنے آتے رہتے تھے اب وہ ڈرنک بھی کرنے لگی تھی اور نشے کی حالت میں وہ جو حرکات کرتی تھی۔ وہ تمام اسکینڈلائز ہو کر میرے سامنے ایسے آتیں کہ میں شرمندہ ہو جاتا۔ ڈیڈ چیمبر آف کامرس کے پریذیڈنٹ تھے ان کی بہو جو حرکات کرتی تھی۔ وہ مرچ مسالوں کے ساتھ نیوز پیپر کی زینت بنتی۔ اور ڈیڈ انڈر اسٹریس آجاتے۔

ہماری فیملی کا ایک نام تھا۔ عزت تھی اور کہیں بھی ـــ ہماری فیملی کے کسی بھی ممبر کی بری شہرت نہیں تھی۔ اور اس چیز کو ایکسپلائٹ کیا جارہا تھا۔ کیونکہ قریبی ہونے والے الیکشن میں ڈیڈ کا ایک مشہور پارٹی کی طرف سے الیکشن لڑنے کا بھی ارادہ تھا۔ سو اس پارٹی اور ڈیڈ کے مخالفین اس بات کو خاصا اچھالتے تھے۔ ڈیڈ مجھ سے باز پرس کرتے تھے۔ اور میں لامیہ سے تو بجائے اپنی غلطی کو ماننے کے وہ الٹا چڑھ دوڑتی۔

"تم خود تو ہر وقت یمنی علی کے سوگ میں ڈوبے رہتے ہو چاہتے ہو کہ میں بھی ہر وقت تمہارے ساتھ اس ماتم میں شریک رہوں۔" وہ تپ کر کہتی۔

"پتا نہیں تمہیں کیا شک ہو گیا ہے لامیہ! یمنی ہمارے درمیان نہ پہلے کبھی تھی اور نہ آئندہ کبھی ہوگی۔ وہ صرف تمہاری ضد کی وجہ سے کچھ وقت کے لیے ہماری زندگی میں آئی تھی اور بس۔" یہ بات میں لامیہ سے زیادہ خود کو سمجھاتا تھا۔

"میز نگ! ٹھیک ہے۔ اگر ایسا ہی ہے تو تم میرے ساتھ آسٹریلیا چلو۔" اس نے مجھ نئی راہ سجھائی کیوں کہ انکل کاظم گردیزی کی پوری فیملی پاکستان سے اپنا بزنس وائنڈ اپ کرکے آسٹریلیا جا بسی تھی۔

میں اس وقت اس کی حرکات سے اتنا ڈپریس تھا کہ اگر وہ سدھرنے کی بات کرتی تو میں اس کی ہر بات ماننے کو دل سے تیار تھا۔ سو اس بات پر بھی لبیک کہا۔ میں نے ڈیڈ سے بات کی اور یہ تو کوئی مسئلہ ہی نہیں تھا ڈیڈ اور میرے دو بھائی تو پاکستان میں ہوتے تھے۔ وہ یہاں کا آفس اور فیکٹری دیکھ سکتے تھے لہٰذا ڈیڈ کے مشورے سے میں نے اپنی آفس کی ایک برانچ آسٹریلیا میں شروع کرنے کا فیصلہ کیا اور اس پر فوراً" عمل در آمد بھی شروع کردیا اور یوں ہم لوگ پاکستان سے آسٹریلیا شفٹ ہو گئے۔

میرا خیال تھا کہ وہ یہاں آکر سدھر جائے گی مگر آسٹریلیا آکر تو وہ زیادہ ہی شتر بے مہار ہو گئی آئے دن بوائے فرینڈز تو بدلتے ہی تھی۔ اب وہ اکثر ویک اینڈز اپنے بوائے فرینڈز کے ساتھ ان کے فلیٹ پر گزارتی تھی۔ اور میرے باز پرس کرنے پر مجھے طعنے دیتی۔

"تم تو کنزرویٹو مائنڈ ہوتے جارہے ہو۔ میں نے بہت آزاد ماحول میں پرورش پائی ہے مجھے تمہارے ساتھ گھٹن ہوتی ہے۔" وہ چیخ چیخ کر گھر سر پر اٹھا لیتی۔

"لامیہ تمہیں کیا ہو گیا ہم وہی ہیں جو دنیا جہان کے ہر موضوع پر بلا تکان ایک دوسرے سے گھنٹوں بات کیا کرتے تھے اور بور نہیں ہوتے تھے پھر اب کیا بات ہے کہ ہر وقت ایک دوسرے پر الزام تراشی کرتے رہتے ہیں۔" میں نے اسے سمجھانا چاہا۔

"اس کی وجہ تم ہو شاہ میر صرف تم۔ پہلے تم بہت براڈ مائنڈڈ تھے۔ جب تک تم پر یمنی علی کا سایہ نہیں پڑا تھا اس سے مل کر تم نیرو مائنڈڈ ہو گئے ہو تم چاہتے ہو کہ میں بھی اسی طرح ساڑھی کے برابر دوپٹہ لپیٹ کر رکھوں تمہارے سوا نہ میری کسی سے دوستی ہو نہ میں کسی سے ملوں گھر میں قید رہوں اور تمہارے سوگ میں شریک رہوں۔" اس کی ہر بات یمنی کے طعنے سے شروع ہو کر یمنی کے طعنے پر ختم ہوتی تھی اتنی تو خود بھی یمنی سے مجھے محبت نہیں تھی جتنی لامیہ نے کروادی تھی۔

"ہاں تو اس میں برائی کیا ہے اگر کوئی مرد اپنی بیوی کو آبرو باختہ نہیں دیکھنا چاہتا تو تم لوگوں کی نظر میں نیرو مائنڈڈ اور اگر کوئی اپنی بیوی کو آپے سے باہر دیکھ کر خوش ہوتا ہو تو تم لوگوں کی نظر میں براڈ مائنڈڈ صحیح کہا تھا یمنی نے کہ ہم نے آزادی کو بے راہ روی کے طور پر اپنا کر اسے لبرل ازم کا نام دے رکھا ہے۔" میں نے بھی ترخ کر کہا۔

"او ہو! کیا بات ہے بھئی آج تک اس کے ڈائیلاگز تک یاد ہیں۔" اس نے چبا چبا کر کہا۔

"کیوں نہ ہوں بقول تمہارے محبت جو کرتا ہوں اس سے۔" میں بھی آخر انسان تھا ٹمپر لوز کر بیٹھا اور اس نے چیخ چیخ کر گھر سر پر اٹھا لیا ہر چیز جو اس کے سامنے آئی اس نے اٹھا کر پھینک دی بڑی مشکل سے وہ قابو میں آئی۔

اس کے بعد بھی میں نے مفاہمت کی کافی کوششیں کیں مگر ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا میں چاہتا تھا کہ ہماری اولاد ہو جائے تو شاید حالات بہتر ہو جائیں مگر اس نے سنا تو بپھر گئی۔

"اچھا پہلے ہی جکڑ رکھا ہے۔ اب نئی زنجیریں لائے ہو مگر سن لو میں کوئی پاکستانی مڈل کلاس نہیں ہوں جو بچے پیدا کرکے پالنے کے چکر میں لگ جاؤں تمہیں اولاد کی اتنی ہی خواہش ہو رہی ہے تو بچہ اڈاپٹ کرلو۔" اس نے تلخی سے کہا۔

"خوامخواہ اڈاپٹ کرلوں جب ہمارے بچے ہو سکتے ہیں تو میں خوامخواہ کسی اور کا بچہ اڈاپٹ کرلوں۔" میں نے غصے سے کہا۔

"سوری اس سلسلے میں تو مجھے معاف ہی رکھو میں تمہارے حوالے سے مزید کوئی زنجیر پہننے کو تیار نہیں ہوں۔" اس نے دو ٹوک کہا۔

غرض میں نے اس تعلق کو گھسیٹنے کی بہت کوشش کی مگر ڈھائی سال میں ہمارا فیصلہ ہو گیا اس نے مجھ سے خلع لے لی۔ اور کسی عیسائی فرینڈ سے شادی کرلی۔

اس فیصلے کے بعد میں نے آسٹریلیا سے اپنا بزنس وائنڈ اپ کیا اور پاکستان آگیا۔ لامیہ کے ساتھ گزارے ڈھائی سالوں نے مجھے اتنا ٹیز کیا کہ میں نے پھر شادی کا طوق گلے میں نہیں ڈالا۔ لامیہ سے میں نے کچھ سیکھا یا نہیں سیکھا زندگی کو رنگین بنانا ضرور سیکھ لیا اب میری بھی کئی گرل فرینڈز تھیں جو کوئی بھی حد پار کرنے کو کسی بھی وقت تیار رہتی تھیں اور میں کوئی زاہد خشک تو نہیں تھا۔ مگر میں محتاط بہت تھا۔ میری کوئی رنگین داستان میرے گھر تک نہیں پہنچی تھی علینہ اور شاہ زمان، شاہ فرقان سب کی شادیاں ہو چکی تھیں سب اپنی زندگی سے خوش اور مطمئن تھے بس ایک میں ہی تھا بے کل و بے چین۔ پتا نہیں احساس گناہ تھا یا احساس ندامت مگر مجھے کہیں سکون نہیں مل سکا تھا۔

☼ ☼ ☼

اور اپنی شادی کے تقریباً" سات سال بعد میری ملاقات اپنے ماموں زاد کزن حمدان یزدانی سے ہوئی حمدان سے میری زیادہ بنتی نہیں تھی۔ وہ بروکن فیملی کا ممبر تھا ماموں کو عورتیں بدلنے کا خبط تھا۔ جیسے ہماری کلاس میں ہر سال گاڑیوں کے ماڈل، فرنیچر، کرٹنز بدلے جاتے تھے اسی طرح ماموں ہر سال مامی بدل

دیتے تھے۔ ہر سال نیا ماڈل اور حمدان اس ماحول اور اس کلاس سے باغی تھا' وہ شروع سے ہی مڈل کلاس ذہنیت کا مالک تھا۔ اس کے تمام فرینڈز مڈل کلاس سے تعلق رکھتے تھے اپنے حلیے اور اپنی کلاس سے لاپروا۔ مما میرا اس سے میل جول پسند نہیں کرتی تھیں۔ سو میں بھی اس سے ملنے سے گریز کرتا تھا۔ حالانکہ وہ خاصا لونگ اینڈ کیئرنگ بندہ تھا۔ ہماری کلاس کی طرح اس کے ملنے میں اوپری پن نہیں ہوتا تھا گرم جوشی ہوتی تھی مگر کیونکہ مما کو وہ پسند نہیں تھا سو میں بہت مجبوری میں اس سے ملتا تھا۔

وہ شروع سے ماموں کی روش سے خائف تھا سو اس نے تعلیم مکمل کر کے اپنا بزنس الگ سیٹ کر لیا تھا۔ اور اس طرح سے اس سے ملنا بالکل ہی ختم ہو گیا کیونکہ اس نے رہائش بھی ماموں سے الگ اختیار کر لی تھی۔ اس کے رف حلیے کے باوجود لڑکیاں اس کے ارد گرد منڈلایا کرتی تھیں کیونکہ ان کی نظر میں یہ بھی اس کا اسٹائل تھا۔ مگر میں نے کہا نا! کہ وہ شروع سے ہی مڈل کلاس ذہنیت کا تھا اسے نہ ایلیٹ کلاس پسند تھی نہ ہی اس میں موو کرنے والی لڑکیاں۔

بہر حال اس دن شیرٹن میں ایک بزنس ڈیلیگیشن کو سی آف کرتے ہوئے میری اس سے ملاقات ہو گئی وہ اسی گرمجوشی سے ملا۔

"کہاں ہوتے ہو یار! ایک زمانہ ہو گیا تم سے ملے ہوئے۔" وہ فوراً مجھے پہچان گیا حالانکہ ہمیں ملے کافی عرصہ ہو چکا تھا جبکہ میں اس عرصے میں خاصا بدل گیا تھا۔ میں اپنی عمر سے خاصا بڑا دکھائی دینے لگا اور وہ اپنی عمر سے خاصا کم عمر لگ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر مکمل آسودگی اور اطمینان تھا۔

"ہونا کہاں ہے۔ یہیں ہوتا ہوں ہاں تم ماموں کی طرف سے ہجرت کر کے بالکل ہی منظر سے غائب ہو گئے۔" میں نے ہلکے پھلکے انداز میں کہا۔

"تمہارے ماموں کی طرف سے ہجرت کرنا ہی بہتر تھا کیونکہ اگر ان کے جراثیم مجھے چمٹ جاتے تو بہت برا ہو جاتا۔" اس نے زندہ دلی سے قہقہہ لگایا۔

"اب اتنے بھی برے نہیں ہیں میرے ماموں جتنا تم نے انہیں بدنام کر رکھا ہے۔" میں نے اسے چھیڑا۔

"چلو اتنے نہ سہی برے تو ہیں نا' تمہارے ماموں یہ تو تم بھی مان رہے ہو نا۔" اس نے شرارت سے کہا۔

"چلو چھوڑو' اس ذکر کو یہ بتاؤ آج کل کیا کر رہے ہو۔" میں نے موضوع بدلا۔

"کرنا کرانا کیا ہے۔ بزنس' گھر اور بس۔" اس نے سکون سے کہا۔

"تو گویا گھر بسا چکے ہو۔" میں نے خوشدلی سے کہا۔

"گھر تو بسانا ہی تھا۔ ورنہ تمہارے ماموں کی مانند ڈال ڈال منڈلانا شروع کر دیتا۔" اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

"پھر کس سے شادی کی۔ تمہارے اکلوتے پن پر تو کافی فدا تھیں۔" میں نے اسے چھیڑا۔

"ان فدائین میں سے کوئی نہیں۔ تجھے تو پتا ہے مجھے ایلیٹ کلاس لڑکیوں سے چڑ تھی مڈل کلاس ماحول بھاتا تھا۔ سو ایک مڈل کلاس لڑکی سے ہی شادی کی ہے۔" اس نے اپنے بارے میں تفصیل سے بتایا۔

"ماموں مان گئے تھے۔" میں نے اسے کریدا۔

"ناراض تو بہت تھے مگر رشتہ لے گئے تھے کیونکہ مانو کے گھر والے بغیر فیملی کے تو کبھی رشتہ نہیں دیتے ڈیڈ کا خیال تھا کہ میرا بھوت جلد ہی اتر جائے گا مگر اب پانچ سال ہو گئے ابھی تک تو نہیں اترا۔" وہ مزے سے سب کچھ بتاتا چلا گیا۔

"یعنی پانچ سال ہو گئے پھر فیملی کچھ بڑھی یا آج بھی وہیں کھڑے ہو۔" میرے لہجے میں خود بخود یاسیت اتر آئی۔

"فیملی کیوں نہیں بڑھتی میرے یار! چار سال کا ایک بیٹا ہے مہران اور ایک سال کی دو جڑواں بیٹیاں ہیں روما اور اروما۔" اس نے محبت سے کہا۔

"تیرے لہجے سے لگتا ہے تو بڑا آسودہ ہے میرے یار۔" میں نے اسے غور سے دیکھا۔

"ہاں تو مانو میرے لیے خداوند کا عطیہ ہے اس نے نا صرف میرا گھر جنت بنا دیا ہے میرے بچوں کی بہترین پرورش کر رہی ہے بلکہ میرے بزنس میں میرا ساتھ دیتی ہے۔" اس نے آسودہ سے انداز میں کہا۔

"تو بہت لکی ہے میرے یار۔" میں پوری سچائی سے بولا۔

"اس میں کوئی شک نہیں اور تم چل رہے ہو میرے ساتھ مانو کو پتا چلا کہ میرا کوئی رشتہ دار ملا تھا اور میں اسے گھر نہیں لایا تو سخت ناراض ہو گی۔" اس نے میرا ہاتھ محبت سے تھامتے ہوئے کہا۔

"نہیں یار! ابھی اس وقت تو نہیں لیکن ان شاء اللہ جلد ہی ضرور آؤں گا۔" میں نے معذرت کی۔

"چلتے تو اچھا تھا لیکن چلو تمہاری مرضی۔ مگر یہ وعدہ توڑنے والا وعدہ نہیں ہونا چاہیے۔ ورنہ میں فون گھما گھما کر تمہاری زندگی حرام کر دوں گا۔" اس نے مجھے دھمکی دی۔

"نہیں یار ضرور آؤں گا میں خود وہ خوابوں کی جنت دیکھنا چاہوں گا۔" میرے لہجے میں حسرتیں پنہاں تھیں پھر ہم نے ایک دوسرے کو اپنے اپنے وزیٹنگ کارڈز دیئے جن پر ہمارے کانٹیکٹ نمبرز تھے اور ایک دوسرے سے ہاتھ ملا کر اپنی راہ ہو لیے۔

☼ ☼ ☼

اس کے بعد پھر وہی میں تھا اور میری مصروفیات کسے یاد رہنا تھا کہ کوئی حمدان یزدانی ملا تھا اور اس نے اپنے گھر انوائیٹ کیا تھا۔ مگر وہ حمدان یزدانی نہیں ہو سکتا تھا جو مجھے بھولنے دیتا۔ ہفتے میں تین سے چار فون تو ضرور آتے تھے اس کے ایفائے عہد کے لیے اور میں اس کی محبتوں کے آگے شرمندہ ہونے لگا اور پھر میں نے عہد کر لیا کہ اس کے گھر جانا ہی ہے۔

اس کے گھر پہلی بار خالی ہاتھ جاتے ہوئے مجھے عجیب سا لگ رہا تھا سو بچوں کے لیے کھلونے' سوئٹس اور چاکلیٹس لیں کچھ پھل اور ڈرائی فروٹس لیے۔ بھابھی اور حمدان کی شادی کے لیے تحفے کے طور پر ایک خوبصورت سا کرسٹل کا شوپیس لیا۔ اور اس کے گھر چلا آیا جانے سے پہلے میں نے حمدان کو فون پر اطلاع کر دی۔

اس کا گھر ڈیفنس کے خوبصورت ترین گھروں میں سے تھا۔ لان سے لے کر گھر کے اندر تک ایک ایک چیز صاف ستھری اور اپنی جگہ پر نگینے کی مانند فٹ تھی۔ جو کہ صاحب خانہ کے ذوق کا پتا دیتی تھی۔ سامنے ہی کارنس پر فریم شدہ املتاس کی پھلی اس کے پتوں کی ایک شاخ اور زرد پھول خشک ہوئے رکھے تھے پتا نہیں کیوں اس فریم نے مجھے چونکا سا دیا مگر میں نے اسے زیادہ اہمیت نہیں دی حمدان گرم جوشی سے میرا ہاتھ تھامے مجھے لاؤنج میں لے آیا۔

"تم کوئی غیر تھوڑی ہو جو تمہیں ڈرائنگ روم کی سجاوٹیں دکھانے کو بٹھا دوں۔" اس نے محبت سے کہا۔

"ارے بھئی مانو کہاں ہو تم سب جلدی آؤ دیکھو میرا یار آگیا ہے۔" اس نے وہیں میرے برابر میں بیٹھے بیٹھے آواز دی۔

تبھی اندرونی کمرے سے وہ نکل کر آئی ایک بچی اسٹرالر میں لیٹی تھی ایک اس کی گود میں تھی اور بچہ اور وہ خود اسٹرالر کو دھکیلتے ہوئے باہر لا رہے تھے وہ اب بھی سات سال پہلے ہی جیسی تھی بلکہ مزید حسین ہو گئی تھی وہی سادہ سا انداز جو کیمپس میں ہوتا تھا وہی باوقار انداز' نپے تلے قدم۔ میرے سامنے آکر اس نے اسی باوقار انداز میں مجھے سلام کیا۔

"میٹ مائی وائف یمنیٰ حمدان۔" اس نے تعارف کا مرحلہ طے کیا۔

"اور مانو یہ ہیں میرے پھپھی زاد شاہ میر۔" اس نے میرا تعارف کروایا اور میں جیسے کسی خواب کی کیفیت سے ہوش میں آگیا۔

"آئی ایم گلیڈ ٹو میٹ یو۔" میں نے خوشدلی سے کہا۔

"سیم ہیئر۔" اس نے عام سے لہجے میں کہا اور مجھے کیمپس میں اس کے ساتھ پہلی ملاقات یاد آگئی۔

"حمدان تم نے تو ان کا نام مانو بتایا تھا۔" میں نے اسے بھابھی کہنے سے گریز کیا۔

"ہاں تو مانو تو میں اسے کہتا ہوں یہ مجھے بلی جیسی جو لگتی ہے۔" حمدان کے لہجے میں محبت ہی محبت تھی اور وہ ہولے سے مسکرادی۔

"بچوں کو کون سنبھالتا ہے؟" میں نے یونہی سوال کیا۔

"گھر، بچوں اور مجھے سب کو مانو ہی دیکھتی اور سنبھالتی ہے۔" اس نے مزے سے کہا۔

"بڑی ہمہ جہت شخصیت ہے۔ مانو کی اس نے ایم بی اے کیا ہے۔ بزنس میں مجھے دیئے گئے اس کے مشورے بڑے صائب ہوتے ہیں۔ اور بھئی مانو کیا شاہ میر یونہی سوکھا منہ لیے بیٹھا رہے گا بھئی کوئی ٹھنڈا ونڈا لاؤ۔" اس نے بیوی کو بڑے پیار سے دیکھا۔

"مجھے ٹھنڈے بر تر خانے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں اب رات تک تمہیں جانے والا۔" میں نے بے تکلفی سے کہا۔

"میں بھی تجھے ڈنر تک نہیں چھوڑنے والا۔ آخر میری بیوی نے سارا دن کچن میں کھپایا ہے اس کی کچھ محنت تو وصول ہو۔" اس نے اطمینان سے کہا۔

اس کے بعد ہم باتوں میں مصروف ہوگئے یمنی کچھ دیر ہمارے ساتھ بیٹھی رہی پھر وہ اٹھ کر کچن کے انتظام دیکھنے لگی شام کی چائے بھی خاصی پرتکلف تھی کیک، کباب، ایگ رول، سموسے، کٹلس سب میں اس کے ہاتھوں کی مہارت اور ذائقہ تھا۔

"یار! یہ مانو تمہیں ملی کہاں۔" میں نے تجسس سے کہا۔

"یہ میری ماما کے جاننے والوں میں سے ہے اور مجھے اس سے پہلے نظر کی محبت ہوئی تھی اور گنوں نے عشق میں مبتلا کردیا۔" وہ بڑے فرینکلی انداز میں سب بتاتا جارہا تھا۔ اس کی ماما اور ماموں کی پہلی بیوی کا تعلق مڈل کلاس سے تھا وہ ان سے اب بھی ملتا تھا۔

"تیری تو وہ پہلی محبت ہیں اور تو ان کی۔" میں نے جملہ ادھورا چھوڑا۔

"نہیں میں اس کی پہلی محبت نہیں ہوں اس کی زندگی میں محبت سے پہلے کوئی عقل اور آنکھ کا اندھا تھا جس نے اس ہیرے کو گنوا دیا مگر میں اس بے وقوف کا شکر گزار ہوں کہ اس کی بے وفائی نے میری منزل روشن کردی۔" اس نے آرام سے کہا اور میں نے پہلو بدلا۔

"تو کیسا انسان ہے تجھے اس سے جیلسی نہیں ہوئی۔" میں نے اسے حیرت سے دیکھا۔

"نہیں مجھے اس ان دیکھے رقیب پر پیار آتا ہے۔" وہ ہنس دیا پھر بولا۔

"ابے یار! کیا بے کار ٹاپک نکال کر بیٹھا ہے۔ جو نہیں ہوا اس کے دکھ میں مبتلا رہنے کے بجائے جو ہوا اس پر شکر گزار کیوں نہ ہوں۔" اس کا اطمینان قابل دید تھا۔

پھر ہمارے درمیان ہلکی پھلکی باتیں چلتی رہیں ڈنر پر بھی خاصا اہتمام تھا اور ہر چیز یمنی کے ہاتھ کی مہارت اور ذائقے کا منہ بولتا شاہکار تھی۔ ڈنر کے بعد میں گھر آ گیا مگر اپنا سکون اسی گھر میں چھوڑ آیا۔

☼ ☼ ☼

اب میں اکثر ہی حمدان کے گھر چلا جاتا تھا اور ایسا ہفتے میں ایک بار ضرور ہوتا تھا۔ پتا نہیں کیوں یمنی کو دوبارہ دیکھ کر اور اس کا پرسکون گھر دیکھ کر میرے اندر یہ کمینی سی خواہش جنم لینے لگی تھی کہ وہ کسی طرح سے دوبارہ میری زندگی میں شامل ہو جائے اور اس بات کو تقویت اس املتاس کی سوکھی پھلی پتوں اور پھولوں کے فریم نے دی تھی جو اس دن اس نے میرے پیروں کے پاس سے اٹھائے تھے اور آج تک انہیں دل سے لگا کر رکھا ہوا تھا گویا وہ مجھ سے اب بھی محبت کرتی تھی۔

مگر ہر بار ہی ایسا ہوتا کہ میں جب میں اس کے گھر جاتا وہاں حمدان موجود ہوتا تھا۔ اور ایک دن تو میں جھنجھلا سا گیا۔

"تو آفس بھی جاتا ہے یا ہر وقت گھر پر ہی رہتا ہے۔ اور اپنا بزنس ٹھیکے پر دے رکھا ہے۔" میں نے چڑ کر کہا تو وہ ہنسا دو پھر ہنستا ہی چلا گیا۔

"جن کا گھر میرے گھر کی طرح پرسکون ہو ان کا دل پھر گھر میں ہی لگتا ہے۔ میں نائن ٹو فائیو ہی اپنی بزنس میٹنگز بھی نبٹا لیتا ہوں بزنس پارٹیز کو عموماً" میں اوائڈ کرتا ہوں۔ فیملی فنکشنز میں عموماً" ہم ساتھ ہی ہوتے ہیں۔ جتنا ہے ہمارے لیے کافی ہے۔ زیادہ کی ہوس نہیں ہے ہمیں۔" اس نے یمنی کو تائیدی انداز میں دیکھا اور وہ بھی سرہلا کر مسکرادی۔

"آپ تھکتی نہیں ہیں گھر، بچے، شوہر اور گھر داری، ان تمام ذمے داریوں کے باوجود آپ ہمیشہ کھلی کھلی رہتی ہیں فریش اور خوشگوار موڈ میں۔" میں نے ستائشی نظروں سے اسے دیکھا۔

"ایک آئیڈیل عورت کی زندگی میرے نزدیک گھر، بچوں اور اس کے شوہر کے گرد گھومتی ہے اور وہ ذمے داریاں جنہیں بوجھ نہ سمجھا جائے تھکن میں مبتلا نہیں کرتیں۔ مسرور کردیتی ہیں تازگی اتار دیتی ہیں روح کو شانت کردیتی ہیں۔" اس نے مسکرا کر کہا اور میری بے کلی سوا ہو گئی۔ اور میری اس سے تنہائی میں ملنے کی خواہش مزید زور پکڑ گئی مجھے اپنے گھر کی تنہائی اور خالی پن کاٹنے لگا میری سوچیں اس کے تصورات سے آباد رہنے لگیں میرا دل اس کے وجود سے اپنے گھر کی تنہائیوں کو دور کرنے کے لیے مچلنے لگا۔

☼ ☼ ☼
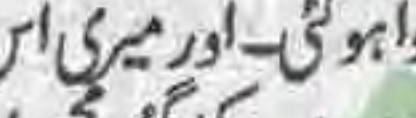
وہ بھی ایک ورکنگ ڈے تھا۔ میں اس دن آفس جانے کے بجائے حمدان کے گھر چلا گیا میری توقع کے عین مطابق حمدان آفس میں تھا۔ مہران اسکول میں تھا اور دونوں بیٹیاں سو رہی تھیں اور وہ حسب معمول ملازمہ کے ساتھ گھر کے کام نبٹا رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر اس کے چہرے سے ناگواری ظاہر ہوئی مگر اس نے کمال مہارت سے اسے چھپالیا اور مجھے بٹھا کر اس نے اورنج جوس نکال کر دیا اور حسب معمول کاموں میں مصروف ہو گئی مجھے بوریت ہونے لگی کچھ دیر بعد وہ کاموں سے فارغ ہو کر آ کر میرے سامنے بیٹھ گئی۔

"اور سنائیے شاہ میر! کیسے آنا ہوا اس وقت تو حمدان آفس میں ہوتے ہیں کوئی کام تھا ان سے؟" اور ایک ہی سانس میں کئی سوال کرتی چلی گئی۔

"اگر میں کہوں کہ میں حمدان سے نہیں تم سے ملنے آیا ہوں یمنی تو۔" میں نے اس کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

"تو میں کہوں گی کہ آپ میں اور مجھ میں نہ اتنی بات چیت ہے اور نہ ہی ایسی بے تکلفی کہ اس کو حوالہ بنا کر آپ مجھ سے ملنے چلے آئیں۔" اس نے روکھے لہجے میں کہا۔

"ماضی میں تو رہ چکی ہے۔" میں نے ڈھیٹ پنے سے کہا۔

"میں تکلیف دہ ماضی کو اپنی یادوں سے نکال دینا پسند کرتی ہوں۔ اور ماشاء اللہ جن کے حال اتنے خوبصورت ہوں تو کیوں ماضی کے ناسور، سڑی ہوئی اور بدبودار یادوں کو کلیجے سے لگا کر رکھیں۔" اس نے دو ٹوک کہا۔

"تو تمہارے دل میں ماضی کی کوئی خلش نہیں۔" میں نے طنزیہ پوچھا۔

"قطعی نہیں۔" اس نے قطعیت سے کہا۔

"تو پھر وہ کیا ہے۔" میں نے فریم شدہ املتاس کی پھلی وغیرہ کی طرف اشارہ کیا۔

"اس محبت کی یادگار کو کیوں سینے سے لگائے بیٹھی ہو۔" میرے لہجے کا طنز گہرا ہو گیا۔

"اوہ! تو مسٹر شاہ میر آپ اس کی وجہ سے غلط فہمی کا شکار ہوگئے۔" وہ استہزائیہ ہنسی۔

"پوری زندگی میں ایک یہی تو زاد راہ کمایا ہے میں نے اس املتاس کی پھلی نے بعد کی میری منزل آسان کردی روشن کردی میری راہ گزر میں نے جان لیا کہ مرد صرف رشتوں سے محبت کرتا ہے۔ عورت سے نہیں عورت ہمیشہ سے اس کے لیے دل بہلانے والا کھلونا رہی ہے اور یوں میں نے ایسی روشن، پائیدار اور قابل فخر منزل کو پالیا۔" وہ بڑے اطمینان سے میری غلط فہمی دور کررہی تھی۔

"گویا تمہیں مجھ سے اب محبت نہیں رہی۔" میں

نے شکستگی سے پوچھا۔
"محبت اب نہیں رہی سے کیا مراد ہے آپ کی۔ محبت تو اس وقت بھی نہیں تھی آپ سے مجھے' ہاں پسند کرتی تھی میں آپ کو اور اس میں بھی آپ کی کوششوں کا عمل دخل زیادہ تھا۔ کیونکہ بیٹ جیتنی تھی نا! آپ کو اپنی فیاسی سے۔" اس نے طنزیہ کہا۔
"تو گویا میں تمہاری زندگی میں اب کہیں نہیں ہوں۔" میں نے بے بسی سے کہا۔
"ہاں کہیں نہیں بلکہ سات سال پہلے بھی تین مہینوں کے لیے آپ میری زندگی میں زبردستی داخل ہوئے تھے۔ ہاں میں آپ کی بے وفائی کے لیے ضرور آپ کی شکر گزار ہوں کہ اس کی وجہ سے مجھے حمدان جیسے باوفا رفیق سفر' مکمل' متناسب شخصیت و کردار کے حامل انسان کا ساتھ ان کا جنت جیسا گھر اور فرشتوں کی طرح معصوم بچوں کا ساتھ ملا۔" وہ مکمل اعتماد سے کہہ رہی تھی۔
"مگر میں اب بھی تم سے محبت کرتا ہوں۔ اور تمہیں پانے کی خواہش رکھتا ہوں۔" میں نے آخری کوشش کی اور اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔
"مائنڈ اٹ! آپ اس وقت بھی مجھ سے محبت نہیں کرتے تھے میں آپ کی بیٹ تھی بس۔ اور دوسری بات میں ایک مکمل مشرقی عورت ہوں مڈل کلاس ذہنیت کی حامل۔ میں اگر یہاں خوش نہیں ہوتی تنگی اور ظلم و ستم کا شکار ہوتی تب بھی اپنے شوہر کی باوفا ہوتی یہاں تو میں خوشیوں کے ہنڈولے میں جھول رہی ہوں پھر میرے دماغ میں کوئی کیڑا کلبلایا ہے جو میں ایسی شاندار زندگی کو ٹھوکر مار کر آپ جیسے فریبی کے بارے میں سوچوں۔ اور یوں بھی یہ پرابلم آپ کی کلاس کی ہے کہ بیویاں اچھی بھلی ازواجی زندگیاں چھوڑ کر سراب کے پیچھے بھاگتی ہیں ہماری نہیں۔ ہم نے جس سے وفا نبھانے کا عہد کرلیا۔ اب اچھی گزرے یا بری گزرے ہمارا نصیب ہمارے فیصلے اٹل ہوتے ہیں۔" اس کے لہجے میں قطعیت تھی۔
پھر میں وہاں رکا نہیں۔ اس نے ٹھیک ٹھاک مجھے آئینہ دکھا دیا تھا۔ میری خوش فہمیوں کے پرخچے اڑا دیئے تھے میں بلا سبب و بلا مقصد ہی سڑکوں پر گاڑی دوڑاتا رہا اور اسی دوران ایک کمینی سی سوچ نے میرے اندر سر ابھارا کہ حمدان کو یہ تو معلوم ہے کہ اس کی زندگی میں کوئی تھا اگر میں اسے یہ بتا دوں کہ وہ میں تھا کچھ جھوٹ و سچ کی آمیزش سے اس داستان کو رنگین بنا دوں تو۔ اگر خوش میں نہیں تو وہ کیوں رہے۔ کیونکہ اب میری نظر میں میری خوشیوں کی حقیقی قاتل وہی تھی لامیہ نے اسی کا ایشو اٹھا کر گھر برباد کیا تھا۔ اس وقت مجھے اپنے گناہ یاد نہیں تھے کہ میں نے کس طرح اس کی معصومیت اور بھولپن کا ناجائز فائدہ اٹھا کر اسے دھوکا دیا تھا اور لامیہ جو بعد میں اس کو ایشو بنائے بیٹھی تھی اس کی پروقار اور ہر دلعزیز شخصیت سے خائف ہو کر بیٹ لگا بیٹھی تھی۔ آج مجھے وہ ہر حالت میں اپنے گھر میں چاہیے تھی جسے میں نے کل ٹھکرا دیا تھا۔ جو کل تک غلط کو غلط اور صحیح کو صحیح سمجھتا تھا اور اپنے غلط کرنے پر نادم تھا آج اپنی خواہش کے آگے اتنا بے بس ہو چکا تھا کہ اسے پانے کے لیے ہر جائز و ناجائز کو درست سمجھ رہا تھا اور حمدان جیسے مخلص بندے کو دھوکا دینے سے نہیں چوک رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

دن کے تین بجے میں حمدان کے آفس میں موجود تھا۔ وہ بڑے مصروف سے انداز میں کافی کے گھونٹ کے ساتھ سینڈوچز کے بڑے بڑے بائٹ لے رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر بڑی خوش دلی سے بولا۔
"کیسے آنا ہوا یار! خیریت تو ہے۔؟" اور ساتھ ہی میرے لیے کافی اور سینڈوچز کا آرڈر کر دیا۔
"بس یہاں سے گزر رہا تھا سوچا تم سے ملتا چلوں۔" میں نے حتی الامکان لہجے کو سرسری بنایا۔
"بڑی بات ہے یار! تم جیسے مصروف لوگ فارغ لوگوں کے لیے وقت نکالیں۔" اس نے محبت سے کہا۔
"تمہاری محبت شرمندہ کر دیتی ہے۔ آج کے دور

میں نایاب ہیں تم جیسے لوگ۔" میں نے حقیقت بیان کی۔
"نہیں یار! میں تو بہت روڈ بندہ تھا یہ سب مانو کی محبت کا اعجاز ہے وہ میرے لیے آسمانی تحفہ ہے اس کی رفاقت اور محبت شاد کر دیتی ہے۔ شانت کر دیتی ہے، روح کو تازگی بخش دیتی ہے اسے سیراب کر دیتی ہے وہ امرت سے لبریز پیالہ ہے پینے والے کو امر کر دیتا ہے۔" وہ جذب کے عالم میں بولتا چلا گیا اور میری کنپٹیوں کی رگیں پھٹنے لگیں خون جسم میں ٹھوکریں مارنے لگا۔ اور میرا لہجہ اچانک بدل سا گیا۔
"تمہیں پتا ہے وہ کون شخص تھا جو مانو کی زندگی میں تھا۔" میں نے عجیب سے بھاری لہجے میں کہا اور حمدان نے مڑ کر مجھے عجیب نظروں سے دیکھا۔
"نہیں پتا اور نہ میں نے جاننے کی کوشش کی کیونکہ مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ وہ کون شخص تھا۔ مگر اب کچھ کچھ اندازہ ہونے لگا ہے۔ مگر میں چاہتا ہوں کہ وہ شخص اپنا بھرم قائم رکھے کیونکہ مجھے اپنی بیوی پر اندھا یقین ہے کہ وہ کبھی کچھ غلط کر ہی نہیں سکتی اور اگر اس کی زندگی میں کچھ بھی غلط ہو چکا ہوتا تو وہ زندہ نہیں ہوتی وہ بہت سچی اور کھری ہے۔" وہ بغیر رکے بولتا چلا گیا اور میرا چہرہ شرمندگی سے سرخ ہو گیا اور پیشانی پر ننھے ننھے قطرے ابھر آئے تبھی حمدان نے مجھے دیکھا۔
"ارے! تمہیں کیا ہوا شاہ میر تم کیوں اتنا فیل کر رہے ہو یہ تمہاری بات تھوڑی ہے۔ یہ تو اس شخص کی بات ہے۔ جو کبھی مانو کی زندگی میں تھا۔" حمدان نے ہلکے پھلکے انداز میں کہا۔
"ہاں یہ میری بات تھوڑی ہے اچھا میں پھر چلتا ہوں پھر ملیں گے۔" میں اپنے بھرم کو سنبھال کر اٹھ کھڑا ہوا اسی عہد کے ساتھ کہ اب ان دونوں سے کبھی نہیں ملنا ہے کہ اپنی ذات کا بھرم بھی تو رکھنا تھا کیونکہ اتنا میں بھی جان چکا تھا کہ میرے بے قرار انداز میں اس کے گھر کے چکر اور یمنی کے بارے میں بار بار کریدنا میرا بھید کھول چکا ہے۔

☼ ☼ ☼

یہاں سے کہانی مزید بھی آگے بڑھ سکتی تھی چوٹ کھایا ہوا انسان کچھ بھی کر سکتا ہے اور غلط فہمیاں پیدا کرنا کون سا مشکل کام ہے مگر یہاں بہت سی باتیں میرے ذہن میں گونج کر رہ گئیں۔ جیسے کہ جیسے اعمال ویسے فرشتے اور نیک عورت کے لیے نیک مرد وغیرہ۔
میں جس قسم کا مرد تھا مجھے لامیہ جیسی عورت ہی سوٹ کرتی تھی۔ جب میں نے دل اور گھر بسانے والی عورت کو دھتکار دیا تھا۔ تو میرا دل اور گھر کیسے بسا رہتا۔ ایسی پاک باز' باوفا اور باکردار عورتیں حمدان جیسے سچے کھرے اور کیچڑ میں کنول کی مانند رہنے والے شخص کا ہی نصیب ہوتی ہیں میرا نہیں۔ سو میں نے اس راستے کو چھوڑ دیا جو کہ ان کی راہ کھوٹی کر سکتا تھا کیا خیال ہے آپ کا۔ میں نے ٹھیک کیا نا۔

☼ ☼

نازیہ جمال

بہاراں تم سے

ناولٹ

"دو مک ہا... کیا بھلے دن ہوتے ہیں جاڑے کے'
...م گرم لحاف میں بیٹھ کر آگ تاپتے ہوئے خشک میوہ
...ت پہ ہاتھ صاف کرتے ہوئے موسم سے لطف اٹھایا
...سکتا ہے۔ مگر موئی یہ گرمی' جان عذاب میں آگئی ہے
...ھا جھل جھل کر ہاتھ ٹوٹنے کو آگئے ہیں' مگر نگوڑ مارا
...ینہ ہے کہ بہے چلا جا رہا ہے۔" ململ کے پھول دار
...کرتے کو پیچھے سے اٹھا کر کندھے پہ ڈالے' ایک ہاتھ
...سے پنکھا جھلتے اور دوسرے ہاتھ سے بدن سے چپکی
...یص کا گریبان پکڑ کر جھٹکتے ہوئے دادی نے ایک سرد
...اہ بھرتے ہوئے گرم حبس بھرے ماحول کے ٹمپریچر کو
...یک طرح سے کم کرنے کی کوشش کی تھی۔

"واہ دادی! بیان بدلنے میں تو آپ نے پاکستان کے
...یڈروں کو بھی مات دے دی ہے۔ ابھی اسی سال کے
...دسمبر میں سردی سے کپکپاتے ہوئے آپ نے گرمیوں
کے فضائل و خواص پہ مقدور بھر روشنی ڈالتے ہوئے
سردیوں کی چیدہ چیدہ خامیاں گنوائی تھیں۔ دمہ بڑھنے
کی شکایت' گھٹنوں کا درد' نزلہ و زکام' اور بھی بہت سی
بیماریاں ہیں جنہیں آپ سرما کی سزائیں کہا کرتی
ہیں۔" چارپائی سے اٹھ کر عاتکہ نے مسکراتے ہوئے
مغربی جانب کی تینوں کھڑکیاں کھول دیں۔ سیدھی قطار
میں بنے تین کمرے' ان کے آگے برآمدہ' سامنے
فرنٹ میں بڑا سا کچا صحن جو دادی نے دادا کی وفات کے
بعد ملنے والی پینشن سے اپنے زیر نگرانی تعمیر کروائے
تھے۔

مغرب کی جانب آدھی کینال جتنی جگہ بچ گئی
تھی۔ جسے دادی کے ذوق تسکین نے ایک سرسبز و
شاداب باغ کی شکل دے دی تھی۔ قطار در قطار کینو'
انار اور امرود کے درختوں پر موسم میں خوب پھل لگتے
تھے۔ جنہیں درختوں سے اتارنے کے بعد دادی
عزیز و اقارب کے ہاں تحفتاً" بھجواتی رہتیں۔ لمبی لمبی
کیاریوں میں اگے گلاب کے علاوہ پودینہ اور نازبو کے
پودے سارا سال چھب دکھلاتے۔ دادی کے کمرے
کی دیوار میں نصب لوہے کی راڈوں پہ چڑھی عشق
پیچاں کی بیل نے دیکھتے ہی دیکھتے کمرے کے بیرونی حصے
کو سبزے سے ڈھک دیا تھا۔ عاتکہ کو اپنے گھر کا یہ
گوشہ سب سے زیادہ پسند تھا۔ صرف عاتکہ پہ ہی کیا
موقوف' بصرہ ــــ اور فارحہ کا دل بھی باغ میں لگے
رس بھرے پھلوں میں اٹکا رہتا۔ لیکن یہ پھل صرف
اس وقت ان کی دسترس میں آتے جب مکمل پک کر
ایک ساتھ اترتے تو دادی انہیں حسب منشا کھانے کو
دیتیں' ورنہ تو کیا مجال کہ کوئی بچہ درختوں کے قریب
بھٹک بھی جائے۔

چوری کے بیر میٹھے ہوتے ہیں کے مصداق جو مزا
دادی کی نظروں سے بچ بچا کر' درختوں سے خود توڑ کر
پھل کھانے میں ہے وہ دادی کے عطا کردہ پھلوں میں
کہاں۔ قسمت جب ساتھ دینے پہ آتی تو دادی کے
سونے اور ڈاکٹر کے پاس جانے کے اوقات کے دوران
وہ اپنی خواہش کو عملی جامہ پہنا ہی لیتے۔ لیکن یہ خوش
قسمتی اس وقت بدقسمتی میں بدل جاتی' جب دادی کو
ایسی واردات کا علم ہو جاتا تو پہلے خود خوب گوشمالی
کرتیں' پھر اقبال کے سامنے بھی کلاس لے ڈالتی
تھیں۔

"اقبال! سمجھا لو اپنے بچوں کو ورنہ ان لاتوں کے
بھوتوں سے نبٹنا خوب جانتی ہوں۔" سخت لہجے میں
خوب دھمکایا جاتا۔ اقبال ماں کی تشفی کے لیے' بچوں کو
حتی المقدور شرارت سے باز رکھنے کی کوشش کرتے'
لیکن وہ کہاں کسی ڈانٹ ڈپٹ کو خاطر میں لانے والے
تھے۔ دو' چار دن صبر کرنے کے بعد پھر وہ ہی چوری کا
سلسلہ شروع ہو جاتا۔ تبھی تو دادی نے باغ کے قریب
والا کمرہ اپنے لیے منتخب کیا تھا اور اس میں بڑی بڑی
چوبی کھڑکیاں بھی رکھوائی تھیں۔ تاکہ اپنے ہاتھوں
سے سینچے گئے بوٹوں کو اپنی نظروں کے سامنے بڑھتا
پھولتا دیکھ سکیں۔

لیکن عاتکہ کا معاملہ تمام بہن بھائیوں سے مختلف
تھا' اسے باغ صرف اس لیے پسند تھا کیونکہ یہاں بیٹھ
کر مکمل یکسوئی سے اپنے اسکول کا کام کیا کرتی' لیکن یہ
کوئی نہیں جانتا تھا کہ گلابوں کے کنج میں' لمبی گھاس کی
اوٹ میں سب گھر والوں کی نظر سے چھپ کر وہ اپنے
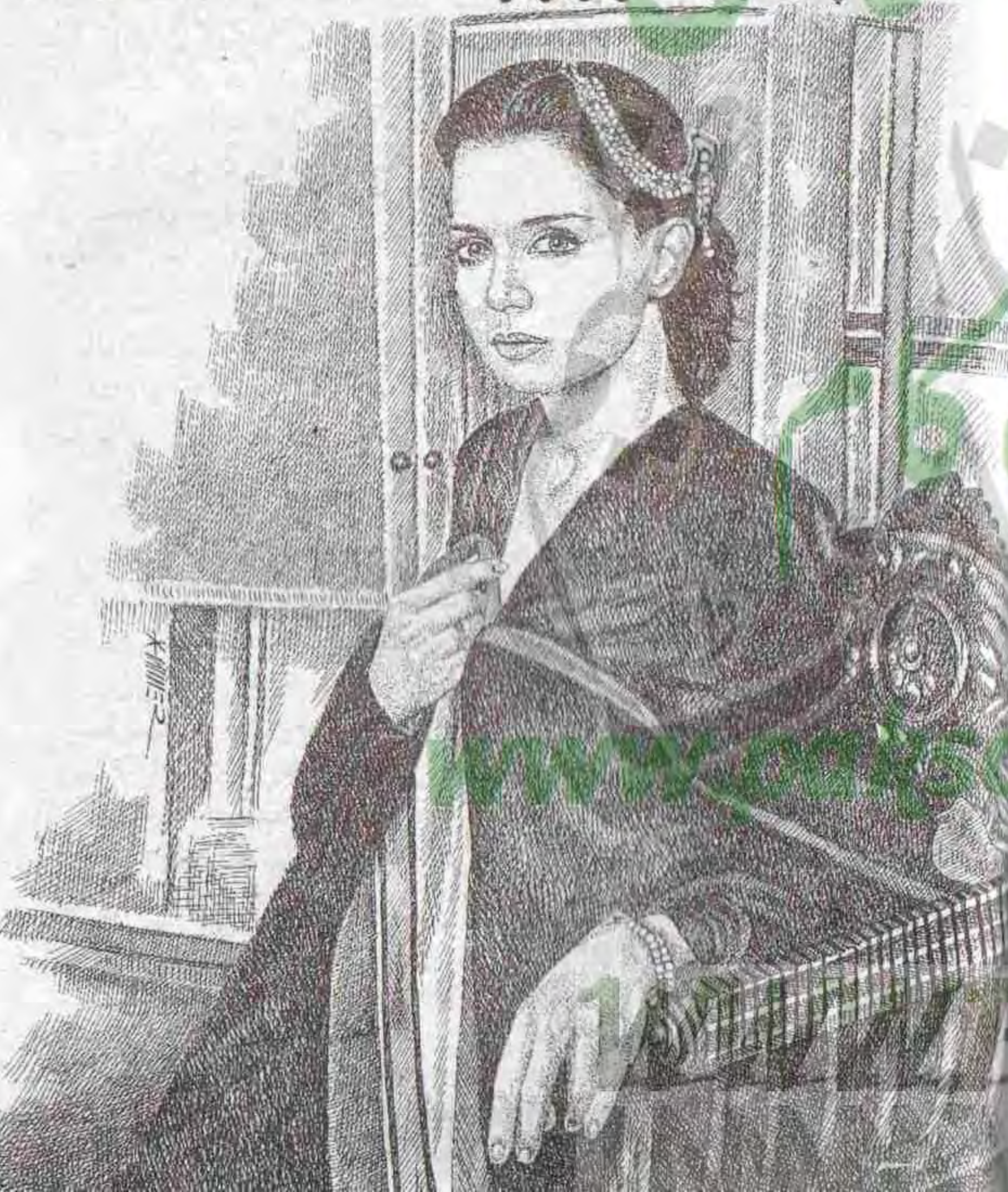
من پسند ڈائجسٹ پڑھا کرتی تھی، جو وہ کلاس میں اپنی دوستوں سے مانگ کر انتہائی احتیاط اور خفیہ طریقے سے بستے میں رکھ کر گھر لے آتی تھی۔ ماں اور دادی کی رسائل و جرائد سے ناپسندیدگی کے پیش نظر اسے صرف باغ ہی ایسا گوشہ نظر آتا جہاں وہ تسلی سے رسالوں کا مطالعہ کرتی۔

آج بھی وہ اپنی دوست ثمرین سے رسالہ مستعار لے آئی تھی۔ ثمرین نے اسے پڑھنے کے لیے صرف دو دن دیے تھے۔ پرسوں اس کا ٹیسٹ تھا، جس کی اس نے کل تیاری کرنی تھی۔ سوچا آج رسالہ پڑھ کر تیاری ذرا دل لگا کر اور تسلی سے کروں گی۔ گرمیوں کی لمبی دوپہروں میں جب سارے گھر والے قیلولہ کر رہے ہوتے تو وہ اپنا شوق باغ میں بیٹھ کر پورا کرتی۔ سخت بے چینی سے وہ دادی کے سونے کی منتظر تھی، لیکن بجلی نہ ہونے کے سبب ان کی آنکھوں کا لگنا مشکل تھا۔ کھڑکیاں کھلنے سے پھولوں کی بھینی بھینی خوشبو اور پھلوں کی رس بھری کھٹاس کی مہک اندر کمرے میں در آئی تھی۔ جس سے ماحول کی تپش میں واضح طور پر کمی آگئی تھی۔

"سچ کہتی ہو کیا گرمی، کیا سردی، بس انسان ہی بے صبرا اور ناشکرا ہے تو ادھر آ میرے گرمی دانے تو مار دے کم بخت یوں جلن دیتے ہیں جیسے بدن پہ آگ سی لگ گئی ہو۔" دستی پنکھے کے ڈنڈے سے برہنہ پشت کو کھجاتے ہوئے دادی نے بے زاری سے کہا تو وہ کھڑکی چھوڑ کر ان کی چارپائی پہ آگئی دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کو ریگ مال مارنے کی شکل میں ان کی پشت پہ چلانے لگی۔ نرم، سفید ڈھلکی ہوئی جلد پہ سرخ سرخ گرمی دانے اسے ایک دم سے خوب صورت لگنے لگے تھے۔

"صرف انگلیاں پھیرنے سے یہ جان نہیں چھوڑیں گے۔ اچھی طرح ناخن سے کھرچ۔" دادی اس کی کارکردگی سے مطمئن نہ ہوئیں۔

"ارے دادی! میرے ناخن ہیں کہاں، انچ بھر بڑھتے نہیں کہ امی کٹوا دیتی ہیں۔" دادی کی بات پہ اس لمحہ بھر کو ہاتھ روک کر غور سے اپنے ناخنوں کو دیکھا پوروں سے بھی پیچھے تراشے ہوئے ناخن اسے یوں لگے جیسے خوب صورت لمبے سرو کے درخت کو ٹنڈ منڈ کر دیا گیا ہو۔

"مائی گاڈ! عاتکہ... تمہارے ہاتھ کتنے نرم اور خوب صورت ہیں۔ تم نیلز کیوں نہیں بڑھاتیں۔"

ثمرین نے ایک دن اس کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھ میں لے کر انتہائی رشک سے کہا تھا۔ اس کی ساری کلاس فیلوز کے ناخن لمبے لمبے اور مختلف کلرز کی نیل پالشوں سے سجے ہوتے تھے تو ایسے میں اس کا جی بھی چاہتا کہ بہت لمبے نہ سہی کم از کم پوروں سے آگے تھوڑا سا وہ اپنے ناخنوں کو نکلنے دے۔ ثمرین کی بات سن کر اس نے اس ہفتے ناخن نہ کاٹنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ لیکن اس کی کوئی اور خواہش آسانی سے پوری ہوئی تھی جو یہ پوری ہو جاتی۔ آٹا گوندھتے ہوئے رضوانہ کی نظر اس کے ہاتھوں پہ پڑ گئی اور فوراً" اس کی گوشمالی کر ڈالی۔

"یہ اتنے لمبے ناخن کس خوشی میں بڑھا رکھے ہیں۔ سب جانتی ہوں یہ فیشن کا فتور جو تمہارے دماغ میں گھسا ہوا ہے۔ کبھی تم ناخن بڑھا رہی ہو تو کبھی کپڑے تمہیں اپنی جسامت سے کھلے اور قد سے لمبے لگنا شروع ہو جاتے ہیں۔" رضوانہ کا لہجہ اتنا کڑا تھا کہ وہ دل ہی دل میں سوچنے لگی کہ نجانے اس سے ایسا کون سا گناہ سرزد ہوا ہے جو امی اتنا سخت نوٹس لے رہی ہیں۔ بھلا ناخن بڑھانے کو فیشن کے زمرے میں کیسے لایا جا سکتا ہے۔

فیشن تو میری کلاس فیلوز کرتی ہیں۔ بالوں میں خوب صورت رنگ برنگے کیچرز، پونیاں اور ربڑ بینڈز لگا کر مختلف ہیر اسٹائل بنا کر اسکول آتیں، جب کہ اسے امی صرف بلیک رنگ کی سادہ سی پونی لا کر دیتی تھیں۔ جو اس نے سیدھی چٹیا بنا کر بالوں کے سرے پہ لگائی ہوتی تھی۔ کلاس کی ساری لڑکیاں اس کے لمبے سیاہ بالوں کی چوٹی اپنے ہاتھ میں لے کر رشک و حسد کا اظہار کیا کرتیں۔

"عاتکہ ایمان سے تیرے تو بال رات ٹی وی پہ شیمپو

کے ایڈ میں آنے والی ماڈل جیسے ہیں۔ اگر اللہ مجھے ایسی نعمت دیتا تو تیری طرح دوپٹے کے بکل میں چھپا کر اس کی ناقدری نہ کرتی۔" کسی کو اس کے ڈھیلے ڈھالے یونی فارم کو دیکھ کر حیرت اور کسی کو افسوس ہوتا۔

"کمال ہے اتنی غضب کی اسمارٹنس ہونے کے باوجود تو ایسے ملنگوں کی طرح لمبے اور کھلے چولے پہنے رہتی ہے۔ سچ ہے خدا حسن بھی ان کو دیتا ہے جنہیں اپنی اس خوب صورتی کا ادراک تک نہیں ہوتا۔" لڑکیوں کے تبصرے سن کر وہ خوش ہونے کی بجائے ایک نامعلوم سے احساس شرمندگی میں گھر جاتی تھی۔ اب وہ انہیں کیا بتاتی کہ اس کی دادی اور امی نے اس کی تربیت و کردار کے متعلق کیسے کڑے اصول وضع کر رکھے ہیں۔ جس میں ذرا برابر بھی لچک کا امکان اسے نظر نہ آتا تھا۔ خود عمل کرنا تو دور کی بات وہ اگر بھولے سے بھی ان لڑکیوں کا تذکرہ گھر میں کر بیٹھتی تو دادی فوراً" اس کے لتے لے ڈالتیں۔

"دفعان دور، ایسی بے دین اور بے راہ رو لڑکیوں سے میل جول رکھنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ یہ چالاک اور پھاپھا کٹنی لڑکیاں ماں باپ کی تربیت پہ ایک دھبا ہوتی ہیں۔"

ایک بار عید کے موقع پر ثمرین، اقرا اور اس کے گروپ کی چند لڑکیاں عید ملنے اس کے گھر آگئیں۔ ان کے زرق برق کپڑے، تیز میک اپ، اور شوخ و شنگ باتوں و قہقہوں نے دادی کو پیچ و تاب کھانے پہ مجبور کر دیا تھا۔ جب اقرا نے سرمئی کاٹن کے پرنٹڈ سوٹ میں ملبوس اپنے مخصوص بالوں کی چوٹی اور آنکھوں میں ہلکے سے کاجل کی لکیر ڈالے عاتکہ سے یہ دریافت کیا کہ اس نے عید کی تیاری کیوں نہیں کی تو دادی نے لڑکیوں کو شرم و حیا اور کردار پہ کم و بیش ایک گھنٹے پہ محیط پر مغز لیکچر دے ڈالا تھا اور ساتھ میں اس بات کی طرف بھی ان کی توجہ دلائی کہ عاتکہ نے بائیں ہاتھ کی کلائی میں چند سادہ کالی چوڑیاں ڈالی ہوئی ہیں اور ایک ہاتھ پہ مہندی کا بتاشہ بھی بنایا ہوا ہے۔ یہ سب عید کی تیاری ہی تو ہے ورنہ روز کے معمول میں عاتکہ کو ان کی اجازت نہ ملتی۔ عید کی چھٹیوں کے بعد اسکول میں اس کی ساری دوستوں کا موڈ بگڑا ہوا تھا۔

"تمہاری دادی ہمارے کپڑوں اور تیاری پہ یوں ناگواری ظاہر کر رہی تھیں۔ جیسے خدانا خواستہ ہم کسی گرے پڑے اور گھٹیا خاندان کی لڑکیاں ہوں اور جنہیں اپنے والدین کی عزت و ناموس کا پاس نہ ہو۔"

اقرا کی خفگی پہ وہ ندامت میں گھر گئی تھی۔ دادی کی صفائی میں کچھ کہنا ان کے غصے کو مزید ہوا دینا تھا سو چپ چاپ ان کی لن ترانیوں کو سنے گئی۔

"ارے یار! یہ سب عاتکہ کو کیوں سنا رہی ہے۔ قسم سے یہ جیسی سیل و بند زندگی گزار رہی ہے۔ وہ کبھی ہم گزارتے تو ہمارا دم گھٹ جاتا۔ ہنسنے بولنے من پسند کپڑے پہننے سے بھلا انسان کی خاندانی روایات کو زک کیسے پہنچ سکتی ہے۔" اپنی دوستوں کی نظروں میں اب اس کے لیے ترحم و ہمدردی تھی جو اسے بہت اچھی لگ رہی تھی۔ کوئی تو ہے جسے اس کے غم کا اندازہ ہے کسی کو تو لگتا ہے وہ عام لڑکیوں سے ہٹ کر ابنارمل زندگی گزار رہی ہے۔ جس میں رنگ ہے نہ کوئی خوشی۔ بس لگی بندھی روٹین میں زندگی گزرتی چلی جا رہی ہے۔ اسے لگتا تھا وہ ایک ایسی فصیل میں بند ہے جس کی بہت اونچی اونچی دیواریں ہیں۔ جن میں قدرت نے کوئی ایسا جھروکا، کوئی روزن نہیں رکھا تھا جس سے وہ تازہ ہوا میں سانس لینے کی امید اپنے اندر محسوس کرتی۔

اس دن کے بعد سے دادی نے اسے ان ساری لڑکیوں سے دوستی ختم کرنے کا سختی سے آرڈر دیا تھا۔

"ایسی فضول لڑکیوں سے دوستی گانٹھتے ہوئے مت بھولا کرو کہ تم شیخ رحیم الدین کی پوتی ہو جن کا راہ طریقت و تصوف میں اعلا مقام تھا۔ انسان اپنی دوست سے پہچانا جاتا ہے۔ کوئی دیکھے گا تو کیا سوچے گا کہ پنج گانہ صلوۃ کی پابند، سلطانہ کی پوتی کا ایسے شہدے لوگوں میں اٹھنا بیٹھنا ہے۔"

آنسوؤں کو اندر ہی اندر اتارتے ہوئے اس نے ایک شکوہ کناں نظر ماں پہ ڈالی تھی جو کسی ڈمی، بے جان

ت کی طرح سنتے ہوئے ایک لفظ بھی اس کی حمایت نہیں بولی تھیں۔ جیسے وہ ان کی بیٹی نہ ہو بلکہ سراسر ں کی ذمہ داری ہو۔ اسے کبھی کبھی لگتا تھا جیسے دادی ر امی میں ساس بہو کا رشتہ نہ ہو بلکہ حاکم اور محکوم کا و۔ آقا اور مالک کا ہو' کسی بات سے اختلاف رکھنا امی کے لیے امر محال ہو۔

لائٹ آگئی تھی۔ دادی ململ کا دوپٹہ منہ پر ڈال کے و نگھنے لگی تھیں۔ قریبی مسجد سے عصر کی اذان بلند ونے لگی۔ وہ ایک یاسیت بھری نظر کھڑکی سے دکھائی یتے پھولوں پہ ڈالتی ہوئی باہر نکل آئی۔ آج کا دن نہی اکارت گیا تھا کیونکہ اذان سنتے ہی امی اور ابو کمرے سے باہر آگئے تھے۔

☼ ☼ ☼

اس کا ٹیسٹ حسبِ سابق بہت اچھا ہوا تھا۔ ساری کلاس میں سے سب سے زیادہ مارکس اس نے لیے تھے۔ یہ اس کے لیے معمولی بات تھی۔ کیونکہ پوزیشن لینا اس کے پڑھائی سے لگاؤ اور ماں کی اس حوالے سے سختی ——— لازمی ہوتی تھی۔ لیکن اس کے لیے خوشی کی بات یہ تھی کہ ثمرین نے طے شدہ مہلت گزرنے کے بعد بھی اس سے رسالہ واپس نہیں مانگا بلکہ کمال فراخدلی سے اسے آرام سے پڑھنے کی اجازت دے دی تھی۔ گھر آکر اس نے یونی فارم تبدیل کرنے کے بعد کھانا گرم کیا۔ چھوٹے بہن بھائیوں نے اودھم مچا رکھا تھا۔ یہ ہنگامہ اس وقت تھما جب اقبال گھر میں داخل ہوئے۔ ان کے ہاتھ میں تہ کیے ہوئے اخبار تھے۔ جو انہوں نے اسے تھما دیے۔

"عاتکہ! بیٹے اسے سنبھال کر میرے کمرے میں رکھ دینا۔ دکان پر پڑھنے کا ٹائم نہیں ملا۔ فارغ وقت میں گھر پڑھ لوں گا۔" کھانے کے بعد رضوانہ ٹھنڈے پانی سے بھری بالٹی میں ڈوبے آم نکال کر سب کو دینے لگیں۔ وہ انتہائی شوق سے اخبارات کے اندر ہفت روزہ میگزین کی ورق گردانی کرنے لگی۔ سیاست و شوبز' علوم نجوم' ناول' سفرنامے غرض تفریح طبع کا تمام مواد اس میں موجود تھا۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ ابو کے پڑھنے کے بعد وہ میگزین کو توجہ سے بعد میں پڑھتی رہے گی۔ فی الحال وہ درمیانی صفحات کھولے مختلف پوز دیتی ماڈل کے نوع بہ نوع ملبوسات دیکھنے لگی۔

"ارے امی! دیکھیں تو یہ زری اور موتیوں کا کتنا نفیس کام ہے۔ میں عقیل ماموں کی شادی پہ ایسا ہی سوٹ بنواؤں گی۔" وہ اشتیاق سے کہتی میگزین اٹھا کر نیچے چٹائی پہ ماں کے پاس آبیٹھی۔

آم کو اچھی طرح گھولنے کے بعد اس پہ منہ رکھتے ہوئے دادی نے یونہی ذرا سی نظر نیچے عاتکہ کے گھٹنوں پہ رکھے میگزین پہ ڈالی۔

"تم کیوں ایسا واہیات لباس بنواؤ گی۔ یہ اتنا گہرا گلا' گھٹنوں سے اوپر قمیص اور آستینیں ندارد کیا شریف اور خاندانی لڑکیوں کے ایسے لچھن ہوتے ہیں۔" دادی کے سخت لہجے اور غصیلے انداز پہ وہ لمحہ بھر کو ہکا بکا رہ گئی تھی۔

"لیکن دادی میں ایسی سلائی تو نہیں کراؤں گی' میں تو صرف گلے اور دامن کے ڈیزائن کی بات کر رہی تھی۔" وہ روہانسی ہو کر وضاحت دینے لگی لیکن دادی کو کسی وضاحت کی کیا ضرورت۔

"مجھے پڑھاؤ نہیں اور ماں کو دیکھو بیٹی ایسے واہیات کپڑے سلوانے کی فرمائش کر رہی ہے اور یہ منہ میں گھنگھنیاں ڈالے بیٹھی ہے یہ نہیں پوچھا کہ ایسے کپڑے بازاری اور بدچلن عورتوں پہ ہی سجتے ہیں۔" اب کے طنز کا ہدف رضوانہ کی ذات تھی جس نے ہمیشہ کی طرح ساس کی کڑوی کسیلی باتوں کو خاموشی سے سن لیا تھا۔

اسے اپنی ماں کے ضبط پر حیرت ہوتی تھی کہ وہ کیوں دادی کی ہر جائز و ناجائز بات پہ سر جھکا دیتی ہیں۔ حیرت تو اسے اپنے اوپر بھی ہوتی تھی۔ وہ جو انتہائی لائق اور ذہین طالبہ مانی جاتی تھی دادی کی غلط فہمی اور ان کے ذہن پہ لگے تنگ نظری کے جالوں کو صاف کرنے کے لیے وہ جب بھی منہ کھولنے کا ارادہ کرتی تو لفظ اندر ہی اپنی موت مرجاتے تھے۔ اسے لگتا اگر اس نے ایک لفظ بھی منہ سے نکالا تو دادی اس کے سانس لینے پر بھی قدغن لگا دیں گی اور اس کی ماں جذبات و احساسات سے عاری دادی کے اس فعل پہ کوئی حرف شکایت ہونٹوں پہ نہیں لا پائیں گی۔

بوجھل دل اور تھکے تھکے قدموں سے وہ باہر صحن میں آگئی۔ سورج نصف النہار پہ تھا۔

تاحد نظر دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ اندھیرے سے نکل کر ایک دم روشنی میں آنے سے اس کی آنکھیں چندھیا سی گئی تھیں۔ ٹاہلی کے درخت کے نیچے رکھے مٹی کے پیالے میں پانی بہت کم تھا درخت پہ بسیرا کیے پرندے سارا دن پیالے سے پانی پینے کے ساتھ ساتھ بال و پر بھی سنوارتے رہتے وہ بلا ناغہ اسکول جانے سے پہلے پیالے کو دھو کر پانی سے صاف کر دیا کرتی تھی۔ کچن سے مٹھی بھر چاول اور باجرہ پیالے کے قریب بکھیرنے کے بعد اس نے دادی کے کمرے میں جھانکا۔ ان کے بلند خراٹے گہری نیند کا پتا دے رہے تھے۔ وہ رسالہ لے کر اپنے من پسند گوشے کی طرف آگئی۔

ایک میگزین دیکھنے پر دادی نے اتنا فیل مچایا ہے اگر جو انہیں میرے رسالے پڑھنے کا علم ہو جائے تو نجانے کیا قیامت اٹھائیں گی۔

دادی تو چلو ناخواندہ ہیں۔ رسائل سے ان کی ناپسندیدگی کی وجہ یقیناً "ان کی لاعلمی ہے۔ مگر امی جو انٹر پاس ہیں۔ انہیں پڑھنے سے اتنا کیوں بدکتی ہیں۔ یقیناً" دادی کی ناراضی سے خائف رہتی ہیں۔ نانی بتاتی ہیں کہ تمہاری ماں ہر جماعت میں اول آتی تھی جیسے کہ تم ہو تو ایسا ذہین انسان علم دوست نہ ہو یہ بات کچھ سمجھ میں نہیں آتی۔

اے حمید کے ماضی کے افسانے انسان کے اندر اپنے ملک اور مسلمانان ہند کی خونچکاں داستانوں کا پتا دیتے ہیں۔

مستنصر حسین تارڑ کے سفرنامے دیس بدیس کی سیر کرنے کے علاوہ فن و فکر کو بھی جلا بخشتے ہیں۔ اردو ادب کے ایسے بے مثال شہ پارے بھلا کسی انسان میں اخلاقی گراوٹ کیسے لاسکتے ہیں۔ رسالے کی ورق گردانی کرتے ہوئے اس نے دل گرفتی سے سوچا گھر کے ڈپریسنگ اور اعصاب شکن ماحول سے وقتی ہی سہی فرار حاصل کرنے کی خاطر اس نے غیر نصابی کتب میں پناہ ڈھونڈلی۔ کتاب کھولتے ہی وہ ایک نئے جہاں میں پہنچ جاتی۔ جہاں نہ بات بے بات ٹوکنے والی دادی ہوتی' نہ لب بستہ روبوٹ کی طرح کام سرانجام دینے والی ہستی ماں کہلاتی جس کے نزدیک بیٹی کا وجود محض ڈانٹنے پھٹکارنے کے لیے ہوتا ہے اور ماں کا کام صرف بیٹی کو اس کی ذرا سی لغزش پہ شرمندہ کرنا ہوتا۔

رسالوں میں اسے ہر وہ رشتہ مل جاتا جو وہ اپنی حقیقی زندگی میں چاہتی تھی۔ کسی کہانی میں اسے ایک ہمدرد و دمساز ماں مل جاتی جو بنا لب کھولے بیٹی کے دل کی ہر خواہش جاننے کی صلاحیت رکھتی۔ تو کسی کہانی میں ڈھیر سارے کزنز کا جھرمٹ' بہن بھائیوں کی لگاوٹ بھری ناراضیاں اور جان چھڑکنے والی دوست اس کی اپنی ساری دوستیں کچھ اس کی سنجیدہ طبیعت اور کچھ اس کے لیے دیئے رویے کی وجہ سے ساتھ چھوڑ چکی تھیں۔ وہ بھی آخر کب تک ان کے ساتھ دوستی نبھاتی۔ کوئی اسے اپنے ساتھ گھر لے جانے پر مصر ہوتی۔ جب کہ گھر سے ——— اسکول کے علاوہ اور کہیں جانے کی اجازت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا تو کوئی اس کے گھر آنے پہ بضد۔

"یار تمہاری امی اور بہنوں سے ملنا ہے۔" اور تو اور ثمن نے تو ایک دن دھماکہ ہی کر ڈالا۔

"آج میں نے امی کے ساتھ تمہارے گھر آنا ہے۔ میں نے تمہاری اتنی تعریفیں کی ہیں کہ امی اس بات پر پکی ہو گئی ہیں کہ ایسی ذہین' شائستہ مزاج اور خوب صورت لڑکی تو ان کی بہو بننے کے لائق ہے کیوں تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں ہے نا؟" ثمن کا معنی خیز لہجہ آخر میں تھوڑا سا شرارتی ہوا تھا۔

"ارے نہیں' میری امی تو پھپھو کے ہاں لاہور گئی ہوئی ہیں دادی کا چیک اپ کروانا تھا۔ گھر میں ہم بہنوں کے علاوہ کوئی نہیں ہے۔" بہانہ تو اسے سوجھ گیا تھا مگر

گھبراہٹ کے مارے برا حال تھا۔

"اوکے ریلیکس، تم اتنا پریشان کیوں ہو رہی ہو۔ آخر کو ہم انٹر کے اسٹوڈنٹ ہیں۔ پروپوزلز آنا تو کامن سی بات ہے اس ایج میں۔" ثمن اس کی حواس باختہ صورت دیکھ کر محظوظ ہوئی تھی اس دن کے بعد دانستہ اس نے ثمن سے کنی کترانا شروع کر دیا تھا۔ مگر ہونی کو کون ٹال سکا ہے۔ چند ہفتے گزرنے کے بعد ثمن اپنی امی اور آنٹی کے ساتھ اس کے گھر موجود تھی۔ جو اسے دیکھتے ہی ریشہ خطمی ہو گئی تھیں۔

"ماشاء اللہ یہ تو چندے آفتاب اور چندے ماہتاب ہے، ہمارے اندازوں سے کہیں بڑھ کر معصوم اور پیاری۔" ثمن کی امی نے آگے بڑھ کر اس کی پیشانی چوم لی۔

دادی نے خلافِ توقع انتہائی خوش اخلاقی اور مہمان نوازی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ان خواتین کا مدعا جاننے کے بعد صاف انکار کر دیا۔

"مگر کیوں، آپ ہمارے بیٹے سے ملیں تو سہی ہر قسم کی جانچ پھٹک کروالیں۔ مجھے امید ہے میرا بیٹا آپ کی توقعات پہ پورا اترے گا۔" انہیں دادی کا یوں صفا چٹ انکار پسند نہ آیا تھا۔

"آپ جو کہہ رہی ہیں وہ بھی ٹھیک ہے مگر میری پوتی عاتکہ کا رشتہ میرے نواسے سرمد سے بچپن کا طے ہے اس لیے آپ سے معذرت۔" وہ بہت مایوس ہوئیں کیونکہ عاتکہ انہیں بے حد پسند آئی تھی۔

دادی کی خوش اخلاقی کا چولا مہمانوں کے جاتے ہی اتر گیا تھا۔

"خوب تربیت کی ہے تم نے اپنی بیٹی کی کبھی ایسا ہوا ہے کہ کیکر کے درخت پہ سیب لگنے لگیں۔ جیسی خود اپنے بر ڈھونڈنے والی ماں ویسی بیٹی۔" آتش فشاں بنی دادی کا غصہ اس کی سمجھ سے بالاتر تھا۔

"چچی جان! خدا کے لیے اب تو میری اولاد میرے برابر آکھڑی ہے۔ اب تو الزام تراشی ترک کر دیں۔" انتہائی عاجزی سے کہتے ہوئے رضوانہ نے ہاتھ جوڑ کر جیسے التجا کی تھی۔

"میں تو ان کو جانتی تک نہیں، عاتکہ کی نسبت کا جسے علم نہیں تو پھر تو آئیں گے ہی۔"

"مجھے سمجھانے کی ضرورت نہیں ہے۔ تم شروع سے ہی اس رشتے کے خلاف تھیں۔ تم چاہتی ہی نہیں تھیں کہ میرے دونوں بچے آپس میں ملیں۔ اس لیے تو ہر ایرا غیرا رشتہ ڈالنے چلا آ رہا ہے۔

عاتکہ تمہاری بیٹی ہے۔ جوان ہے۔ اس کے دماغ میں یہ بات بٹھاؤ کہ اسے ادھر ادھر تاکنے جھانکنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اس کا نصیب سرمد سے جڑ چکا ہے۔ اگر تم نے اسے یہ بات بتائی ہوتی تو اس کی ہم جماعت یوں منہ پھاڑ کے اس کا ہاتھ مانگنے نہ چلی آتی۔ ماں تو کیا مجھے بیٹی کا دل بھی پھپھو کی طرف سے کھٹا لگتا ہے۔" اپنے ترکش کو مکمل خالی کر کے سلطانہ بیگم اپنے کمرے میں چلی گئیں۔ جب کہ اس انکشاف نے اس کے اعصاب کو سن سا کر دیا تھا۔ نظروں میں دادی جیسا شکیلہ پھپھو کا نرمی سے انجان، کرخت اور تیوریوں سے اٹا چہرہ در آیا تھا۔

اس چہرے کے پیچھے اور دو چہرے تھے جو اس نے اپنے بچپن میں دیکھے تھے پھپھو کی بیٹیوں سائرہ اور حنا کے چہرے۔ جن پہ اتنی درشتی اور سختی تھی کہ ایک بار دیکھنے کے باوجود اس کے ذہن پر نقش ہو گئے تھے۔ اس نے سہم کر ماں کو دیکھا۔ سفید بے رنگ چہرہ، کاجل سے خفا آنکھیں، سرخی و لطافت سے محروم ہونٹ، ہمہ وقت سرد سی کیفیت خود پہ طاری کیے ہوئے اس کی ماں سے اس کے باپ نے لو میرج کی تھی۔ نانی بتاتی تھیں کہ تمہاری ماں کو اقبال انتہائی چاہ اور ماں بہنوں کی مخالفت مول کر بیاہ لے گیا تھا۔ مگر اسے اپنی ماں میں ایسی کوئی خاص بات نظر نہ آتی تھی۔ جس سے نانی کی کہی بات کی تصدیق ہوتی۔ محبت کرنا اور اسے پالینے کی فتح کا غرور تو کیا اس کا شائبہ بھی اپنے باپ کے چہرے پہ نہ ملتا۔

بہترین کاروباری دماغ رکھنے والا، روکو بائیس بنانے کی سوچوں میں غلطاں شخص کو دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ اس شخص نے کبھی محبت کے الوہی جذبے

کی لطافت کو محسوس کیا ہے۔ اس سے پہلے اس کے نزدیک صرف ایک ہی ہستی قابل رحم تھی۔ وہ تھی عاتکہ اقبال۔ اب اسے لگتا اصل رحم کی حق دار تو اس کی ماں ہے۔ یا شاید اس کا باپ بھی۔

☼ ☼ ☼

"کوئی ضرورت نہیں ہے کالج میں داخلہ لینے کی۔ آرام سے گھر میں بیٹھ کر پڑھائی کرو۔" رضوانہ کا انداز حتمی تھا۔

"مگر کیوں، میں نے انٹر میں اے پلس گریڈ اس لیے نہیں لیا کہ نالائق لڑکیوں کی طرح پرائیویٹ پڑھوں۔" وہ احتجاجاً چلائی۔ ابھی کچھ ہفتے پہلے اس کا رزلٹ آیا تھا۔ حسب سابق اس نے اپنی پوزیشن برقرار رکھی تھی۔ کالج میں داخلے کے لیے اس نے ضروری کاغذات کی فائل عقیل ماموں کو بھجوانے کا فیصلہ کیا تو رضوانہ نے منع کر دیا۔

"ابھی جتنا تماشا ہوا ہے وہ کیا کم تھا۔ اور کتنے الزام تم نے ماں پہ لگوانے ہیں۔" رضوانہ کا لہجہ قدرے طنز لیے ہوئے تھا۔

"امی یقین کریں میں نے ثمن کو واضح طور پر منع کیا تھا دادی نے آپ کی ذات کو ڈی گریڈ کرنے کے لیے مجھے بھی شک کی زد میں لے لیا تھا۔ آپ تو میری ماں ہیں۔ جانتی ہیں کہ پڑھائی میرا جنون ہے۔ پلیز میری خواہش کو حسرت میں مت بدلیں۔" وہ سسک اٹھی۔

"مت پالو ایسی خواہشیں جنہیں پانا مشکل ہو۔ زندگی کے وہ رنگ اپنی شخصیت پہ نہ لگنے دو کہ جب ان رنگوں کو مٹانے کا وقت آئے تو زندگی ایک امتحان بن جائے۔ جس میں سے پاس ہونا آپ کے لیے لازمی ہو۔"

وہ رونا بھول کر ماں کے ناقابل فہم تاثرات سے سجے چہرے کو دیکھنے لگی۔ ہموار و دھیما لہجہ اسے عجیب سا لگا۔

"پتا ہے عاتکہ۔ جب اسکول ڈراموں میں شہزادی یا ملکہ کے رول کے لیے کسی لڑکی کے انتخاب کا مرحلہ آتا تو سب کا مرکز نگاہ میں ہی ہوتی۔ اماں میرے بے تحاشا اور اونچا ہنسنے سے عاجز رہتیں۔ اماں کہتیں۔

گندم کو ڈل (مٹی) نے بگاڑا اور عورت کو کھل (ہنسی) نے بگاڑا۔ مجھے چپ کرانے کے وہ کئی گر آزماتیں مگر دیکھ لو...... اب وہ بلند و بانگ ہنسی تو کیا میں مسکرانا تک بھول گئی ہوں۔" بولتے بولتے رضوانہ ایک دم خاموش ہو گئیں اور عاتکہ کو یہ خاموشی گراں گزرنے لگی۔ اپنا دکھ بھول کر اسے ماں کی باتیں دلچسپ لگنے لگیں۔ ورنہ تو عام روٹین میں ان کے کھنچے ہوئے چہرے کو دیکھتے ہوئے کبھی ان سے بے تکلف ہونے کی کوشش نہیں کی تھی۔

"اماں تو میرے ہر آئے دن کے رشتوں سے بھی تنگ آئی ہوئی تھیں۔ کیونکہ مہمانوں کی خاطر پر ان کا اچھا خاصا خرچا ہو جاتا تھا۔ کہتی تھیں کہ تمہاری شادی ہوتے ہی میں پرسکون ہو جاؤں گی۔ خود تو پرسکون ہوئیں مگر میرا سکون......" رضوانہ کی آنکھوں میں نمی چمکنے لگی تھی۔ اور ہونٹوں پہ پھیکی مسکراہٹ پھیل گئی۔

"میرے کان پھاڑ قہقہے در و دیوار کو ہلا دیتے تھے۔ مگر یہاں آکر میرے وہ قہقہے ان در و دیوار میں گھٹ کر رہ گئے۔ کیونکہ اونچا ہنسنے والی عورتیں تمہاری دادی کے نزدیک اخلاق باختہ ہوتی ہیں۔ بہنوں میں سب سے زیادہ کپڑوں پہ خرچ میں کیا کرتی۔ اسکول میں ساری لڑکیاں مجھے سائرہ بانو کہا کرتیں۔ اور میں ساری تعریفیں اپنا حق سمجھ کر وصول کرتی۔ تمہارے ابو کی محبت کا پھول میرے دل کے آنگن میں کھلا تو اس کی خوشبو نے مجھے مدہوش کر کے نہ جانے کن کن جہانوں کی سیر کروائی پھر تمہاری دادی کی حاکمیت مزاجی اور تشکیک آمیز رویے نے مجھے ایسی دنیا میں لا پٹخا کہ خود کو پہچاننا ہی میرے لیے مشکل ہو گیا۔

اب میں چاہتی ہوں کہ اپنی ذات پہ وہ رنگ نہ چڑھنے دو کہ بعد میں ان کو کھرچ کر اتار کر پھینکنا یوں مشکل ہو جائے جیسے جسم سے روح کو کھینچ نکالنا۔ جاں کنی کی یہ کیفیت میں نے موت سے پہلے کئی بار محسوس

کی ہے۔ میں اس تکلیف سے تمہیں بچانا چاہتی ہوں۔ شکیلہ آپا بالکل چچی جان کا پرتو ہیں۔ اپنی من مانی کرنے والی۔ دوسروں کے جذبات و احساسات کو ذرا برابر اہمیت نہ دینے والی لیکن تمہیں کوئی دقت محسوس نہیں ہوگی۔ دقت تو اسے ہوتی ہے جو بالکل انجان ہو جیسے کہ میں۔"

دھیمے لہجے میں بولتے ہوئے آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے ہوئے رضوانہ باہر کو چل دیں۔

"ہاں مجھے کیوں دقت ہوگی' میں کون سا آزاد فضا میں سانس لینے کی عادی ہوں۔ پرندے کے پر قینچ کر اسے ایک پنجرے سے نکال کر دوسرے پنجرے میں ڈال بھی دیا جائے تو اسے کیا فرق پڑتا ہے۔ آزادی تو اس کی سلب ہو چکی ہوتی ہے۔ میں نے کبھی کون سا اپنے لیے دس روپے کی چیز خریدی ہو۔ جو میرے دل میں نت نئی چیزیں خریدنے کی خواہش پیدا ہوگی۔" وہ خود اذیتی سے سوچنے لگی۔

اسے یوں لگتا تھا جیسے اس کی ذات ایک سادہ کینوس ہے۔ جس پہ ایک اسٹروک رضوانہ اپنی مرضی کا لگاتی ہے تو دوسرا دادی اپنی مرضی کا متضاد رنگوں کا یہ ملاپ نجانے کیسا ماسٹر پیس بنے گا۔ جسے سارے نجانے سراہیں گے یا تنقید کریں گے۔

☼ ☼ ☼

"کیا کہہ رہے ہو اقبال تم ہوش میں تو ہو۔" سلطانہ بیگم کو اپنے اکلوتے و فرماں بردار بیٹے کی بات سن کر ایک لمحے کو اپنی سماعتوں پہ شک گزرا جس نے اتنی بڑی بات کتنے آرام سے کہہ دی تھی۔

"اماں جان میں سچ کہہ رہا ہوں آپ چاچا کریم کے پاس جائیں اور رضوانہ کا ہاتھ میرے لیے مانگیں۔ رضوانہ میرے لیے ہر لحاظ سے مناسب لڑکی ہے اور چاچا کو بھی یقیناً" مجھے اپنی فرزندی میں لینے میں کوئی اعتراض نہ ہوگا۔" اقبال نے انتہائی احترام سے سر جھکائے ہوئے اپنے دل کی خواہش کو درخواست میں لپیٹ کر ماں کے سامنے پیش کیا۔

"کریم الدین کو بھلا اعتراض کیوں ہوگا۔ اکلوتا' اتنے بڑے گھر اور جائیداد کا تنہا وارث داماد جو انہیں آسانی سے مل جائے گا۔ اعتراض تو مجھے ہے۔ میں رضوانہ کو کسی صورت بہو نہیں بناؤں گی۔ جیسی چلتر ماں ویسی بیٹی۔ سعیدہ کو تو میں نے کبھی منہ نہ لگایا کجا کہ سمدھن بنا کر ساری زندگی کے لیے اسے اپنے سر پر سوار کرلوں۔"

دیورانی کے لیے ان کے لہجے میں زہر ہی زہر تھا۔

"اماں آپ بلاوجہ کا بیر پال رہی ہیں۔ سعیدہ چچی کتنی اچھی تو ہیں۔ آپ کا بہت احترام کرتی ہیں۔ آپ ساری کدورتیں ایک طرف رکھ کر صرف رضوانہ کا ہاتھ اس لیے مانگنے جائیں کہ یہ آپ کے بیٹے کی محبت کا سوال ہے۔" انتہائی لجاجت سے کہتے ہوئے اقبال نے ماں کے ہاتھ تھام لیے۔ دراز قد' بے داغ گوری رنگت اور گھنے سیاہ بالوں والی رضوانہ یوں بے دھڑک اس کے دل کے کواڑ کھول کر سب سے اونچے سنگھاسن پہ یوں براجمان ہوئی کہ دل شدت سے اس کی عمر بھر کی رفاقت کا تمنائی بن گیا تھا۔ چاچا' چاچی اور ان کے بچوں سے ماں کی بے زاری اس سے کوئی ڈھکی چھپی نہیں تھی لیکن سلطانہ بیگم نفرت کی جس انتہا پہ کھڑی تھیں اسے دیکھ کر وہ حیران رہ گیا۔

"اوہو' آخر پھانس ہی لیا نا تمہیں ان چنڈال ماں بیٹیوں نے۔ اسی دن کا مجھے دھڑکا لگا رہتا تھا۔ آخر ہوا بھی وہی۔ ایسے ہی تو نہیں تم چچا کی عیادت کے بہانے روز ان کے گھر بھاگے چلے جاتے تھے۔" طنز میں ڈوبا لہجہ اور کٹیلا ہو گیا تھا۔ کریم الدین کا پچھلے دنوں ایکسیڈنٹ ہوا تھا۔ ان کے مکمل علاج کی ذمہ داری اقبال نے خود اٹھائی ہوئی تھی اور یہی بات سلطانہ بیگم کے شک کو تقویت بخش رہی تھی۔

"بخدا ایسا بالکل نہیں ہے جیسا آپ سمجھ رہی ہیں۔ رضوانہ ایک باحیا اور باکردار لڑکی ہے جس سے شادی کا فیصلہ سراسر میرا اپنا ذاتی ہے۔"

"ارے جتنی بھی باحیا ہو' ہے تو آخر سعیدہ کی بیٹی نا۔ سعیدہ خود تیرے چچا کے ساتھ نین مٹکا کر کے بیاہ آئی تھی۔ تیری دادی تو بالکل راضی نہیں تھی۔ جادو گرنی سعیدہ نے کریم کی عقل کچھ ایسے خبط کی کہ کریم ماں کے آگے ڈٹ گیا تھا۔ نجانے کتنے مردوں کے سر پھٹول ہوئے تھے پھر یہ منحوس ڈولی بیٹھی تھی۔ اور ایسی عورت کی بیٹی کو میں بہو مر کے بھی نہ بناؤں۔ جیسی ماں ہے آخر وہی گن کچھ نہ کچھ تو بیٹی میں بھی ہوں گے۔ تو کہہ رہا ہے کہ وہ باحیا ہے۔ اگر وہ حیا والی ہوتی تو اس وقت تو ماں کے منہ کو نہ آرہا ہوتا۔ ابھی اس نے اس گھر میں قدم نہیں رکھا اور تو رسہ تڑوانے کی فکر میں لگ گیا ہے۔ ہائے...... میں لٹ گئی' میری تو ساری پونجی ہی نہ رہی۔" سلطانہ بیگم سینے پہ دوہتڑ مارتے ہوئے یوں دہائیاں دینے لگیں کہ اقبال کے تو ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ بڑی دقت سے ماں کو سنبھال کر پانی پلایا۔

لاہور سے شکیلہ کو شارٹ نوٹس پہ بلایا گیا۔ ساری بات اس کے سامنے رکھی تو وہ بھی ماں کی طرح غصے سے پاگل ہونے لگی۔

"ہرگز نہیں' رضوانہ کو بھابھی بنانا تو درکنار میں اس کی صورت دیکھنا بھی پسند نہیں کرتی۔" کوتاہ قامت اور سانولے رنگ کی شکیلہ کو اپنی یہ گوری چٹی اور بلا کی خوش مزاج کزن رضوانہ زہر لگا کرتی۔ خاندان میں کسی کو اس کی صاف شفاف جلد کا راز جاننے کی جستجو ہوتی تو کوئی اس کے بالوں پہ فریفتہ۔

صرف رضوانہ ہی کیا وہ ہر خوب صورت لڑکی سے خار کھاتی۔ لیکن رضوانہ سے اس کی نفرت کی ایک ٹھوس وجہ اس کے پاس تھی۔ کسی زمانے میں' شادی سے پہلے اس کے میاں عزیز' رضوانہ کی زلف گرہ گیر کے اسیر ہوئے تھے۔

عزیز کی اماں اور سلطانہ بیگم آپس میں دوپٹہ بدل بہنیں تھیں جنہوں نے رشتے کی ڈور میں بندھنے کا فیصلہ کرتے ہوئے شکیلہ کو عزیز کی شریک حیات بنا دیا۔ سانولی' پھوہڑ اور زبان دراز شکیلہ کے ساتھ نبھا کرتے ہوئے کبھی کبھی نادانستگی میں رضوانہ کا ذکر عزیز کے منہ سے نکل جاتا پھر تو شکیلہ وہ پنجے جھاڑ کر پیچھے پڑتی کہ جان بچانی محال ہو جاتی۔ ایسے میں شکیل کا دل چاہتا کہ رضوانہ کا گلا دبا ڈالے۔ اور اب اقبال اس سے شادی پہ بضد تھا۔ خاندان کی بیسیوں لڑکیاں دکھا ڈالیں مگر دل کی دیوار پر ایک ہی تصویر نقش ہو چکی تھی۔

بالآخر سلطانہ بیگم کو اکلوتے بیٹے کی خواہش کے سامنے گھٹنے ٹیکنے ہی پڑے۔

بااخلاق' تعلیم یافتہ اور ہر ہنر سے آراستہ رضوانہ نے دل میں ٹھان لیا تھا کہ وہ اپنی محبت' خدمت اور اطاعت شعاری سے چاچی اور ان کی بیٹی کا دل جیت لے گی۔ لیکن وہ نہیں جانتی تھی کہ جن کا خمیر ہی نفرت سے اٹھا ہو انہیں اپنی محبتوں سے رام کرنا ایسے ہی ناممکن ہوتا ہے۔ جیسے کالے پتھر کو دھو دھو کر سفید کرنا۔

☼ ☼ ☼

"یہ زہر ملا کھانا میں بڑھیا کھاؤں گی تو لمحوں میں چٹ پٹ ہو جاؤں گی اور یہی تم چاہتی ہو نا۔ جانتی بھی ہو میں بلڈ پریشر کی مریض کم نمک کھانے کی عادی ہوں مگر یہ مٹھی بھر نمک سالن میں جھونکا ہے تاکہ ہائی بلڈ پریشر میری جان لے لے۔"

ایک نوالہ منہ میں ڈالتے ہی سلطانہ بیگم نے بگڑے انداز میں رکابی ایک طرف کھسکا دی۔ رضوانہ نے بے حد حیرانی سے ساس کا برہم چہرہ دیکھا۔

کھانا اس نے ہمیشہ کی طرح بہت توجہ اور دل سے بنایا تھا۔ کل اس نے ساس کے ہائی بلڈ پریشر کے پیش نظر کھانے میں نمک کا تناسب کم رکھا تھا تو سلطانہ بیگم نے کھانے کو پھیکا قرار دیتے ہوئے اسے نمک بڑھانے کا کہا تھا۔ اور آج ان کے حسب منشاء کھانا بنایا تو بھی اعتراض' اقبال نے اسے ماں کے لیے پھر سے کھانا بنانے کا حکم دیا۔ ماں بغیر کھائے دسترخوان سے اٹھ گئی تھیں تو اس کے حلق سے بھی نوالہ اترنا مشکل تھا۔ یہ کوئی ایک دن کا قصہ نہ تھا۔ بلکہ روز کا معمول تھا۔ سلطانہ بیگم کو رضوانہ کے ہاتھ کا کیا کوئی کام پسند نہ

آتا۔ دھلے ہوئے کپڑوں کو دوبارہ سہ بارہ دھلواتیں۔
”میں پانچ وقت کی نمازن ہوں۔ ذرا سی ناپاکی بھی میرے نزدیک گناہ ہے۔“

پورے گھر میں پونچھا لگانے کے بعد انہیں فرش یوں چمکتا ہوا دکھائی نہ دیتا جیسے وہ خود صاف کیا کرتی تھیں۔ مجبوراً“ رضوانہ کو پھر سے سارے گھر کو رگڑ رگڑ کر صاف کرنا پڑ جاتا۔ برتنوں کی دھلائی۔ کپڑوں کی استری۔ کھانا پکانے غرض کوئی ایسا کام نہ ہوتا جس میں مین میخ نکال کر وہ رضوانہ کو دوبارہ سے کرنے کی ہدایت دیتیں۔

سارا دن کام میں جتے رہنے کی وجہ سے رات کو اقبال کو ایک تھکی ہاری اور پژمردہ سی بیوی ملتی جو بستر پہ آتے ہی نیند کی گہری وادی میں اتر جاتی اور وہ اس سے ڈھیروں پیار بھری باتیں کرنے کی خواہش پوری نہ ہونے پر دل مسوس کر رہ جاتا۔

☼ ☼ ☼

”یہ شریفوں کا گھر ہے نا کہ کسی بائی کا کوٹھا‘ جو ہر وقت ہاتھوں‘ پاؤں سے جھنکار بجتی رہتی ہے۔ تمہاری ماں بھی ہر وقت انہی ہتھیاروں سے لیس رہتی تھی۔ تبھی تو کریم کو بیوی کے سوا کچھ سجھائی نہیں دیتا۔۔۔۔ اب تم نے بھی ماں کی سکھائی اداؤں سے میرے بیٹے کو پٹا لیا ہے۔ لیکن یہاں رہنے کے لیے تمہیں وہ طور طریقے اپنانے ہوں گے جو میں نے وضع کیے ہیں۔“ سلطانہ بیگم کی زبان سے نکلے لفظ تھے یا زہر میں بجھے ہوئے تیر جو سنسناتے ہوئے اس کے جسم و جاں میں یوں پیوست ہوئے تھے کہ سارا بدن نیلو نیل ہو گیا۔

”چاچی جان! یہ آپ میری اماں کے بارے میں کیسے الفاظ استعمال کر رہی ہیں۔ میرے ابا نے ان سے محبت کی شادی کی تھی کوئی گناہ نہیں۔“ مارے صدمے کے آواز بمشکل اس کے حلق سے نکل پائی۔

”اے بی! سناؤ اسے۔ جو جانتا نہ ہو۔ سب کو معلوم ہے کہ سعیدہ نے کریم سے عشق کی پینگیں بڑھانے کے بعد ہی ماں باپ کے گھر کی دہلیز ناپی تھی وہ ہم ہی شریف تھے کہ جہاں ماں باپ نے باندھ دیا سو چپ چاپ نصیب کا لکھا سمجھ کر بندھ گئے ورنہ کون اس حقیقت سے بے خبر ہے کہ میری بہن زلیخاں کریم کی بچپن کی منگ تھی۔ تمہاری ماں نے اداؤں کا ایسا جال پھینکا کہ کریم پھڑپھڑا بھی نہ سکا۔

ارے مردوں کو رجھا کر گھر بسانا تو تمہارے خاندان کا نسل در نسل سے وطیرہ رہا ہے۔ میرا سیدھا سادا اقبال‘ ہمیشہ میرا پلو پکڑ کے چلنے والا بیٹا تیری صورت کے جھانسے میں تو آ گیا ہے مگر میں نہیں۔“ اچھی طرح زہر افشانی کرنے کے بعد وہ اپنے کمرے میں لیٹ کر لمبے لمبے سانس لینے لگیں۔ رضوانہ کے دوپٹے کے پلو پہ چھوٹے چھوٹے گھنگھرو لگے تھے۔ دونوں کلائیوں میں کانچ کی چوڑیاں اور پاؤں میں چاندی کی پازیب ڈالی ہوئی تھی۔ گھنگھروؤں کی جھنکار اور چوڑیوں کی کھن کھن انہیں ایسا ناقابل برداشت شور لگتیں کہ انہیں لگتا کہ کسی دم ان کے کان کے پردے پھٹ جائیں گے۔

☼ ☼ ☼

”رحیم کی وہ ہٹی شکل کی ماٹھی ہے پر کریم کی وہٹی تو چن کا ٹوٹا (ٹکڑا) ہے۔“

”ارے اتنی سوہنڑی ہے تبھی تو کریم پورے ٹبر سے لڑ بھڑ کر اسے بیاہ لایا ہے۔“

شیخ نعمت کی حویلی میں قدم رکھنے والی دونوں دلہنوں سلطانہ بیگم اور سعیدہ بی بی نے عورتوں کے ان تبصروں کو بخوبی سنا تھا اور ان تبصروں نے جہاں سعیدہ کے لبوں پہ دھیمی مسکان بکھیری تھی‘ وہیں سلطانہ بیگم کے دل میں حسد کی ہلکی سی چنگاری ٹمٹمائی تھی جو آنے والے چند دنوں میں بھڑک کر شعلہ بن گئی تھی۔

کریم الدین اپنے بڑے بھائی رحیم الدین کو باپ کا سا مان اور رتبہ دیتا تھا اپنی بیوی سعیدہ پہ بھی یہ بات واضح کر دی تھی کہ میری عزت سے زیادہ میرے بھائی اور بھابھی کی عزت و توقیر کو مقدم جانتا ہے۔ نرم مزاج اور خوش طبع سعیدہ کو بھلا شوہر کی بات سے انکار کیسے

ہو سکتا تھا۔

گھریلو کاموں میں مکمل مہارت رکھنے کے باوجود وہ سلطانہ کے پاس محض ان کی بڑائی کا پاس رکھتے ہوئے کبھی کسی پکوان کی ترکیب پوچھنے چلی جاتی تو کبھی سوئی فریم لے کر کوئی ٹانکا سمجھتا ہوتا۔ لیکن سلطانہ اس کی ساری وارفتگیوں اور عزت و اکرام کو ایک ڈھکوسلہ سے زیادہ کچھ نہ سمجھنے پر تیار ہوئیں آخر کو سعیدہ ان کی بہن زلیخا کے حق پہ غاصب ہوئی تھی۔ کریم نے ان کی بہن کو صرف اس لیے دھتکار دیا تھا کہ وہ بھی ان کی طرح معمولی نقوش کی حامل اور سانولی رنگت کی ایک عام سی لڑکی ہے۔

انتہائی بے رخی اور کٹھور پن کا مظاہرہ کرنے کے باوجود بھی سعیدہ کے رویے میں سرمو فرق نہ آیا۔

”آپا! یہ چوڑیاں دیکھیں‘ کریم میرے لیے لایا تھا۔“ ایک شرمگیں مسکراہٹ صبیح چہرے پہ سجائے وہ انہیں بتاتی تو ایک بے نام سی جلن پورے جسم کو گھیرے میں لے لیتی۔

”آپا! کریم مجھ سے اس بات پہ ناراض ہے کہ میں نے اس کے لائے ہوئے گجروں کو کیوں۔۔۔ اتارا؟ اب آپ بتائیں میں گجرے پہنے ہوئے سالن تو نہیں پکا سکتی نا۔“ اداس لہجے میں وہ اپنی صفائی دے رہی ہوتی یا کریم کی چاہت پہ نازاں ہو رہی ہوتی۔ سلطانہ سمجھ نہ پاتیں۔ ان کا دل چاہتا کہ منت کے ہزارویں حصے میں وہ صحن میں اتنی اونچی دیوار کھڑی کر دیں کہ ان کو کریم کی شوخی سے بھرپور باتیں اور سعیدہ کا شرم سے لال پڑتا خوب صورت چہرہ اور محبتوں سے سرشار کھنکتا لہجہ سنائی نہ دے۔

اور نہ وہ ان کے اجڑے چہرے اور ویران آنکھوں کو دیکھتے ہوئے ان کے دل کی بیابانی کا اندازہ لگائیں۔

صوم و صلوۃ کے پابند شیخ رحیم الدین کے نزدیک بیوی صرف ازدواجی حقوق پورے کرنے کے علاوہ شوہر کے آرام اور ہر قسم کی ضروریات کا خیال رکھنے کے لیے ہوتی ہے اور بس۔

بیوی کو نہ ستائش کی ضرورت ہوتی ہے نہ دو میٹھے بول کی۔ کپڑا‘ زیور اور بہترین گھر فراہم کرنے کے بعد ایسا کون سا حق ہوتا ہے‘ جو شوہر پر بیوی کی طرف سے واجب الادا ہوتا ہے۔

باریش اور احکام شریعت پہ بزعم خود‘ عام مسلمانوں کی نسبت زیادہ عمل کرنے والے رحیم الدین کی بیوی کو انتہائی سادہ‘ عبادت گزار‘ خاموش طبع اور دنیا سے بہت معمولی فائدہ حاصل کرنے والی ہونا چاہیے اس لیے سلطانہ بیگم پہ شب زفاف میں ہی جتا دیا تھا کہ انہیں عورتوں کے بناؤ سنگھار سے سخت اکتاہٹ ہوتی ہے اور زیادہ بولنے والی عورت شوہر کے حقوق پوری طرح ادا کرنے میں کامیاب نہیں رہتی۔

رضوانہ کی چوڑیوں کی کھنک‘ مہندی رچے ہاتھ اور خوب صورت چمکیلے کپڑے دیکھ کر ان کا احساس محرومی عود کر آ جاتا۔ رضوانہ کے وجود میں انہیں سعیدہ کی جھلک دکھائی دیتی جو ان کی محبت میں نہیں بلکہ ان کو جتانے کے لیے شیشوں والا پراندہ لمبے بالوں میں ڈال کر جھلاتی ہوئی ان کے سامنے آ کھڑی ہوتی اور کہتی۔

”آپا! دیکھیں تو کریم میرے لیے عید کے تحفے میں یہ پراندہ اور دوسری سنگھار کی بہت سی چیزیں لائے ہیں۔“

رحیم الدین کی وفات کے بعد انہوں نے سعیدہ کی شکل دوبارہ نہ دیکھنے کا سوچتے ہوئے شہر کے آخری کونے میں گھر بنوایا۔ مگر اقبال کی رضوانہ سے ضد میں کی ہوئی شادی کے بعد انہیں ایسا لگنے لگا۔ جیسے سعیدہ کا بھوت ان کے اعصاب پر پھر سے سوار ہو گیا ہو۔ جس سے پیچھا چھڑانے کے لیے انہوں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ جو کچھ بھی ہو جائے وہ اقبال پہ یہ ثابت کر کے ہی رہیں گی کہ رضوانہ سے اس کی شادی کا فیصلہ اس کی زندگی کی سب سے بڑی غلطی ہے۔ رضوانہ کے ساتھ وہ جتنا بھی برا کرتیں کم تھا آخر رضوانہ‘ سعیدہ کی بیٹی تھی جس سے انہوں نے زندگی میں سب سے زیادہ نفرت کی تھی۔ کیونکہ سعیدہ ہی کی وجہ سے وہ شوہر کے سامنے کبھی اچھی بیوی نہ بن پائیں۔ ان کے پکے ہوئے کھانوں میں عیب نکالتے ہوئے با آواز بلند رحیم

انہیں پھوہڑ' بد سلیقہ اور نہ جانے کیا کیا کہہ رہے ہوتے کہ کچن میں موجود سعیدہ اپنے سالن سے کٹوری بھرلاتی اور رحیم الدین کے سامنے انتہائی ادب سے پیش کرتی۔

"یہ لیجیے بھائی جان! آپ میرا سالن چکھ کر دیکھیں' کریم تو کہتے ہیں کہ اگر کسی دن ان کی انگلیاں کٹ گئیں تو ذمہ دار میں ہوں گی آخر کو اتنا سوادی کھانا بناتی ہوں۔" انتہائی ناز سے اطلاع دی جاتی۔ اور بھائی جان تائیدی انداز میں سرہلاتے ہوئے ہر لقمے پر تعریف کے ڈونگرے برساتے جاتے۔

وہ اس زیادتی پر شوہر سے کچھ نہ کہہ سکتیں کہ انہیں زیادہ بولنے والی اور بحث کرنے والی عورتوں سے چڑ تھی البتہ یہ ضرور دل چاہتا کہ سعیدہ کی چوٹی پکڑ کر اسے اپنے کمرے میں لے جاکر خوب سنائیں جو ایک کنال کے مشترکہ گھر کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ان کی طرف اسی وقت آدھمکتی جب رحیم ان کو کسی معمولی غلطی پر سخت سست سناتے ہوئے ان کے اگلے پچھلوں کی مٹی خراب کررہے ہوتے۔ انہیں لگتا دندا سے سے رنگے سرخ ہونٹ' کاجل سے بھری آنکھوں اور ریشمی لباس پہننے والی سعیدہ' ایک خون آشام بلا ہے' جو ان کے دل کے سکون' آرام اور خوشیوں کو ہڑپ کرتی جارہی ہے۔

☼ ☼ ☼

بے تحاشا کام' جسمانی راحت و دلی طمانیت کی کمی اور اوپر تلے تین بیٹیوں کی پیدائش نے رضوانہ کے جسم سے گداز' چہرے کی شادابی اور زبان سے نرمی چھین لی تھی۔ وہ اپنی طرف سے سلطانہ بیگم کا دل جیتنے کی پوری کوشش کرتی لیکن اس کی ہر کوشش نقش بر آب ثابت ہورہی تھی۔

"پوچھیں اس سے' یہ کس چکر میں عزیز کے گرد منڈلاتی رہی جب سے یہاں سے گئے ہیں اسی چڑیل کے گن گارہے ہیں۔ نہ میرے ہاتھ کا پکا کچھ پسند آتا ہے نہ میری صورت بھاتی ہے ہاں میں بھلا کیونکر اچھی لگوں گی۔ دل و دماغ پہ اس ڈائن نے جو قبضہ کررکھا ہے۔ ہائے میرا میاں میرا ہو کے بھی میرا نہ رہا۔"

شکیلہ کی میکے آمد ہمیشہ کسی نہ کسی فساد کا پیش خیمہ ثابت ہوتی تھی۔ اب یہ نیا واویلا اس کی سمجھ سے باہر تھا۔

"تیرا رونا بھی کچھ غلط نہیں ہے میری بچی! یہ اسی کلموہی سعیدہ کی پیٹ جائی ہے نا۔ دوسرے مردوں کو رجھا کر ان سے اپنے حسن و سگھڑاپے کی داد پانے کا خوب ڈھنگ آتا ہے۔

مرن جوگی سعیدہ کی وجہ سے بہشتی رحیم الدین میرے ہر کام میں عیب نکالتے تھے۔ مجال ہے' جو کبھی بھولے سے بھی تعریف کردیتے۔

تعریفوں کا کوٹہ تو بے حیا سعیدہ پہ ختم کرچکے ہوتے تھے۔ اس کی صفائی' سلیقے اور روپ رنگ کو سراہنے کے بعد میرے حصے میں جھڑکیاں اور طنز ہی آتے تھے۔ تو بھی اپنی ماں کی طرح کھوٹی نکلی۔" سلطانہ بیگم نے ایک تشنہ سرد آہ بھری۔

اس نئے الزام پہ تو اس کا خون جیسے رگوں میں جم کر رہ گیا تھا۔ شکیلہ کی مس کیرج ہوئی تو اس نے خدمت میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی تھی۔ سرمد' حنا اور سائرہ کا خیال بھی اپنے بچوں کی طرح رکھا کیونکہ ان کی اپنی ماں تو چارپائی ہی کی ہو کر رہ گئی تھی۔ سوا مہینہ گزرنے کے بعد بھی شکیلہ بستر پہ بیٹھے بیٹھے ہر چیز طلب کرتی اور وہ پندرہ دنوں کی فارحہ کو روتا بلکتا چھوڑ کر شکیلہ کی ایک پکار پر بھاگ بھاگ کر سارے کام انجام دیئے جاتی۔

بارہ سالہ سرمد تو انتہائی شریف اور خاموش طبع بچہ تھا جسے اپنی ممانی جان کے ہاتھوں کے کھانے خوب پسند آرہے تھے البتہ حنا اور سائرہ ضدی اور بدتمیزی ہونے کے ساتھ ساتھ کھانے میں اعتراض کرتیں تو شکیلہ اس پہ چڑھ دوڑتی۔

"بیماری نے مجھے تمہارا محتاج بنادیا ہے۔ جس کا تم خوب فائدہ اٹھارہی ہو۔ میری بچیاں بھوکی رہ جاتی ہیں تو میرا کلیجہ منہ کو آجاتا ہے۔" وہ سارا دن ان کی فرمائشیں پوری کرتے کرتے ہلکان ہوجاتی تھی۔ سلطانہ بیگم کی طرف سے اسے یہ آرڈر بھی ملا تھا کہ شکیلہ کے میاں کی ہر ضرورت کا خیال رکھنا بھی اس کے ذمے ہے۔ وہ اس گھر کا اکلوتا داماد ہے۔ اس لیے اس کی طرف سے کوئی شکایت نہ ملے۔

عزیز کے کھانے پینے' وقت پہ کپڑے تیار کرنے اور دوسری ضروریات و آرام کا خیال رکھتے ہوئے اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ یہ دونوں ماں بیٹیاں اس کی کارگزاری کو اتنے غلط معنی پہنادیں گی۔ ان کی بدگمانیوں کا گراف دن بدن بڑھتا ہی چلا جارہا تھا۔

"توبہ کیسی بے دید ہے تو رضوانہ ارے چڑیل بھی سات گھر چھوڑ کر کھاتی ہے۔ عزیز پہ ڈورے ڈالنے سے پہلے یہ تو سوچ لیا ہوتا میرا فرشتہ صفت بھائی تجھے محبت کا تاج پہنا کر بیاہ لایا ہے اب اس کی محبت میں خیانت کرتے ہوئے تجھے ذرا بھی رحم نہ آیا۔" شکیلہ نفرت سے پھنکاریں مارنے لگی۔ جب سے اس کے دیور سمیع نے رضوانہ کی چھوٹی بہن تہمینہ کو کسی فیملی فنکشن میں دیکھا تھا اس وقت سے اس کا گھٹنا پکڑ رکھا تھا کہ فی الفور اس کے لیے تہمینہ کا ہاتھ مانگنے جائیں کیونکہ ان کے چچا شکیلہ کی گارنٹی پر اس رشتے کے لیے ضرور راضی ہوجائیں گے۔ عزیز بھی بھائی کی ہاں میں ہاں ملانے لگے۔ کیوں کہ تہمینہ' رضوانہ کی بہن تھی جس کی خوب صورتی اور خوب سیرتی کا اعتراف وہ بارہا شکیلہ کے سامنے کرچکے تھے۔ اور شکیلہ میاں اور دیور کے منہ سے ان بہنوں کی تعریف سن کر کئی بل کھا چکی تھی۔ سمیع کے لیے وہ کسی قبول صورت' کم تعلیم یافتہ لڑکی کو اپنی دیورانی بنانے کا سوچ رہی تھی تاکہ گھر پہ اس کا سکہ جما رہے۔

تہمینہ تو رضوانہ سے کئی گنا زیادہ خوب صورت پڑھی لکھی ہونے کے ساتھ ساتھ بلا کی پر اعتماد لڑکی تھی جس کے آگے اس کی کسی طور نہیں چلتی تھی۔ تہمینہ کو دیورانی بنانا اپنے پاؤں پہ خود کلہاڑی مارنے کے مترادف تھا سو سمیع کو تہمینہ سے برگشتہ کرنے کے اس کے پاس بہانوں کی کمی نہ تھی بس عزیز کی رضوانہ کے لیے تعریف اسے کھولائے جارہی تھی۔

"ہو نہ ہو یہ رضوانہ ابھی تک ان کے حواس پہ چھائی ہوئی ہے۔ تبھی تو میرا کھانا بدمزا اور میں انہیں جھگڑالو۔ بدتمیز عورت دکھائی دیتی ہوں۔"

رضوانہ بھابھی کی صورت ایک مسلسل عذاب اس کے سر پر سوار تھا کجا کہ تہمینہ کو دیورانی بنا کر وہ ساری زندگی کے جلاپے کا انتظام کرلیتی۔

رضوانہ کو لگا جیسے وہ گرسنہ بھیڑیوں کے جتھے کے درمیان گھری ہوئی ہے۔ بالکل نہتی اور بے دست وپا۔ لفظ اندر ہی دم توڑ گئے تھے جب اس نے اقبال کے منہ سے ایک لفظ بھی اپنی حمایت میں نہ سنا۔ ماں' بہنوں کی بیوی پہ الزامات کی بوچھاڑ اس کی خاموشی کے دریا میں ذرا برابر بھی ارتعاش نہ لاسکی۔

اور اقبال کی اس خاموشی نے رضوانہ کو اندر سے جیسے توڑ کر رکھ دیا تھا۔

ناخوش تو سلطانہ اور شکیلہ بھی ہوئیں کیونکہ بیوی کے کردار پہ اتنا کیچڑ اچھالنے پر بھی اقبال نے ذرا سی بدگمانی بھری نظر رضوانہ پہ نہ ڈالی تھی۔

جاتے جاتے شکیلہ ایک دھماکہ کرتی گئی۔

"عاتکہ میرے سرمد کی دلہن بنے گی۔" پانچ سالہ عاتکہ کے ننھے ہاتھ میں سونے کا کنگن پہناتے ہوئے شکیلہ نے گویا سب کو مطلع کیا تھا۔

اس فیصلے کے پیچھے بھی اس کی اپنی غرض پنہاں تھی۔ اپنی اکلوتی نند سے اس وقت ہی ٹھن گئی تھی جب اس نے شکیلہ کے جہیز سے لے کر اس کے اٹھنے بیٹھنے کے طریقوں پر بری طرح تنقید کرتے ہوئے اسے کسی طور اپنے بھائی عزیز کے قابل قرار نہیں دیا تھا۔ اور اب یہی نند اپنی بیٹی کی نسبت سرمد سے یکجا کرنے کے چکر میں تھیں۔ سادہ لوح اور شریف عزیز کو اپنی اکلوتی بہن اور اس کی اولاد سے بے تحاشا پیار تھا۔ اسی پیار کو دیکھتے ہوئے انہیں یہ خدشہ رہتا کہ کہیں عزیز بہن کی باتوں میں آکر سرمد کو اس کی جھولی میں نہ ڈال دیں اس لیے بروقت فیصلہ کرتے ہوئے اس خدشے کی پیش بندی کردی تھی۔

"یہ نہیں ہو سکتا' میری عاتکہ ابھی اتنی چھوٹی ہے۔ اس کی زندگی کا اتنا بڑا فیصلہ اس کی رضامندی لیے بغیر کیسے ہو سکتا ہے۔؟" رضوانہ نے سنتے ہی انکار کر دیا۔

"لو! اب اتنی سی بچی کی رضامندی چہ معنی دارد؟ ویسے بھی ہم پگ کے وارث ہیں۔ تم میری بھتیجیوں کو اپنی طرف دینے کا سوچ رہی ہو تو یہ تمہاری خام خیالی ہے۔" شکیلہ نے رضوانہ کے انکار کو یوں چٹکی میں اڑا دیا تھا جیسے وہ عاتکہ کی ماں نہ ہو بلکہ اس کی گورنس ہو۔

رضوانہ کو بری طرح رونا آ رہا تھا۔ اسے یہ عاتکہ اور اپنے اوپر سراسر ظلم لگا تھا۔ تنگ دل و تنگ ذہن سلطانہ بیگم نے اس کی ذات کو کوڑی کا کر دیا تھا اور شکیلہ بھی تو انہی صفات سے متصف تھی بلکہ دو ہاتھ ماں سے آگے۔ وہ عاتکہ کو خود اپنے ہاتھوں جہنم میں نہیں جھونک سکتی تھی اس لیے اپنے انکار پہ اڑی رہی۔

"ارے بجائے شکر گزار ہونے کے منہ کو آ رہی ہو۔ میرا بچہ رشتے کے لیے کہاں ٹھوکریں کھاتا پھرے گا۔ شکیلہ تو بھائی کی محبت میں اس کا بوجھ بانٹ رہی ہے۔ تم چار بہنوں کو تو ماں نے مرغے پھانسنے کے خوب گر سکھا کر اپنا فرض پورا کر لیا ہے۔ لیکن یہ میری پوتی ہے۔ اس کی زندگی کا ہر فیصلہ کرنے کی میں خود مجاز ہوں تم نے بیٹیوں کی قطار لگانے کے سوا کیا ہی کیا ہے ایک بیٹا تک تو نہ دے سکیں۔ میرا ایک ہی بچہ ہے۔ شیخ رحیم الدین کی نسل آگے بڑھے تو کیسے بڑھے۔؟" سلطانہ بیگم کا لہجہ ازحد بے زاری لیے ہوئے تھا۔ اور یہیں آ کر وہ کمزور پڑ جاتی تھی۔

"اماں ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ سرمد میرا بھانجا ہے۔ کوئی جائے انکار رہتی ہے۔ بھلا۔" اقبال کا انداز دو ٹوک اور حتمی تھا۔

"وہ تو ٹھیک ہے اقبال! سرمد تو مجھے بھی خود پیارا لگتا ہے لیکن یہ سب ابھی کچھ قبل از وقت نہیں ہے؟ میں تو صرف چاہ رہی۔۔۔۔۔"

"پلیز رضوانہ! میں اماں کی اب کسی بات سے انکار نہیں کر سکتا۔ میں پہلے ہی ان کی بہت حکم عدولی کر چکا ہوں۔" اقبال نے بے زاری سے اس کی بات کاٹ دی۔

اماں نے شادی کے موقع پر کہا تھا کہ رضوانہ ایک کاغذی پھول ہے۔ جس کی خوشنمائی و دل فریبی وقت کے ساتھ تمہارے دل سے اتر جائے گی۔ اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے اماں کا کہا لفظ بہ لفظ درست ثابت ہو گیا ہے۔ اجاڑ حلیے' بکھرے الجھے بالوں' ویران چہرہ اور بے رونق آنکھوں والی رضوانہ سے تو اس نے محبت نہیں کی تھی۔ وہ جس رضوانہ پہ مرمٹا تھا وہ تو جب مسکراتی تھی تو اس کے رخساروں پہ بننے والے ڈمپلز میں اسے اپنا دل ڈوبتا محسوس ہوتا تھا۔ جس کے قہقہے کے ساتھ زندگی مسکراتی تھی۔ اور اب اس رضوانہ کے لبوں پہ بھولے بھٹکے سے کبھی دھیمی مسکان سجی ہو تو ہو ورنہ اس کے سپاٹ' بے تاثر چہرے دیکھ کر اسے صرف اکتاہٹ کا احساس ہوتا تھا اور بس۔

رضوانہ نے سوچ لیا تھا کہ وہ عاتکہ کی ایسی تربیت کرے گی کہ چچی اور شکیلہ اپنے لگائے ہوئے الزامات کی ازخود نفی کرنے لگیں گی۔

☼ ☼ ☼

میں نے دیکھ لیا ہے سب چکھ کر
تیرے عشق سے میٹھا کچھ بھی نہیں
نہ زہر نہ شیرا نہ شکر
تیرے عشق سے میٹھا کچھ بھی نہیں

میوزک کے تیز بلند شور سے اسے گھر کے در و دیوار ہلتے ہوئے محسوس ہوئے تھے۔ ناگواری کی ایسی تیز لہر اس کے اندر سے اٹھی کہ کچن میں کام چھوڑ کر فوراً" اندر جا کر اسٹریو کا پلگ کھینچ نکالا۔

"یہ کیا کر دیا باجی! میری پریکٹس ابھی پوری نہیں ہوئی اور شادی سر پر آ گئی ہے۔" فارحہ کمر کے گرد دوپٹہ باندھے انتہائی مہارت سے ڈانس کے اسٹیپ لے رہی تھی مگر اچانک میوزک بند ہونے سے وہ یک دم ساکت ہو گئی۔

"صبح سویرے لوگ اللہ' رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا نام لے کر دن کا آغاز کرتے ہیں ۔۔۔۔۔ ایک ہمارا گھر ہے جہاں بے ہودہ ڈرامے دیکھتے آنکھ بند ہوتی ہے اور لچر گانوں کی آواز سے آنکھ کھلتی ہے؟" وہ غصے سے بولتی ہوئی فارحہ کے دوپٹے کو کمر سے کھولتے ہوئے سر پر ڈالنے لگی۔ اسے حقیقتاً" ٹی وی کے اخلاق باختہ ڈرامے اور موویز زہر لگتے تھے۔ وہ ان فضول پروگراموں سے جتنا خار کھاتی تھی اتنا ہی سارے گھر والے ان پروگراموں کو انتہائی شوق اور توجہ سے دیکھا کرتے تھے۔

"بس آپ کو تو موقع ملنا چاہیے دادی کا رول پلے کرنے کا' جب دل چاہا سر پہ لادی نصیحتوں کی گٹھڑی میں سے حسب موقع نصیحت نکال کر سامنے والے پہ جھاڑ دی؟" فارحہ کا موڈ انتہائی آف ہو چکا تھا۔ عقیل ماموں کی شادی کی تیاریاں زور و شور سے جاری تھیں۔ شاپنگ کے ساتھ ساتھ ڈانس و سنگیت کا پروگرام سب کزنز نے مل کر بنایا تھا۔ لیکن وہ جب بھی ڈانس سیکھنے کی کوشش کرتی وہیں عاتکہ آ کر سارا پروگرام چوپٹ کر ڈالتی۔

"یہ انڈین میوزک کیوں اتنا تم لوگوں کو مسحور کیے ہوئے ہے۔ بے تکی شاعری پہ بے ہودہ ڈانس بھلا مسلمان لڑکیوں کو ان کی نقالی کرنا زیب دیتا ہے؟" وہ مدبرانہ انداز میں انہیں شرم دلانے کی کوشش کرتی۔

"پلیز عاتکہ باجی! آپ نے ہمیں جوائن نہیں کرنا تو نہ کریں' مگر یہ وعظ و نصیحت کو فی الحال لپیٹ کر کہیں رکھ دیں۔ ہمارے سویٹ ماموں کی شادی ہے' ہم نے سارے ارمان پورے کرنے ہیں۔" بصرہ ہاتھ جوڑ کر اس سے درخواست کرتی' بہنوں کو خود سے متنفر کرنا بھی مقصود نہیں تھا' اس لیے چپ سادھ لیتی۔ اس وقت بھی فارحہ کے تپے ہوئے چہرے کو تاسف سے دیکھتے ہوئے وہ باہر نکل آئی۔

"دادی!" اس نے ہولے سے پکارا تو دادی نے آنکھیں کھول دیں۔

"یہ گاجر اور موگروں کا اچار چکھ کر دیکھیں۔ بتائیں ترشی آئی ہے یا ابھی چند دن اور مرتبان کو دھوپ میں رکھوں۔" اچار کا پیالہ پائنتی پہ رکھ کر وہ ان کے سر کو تکیوں کی مدد سے اونچا کرتے ہوئے بولی۔

"فارحہ اور بصرہ کہیں گئی ہوئی ہیں کیا' گھر میں کافی خاموشی ہے' ابھی تھوڑی دیر پہلے تک تو شور شرابے کی آواز آ رہی تھی۔" بے حد نحیف آواز میں اس سے پوچھا۔

"جی! مجھ سے ناراض ہو گئی ہے۔ میرا ٹوکنا اسے برا لگا ہے۔ جب چھوٹا غلط چیز اپنا رہا ہو تو بڑے کا فرض ہوتا ہے کہ اسے صحیح و غلط میں حد فاصل کا پتا دے۔" وہ اداسی بھرے لہجے میں اپنی صفائی دیتے ہوئے بولی۔ اونچی آواز میں میوزک سننے پر پابندی لگاتے ہوئے اس کے پیش نظر یہ بھی ہوتا کہ اس کان پھاڑ شور سے ساتھ والے کمرے میں خلل پڑنے کا احتمال ہوتا ہے۔

دو سال قبل سلطانہ بیگم کے جسم کا نچلا دھڑ اور دایاں بازو فالج کے حملے سے تقریباً" ناکارہ اور بے حس و حرکت ہو گئے تھے۔ ان دو سالوں کے دوران ان کو اٹھانے' بٹھانے' کروٹ دلانے اور ادویہ اور پرہیزی کھانا وقت پر کھلانے کی مکمل ذمہ داری عاتکہ نے اپنے ذمہ لے لی تھی۔ مفلوج حصوں پہ روغن بادام کی مالش کرنے کے ساتھ ساتھ حوائج ضروریہ اور غسل جیسے مراحل میں بھی عاتکہ ان کی مدد و معاون ہوتی۔

سلطان بیگم ایک ایسے آمر کی طرح تھیں جنہیں قدرت نے ان کی بداعمالیوں کی وجہ سے معزول کر کے مسند اقتدار چھین لی تھی۔ ان کی سلطنت کا سورج ڈوب چکا تھا۔ تنہائی' مایوسی اور معذوری کی ایک طویل سیاہ رات ان پہ مسلط ہو چکی تھی۔ ان کے میزان حیات میں اچھائیوں اور نیکیوں کا پلڑا بہت سبک اور بالکل تہی تھا۔ اپنی بے بنیاد بڑائی' خود ساختہ تکبر و رعونت میں محض اپنی جھوٹی انا کی تسکین کی خاطر انہوں نے رضوانہ کی زندگی اجیرن کیے رکھی۔ تہمتوں کے چھینٹے اڑا کر اس کے شفاف کردار کو داغ دار کرتی رہیں کہ مبادا کہیں رضوانہ ان کے بیٹے پہ قابض ہو کر

ان کی راج دھانی نہ ہتھیا لے۔

بہت کج فہم اور کوتاہ نظر تھیں وہ۔ اپنے رب اور اس کے بندوں کے حضور وہ بہت شرمندہ تھیں۔ بے حد پشیمان۔ اب ان کا بیشتر وقت عرق انفعال کے قطرے بہاتے گزرتا۔

''باجی! درزن کپڑے دے گئی ہے' آپ آکر اپنے کپڑے دیکھ جائیں؟'' فارحہ پیغام اسے پہنچاتی فوراً پلٹ گئی تھی۔

''اچھا دادی! میں ذرا کپڑوں کا جائزہ لے آؤں؟'' فالج زدہ بازو کی فزیو تھراپی کرنے کے بعد اس نے انتہائی احتیاط سے بازو ان کے پہلو میں رکھتے ہوئے جانے کا عندیہ دیا۔

''جیتی رہو' خدا ہر خوشی دکھائے' مجھ محتاج و بے کس کو تمہارے وجود کا ہی تو سہارا ہے۔'' سلطانہ بیگم کے منہ سے اس کے لیے دعاؤں کا چشمہ جاری ہو گیا تھا۔ کپڑے اس کے حسب منشاء سل کر آئے تھے۔

بالکل سادہ اور ڈھیلے ڈھالے' البتہ بصرہ اور فارحہ نے اپنی خواہش کے مطابق ہر فنکشن کے مختلف ڈریسز بنوائے تھے۔

''اف! ترس آرہا ہے مجھے سرمد بھائی کی قسمت پر۔ بے چارے کافی عرصہ بعد ننھیال کا چکر لگا رہے ہیں اور ہماری ہمشیرہ محترمہ کو دیکھ کر انہیں یقیناً'' مایوسی ہی ہوگی۔ کہاں خود ویل ڈریس اور ریفائنڈ بندے اور کہاں ان کی ہونے والی شریک حیات جسے چٹیا کے سوا اور کوئی ہیر اسٹائل پسند نہیں۔ جسے میک اپ سے الجھن ہوتی ہے اور فینسی کپڑے پہننا حرام سمجھتی ہے۔'' اپنی چولی جس کا آگے پیچھے گلا بے حد گہرا تھا۔ خود پہ لگائے آئینے میں جانچتی نظروں سے خود کو دیکھتے ہوئے بصرہ نے اس کے مناسب قیمت کے کپڑوں پہ چوٹ کی تھی۔

''ایسے فضول اور بے ہودہ ملبوسات کم از کم میں تو نہیں پہن سکتی۔ ساڑھی کو پہننا تو اپنی مذہبی و ملی روایات کو سبوتاژ کرنے کے مترادف ہے۔ کئی گز لپیٹ کر بھی ستر پوشی کا احساس نہیں ہوتا۔ پاجامے کا پہننا نہ پہننا برابر ہے اور لہنگا چولی کو تو دل چاہتا ہے آگ لگا دوں۔ کیا فائدہ ایسے لباس کا جسے پہنتے ہوئے برہنگی کا احساس ہونے لگے۔'' بے حد اطمینان سے ان کے کپڑوں کے بخیے ادھیڑتے ہوئے وہ اپنے جوڑں کو تہ لگانے لگی۔

اپنی قمیص کا ڈیزائن ناقدانہ نظروں سے دیکھتے ہوئے رضوانہ نے چونک کر اس کا چہرہ دیکھا تھا۔ عاتکہ ویسی ہی تو تھی جیسی وہ چاہتی تھیں۔ سادہ' بے ریا' شوخی و بانکپن سے انجان' پھر پتا نہیں ان کا دل کیوں اسے اپنی دوسری بیٹیوں سے یوں یگانہ و مختلف دیکھ کے شرمندہ ہوا تھا۔ رضوانہ کو لگا کہ بچپن میں تربیت کے نام پہ جو اس کی معصوم خواہش رد کرتی رہی تھیں اور یہ تشنہ خواہش اس کی ذات میں خلا پیدا کرنے کی موجب بنی ہیں۔

صرف کپڑوں تک ہی نہیں دوسری عادات میں بھی وہ ان سے یکسر جدا تھی۔ بصرہ بے حد فیشن کی دلدارہ ہونے کے علاوہ وسیع حلقہ احباب رکھتی' جبکہ اس کی کوئی دوست نہیں تھی' جو تھیں ان کا ساتھ پڑھائی کے ساتھ ہی چھوٹ گیا تھا۔ کالج میں پڑھنے کی اجازت نہ ملنے پر اس نے پرائیویٹ پڑھنے کا بھی ارادہ ترک کیا تھا۔ اپنی ماں کے برعکس اپنے بچپن کی یہ محرومیاں نہ تو اس کے پیمانہ صبر کو توڑ سکیں' نہ ہی کسی قسم کی مایوسی نے اس کے دامن فکر کو تار' تار کیا۔ اپنا بچپن اور لڑکپن اس نے تنے ہوئے رسے پہ چلتے ہوئے بتایا تھا۔ لیکن لبوں پہ کوئی شکوہ کبھی بھولے سے بھی نہ مچلا تھا۔ اس کا دل طمانیت کی دولت سے تونگر تھا۔

اقبال کو اس کے ہاتھ کے سوا کسی اور کے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا پسند نہ آتا۔ اس کے ہاتھ سے دوائی لیتے ہوئے دادی کو یقین تھا کہ وہ تیزی سے روبہ صحت ہو رہی ہیں۔ اس کی خوش خلقی نے خاندان بھر کے دل موہ لیے تھے۔ ہر شخص اس کی خوب سیرتی کو سراہنا اپنا فرض سمجھتا۔ ایسے میں وہ کس چیز کی شکایت کرتی' بے وجہ گلہ کس سے کرتی؟

اس کی تربیت جن اصولوں پہ ہوئی تھی وہ اصول

اسے بہت پیارے تھے۔ کچے ذہن و دل پہ جو نقوش ثبت ہوئے تھے اب پتھر پہ تحریر بن چکے تھے۔ ساحل کی ریت پہ لکھے ہوئے چند لفظ نہیں کہ ایک لہر آئی اور سب کچھ مٹ گیا۔

☆ ☆ ☆

''رضوانہ صحیح کہتی تھی' چھوٹے نابالغ بچوں کی زندگی کا سب سے بڑا فیصلہ قبل از وقت کچھ ٹھیک نہیں ہوتا' اب یہ ہی دیکھ لیں' سائرہ اور حنا تو عاتکہ کو دیکھ کر انتہائی مایوس ہوئی ہیں' بڑے سے تنبو میں خود کو لپیٹے ہوئے الگ تھلگ خاموشی سے بیٹھی عاتکہ انہیں کسی طور پر اپنی بھابھی بنانے کے قابل نہیں لگ رہی تھی۔'' شکیلہ کا لہجہ گلہ آمیز اور کسی قدر مایوسانہ تھا۔

''کیوں تمہاری بیٹیوں کو عاتکہ اپنے بھائی کے قابل کیونکر نہیں لگی' شریف' باحیا' سگھڑ اور تمیزدار لڑکی تو ہر گھرانے کی چاہ ہوتی ہے' مگر لگتا ہے بڑے گھروں میں بیاہنے سے تمہاری بیٹیوں کا دماغ الٹ گیا ہے۔'' سلطانہ بیگم نے تیکھے چتونوں سے بیٹی کو گھورا تو شکیلہ کا منہ حیرت سے کھل گیا تھا۔

''اماں! آپ کی ناراضی بے جا ہے' زمانہ بدل گیا ہے۔ اس کی قدریں بھی بدل گئی ہیں اور سگھڑاپے کا کیا کرنا ہے' گھر میں دس' دس نوکر موجود ہیں' ان سب کے علاوہ بھی اور بہت کچھ درکار ہوتا ہے۔ عاتکہ میں تو آج کل کی لڑکیوں والی کوئی بات نہیں۔ خاندان میں ایک سے ایک طرح دار' خوب صورت اور تعلیم یافتہ لڑکی موجود ہے' اب بتائیے بھلا جسے نہ پہننے کا سلیقہ ہے' نہ بات کرنے کا ڈھنگ۔ سرمد کو کمپنی غیر ملک بھیج رہی ہے' وہ کہتا ہے شادی کے بعد بیوی کو ساتھ لے جائے گا۔ عاتکہ ہمارے ماحول میں سروائیو کیسے کرے گی۔'' ماں کے روکھے اور سخت تیوروں نے اسے اب کے نرم اور مصالحانہ انداز اپنانے پر مجبور کر دیا تھا۔

''تو ٹھیک ہے تمہیں اپنی پسند کی بہو اپنے سسرال میں آسانی سے مل جائے گی' مگر سرمد کیا واقعی اس رشتے سے دلی طور پر دست بردار ہوا ہے؟'' سلطانہ بیگم کا انداز چبھتا ہوا تھا۔ شکیلہ کا جواب خاموشی تھا۔

''آپا! چچی جان ٹھیک کہہ رہی ہیں' بچوں کی مرضی کے خلاف اپنے فیصلے ان کے سروں پہ تھوپنا محض حماقت ہے' عاتکہ کو تو جمیل بھائی اپنے نبیل کے لیے بچپن سے مانگ رہے ہیں۔ آپ کی ہی جوڑی گئی نسبت کی بدولت میں انہیں کوئی امید افزا جواب دے نہ پائی تھی' لیکن اب تو ایسا کوئی مسئلہ نہیں ہے' ہم بہن' بھائی آپس میں مل جائیں' میرے لیے اس سے بڑی خوشی کی کیا بات ہو سکتی ہے۔'' بے فکری اور طمانیت رضوانہ کے ہر انداز سے عیاں تھی۔ لہجہ ایک لمحے کو خوشی سے معمور ہو گیا تھا۔

اب وہ گھگیاتی' گھبراتی رضوانہ نہیں تھی جو شکیلہ کی ہر کڑوی کسیلی کو خاموشی سے سن' سہہ لیتی۔ اب اس کے پاس ساس کا اعتماد اور شوہر کی مان بھری محبت تھی' جس کے بل بوتے پر وہ اب اپنے بچوں کے بارے میں ہر طرح کا فیصلہ کرنے کا اختیار رکھتی تھیں۔ زندگی کے کٹھن سفر میں انہیں سرخروئی ملی تھی' پایا بی حاصل ہوئی تھی۔ اقبال ہر معاملے میں ان کی رائے کو ترجیح دیتے اور سلطانہ بیگم کا وجود تو ان کے رحم و کرم پہ تھا۔ فالج کے جھٹکے نے جسم سے حرکت چھین لی۔ زبان کا دم خم جاتا رہا۔ لیکن وہ ہر لمحہ ان کی بزرگی اور بڑائی کو اولیت دیتیں۔

رضوانہ کے لیے تو وقت نے الٹے پاؤں سفر کرنا شروع کر دیا تھا۔ کمزور بے رونق چہرہ گلابیاں چھلکانے لگا تھا۔ ہونٹوں سے روٹھی ہنسی اب پہلے سے شوق و شنگ قہقہے میں بدل گئی تھی۔ بہنوں کے گھر کے خوب چکر لگتے اور اپنے ملبوسات کی تراش خراش کی فکر کسی نوخیز دوشیزہ کی طرح رہنے لگی تھی۔

''عاتکہ میرا پارہ جگر اور آنکھوں کا نور ہے۔ میں بدبخت بھلا اسے تمہارے گھر میں کیسے جھونک سکتی ہوں' جہاں اس کی قدر نہ ہو' تمہاری بیٹیوں کے معیار تک جو لڑکی پہنچے گی یقیناً'' اس کے کرم ہی پھوٹیں گے' ہونہہ۔

"ٹھکرتے انگور چڑھایا ہر گچھا زخمایا" والی بات ہوگی' میری بخت آور بچی کے ساتھ۔" نخوت بھرے لہجے میں کہتے ہوئے سلطانہ بیگم نے گویا آخری فیصلہ سنایا تھا۔ رضوانہ نے جتاتی ہوئی نظروں سے شکیلہ کو دیکھا تو وہ ماں کی اس درجہ بے رخی اور "توتا چشمی" پر کڑھ کر رہ گئی تھی اور اس سارے مذاکرے کو باہر کھڑکی سے لگی غور سے سنتی عاتکہ کا دل دھڑکنا بھول گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

ٹھٹھرتے' یخ بستہ سرما کا گریباں چاک کرتا ہوا موسم خوشی سے بہار سے ہم آغوش ہونے لگا' رت کیا گدرائی کہ ہر بے برگ و بار بوٹا گل و بو سے آراستہ ہوگیا۔

مستانی ہوا کے عطر بیز مست جھونکوں نے دلوں کو گدگداتے ہوئے امید وصل کی کونپل کو کھلنے کا موقع فراہم کردیا تھا۔

وہ آج کئی دنوں بعد باغ کی سمت آئی تھی۔ اسے اپنے گھر کا یہ حصہ اتنا ہی پسند تھا جتنا کہ بچپن میں' تبھی تو دادی کی بیماری کی وجہ سے پودوں کی تراش خراش' نلائی و آبیاری کا کام وہ خود تندہی سے انجام دینے لگی تھی۔ اسی لیے تو باغ اتنا ہی سرسبز و شاداب اور ہرا بھرا تھا جتنا کہ دادی کے زیر نگرانی ہوتا تھا۔

گزشتہ ایک ہفتے سے شادی کی مصروفیت کے باعث وہ باغ کی صفائی نہ کرسکی تھی۔

نئی کلیوں کو پھوٹنے کی جگہ دینے کے لیے عمر رسیدہ پھول اور درختوں کے نیچے بوسیدہ پتوں کا ڈھیر لگا تھا۔ لیکن اس کے جسم و جاں پہ ہنوز خزاں کا بسیرا تھا۔

رات دادی کا فیصلہ سننے کے بعد اسے خوش ہونا چاہیے تھا کہ پھپھو شکیلہ نے بہو تو درکنار کبھی بھتیجی کی حیثیت سے اپنا دستِ شفقت اس کے سر پر نہیں پھیرا تھا۔

اس طوق کے گلے سے نکلنے پر تو اسے جشن طرب و نشاط بپا کرنا چاہیے تھا کہ اپنی پھوپھی زاد بہنوں سائرہ اور حنا کی ایک لمحے کی بھی صحبت اس کی روح پہ گراں گزرتی تھی۔ ان کی شیخی بگھارتی باتیں' پر تصنع انداز گفتگو' دامن تہذیب کو تار تار کرتے ملبوسات فاخرہ کو وہ انتہائی ناگواری سے دیکھتی تھی۔

قسمت نے اسے اس روح کے آزار سے نجات دلا دی تھی۔ لیکن اس کا دل کیوں اندر سے پچھاڑیں مار رہا تھا۔ روح جسم سے نکلتی محسوس ہو رہی تھی۔ لبوں سے پہلے مسکراتی آنکھیں دھواں دھواں ہو رہی تھیں۔

اپنی یہ کیفیت خود اس کے لیے بھی اجنبی تھی۔ خود سے اس بے کلی اور بے چینی کا جتنی دفعہ جواب مانگا ہر بار ایک ہی جواب آیا کہ وہ سرمد عزیز کی محبت میں پور پور ڈوبی ہوئی ہے۔ سرمد عزیز کی چاہت اس کے تار و پود میں یوں پیوست ہے گویا اس چاہت سے منہ موڑنا جسم و جاں کا تعلق قطع کرنا ہے۔ اس جذبے کا ادراک اسے پہلے تھوڑا بہت تو تھا جس کا اعتراف وہ خود سے کرنے سے کتراتی تھی' جھجکتی تھی' لیکن اب دل کی بغاوت پر ششدر و پریشان رہ گئی تھی۔

طاقچۂ دل پہ دھرا سرمد کی محبت کا چراغ اس کے دل کی نگری کو فروزاں کیے ہوئے تھا۔ اب اس چراغ کی ہموار لو یوں بھڑکنے لگی تھی' جیسے کسی دم بجھا چاہتی ہو۔

دونوں بازو ٹانگوں کے گرد لپیٹنے کے بعد اس نے سر خستگی سے ان پہ رکھ دیا تھا۔ بے جان نظریں تازہ شگوفوں سے ہوتی ہوئی سامنے زمردیں گھاس کے فرش پہ عالم انبساط میں لوٹیاں لیتی بلبل پہ ٹک گئی تھیں۔ قریب ہی خزاں رسیدہ' خشک' بے جان سوکھے پتوں پہ کسی کے قدموں کی زوردار چاپ ابھری تھی۔ اس نے چونک کر سر اٹھایا تو نظر سامنے جس ہستی پہ پڑی تو وہ ساکت بیٹھی رہ گئی۔

ٹک ٹک دیدم دم نہ کشیدم کے مصداق وہ اس چہرے سے نظریں ہٹانا بھول گئی تھی جو ہاتھ بھر کے فاصلے پہ ہونے کے باوجود اسے قرنوں کی مسافت پہ کھڑا دکھائی دیا۔

"دادی اور سسٹرز کی تمہارے بارے میں کہی سب

باتیں غلط سہی' مگر ایک بات تو طے ہے کہ تم ایک بدذوق اور حس لطیف سے عاری لڑکی ہو۔ جسے بہار کی سحر آفرینی' دل فریبی اور جادوگری سے کوئی غرض نہ ہو۔ ایسے منہ لٹکائے اس مثل بہشت جگہ پہ بے زار بیٹھی تم یوں تاثر دے رہی ہو جیسے فطرت سے تمہیں ذرا برابر بھی دلچسپی نہ ہو۔" ہلکے پھلکے' دوستانہ انداز میں بولتے ہوئے وہ قدرے فاصلے پہ اس کے پہلو میں بیٹھ گیا تھا۔

پھولوں کے کنج کے قریب بیٹھی وہ بھی ایک پھول ہی لگ رہی تھی۔ ایک کملایا ہوا خزاں گزیدہ پھول' جس کے لب و رخسار سے پت جھڑ کی سرد و تیز ہوا نے تازگی کا غازہ نوچ لیا ہو۔

اس کی اس درجہ قربت سے ہاتھوں میں در آنے والی کپکپاہٹ کو چھپانے کے لیے اس نے بازوؤں کو ٹانگوں کے گرد زور سے کسا تھا۔ لب انداز تکلم بھول گئے تھے۔

"تم یقیناً" بڑوں کے فیصلے سے ڈسٹرب ہو۔ میں بھی ڈسٹرب ہوں' اس سوچ سے کہ راہ حیات پہ تمہارا چند قدموں کا ساتھ نصیب بھی نہیں ہوا کہ بچھڑنے کی گھڑی آ پہنچی۔ لیکن خیر' میرے جذبوں میں اتنی زور آوری ہے' تبھی تو امی کو راضی کرلیا ہے۔ باقی رہ گئیں میری عزیز خواہران' جنہیں تمہیں بھابھی بنانے میں اس لیے تامل ہے کہ تم ٹیبل مینوز نہیں جانتیں' چمچہ و کانٹے کا استعمال نہیں آتا' کھانے کے بعد پیالہ صاف اور انگلیاں چاٹ لیتی ہو۔ لیکن میں ان کی طرح ظاہر بین اور کم فہم ہرگز نہیں ہوں۔ میرا دل تو سدا سے اس لڑکی کا تمنائی رہا ہے' جسے زشت و خوب کی تمیز ہے' جو نیک و بد میں امتیاز کرنا جانتی ہے' جسے مخلص و غیر مخلص کی خوب پہچان ہے۔ اس کی محبت میرے حرز جاں اور نام ورد زباں رہتا ہے۔" دھیمے دھیمے' ٹھہرے ہوئے انداز میں بولتے ہوئے سرمد نے اس کے گوشہ چشم پہ ٹکے شبنمی قطرے کو ہاتھ بڑھا کر اپنی انگلی کی پور پہ چن لیا تھا۔ تو وہ جو ہمہ تن بیٹھی اس کے لفظوں کے سحر میں جکڑی اس کا ایک ایک لفظ خود فراموشی کے عالم میں سن رہی تھی' اس حرکت پہ چونک کر اسے دیکھا۔ سرمد کی آنکھیں محبت کی جوت سے جگمگا رہی تھیں اور چہرے پہ نرم' اس کے جذبوں کا پتا دیتی ایک البیلی مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔ عاتکہ نے شانت ہو کر اس کے چہرے سے نظر ہٹا کر طائرانہ انداز میں باغ کا جائزہ لیا تھا۔

پرندوں کی چہچہاہٹ پہلے کی نسبت بڑھ گئی تھی۔ نئی کونپلیں' تازہ شگوفے' ہریالی' نوع بہ نوع کے پھول اور شاداب روشیں دور' دور سے ان کی بلائیں لے رہے تھے۔ اس بہار کا رنگ اس کی زندگی کی گزری بہاروں سے کئی گنا خوب صورت' جدا اور حیات بخش تھا۔ اس کے طاقچۂ دل پہ دھرے سرمد کی محبت کے چراغ کی تھرتھراتی لو کو قدرت نے اپنے ہاتھوں کی اوک میں لے کر متوازن اور ہموار کردیا تھا۔

☼ ☼

☆ "کے ڈی اے کوہاٹ جہاں میرا گھر اور سسرالیوں کے گھر ہیں۔"

○ وہ جگہ جہاں چھٹی گزارنا پسند کروں؟

☆ "کوہاٹ۔"

○ میری قوت ارادی؟

☆ "کوئی خاص نہیں۔"

○ "گھر کا پسندیدہ کمرا؟"

☆ "اپنا بیڈ روم۔"

○ "کیا پہننا پسند کرتی ہوں لباس میں؟"

☆ "شلوار قمیص۔"

○ "پسندیدہ رنگ؟"

☆ "ہرا رنگ۔"

○ "پسندیدہ مصنف؟"

☆ "عظیم الحق حقی۔"

○ "پسندیدہ شاعر؟"

☆ "شاعری کے بارے میں کچھ نہیں جانتی کسی شاعر کو نہیں پڑھا تو مناسب جواب کیا دوں۔"

○ "ویران سنسان جزیرے پر سب سے پہلا کام کیا کروں گی؟"

☆ "کوئی گھر ڈھونڈوں گی تاکہ کسی سے بات کر کے اپنا خوف کم کر سکوں۔"

○ "خود اپنی بری عادت؟"

☆ "غصہ پہلے کبھی اتنا نہیں آتا تھا اب بڑی غصیلی ہو گئی ہوں اور بھی بہت سی ہیں صفحات کم پڑ جائیں گے۔"

○ "کھانے کی پسندیدہ جگہ؟"

☆ "اپنا گھر اپنے گھر کا کھانا شوق سے کھاتی ہوں۔"

○ "اگر میں مصنفہ نہ ہوتی تو؟"

☆ "تو ایک صحافی ہوتی۔"

○ "ایک لفظ جو مجھے واضح کردے؟"

☆ "لاپرواہ۔"

○ "جنس مخالف کے بارے میں رائے؟"

☆ "ان کی آنکھیں ان کے اندر کا حال بتا دیتی ہیں۔"

○ "محبت کے بارے میں خیال؟"

☆ "بے لوث جذبہ۔"

○ "پسندیدہ رشتہ؟"

☆ "ماں' اولاد۔"

○ "اگر محبت کی تو کیا نتائج نکلیں گے؟"

☆ "اگر محبت کی تو شوہر صاحب قتل کر دیں گے۔"

○ "پسندیدہ لو اسٹوری؟"

☆ "ایک پسندیدہ لو اسٹوری ہے لیکن نام نہیں بتاؤں گی شاید برا مان جائیں۔"

○ "کوئی ایسی فلم جو بار بار دیکھنا چاہیں؟"

☆ "مسکراہٹ۔"

○ "چہرے کچھ بتاتے ہیں؟"

☆ "کچھ چہرے ایسے ہوتے ہیں جو اپنے اندر کا سارا حال بتا دیتے ہیں منفی و مثبت تاثرات ایسے چہروں سے بہ آسانی ٹپکتے ہیں وہ چہرے حسد' محبت' نفرت سب بتا دیتے ہیں۔"

○ "شاعری کے بارے میں خیال؟"

☆ "اپنے اندر کی تشنگی و جذبات کے اظہار کے لیے اچھی ہے لیکن ٹھوس حقائق شاعری کو وہ تھپڑ مار دیتی ہے کہ انسان زندگی اور شاعری میں نمایاں فرق محسوس کرنے لگتا ہے۔"

○ "میری جستجو' میری کھوج؟"

☆ "مخلصانہ رویے' پیار بھرے لہجے۔ میں انہی کی کھوج میں ہوں۔"

○ "بہترین کامیابی؟"

☆ "ابھی تو ان دنوں کے انتظار میں ہیں جب حقیقتاً کوئی غیر یقینی کامیابی ملے۔"

○ "وہم کا ازالہ کس طرح کرتی ہوں؟"

☆ "مجھے بے شمار اوہام لاحق ہیں۔ اب ایک ایک کیا بتاؤں' جس طرح کے آج کل کے حالات ہیں تو ان کے پیش نظر باہر نکلنے کا وہم۔ بچے اور شوہر جب تک گھر

نہیں آتے وہم لاحق رہتا ہے۔ پھر اس وہم کا ازالہ قرآنی آیات کی ورد سے ہی ہوتا ہے۔ کلام پڑھ کر پھونکتی ہوں تو دل کو کچھ ڈھارس رہتی ہے۔"

○ "سائنس کی بہترین ایجاد؟"

☆ "موبائل۔"

○ "بدترین ایجاد؟"

☆ "کیبل' جس سے غیر اخلاقی پروگرام نشر ہوتے ہیں۔"

○ "ایسی شخصیت جو شدت سے یاد آتی ہے؟"

☆ "اپنے والد صاحب (اللہ ان کی مغفرت فرمائے۔)"

○ "بستر پر جانے سے پہلے کیا جانے والا آخری کام؟"

☆ "کچن سمیٹنا۔"

○ "ایک بات جو ہمیشہ یاد رہی؟"

☆ "میٹرک کے رزلٹ والے دن میری ٹیچر مس ترنم نے کہا تھا کہ یاد رکھنا جو اپنی قابلیت سے آگے بڑھتے ہیں ان پر زندگی کے دروازے کبھی بند نہیں ہوتے۔"

○ "زندگی کا خوب صورت ترین دن؟"

☆ "جب میں اپنے نئے گھر میں شفٹ ہوئی تھی اس دن میری خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔"

○ "پیغام قارئین کے لیے؟"

☆ "عزیز از جان بہنوں! پہلے تو میں آپ سب کی بے پناہ مشکور ہوں جنہوں نے میری کہانیوں کو سراہا۔ کچھ نے مجھ پر بڑے مزے کی تنقید بھی کی جن میں سر فہرست میری کزن نگہت ہے۔ کہتی ہے۔

"یار ایک تو تمہارے ہیرو ہیروئن کے ڈائیلاگ کم ہوتے ہیں۔ ایک تم کہانی ایک قسط میں لکھ کر جان چھڑاتی ہو۔ تمہاری ہیروئن بے چاری تو چائے بنا بنا کر تھک جاتی ہے۔ اس سے چائے کم بنوایا کرو اور مزید فرمائش کرتی ہے کہ کہانی تین چار اقساط تک لے جایا کرو۔ اب اللہ کرے کہ میں ایسا کر سکوں۔ ورنہ تو مصروفیت ہے کہ...... میری تمام دوستوں سے اپیل ہے کہ میری کہانیوں کو بڑے شوق' لگن' پیار سے پڑھا کریں اور مجھے اپنی دعاؤں میں یاد رکھیے۔"

○ "کرن کے بارے میں رائے؟"

☆ "کرن ہمارے لیے صبح کی وہ کرن ہے' جو سب کے لیے زندگی کی نوید لاتی ہے۔ کرن نے مجھے نام دیا عزت دی اس سے بڑھ کر میرے لیے کوئی خوشی ہو ہی نہیں سکتی۔ سب سے بڑھ کر اسی کرن نے مجھے بے پناہ محبت والی اچھی اچھی فرینڈز دیں تو میں آج اگر کچھ ہوں اسی کرن کی بدولت ہوں کرن اور نادیہ امین ایک تصویر کے دو رخ ہیں۔ نادیہ امین کرن کے بغیر کچھ نہیں۔ میں کرن کے لیے حقیقتاً دعا گو ہوں کہ اللہ اسے دن دگنی رات چگنی ترقی دے اللہ ہم سب کو اپنے حفظ و امان میں رکھے۔ آمین۔"

☆ ☆

مکالمہ انسان کو زندگی کی دیگر شکلوں سے ممتاز کرتا ہے انسان و حیوان کے مابین ایک واضح حد کھینچتا ہے اور انسان کو اس قابل بناتا ہے کہ وہ نا صرف دوسرے انسانوں کے احساسات اور سوچوں کو جان سکے، بلکہ اپنے خیالات اور جذبات سے بھی آگہی حاصل کر سکے۔

زندگی کے ہر میدان اور شعبے میں ہر شخص باتوں کی بساط بچھا کر لفظوں کے مہرے آگے پیچھے کرنے میں لگا ہوا ہے۔ ہر موضوع پر باتیں ہو رہی ہیں، ہر زاویے پر لکھا جا رہا ہے۔ نئے نکتے تلاش کر کے نئے سرے سے باتوں کے جال بچھائے جا رہے ہیں لیکن اپنے کہے پر، اپنے منصوبوں پر عمل کوئی نہیں کر رہا۔ ہر شخص دوسرے سے شکوہ کناں ہے۔

اگر آپ کو حالات سے، لوگوں کے رویوں سے، ارد گرد کے ماحول سے کچھ شکایات ہیں تو ایسی شکایات اوروں کو بھی آپ سے ہوں گی متعلقہ افراد سے ان شکایات کے سلسلے میں تبادلہ خیالات کر کے ان شکایات کو دور کیا جا سکتا ہے۔ لوگوں کی ایسی تمام باتیں، حرکتیں جو تکلیف دہ محسوس ہوں انہیں کہہ دیں۔ اگر اسے آپ نے اپنے ذہن میں جمع کیا تو وہ فضول احساسات کا کباڑ خانہ بن جائے گا اور اس میں کسی اچھے جذبے، احساس، خیال یا تصور کے لیے جگہ نہیں رہے گی۔

اپنے خیالات کو لفظوں کا روپ دے کر ہمیں بھیجیں۔ مگر تنقید برائے اصلاح ہو نہ کہ تنقید برائے تنقید..... آپ کی تنقید ہو سکتا ہے کہ کچھ سدھار لانے میں معاون ثابت ہو۔

اسی حوالے سے ہم نے قارئین کے لیے ایک سلسلہ "بول کہ لب آزاد ہیں تیرے" کے نام سے شروع کیا ہے۔ جس کے ذریعے آپ کے خیالات دوسروں تک با آسانی پہنچ سکتے ہیں اور یہی ذریعہ معاشرے میں سدھار لا سکتا ہے، تو اپنی رائے کا اظہار کھل کر کریں۔

بول کہ لب آزاد ہیں

ریحانہ امجد بخاری

عالیہ ذوالقرنین..... لاہور

"بول کہ لب آزاد ہیں تیرے" ایک یقین دلاتا ہوا موضوع کہ ابھی باضمیر دنیا میں باقی ہیں۔ میڈیا مقید تو ہے، مگر اتنا نہیں کہ کچھ بھی سچ شائع نہ ہو سکے۔ اور الحمدللہ تاقیامت شر کے ساتھ ساتھ خیر کی قوتیں بھی کام کرتی رہیں گی۔

آج اپنے چاروں طرف نظر دوڑائیں تو ہر طرف مختلف نوعیت کی تکالیف، پریشانیاں، نفسیاتی الجھنیں انسان کو گھیرے نظر آتی ہیں۔ کبھی اس کی وجہ سوچیے ہمارے جیسے اعمال اوپر جا رہے ہیں ویسے فیصلے نیچے آ رہے ہیں۔ اور یہ تو نظام قدرت ہے۔

حدیث قدسی ہے۔

"اے ابن آدم! اک تیری چاہت ہے اور اک میری چاہت ہے۔ اگر تو نے فرماں برداری کی اس کی جو میری چاہت ہے تو میں نوازدوں گا تجھے وہ بھی جو تیری چاہت ہے۔ اگر تو نے نافرمانی کی اس کی جو میری چاہت ہے تو میں تھکا دوں گا تجھے اس میں جو تیری چاہت ہے، پس ہوگا وہی جو میری چاہت ہے۔"

غور کیجیے کہ کیا ہم اپنے رب کی چاہت پر پورا اترنے کی جدوجہد کر رہے ہیں؟ ہم سے پہلے بہت قومیں آئیں، لیکن اللہ کی نافرمانی پر صفحہ ہستی سے مٹا کر رکھ دیا گیا۔ وہ تمام عناصر فطرت جو انسان کے فائدے کے لیے مسخر کیے گئے ان سے رب العزت نے کام لیا۔ اور ان قوموں کو عبرت کا نشان بنا دیا۔ قوم نوح علیہ السلام آئی۔ نافرمانی کرتی، اللہ کی وحدانیت کا انکار کرتی، حضرت نوح علیہ السلام دعوت حق دیتے تو کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیتے، نو سو پچاس سال کے طویل ترین عرصے کے باوجود چالیس مرد اور چالیس عورتوں کے سوا کوئی ایمان نہ لایا۔ خدا کی خدائی حرکت میں آئی اور پانی کو تباہی کا ذریعہ بنا دیا۔

قوم عاد آئی وندناتی ہوئی۔ "من اشد منا قوۃ" (ہم میں کون طاقت میں زیادہ ہے) کا نعرہ لگاتی۔ چار سو گز لمبے قد والے لوگ۔ زمین پر طاقت سے پاؤں مارتے تو زانو تک پاؤں اندر چلا جاتا۔ اللہ کو جھٹلایا تو اس کا نظام حرکت میں آیا۔ اللہ عزوجل نے ہوا کو تباہی کے لیے منتخب کر کے انہیں خس و خاشاک کی طرح تباہ و برباد کر کے رکھ دیا۔

قوم ثمود نے اپنے پیغمبر حضرت صالح علیہ السلام کی نہ مانی۔ اللہ رب العزت نے فرشتے کی چنگھاڑ کے ذریعے انہیں خاک میں ملا کر نام و نشان تک مٹا دیا۔

قوم لوط آئی اور ہم جنس پرستی جیسا ناپاک گناہ کا آغاز کیا۔ خدا کا قہر حرکت میں آیا اور اس قوم پر پانچ عذاب نازل کیے گئے۔ فرشتے کی چنگھاڑ سے ان کے دل پھاڑ دیے گئے۔ پھر اوپر لے جا کر انہیں آپس میں ٹکرا کر اس کے جسم پھاڑ دیے گئے۔ پھر نیچے پھینکا اور پتھروں کی بارش کی گئی۔ اس پر بھی قہر خداوندی ٹھنڈا نہ ہوا تو پورے شہر کو زمین کے اندر پلٹ دیا گیا۔ (استغفر اللہ) آج بھی وہ قوم بحیرہ مردار کی اتھاہ گہرائیوں میں اپنے کیے کا عذاب بھگت رہی ہے۔ قومیں آئی گئیں اپنی نافرمانیوں کے باعث تباہ و برباد کر کے انہیں آئندہ آنے والی قوموں کے لیے عبرت بنایا جاتا رہا۔ جنہوں نے خوف خدا سے کام لیا۔ یہ تمام آفات و عذاب اس کا کچھ نہ بگاڑ سکے۔

خدارا ہوش کیجیے، اپنے اللہ کی طرف پلٹیے، نجات کا راستہ صرف اور صرف اپنے اعمال پیغام خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرنے میں ہے۔ موت سر پہ ہے، پل کی مہلت نہ ملے گی۔

قزاق اجل کا لوٹے ہے دن رات بجا کر نقارہ
سب ٹھاٹ پڑا رہ جائے گا، جب لاد چلے گا بنجارہ

ہماری بچت مغرب کی اندھی تقلید کرنے میں نہیں۔ مغرب میں تو سورج غروب ہوتا ہے، تاریکی ہو جاتی ہے، ہم مشرقی ہیں، چڑھتے سورج کے امین۔ ہماری بچت صرف اسوہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر عمل کرنے میں ہے۔ ابھی ہمارے پاس موقع ہے، موت نے مہلت دی ہے۔ آئیے لوگوں کو اس گندگی کے ماحول سے نکالیں جو مغرب نے ہم پر ٹیلی ویژن اور کیبل کے طور پر مسلط کر دیا ہے۔ ہمارے نصاب تعلیم میں فزکس، کیمسٹری، بیالوجی کے پریکٹیکل تو شامل ہیں، لیکن مسلمان ملک ہونے کے ناتے اسلامیات کے پریکٹیکل کیوں نہیں کروائے جاتے؟ جاگیے جاگیے اس سے پہلے کہ باطل ہمارا ایمان تک لوٹ کر ہمیں تہی دست کر دے اور ہمیں پتا بھی نہ چلے۔

شمائلہ رفیق..... سمندری

وطن عزیز کو اللہ ہر دشمن کی میلی آنکھ سے محفوظ رکھے۔ یہ سلسلہ "بول کہ لب آزاد ہیں تیرے" اس کا سہارا لے کر میں ایک اہم مسئلہ کی جانب حکومت کی توجہ مبذول کروانا چاہتی ہوں۔

اہم قومی تہوار جیسے 25 دسمبر، 11 ستمبر، 23 مارچ، یوم اقبال وغیرہ ہوں تو اسکولوں کی چھٹی ہوتی ہے آخر ایسا کیوں۔ کیا یہ دن اس قدر غیر اہم ہیں کہ ان کا تذکرہ سننا ناگوار گزرتا ہے، دل اس قدر دکھ سے بھر جاتا ہے جب ان مواقع پر چھٹی کا سنتے ہیں بجائے اس کے کہ ہمیں قائداعظم، علامہ اقبال اور دیگر رہنماؤں کے بارے میں نئی نئی باتیں سننے کو ملیں،

بچوں کی چھٹی ہوتی ہے اور وہ سارا دن گلیوں میں پھرتے ہیں۔ یہ رہنما تو ہماری روحوں کے مکین ہیں' انہیں تو دل و دماغ میں رہنا ہے' مگر کس طرح کوئی اس پر توجہ دینے والا نظر نہیں آتا اپنی تاریخ سے ہی تو ہم سیکھیں گے۔ پر سکھائے کون؟ دوسری اہم بات قومی زبان کے بارے میں ہے پاکستان کے لوگ انگریزی کے پیچھے اتنے پاگل کیوں ہو رہے ہیں۔ ہماری قومی زبان اردو اب قومی لگتی ہی نہیں' نہ تین میں' نہ تیرہ میں۔ سمجھ دار لوگ کیا گئے کہ پاکستان کا بیڑہ غرق ہو کے رہ گیا۔ وہ لوگ جنہوں نے اردو کی خاطر قربانیاں دیں' ان کی قربانیاں رائیگاں گئیں۔ خدا کا واسطہ کوئی تو پاکستان کی پہچان باقی رہنے دیں۔ اللہ پاکستان کی حفاظت کرے۔

حرا رشید...... کراچی

آج کل قسمت کی دیوی مارننگ شو' ٹاک شو اور نائٹ شو کے اینکرز پر بہت مہربان ہے۔ ہر کام میں محنت ہوتی ہے اور اینکرز بھی محنت تو بہر حال کرتے ہیں۔

لاکھوں روپے مہینہ کمانے والے یہ خواتین و حضرات اپنے پروگراموں کے ذریعے ملک و قوم کے انتہائی ہمدرد نظر آتے ہیں۔ یوں لگتا ہے کہ سارے جہاں کا درد ان کے جگر میں ہے۔ مگر آج تک ان کے پروگراموں کا کوئی مثبت نتیجہ بر آمد نہیں ہوا۔ کیوں؟ اس لیے کہ یہ عوام سے ہمدردی' محبت اور غمگساری کا رول تو ادا کرتے ہیں' مگر "رول ماڈل" نہیں بنتے۔

مارننگ شوز کی تمام اینکرز خواتین روزانہ تقریباً" پچاس ہزار سے زائد مالیت کا جوڑا زیب تن کر کے آتی ہیں۔ ان کی جیولری' ان کے جوتے نا صرف میچنگ ہوتے ہیں بلکہ انتہائی قیمتی بھی ہوتے ہیں اور ماشاءاللہ سے ان کے حسین جسم پر ایک ہی مرتبہ نظر آتے ہیں۔ پھر نیا دن اور نئی چیزیں ہوتی ہیں۔ اور جدید ہیئر اسٹائل کے ساتھ جب یہ غریب اور دکھی لوگوں کے ساتھ بیٹھ کر آنسو بہاتی ہیں تو "مگرمچھ کے آنسو" والا محاورہ یاد آجاتا ہے۔ اور پروگرام ختم ہوتے ہی یہ اپنی نارمل روٹین میں آجاتی ہیں۔

اسی طرح آپ حالات حاضرہ کے اینکرز کو دیکھ لیں۔ سوائے ایک اینکر کے جو اسکارف میں ہوتی ہیں' باقی اینکرز خواتین کو دیکھ کر ایسا لگتا ہے جیسے کسی فیشن شو میں آگئی ہوں۔ گہرا میک اپ' جدید ہیئر اسٹائل' قیمتی ڈریس اور قیمتی جیولری..... اس پر باتیں کرتی ہیں کرپشن کی' غربت کی' مہنگائی کی' سیاست دانوں کی بے وفائی کی۔

اور یہ مرد اینکرز چونکہ ان کے پاس خواتین کی طرح دکھانے کو کچھ نہیں ہوتا۔ لہٰذا یہ بھی روز نئی ٹائی اور سوٹ کے ساتھ نظر آرہے ہوتے ہیں۔ نائٹ شو کے ایک اینکر جو اپنے نام کے ساتھ انٹرٹینمنٹ کا پروگرام کرتے ہیں وہ بھارت کے پروموٹر لگتے ہیں..... باتیں کرتے ہیں اپنے ملک کی محب وطن ہونے کا دعوا بھی کرتے ہیں' مگر اسٹائل انڈین' شاہ رخ خان ان کا پسندیدہ ہیرو ہے اور ان ہی کی کاپی کرتے ہیں۔ روتے بھی اسی کی طرح ہیں' ڈانس کرنے کا شوق بھی ان ہی کی طرح ہے' اپنے پروگرام میں انڈین گانے سے ابتدا' انڈین گانے سے اختتام۔ ان ہی کے گانوں پر ڈانس ہو رہے ہوتے ہیں۔ یہ کیسا پیار ہے وطن سے؟ یہ کیسی محبت ہے' کتنے خوش ہوتے ہوں گے انڈین حکمران اور آرٹسٹ اپنے لیے پاکستانیوں کی محبت دیکھ کر۔

کرکٹ کے مقابلے ہوں تو انڈیا سے نفرت کا اظہار' مگر گانے سننے ہیں تو ان ہی کے' فلمیں دیکھنی ہیں تو انہی کی' اور پروگراموں کو سجانا ہے تو ان ہی کے گانوں سے..... کم سے کم یہ منافقانہ رویہ میڈیا میں تو اختیار نہ کریں۔ میڈیا کو تو اس سے پاک رکھیں۔ اپنے پروگرام میں ایک آدھ مظلوم یا باہمت بندے کو لا کر وہ سمجھتے ہیں کہ پروگرام کا حق ادا ہو گیا اور یہ بھی وہ خود کہاں کرتے ہیں' ایک ٹیلی کام کے سلوگن کے تعاون سے کرتے ہیں۔ خود تو "منی" اور "شیلا" کی جوانی سے باہر نہیں آتے۔

اور دلچسپ بات یہ تمام خواتین و حضرات اینکرز اسکرین پہ انتہائی بااخلاق' خوش اخلاق' لوگوں سے محبت کرنے والے نظر آتے ہیں۔ لائیو کالرسے ایسے بات کرتے ہیں کہ جیسے ان جیسا خوش اخلاق دنیا میں کوئی ہوگا ہی نہیں اور عام زندگی میں یہ کیسے ہیں..... تو اس کا جواب یہ ہے کہ جب ان سے پوچھیں کہ پاکستان میں آپ شاپنگ کہاں سے کرتے ہیں تو جواب آتا ہے۔ پاکستان سے نہیں' جب پاکستان سے باہر جاتے ہیں تو شاپنگ کرتے ہیں' کیونکہ لوگ پہچان لیتے ہیں اور بڑی مشکل ہو جاتی ہے اور سچ تو یہ ہے کہ یہ عام لوگوں کے فون ریسیو تک نہیں کرتے' خوش اخلاقی سے بولنا تو بہت دور کی بات ہے۔

مارننگ شو میں گزشتہ دنوں ایک چینل نے شادی ویک منایا۔ اگر اس ویک کو فیملی ویک کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ پروگرام کی میزبان نے اپنی ہی بہن کی شادی کی (سچ مچ نہیں) اور اپنی ہی فیملی اور بہن کے سسرال کو مدعو کیا۔ بے تحاشا خرچ کیا گیا اور جس بہن کی شادی دکھائی گئی ان کی شادی 2008ء میں ہو چکی ہے۔

لگتا ہے کہ دونوں کا جھگڑا ہوا تھا اور پھر نکاح کو "ری نیو" کرایا گیا۔ بھئی ویک ہی منانا تھا اور خرچ ہی کرنا تھا تو کسی مستحق کی شادی کرا دیتے۔ اس کا اور اس کی فیملی کا بھی بھلا ہو جاتا اور مفت کے گفٹ اپنے ہی گھر جانے کی بجائے کسی مستحق کو مل جاتے۔ اس شادی ویک پر تو لوگوں کو بہت ہی غصہ ہے اور ایسے ہی لوگوں کے لیے "اندھا بانٹے ریوڑیاں اپنوں اپنوں کو" کا محاورہ بنا ہے۔

یہ سب کچھ کیا ہے' ہمارے ہر کام میں کرپشن کیوں ہے۔ ہم ایمان داری اور دیانت داری سے کام کیوں نہیں کرتے اور سچ بتائیں یہ لائیو کالز کا صرف ڈھونگ ہوتا ہے۔ اصل صورت حال کچھ اور ہوتی ہے اور اکثر پروگرام جن پر لائیو لکھا ہوا ہوتا ہے وہ لائیو نہیں ہوتے' بلکہ ریکارڈ شدہ ہوتے ہیں۔ محض لوگوں کو بے وقوف بنانے کے لیے ایسا لکھ دیا جاتا ہے۔

مارننگ شو دیکھیں تو لگتا ہے کہ ہم امیر ترین ملک کے باشندے ہیں۔ ہر طرف خوش حالی' امن و امان' سکون' دودھ کی نہریں بہہ رہی ہیں۔ امیر اور غریب سب ایک ہی گھاٹ سے پانی پیتے ہیں۔ غربت اگر ہے بھی تو صرف دس فیصد..... اور ان دس فیصد کو یہ لوگ پیش بھی کر دیتے ہیں اور رات کے وقت کرنٹ افیئرز کے ٹاک شو دیکھیں تو ہر چینل پہ لوگ لڑتے جھگڑتے' ایک دوسرے پر الزامات کی بارش کرتے' ایک دوسرے کو ٹکے ٹکے کی سناتے ہوئے نظر آئیں گے۔ سوکن بھی ایک دوسرے سے کیا لڑتی ہوں گی جو سیاست دان لڑتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ یہ پروگرام دیکھ کر ایسا لگتا ہے کہ جیسے ملک میں ہر طرف افراتفری ہے۔ لوٹ مار ہے۔ ٹارگٹ کلنگ ہے' لوگ ایک دوسرے کے دشمن ہیں۔ لوگوں کے پاس کھانے کو کچھ نہیں ہے۔ مہنگائی کا طوفان' کرپشن' بے روزگاری' غربت' افلاس' سونامی کی شکل اختیار کر گیا ہے اور بس اب یہ ملک گیا کہ گیا یا یہ آپس میں تقسیم ہو جائے گا۔ ہر صوبے کا اپنا وزیر اعظم اور صدر ہوگا۔ اور پھر ایک نہیں کتنے ہی پاکستان ہوں گے۔ (خدانا خواستہ)

ان سب باتوں کا مقصد یہ ہے کہ ہر چیز میں' ہر کام میں اعتدال پسندی بہت ضروری ہے۔ جو ہمارے ملک میں ناپید ہے۔ اللہ ہمارا اور ہمارے ملک کا حامی و ناصر ہو۔ ملک سے سچی محبت کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

شعاع عمیر

کرن کرن خوشبو

شرک کا عذاب

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"جس شخص کو دوزخ میں سب سے ہلکا عذاب ہوگا تحقیق اللہ تعالیٰ اس سے پوچھے گا "اگر تیرے پاس اس وقت زمین بھر کا مال ہو تو اس کو دے کر تو اپنے آپ کو چھڑانا چاہے گا۔" وہ کہے گا۔ "یقیناً"۔"
اللہ تعالیٰ فرمائے گا۔
"میں نے تو اس سے بہت ہی آسان بات تجھ سے چاہی تھی، جب تو آدم کی پشت میں تھا یعنی میرے ساتھ کسی کو شریک نہ بنانا تو نے نہ مانا اور شرک ہی پر اڑا رہا۔"

(بخاری شریف)

حمیرہ مہتاب.... سعودی عرب

تلاش

ایک مرتبہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے فرمایا۔
"میں نے چھ چیزوں کو چھ چیزوں پر چھپا رکھا ہے، لیکن لوگ انہیں غیر محل تلاش کرتے ہیں، اس لیے نہیں پاتے۔

☆ عزت کو میں نے شب بے داری میں رکھا ہے، مگر لوگ سلاطین کے دربار میں تلاش کرتے ہیں۔
☆ راحت کو میں نے جنت میں چھپا رکھا ہے، لوگ اسے دنیا میں تلاش کرتے ہیں۔
☆ بلندی کو میں نے تواضع اور انکساری میں چھپا رکھا ہے مگر لوگ اسے غرور میں تلاش کرتے ہیں۔
☆ دعا کی قبولیت کو میں نے لقمہ حلال میں چھپا رکھا ہے، لوگ اسے لقمہ حرام میں تلاش کرتے ہیں۔
☆ تونگری کو میں نے قناعت میں چھپا رکھا ہے، مگر لوگ اسے حرص میں تلاش کرتے ہیں۔
☆ علم کو میں نے سفر و بھوک میں رکھا ہے، لوگ اسے شکم سیری اور کتابوں میں تلاش کرتے ہیں۔

شافعہ اعوان.... کراچی

فطرت

ایک دفعہ ایک بزرگ کسی حوض کے کنارے بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک بچھو بار بار حوض کی طرف جاتا تھا اور وہ بزرگ بار بار اس کا رخ بدل دیتے تھے۔ ان کے پاس بیٹھے ہوئے ایک مرید نے جب بارہا یہی نظارہ دیکھا تو عرض کیا۔
"اے مرشد صاحب! آپ اس کو اس کے حال پر کیوں نہیں چھوڑ دیتے" یہ بار بار آپ کو ڈستا ہے اور آپ بار بار اس کے حق میں نیکی کرتے ہیں۔" بزرگ نے فرمایا۔
"جب یہ کیڑا ہو کر اپنی فطرت سے باز نہیں آتا تو میں انسان ہو کر اپنی فطرت سے کیوں باز آؤں؟"

راحیلہ.... چمن

محبت

خلیل جبران کہتا ہے
آسمانوں سے ہماری محبت ہمارے دل پر اترتی ہے اور سب کچھ بدل کر رکھ دیتی ہے۔ ہمارے لیے ہر منظر، ہر موسم اور کیفیت کے معنی بدل دیتی ہے۔ ایک نیا احساس جگاتی ہے۔ پھول سے خوش رنگ، مشک اپنی خوشبو سے کچھ اور سوا، سبزہ اور بھی تراوٹ بخش ہو جاتا ہے، ساون رت کی ٹھنڈی پون اور جھومتی گھٹا، جذبات میں آگ لگا دیتی ہے اور پھر بارش بالکل پاگل کر دیتی ہے۔ خوش گمانی کی حسین پریاں، ہمیں اپنی نرم گداز بانہوں میں سمیٹ لیتی ہیں۔ اور کبھی ایک نظر عمر بھر کے لیے زندگی بن جائے، لیکن اس کے باوجود اسی کا نام محبت ہے، جہاں سے کائنات شروع ہوتی ہے۔
محبت ایک طلسم کدہ ہے جس میں اگر انسان پھنس جائے تو پھر ساری زندگی رہائی کے لیے تڑپتا ہے اور شہر دل کے موسم بھی عجیب ہوتے ہیں، کبھی تو برسوں نہیں بدلتے اور کبھی لمحوں میں دل کی دنیا بدل دیتے ہیں، محبت ایسی ہی ہوتی ہے امبر کی طرح دل پر چھا جاتی ہے۔

نوشین اقبال نوشی.... گاؤں بدر مرجان

ادا شناس

اورنگ زیب عالمگیر کے زمانے میں ایک دفعہ مشہور ہو گیا کہ آپ دکن پر حملہ کرنے والے ہیں۔ اگرچہ آپ اس معاملہ کا ارادہ کر چکے تھے، مگر ابھی تک کسی سے اظہار نہیں کیا تھا، حتیٰ کہ معتمد خاص سے بھی اس کا ذکر نہیں کیا تھا، مگر لوگوں میں اس کی شہرت عام ہو چکی تھی۔
سلطان عالمگیر حیران تھے کہ لوگوں میں یہ خبر کیسے پہنچ گئی۔ محکمہ خاص کو حکم دیا گیا کہ سراغ لگائیں کہ اس کی ابتدا کہاں سے ہوئی۔ کھوج لگتے لگتے پتا چلا کہ سب سے پہلے ملازم خاص کی زبان سے یہ بات سنی گئی۔ اس کو بلا کر پوچھا گیا "کہ تم نے یہ بات کہاں سے سنی؟" اس نے عرض کی۔
"جہاں پناہ! میری عمر اس خانوادہ کے قدموں میں گزری ہے۔ غلام ادا شناس ہے۔ ایک صبح حضور کو وضو کروا رہا تھا کہ آپ نے ایک لمحہ توقف فرمایا، دکن کی جانب نگاہ ڈالی اور دست مبارک مونچھوں پر پھیرا۔ میں سمجھ گیا کہ دکن پر حملہ کرنے کا ارادہ ہے۔"

عارفہ.... کراچی

دسمبر

دسمبر کی سرد ہواؤں کو
کون بتائے کہ اندر سلگتی ہوئی آگ کو
اس کی برف ہوتی شامیں ٹھنڈا نہیں کر سکتیں۔
ان کہر آلود راتوں کو کیا پتا کہ
دل کی چوکھٹ سیاہ ہو جانے کے بعد
پھر وہاں سورج نہیں نکلتا

نواب زادہ سولنگی.... تحصیل مورو سندھ

باتوں سے خوشبو آئے

☆ بیٹیاں اور مردہ مچھلیاں اسٹور روم میں غیر معینہ مدت تک رکھنے کی چیزیں نہیں۔
(انگریزی مقولہ)
☆ جو بیٹیوں کا باپ ہے، وہ اک خاندان کا مالک ہے اور جس کے بیٹے ہیں اس کے لیے اجنبیوں کا مجمع انتظار کر رہا ہے۔
(چیکوسلواکیہ کی کہاوت)
☆ جس کی بیٹی کی شادی کسی اچھے آدمی سے ہوتی ہے تو اسے بیٹا مل جاتا ہے، ورنہ وہ بیٹی کو بھی کھو دیتا ہے۔
(کوالز)
☆ بیٹا اس وقت تک بیٹا رہتا ہے جب تک اس کی شادی نہ ہو، لیکن بیٹی تمام عمر کے لیے بیٹی ہوتی ہے۔
(فلر)
☆ بیٹی کی شادی میں سب سے دکھی ہنسی باپ کی ہوتی ہے۔
(ہومر)
☆ نافرمان بیٹی ناقابل اصلاح بیوی ہوتی ہے۔
(فرینک لن)

حرمت.... ڈلوال

تین اشعار

کاش آزاد قبیلے کے سخن ور ہوتے
ہم محاذوں پر نہ بکتے تو سکندر ہوتے
خود فریبی کے خرابوں میں رہے ہم ورنہ
اپنی اوقات میں رہتے تو قلندر ہوتے
موج کوثر کی قسم ہم تھے محبت کے ولی
خاک کے در پر نہ جھکتے تو سمندر ہوتے

نوشی... گاؤں بدر مرجان

موتی کی قیمت

ایک بدنام زمانہ شخص علم و دانش کی باتیں کر رہا تھا۔ لوگوں نے اس کا مذاق اڑایا اور بولے۔

"بھلا اس کی باتیں کیوں کوئی سنے' یہ تو ایک نہایت برا اور بد قماش شخص ہے۔" وہیں سقراط بھی موجود تھا۔ اس نے کہا۔

"لوگو! یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟ یہ شخص جو قیمتی باتیں کر رہا ہے' اسے غور سے سنو اور ذہن نشین کرلو' کیونکہ اس شخص کی حیثیت غوطہ خور جیسی ہے۔ غوطہ خور کے ذلیل ہونے سے موتی کی قیمت پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔"

سائرہ لودھی... کوئٹہ

خاص عنایتیں

اللہ نے اپنے بندوں پر تین خاص عنایات کیں۔

☆ گندم اور اناج میں کیڑے پیدا کردیے' ورنہ لوگ اسے سونے' چاندی کی طرح ذخیرہ کرلیتے اور لوگ بھوکے مرجاتے۔

☆ موت کے بعد مردے کے جسم میں بدبو پیدا کردی' ورنہ کوئی اپنے پیاروں کو دفن نہ کرتا۔

☆ مصیبت کے بعد اہل خانہ کو صبر و سکون دیا' ورنہ ان کی زندگی کبھی خوش گوار نہ ہوتی۔

تو تم اپنے پروردگار کی کون کون سی نعمت کو جھٹلاؤ گے؟

ڈاکٹر حمیدہ شیخ... باغبان

باتوں سے خوشبو آئے

☆ دکھ انسان کے مرنے کا نہیں ہوتا' بلکہ اپنائیت' محبت اور خلوص کے رشتوں کے ٹوٹ جانے کا ہوتا ہے۔

☆ کوئی گناہ لذت کے لیے مت کرنا' کیونکہ لذت ختم ہوجائے گی' گناہ باقی رہ جائے گا اور کوئی نیکی تکلیف کی وجہ سے مت چھوڑنا کیونکہ تکلیف ختم ہوجائے گی' نیکی باقی رہ جائے گی۔

☆ دوستی' بھروسا' دل' رشتہ' وعدہ' پیار' کبھی مت توڑنا' کیونکہ جب یہ ٹوٹ جاتے ہیں تو آواز نہیں آتی' لیکن درد بہت ہوتا ہے۔

☆ شرم کی کشش حسن سے زیادہ ہوتی ہے۔

☆ اپنے خیالات کو اپنا جیل خانہ نہ بناؤ۔

☆ تاریخ کو یاد رکھنے کی بجائے' تاریخ بنانے کی فکر کرنا چاہیے۔

☆ ناامید شخص ہر اچھا موقع گنوا دیتا ہے اور پرامید شخص پریشانی میں بھی موقع تلاش کرلیتا ہے۔

☆ بے بسی اتنا اداس نہیں کرتی' جتنا بے بسی کا احساس اداس کردیتا ہے۔

قمرناز دہلوی... کراچی

روز شب

کبھی مصروف دن کے خاتمے پر
مجتمع کرتا ہوں جب اپنے پراگندہ خیالوں کو
تو سانسوں میں تمہاری یاد کی خوشبو
دکان شیشہ گر میں جیسے کوئی فیل بے زنجیر گھس آئے
بہت کچھ ٹوٹنے لگتا ہے پہلو میں
تو شب بھر کروٹیں لیتے حساب رائیگاں کرتا ہوں ماضی کا
اور آخر پھر نیا دن برچھیاں لے کر نکل آتا ہے
مشرق سے۔

(تصدق شعار)

ارم آفتاب... کراچی

دنیا درد نہ جانے امڑی

دل سے دور دراز
دل سے دور دراز بسے ہے' دنیا دور دراز
اشک لہو میں گھل مل جائیں' سینہ سہک سہک سہلائیں
آنسو بے آواز
دور دور تک روح میں گونجیں خاموشی کے ساز
نہ جانے کس نقطے پر جاکے کھلے غموں کا راز
ابھی تو ہے آغاز نی امڑی' ابھی تو ہے آغاز
دنیا درد نہ جانے امڑی' دل سے دور دراز

امبر گل... جھڈو

بوڑھا سال

یاد ہے میں کیا تھا' پر اب جانے کیا ہوگیا
آئینے میں شکل دیکھے اک زمانہ ہوگیا
ختم ہوئی ڈائری کرتے ہوئے پتے ریاض
آگیا ماہ دسمبر' سال بوڑھا ہوگیا

عنبر وسیم... گوجرانوالہ

بے بسی

ایک مرتبہ امام شافعی ایک خلیفہ کے پہلو میں تشریف فرما تھے کہ ایک مکھی خلیفہ کو پریشان کر رہی تھی اس پر خلیفہ نے تنگ آکر کہا۔

"نہ جانے اس مکھی کے پیدا کرنے میں خدائے بزرگ و برتر کی کیا حکمت تھی۔" امام شافعی نے جواب دیا۔

"اس میں حکمت یہ ہے کہ طاقتوروں کو ان کی طاقت کی بے بسی دکھائے۔"

سلمٰی رانی ..... قادر پور ملتان

انسان

○ انسان کو باد صبا کی طرح ہونا چاہیے کہ ہر کوئی اس کے آنے کا انتظار کرے۔

○ انسان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ وہ اپنے دل اور زبان کو قابو میں رکھے۔

○ کسی کے چہرے پر مت جائیں کیونکہ انسان ایک بند کتاب کی مانند ہے۔

○ انسان ہو کر ایسے کام نہ کرو کہ جس سے انسانیت کا دامن داغدار ہوجائے۔

○ انسان کی تمام خوبیوں کا مرکز زبان ہے۔

○ انسان کا لباس اور سوسائٹی اس کے اخلاق و کردار کا پہلا سرٹیفکیٹ ہے۔

○ انسان کی ہر خواہش کا پورا ہونا ضروری نہیں کیونکہ پھول کی کچھ پتیاں بکھر بھی جاتی ہیں۔

○ انسان بچپن سے لے کر بڑھاپے تک اچھے دوست کی تلاش میں رہتا ہے۔

انمول موتی

☆ انسان کی تمام پریشانیوں کی وجہ تقدیر سے زیادہ چاہنا اور وقت سے پہلے چاہنا۔

☆ انسان کے جھوٹا ہونے کے لیے یہی کافی ہے کہ جو بات سنے بغیر تحقیق کیے لوگوں سے بیان کرنی شروع کردے۔

☆ انسان کو بہت سے نقصانات کسی سے مشورہ نہ لینے کی وجہ سے ہوتے ہیں۔

☆ اس انسان سے ڈرنا چاہیے جو اپنی برائیوں کو فخر سے بیان کرے۔

☆ خواہشات کو دبانے اور مشکلات پر قابو پانے سے انسان کا کردار مضبوط ہوتا ہے۔

☆ انسان کو ایمان کا مزا اس وقت تک نہیں ملتا جب تک وہ جھوٹ کو ترک نہ کردے' حقیقی طور سے بھی اور مزاح کے طور سے بھی۔

☆ ہر مشکل انسان کی ہمت کا امتحان لینے آتی ہے۔

بشریٰ ملک' مائرہ ملک... دھاندرہ

☆ ☆

بشریٰ محمود

یادوں کے دریچے سے

الماس علی، کی ڈائری میں تحریر

ابن انشاء کی نظم

چل انشا اپنے گاؤں میں
یہاں اُلجھے اُلجھے روپ بہت
پر اصلی کم بہروپ بہت
اس پیڑ کے نیچے کیا رُکنا
جہاں سائے کم دھوپ بہت
چل انشا اپنے گاؤں میں
بیٹھیں گے سکھ کی چھاؤں میں
کیوں تیری آنکھ سوالی ہے
یہاں ہر اک بات نرالی ہے
اس دیس بسیرا مت کرنا
یہاں مفلس ہونا گالی ہے
چل انشا اپنے گاؤں میں
جہاں سچے رشتے یاروں کے
جہاں وعدے پکے پیاروں کے
جہاں سجدہ کرے وفا پاؤں میں
چل انشا اپنے گاؤں میں

ارم آفتاب، کی ڈائری میں تحریر

اسداللہ خان غالب کی غزل

یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصال یار ہوتا
اگر اور جیتے رہتے، یہی انتظار ہوتا

ترے وعدے پر جیے ہم، تو یہ جان جھوٹ جانا
کہ خوشی سے مر نہ جاتے، اگر اعتبار ہوتا

کوئی میرے دل سے پوچھے، ترے تیر نیم کش کو
یہ خلش کہاں سے ہوتی، جو جگر کے پار ہوتا

غم اگرچہ جاں گسل ہے، یہ کہاں بچیں کہ دل ہے
غم عشق اگر نہ ہوتا، غم روزگار ہوتا

کہوں کس سے میں کہ کیا ہے، شب غم بری بلا ہے
مجھے کیا برا تھا مرتا، اگر ایک بار ہوتا

اسے کون دیکھ سکتا کہ یگانہ ہے وہ یکتا
جو دوئی کی بو بھی ہوتی، تو کہیں دوچار ہوتا

یہ مسائل تصوف، یہ ترا بیان غالب
تجھے ہم ولی سمجھتے، جو نہ بادہ خوار ہوتا

سدرہ وزیر، کی ڈائری میں تحریر

عرش صدیقی کی نظم

اسے کہنا

اسے کہنا دسمبر آگیا ہے
دسمبر کے گزرتے ہی برس اک اور ماضی کے
گپھا میں ڈوب جائے گا
مگر جو خون سو جائے گا جسموں میں نہ جاگے گا
اسے کہنا ہوائیں سرد ہیں اور زندگی کے
کہرے دیواروں میں لرزاں ہیں
اسے کہنا شگوفے ٹہنیوں میں سو گئے ہیں
اور ان پر برف کی چادر بچھی ہوئی ہے
اسے کہنا اگر سورج نہ نکلے گا
تو برف کیسے پگھلے گی
اسے کہنا کہ لوٹ آئے

حمیرہ مہتاب، کی ڈائری میں تحریر

جون ایلیا کی غزل

ہے بکھرنے کو یہ محفل رنگ و بو، تم کہاں جاؤ گے، ہم کہاں جائیں گے
ہر طرف ہو رہی ہے یہی گفتگو، تم کہاں جاؤ گے، ہم کہاں جائیں گے

کوئی حاصل نہ تھا آرزو کا مگر، سانحہ یہ ہے اب آرزو بھی نہیں
وقت کی اس مسافت میں بے آرزو، تم کہاں جاؤ گے ہم کہاں جائیں گے

کس قدر دور سے لوٹ کر آئے ہیں، یوں کہو عمر برباد کر آئے ہیں
تھا سراب اپنا سرمایۂ جستجو، تم کہاں جاؤ گے، ہم کہاں جائیں گے

اک جنوں تھا کہ آباد ہو شہر جاں، اور آباد جب شہر جاں ہو گیا
ہیں یہ سرگوشیاں در بہ در کو بہ کو تم کہاں جاؤ گے ہم کہاں جائیں گے

دشت میں رقص شوق بہار اب کہاں، بادِ پیمائی دیوانہ وار اب کہاں
بس گزرنے کو ہے موسم ہائے و ہو، تم کہاں جاؤ گے، ہم کہاں جائیں گے

ہم ہیں رسوا کن دلی و لکھنؤ، اپنی کیا زندگی اپنی کیا آبرو
میر دلی سے نکلے، گئے لکھنؤ، تم کہاں جاؤ گے، ہم کہاں جائیں گے

ریحانہ علی احمد، کی ڈائری میں تحریر

اقبال عظیم کی غزل

شکوہ بھی جفا کا کیسے کریں، اک نازک سی دشواری ہے
آغاز وفا خود ہم نے کیا تھا، پہلی بھول ہماری ہے

دکھ تم کو جب پہنچا ہے، خود ہم نے آنسو پونچھے ہیں
اب دل پہ ہمارے چوٹ لگی ہے اب کے تمہاری باری ہے

بے کھیلے بازی جیت کے بھی تم ہم سے شاکی رہتے ہو
اور ہم کو دیکھو ہم نے تو خود جان کے بازی ہاری ہے

وہ عہد تھا عیش و جوانی کا، اب عمر ہے سعی تلافی کی
پہلے بھی نیند پرائی تھی اور اب بھی شب بیداری ہے

کچھ درد نہاں، کچھ فکر جہاں، کچھ شرم خطا، کچھ خوف سزا
اک بوجھ اٹھائے پھرتا ہوں اور بوجھ بھی کتنا بھاری ہے

جو کاری زخم لگا ہے دل پر، پہلے اس کی فکر کرو
یہ بعد میں دیکھا جائے گا یہ کس کی کارگزاری ہے

جو صاحب گھر گھر میری بابت زہر اگلتے پھرتے ہیں
وہ صرف میرے ہمسائے نہیں ہیں، ان کی قرابت داری ہے

اس راہ سے ہو کر گزرے ہیں کچھ رہبر بھی کچھ رہزن بھی
اب نقش قدم پہچان کے چلنا آپ کی ذمہ داری ہے

نمرا، اقرأ، کی ڈائری میں تحریر

ندا فاضلی کی غزل

دل میں نہ ہو جرأت تو محبت نہیں ملتی
خیرات میں اتنی بڑی دولت نہیں ملتی

کچھ لوگ یوں ہی شہر میں ہم سے بھی خفا ہیں
ہر ایک سے اپنی بھی طبیعت نہیں ملتی

دیکھا تھا جسے میں نے کوئی اور تھا شاید
وہ کون ہے جس سے تری صورت نہیں ملتی

ہنستے ہوئے چہروں سے ہے بازار کی زینت
رونے کی یہاں ویسے بھی فرصت نہیں ملتی

نکلا کرو یہ شمع لیے گھر سے بھی باہر
تنہائی سجانے کو، مصیبت نہیں ملتی

ساجدہ حبیب کی ڈائری میں تحریر

اسلم ہمدم کی غزل

تیرے بینے میں دل اپنا سجا کر کیا کریں گے ہم
تمہیں اپنا بنا کر، مسکرا کر کیا کریں گے ہم

کسی ویران بستی میں اگر تنہا ہمیں چھوڑا
نشیمن پھر محبت کا بنا کر کیا کریں گے ہم

جگر میں درد باقی ہے کبھی جب چوٹ کھائی تھی
نئے دُکھ اور نئے صدمے اُٹھا کر کیا کریں گے ہم

ہمارے درد پر ہمدرد یاروں کو ہوئی خوشیاں
کسی کے درد پر خوشیاں منا کر کیا کریں گے ہم

ہر اک شب اشک بہتے ہیں مگر سنوری نہیں قسمت
تمہاری یاد میں آنسو بہا کر کیا کریں گے ہم

بڑا بے کار ہے جیون ہُوا نہ پیار کے قابل
تمہارے واسطے جیون لُٹا کر کیا کریں گے ہم

ہر اک چہرہ کسی کے حال کی تصویر ہوتا ہے
بُرے حالات کے قصے سُنا کر کیا کریں گے ہم

میرے ہمدم بڑی ہی سنگدل دُنیا ہے کچھ سوچو
تمہیں ہنسنے کی عادت ہے رُلا کر کیا کریں گے ہم

فوزیہ ثمر بٹ، کی ڈائری میں تحریر

فاطمہ جہاں کی غزل

راہِ عشق میں سفینوں کو جلایا نہیں کرتے
یوں ہی انمول خزینوں کو لٹایا نہیں کرتے

سجدہ ہے اس مسجود و معبود کے لائق
ہر اک کے آگے جبینوں کو جھکایا نہیں کرتے

[illegible]
در پہ آئے گداؤں کو ٹھکرایا نہیں کرتے

پردہ داروں میں لازم ہے پردہ داری
سربستہ رازِ سرِ محفل لایا نہیں کرتے

لگی رہتی ہے در پہ جانے کیوں آنکھیں
جانے والے کبھی لوٹ کے آیا نہیں کرتے

گرد سی جم گئی ہے ہر اک شجر پر
کسی کے صبر کو یوں آزمایا نہیں کرتے

سنگدل محبوب کہتے پھرتے ہیں گلی گلی
ٹوٹی ہوئی کرچیاں دیواروں پہ سجایا نہیں کرتے

ارم، کی ڈائری میں تحریر

سلیم کوثر کی نظم

ہاں ابھی نہیں،

جذبے زنجیر نہیں ہوتے، سائے تو اسیر نہیں ہوتے
جو منظر ہے، پس منظر ہے، وہ کیوں تصویر نہیں ہوتے
جتنے بھی خیال گزار لیں وہ کیوں تحریر نہیں ہوتے
اب خواب سراب سے لگتے ہیں
دن رات عذاب سے لگتے ہیں
کہیں جلتے بجھتے سائے سے
کہیں ان دیکھے ہمسائے سے
آنگن بازار میں گلیوں میں سب موت کا کھیل اُٹھا لائے
کوئی کسی کی فردِ جرم لکھے، کوئی کسی کی جیل اُٹھا لائے
اک خوف بچھا ہے رستوں میں
بارود چھپا ہے بستوں میں
اب زہر ہے رات کی رانی میں
کہیں آگ لگی ہے پانی میں
تم کہتے ہو تمہیں آن ملے
تمہیں کیسے آن ملے آخر
جو کچھ تھا بے ترتیب ہوا
اس شہر کا حال عجیب ہوا

مجھے یہ شعر پسند ہے

شگفتہ سلیمان

لبنیٰ مشتاق — پھول نگر

مہکے سدا بہار کی صورت تیرا وجود
تو مسکرائے شام کی رعنائیوں کے ساتھ
خوشیاں تیرے نصیب کا حصہ رہیں سدا
وابستہ تیرا نام رہے شہنائیوں کے ساتھ

منزہ — ڈگری

انتقاماً مجھ کو وہ درسِ وفا دے جائے گا
زخم دے کر اک دردآشنا دے جائے گا
کس قدر نادم ہوا ہوں میں بُرا کہہ کر اسے
کیا خبر تھی جاتے جاتے وہ دُعا دے جائے گا

سیدہ نسبت زہرا — کہروڑ پکا

ہم بھی کیا لوگ ہیں خوشبو کی روایت سے الگ
خود پہ ظاہر نہ ہوئے تجھ کو چھپانے کے لیے

گڑیا شاہ — کہروڑ پکا

دل میں تھی ویرانی، ہم بھی تھے خاموش بہت
تم آئے تو جان گئے ہم موسم کتنا پیارا ہے
باتوں باتوں میں آؤ اس شخص کی بات کریں
جس کی خاطر اب دُنیا کا ہر دُکھ ہمیں گوارا ہے

فوزیہ ثمر — گجرات

ہنسے تو آنکھ سے آنسو رواں ہمارے ہوئے
کہ ہم پہ دوست بہت مہرباں ہمارے ہوئے
بہت سے زخم ہیں ایسے جو اُن کے نام کے ہیں
بہت سے قرض سرِ دوستاں ہمارے

نمرا — کراچی

نہ دید ہے نہ سخن، اب نہ حرف ہے نہ پیام
کوئی بھی حیلہ تسکیں نہیں اور آس بہت ہے
امیدِ یار، نظر کا مزاج، درد کا رنگ
تم آج کچھ بھی نہ پوچھو کہ دل اُداس بہت ہے

سدرہ سحر عمران — کراچی

ہر بار کی طرح تیرا بے وفا سا وعدہ
معلوم ہے کہ جھوٹا مگر اعتبار لازم

اُم تہمینہ[?] — لاہور

تیری بھیگتی پلکوں کے جو خواب ہیں ٹوٹے
تو تیری یادوں کے سب گلاب ہیں سوکھے
نیند میری پلکوں سے دُور ہو گئی!
جب سے تیرے سارے خواب ہیں روٹھے

سونیا مغل — فیصل آباد

آئینے میں غبار اُتر آیا
عکس ٹکرا رہے ہیں پتھر سے
میں تھکن اوڑھ کے کدھر جاؤں
آسماں ہٹ گیا ہے میرے سر سے

این۔ ایس نوئی — عارف والا

آنکھوں میں بھر کے سادہ محبت کی ڈوریاں
مٹھی میں بند کر کے دل و جاں کی چوریاں
دھرتی کو لوٹتی ہیں تبسم کی اوٹ سے
چالاک کس قدر ہیں یہ گاؤں کی گوریاں

ایم۔ آر۔ کے — مظفر گڑھ

ٹھہر جا آبلہ پا دن ذرا کچھ اور ڈھلنے دے
سلگتی ریت پر چلنا بڑا دشوار ہوتا ہے
جدائی کی رُتوں نے ہی نہیں مارا مجھے
کسی کی یاد کا آسیب بھی خونخوار ہوتا ہے

شہلا وہاب — کورنگی کراچی

اُس شبنمِ وفا کو جو دل کی شکست پر
اک پل کو آ کے رو گئی، میں ڈھونڈتا پھرا
بے مہر آسمان کے تلے رسم دوستی
کسی دل میں جا کے سو گئی، میں ڈھونڈتا پھرا

عظمیٰ فوزیہ — کراچی

اس اذیت سے کسی طور رہائی تو ملے
اس کے لکھے ہوئے خطوط آج جلا ڈالتے ہیں
روگ تم دل کو لگا لیتے ہو اور لوگ بشیر
ربط کتنا بھی ہو دو دن میں بھلا ڈالتے ہیں

صائمہ ——— کوئٹہ

ہم جو روئے تو انہیں کہنا پڑا
اس طرح کرتی ہے برسات سفر

ندا ——— اسلام آباد

تھی میری تباہی میں کچھ درختوں کی بھی سازش
ورنہ یہ اجڑنے کا موسم تو نہیں تھا

رقیہ آرزو ——— کوئٹہ

محبت تو ازل سے ہے محبت تا ابد ہوگی
اسے میں عصر حاضر کا عقیدہ کہہ نہیں سکتا
کتاب زندگی میں ہے رقم باب محبت بھی
مگر کتنی ہیں سطریں خط کشیدہ کہہ نہیں سکتا

کرن ناز ——— نامعلوم شہر

یہ کچھ میں ہی جانتا ہوں جو مجھ پہ گزر گئی
دنیا تو لطف لے گی میرے واقعات میں
میرا تو جرم تذکرہ عام ہے مگر
کچھ دھجیاں ہیں میری زلیخا کے ہاتھ میں

سلمیٰ بانو ——— کراچی

ہر اک بار یہ سوچ کے دل بھر آیا ہے
اتنی عمر میں کیا کھویا کیا پایا ہے

صبا نیازی ——— کراچی

اب تو ٹوٹی کشتی بھی آگ سے بچلتے ہیں
ہاں کبھی تھا نام اپنا بخت آزماؤں میں
صرف اس تکبر میں اس نے مجھ کو جیتا ہے
ذکر نہ ہو اس کا بھی کل کو نارساؤں میں

روبی کنول ——— میاں چنوں

عمر بھر سنگ زنی کرتے رہے اہل وطن
یہ الگ بات کہ دفنائیں گے اعزاز کے ساتھ

عاصمہ بخاری ——— دھریمہ

اپنی اپنی انا کے قیدی تھے
ہمارے بیچ کوئی دوسرا نہ تھا

نینا عمران خان ——— ٹنڈو اللہ یار

وہ تعلق توڑ کر مہربانی کر گیا
ربط جو فانی تھا اس کو غیر فانی کر گیا
میں سمجھا تھا کہ مل کر داستاں پوری ہوئی
وہ تو بچھڑ کر پھر بڑی لمبی کہانی کر گیا

سلمیٰ عنبرین ——— پڑی درویزہ

تیرے گرد ہے میری دعاؤں کا دائرہ
ہیں تیری عافیت کی مبارک لکیر ہوں

فرح ویسار اؤ ——— اوکاڑہ

چھکانے ہیں وہ قرضے سطح پر ہیں کہیں زیر زمیں ہیں
ابھی اس خاکداں میں تم بھی زندہ ہو مرے ہم بھی نہیں ہیں
ابھی میداں میں ہم اپنے پیروں پر کھڑے ہیں مار کھی
ابھی تو کھیل کا آغاز ہے تم بھی نہیں ہم بھی نہیں ہیں

حنا طارق ——— کراچی

ایک مہینے بعد ملا تو نام بھی میرا بھول گیا
جس نے چلتے وقت کہا تھا یاد بہت تم آؤ گی

طاہرہ ——— حیدر آباد

مل گئی جو محبت یاراں غنیمت جانیے
پھر نہیں آتے پلٹ کر جب چلے جاتے ہیں دن
وقت اس کے ساتھ کچھ محسوس ہوتا ہی نہیں
جانے کس پل میں نہ جانے کب گزر جاتے ہیں دن

رانی ——— کراچی

شہر طلب کرے اگر تم سے علاج تیرگی
صاحب اختیار ہو آگ لگا دیا کرو

آمنہ ناز محمد ——— میرپور ساکرو

زندگی گزر جائے گی بہر صورت
تو کوئی شرط زندگی تو نہیں

قمر النساء بیگ ——— راولپنڈی

ہم اپنے آپ میں یوں گم ہوئے ہیں عرصے سے
ہمیں تو جیسے کسی کا بھی انتظار نہیں
کسی کو ٹوٹ کے چاہیں کہ چاہ کر لوٹیں
ہمارے پاس تو اتنا بھی اختیار نہیں

ثنازیہ ریاض ——— کھاروں

یہ پھیلی ہوئی رات ڈھلے یا نہ ڈھلے
یہ پرورش حالات ٹلے یا نہ ٹلے
روشن کر چراغ دیر و کعبہ
پھر شمع خرابات جلے یا نہ جلے

صبا ناصر ——— کراچی

میں نے جھیلا ہے گلے مل کے بچھڑنے کا عذاب
میرے معبود کسی کو یہ سزا مت دینا

مسکراتی کرنیں

انداز بیاں اور.....

پچھلے دنوں "ہیلمٹ" کی طرح "پلاسٹک کے لفافوں" کے سلسلے میں بھی شور اٹھا تھا۔ لوگوں کا خیال تھا کہ آلودگی کے ذمہ دار یہ پلاسٹک کے لفافے ہیں' جو شاید حکومتی اقدامات کے بعد اب کبھی دکھائی نہ دیں۔ اس انڈسٹری سے وابستہ لوگوں نے تو متبادل کاروبار کی تلاش بھی شروع کردی تھی۔ "ہفتہ صفائی" بھی منایا جائے گا۔

مگر پھر کیا ہوا' پلاسٹک کے لفافے بنتے گئے' بنتے رہیں گے' بلکہ اب تو کسی پلاسٹک کے برتن میں سالن ڈال کر کھاتے ہوئے بھی ڈر لگتا ہے کہ ہو سکتا ہے جو پلاسٹک اس جنم میں سالن ڈالنے والے برتن کی صورت میں سامنے ہے' پہلے جنم میں کہیں چپل کی شکل میں نہ رہ چکا ہو۔

حافظ مظفر محسن کی کتاب "ہیلمٹ' لفافہ اور سیاسی آلودگی" سے اقتباس۔

لائبہ کاشف۔۔۔ لاہور

بے چارگی

"تمہاری یہ جرات کہ تم میرے ڈیڈی کو فضول اور بے ہودہ انسان کہہ رہے ہو؟" لڑکی نے اپنے بوائے فرینڈ پر برہم ہوتے ہوئے کہا۔

"تو اور کیا کہوں؟" بوائے فرینڈ نے بے بسی سے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔

"میں ان سے تمہارا رشتہ مانگنے گیا۔ میں نے کہہ دیا کہ میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ اس پر وہ بولے کہ کوئی بات نہیں۔۔۔ تدفین کا خرچ میں اٹھالوں گا۔"

ناصرہ۔۔۔ پشاور

نقصان

ہوٹل میں جنید صاحب کو ان کے دوست فیاض صاحب نے اداس' غم زدہ اور منہ لٹکائے بیٹھے دیکھا تو ہمدردانہ انداز میں سبب پوچھا۔ جنید صاحب بولے۔

"دو ماہ پہلے میرے ایک خالو کا انتقال ہوا' ان کی کوئی اولاد نہیں تھی۔ انہوں نے ترکے میں میرے لیے چھ لاکھ روپے چھوڑے۔"

"تو اس میں اداس ہونے کی کیا بات ہے؟ آپ کو تو خوش ہونا چاہیے۔" فیاض صاحب نے کہا۔

"پچھلے ماہ میرے ایک چچا مر گئے تھے' انہوں نے میرے لیے دس لاکھ روپے چھوڑے۔" جنید صاحب نے گویا ان سنی کرتے ہوئے بتایا۔

"تو پھر آخر آپ منہ لٹکائے کیوں بیٹھے ہیں؟" فیاض صاحب نے حیرت سے ایک بار پھر پوچھا۔

"بھئی۔۔۔ یہ پورا مہینہ ختم ہونے کو آرہا ہے' ابھی تک کہیں سے مزید کوئی خبر نہیں آئی۔" جنید صاحب نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

نجمہ۔۔۔ کراچی

صحیح طریقہ

ایک صاحب اپنی گاڑی کے پاس بیٹھے آرام سے سگریٹ پی رہے تھے جبکہ ان کی بیگم پسینے میں شرابور گاڑی کی سروس میں مصروف تھیں۔ اتنے میں ان کا ایک دوست ادھر آیا اور اس نے جب یہ منظر دیکھا تو

ان صاحب کو مبارک باد دیتے ہوئے کہا۔
"تم یہ کام کس طرح اپنی بیوی سے کرانے میں کامیاب ہوئے ہو؟"
ان صاحب نے لاپروائی سے منہ سے دھوئیں کا مرغولہ چھوڑتے ہوئے جواب دیا۔
"معمولی سی بات ہے' ایک دن میں نے بیگم سے کہا کہ جب میں گاڑی کی سروس کرتا ہوں تو میرا وزن ایک پونڈ کم ہو جاتا ہے' بس اسی دن سے بیگم نے یہ کام اپنے ذمے لے رکھا ہے۔"

ثروت یعقوب..... لاہور

کم ظرفی

مشہور افسانہ نگار راجندر سنگھ بیدی ریل میں سفر کر رہے تھے۔ دوران سفر ٹکٹ چیکر نے ان سے ٹکٹ مانگا تو بیدی صاحب نے اپنی جیبیں ٹٹولیں' مگر ٹکٹ کا پتا نہ تھا۔
ٹکٹ چیکر بیدی صاحب کو پہچانتا تھا' کہنے لگا۔
"مجھے آپ پر بھروسا ہے' آپ نے یقیناً" خریدا ہوگا۔"

بیدی صاحب پریشانی سے بولے۔
"بھائی! بات آپ کے بھروسے کی نہیں' مسئلہ تو سفر کا ہے' اگر ٹکٹ نہ ملا تو یہ کس طرح معلوم ہوگا کہ مجھے کہاں اترنا ہے۔"

آمنہ..... لاہور

مشورہ

دلہن رخصت ہو رہی تھی۔ خواتین آنسو بہا رہی تھیں' تیز آواز میں ریکارڈ بج رہا تھا۔
"چھوڑ بابل کا گھر' موہے پی کے نگر' آج جانا پڑا۔"
مہمانوں میں ایک لڑکی ایسی بھی تھی' جو رونے کی بجائے کونے میں کھڑی دانت پیس رہی تھی۔
"کیا بات ہے' تم یہاں کیوں کھڑی ہو؟" اس کی سہیلی نے پوچھا۔
"تمہیں ریما کی رخصتی کا دکھ نہیں ہو رہا؟"
"دکھ کرے میری جوتی' ریما نے میرے ساتھ جو سلوک کیا ہے' ایسا سلوک تو بڑے سے بڑا دشمن بھی نہیں کر سکتا۔" لڑکی نے جواب دیا۔
"وہ مجھے ایک ہی مشورہ دیتی تھی کہ عامر سے جتنی ترش روی سے پیش آؤ گی' وہ تم سے اتنی ہی محبت کرے گا۔"
"یہ عامر کون ہے؟" سہیلی نے پوچھا۔
"وہ' جو سہرا باندھے ریما کا بازو پکڑے ہوئے پھولوں سے آراستہ کار کی طرف جا رہا ہے۔" لڑکی نے افسردگی سے کہا۔

نویدہ..... اسلام آباد

پسند کی حجامت

فوجی کمانڈر ایک سارجنٹ کے ساتھ نئے بھرتی ہونے والوں کے سامنے پہنچا۔ اس نے تعارفی تقریر شروع کی۔ چند تعارفی کلمات کے بعد وہ بالوں کی حجامت کے موضوع پر آیا۔
"بالوں کے معاملے میں آپ بالکل آزاد ہیں۔"
لمبے لمبے بالوں والوں نے اطمینان کی سانس لی۔ کمانڈر نے کہا۔
"آپ لوگ اپنی پسند کے بال رکھ سکتے ہیں' مگر ان کی لمبائی میرے بالوں سے زیادہ۔" اس نے اپنے سر سے ٹوپی اٹھا کر اپنی سولجر کٹ حجامت دکھائی۔
"اور سارجنٹ کے بالوں سے کم نہ ہو۔" سارجنٹ نے بھی اپنی ٹوپی اٹھائی' وہ گنجا تھا۔

زینب..... سیالکوٹ

دور اندیش

ایک نوجوان نے اپنے دوست سے پوچھا۔
"تم نے اس کمپنی میں نوکری کیوں نہیں کی۔ جہاں تم انٹرویو میں کامیاب ہو گئے تھے۔"
"مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہاں میرا کوئی مستقبل نہیں ہے۔" دوست نے جواب دیا۔
"یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو؟" نوجوان نے حیرت سے

پوچھا۔
"کمپنی کے مالک کی بیٹی پہلے سے شادی شدہ تھی۔" دوست نے جواب دیا۔

انجم..... کراچی

مداخلت

بچہ! ماں سے۔ "امی جان! آپ نے فرمایا تھا نا کہ انسان کو امید کا دامن کبھی نہیں چھوڑنا چاہیے؟"
"ہاں کہا تھا۔" ماں نے جواب دیا۔
"آپ نے یہ بھی کہا تھا کہ سب کچھ خدا کی مرضی سے ہوتا ہے۔"
"ہاں یہ بھی کہا تھا۔"
"آپ نے یہ بھی کہا تھا کہ خدا کے کاموں میں دخل نہیں دینا چاہیے۔"
"لیکن بات کیا ہے تم کیوں پوچھ رہے ہو؟" ماں نے زچ ہو کر پوچھا۔
"بات صرف یہ ہے کہ میں امتحان میں فیل ہو گیا ہوں۔" بچے نے معصومیت سے جواب دیا۔

نجمہ..... سیالکوٹ

خوف

بارش ہوئی تو ایک شخص نے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔
"اب ہر طرف ہریالی ہی ہریالی نظر آئے گی اور چند دنوں میں زمین کے اندرونی اشیا باہر نکل آئیں گی۔"
"یا اللہ خیر۔" دوسرے نے بدحواس ہو کر کہا۔
"میری تین بیویاں زمین میں دبی ہوئی ہیں۔"

رمشا..... لاہور

احسان مند

دعوت میں ایک ڈاکٹر کی ملاقات ایک نوجوان لڑکی سے ہوئی' لڑکی مسکرا کر کہنے لگی۔
"ڈاکٹر صاحب! آپ کے علاج سے جو فائدہ مجھے پہنچا ہے میں اس کے لیے زندگی بھر آپ کی احسان مند رہوں گی۔"
ڈاکٹر نے خوب صورت لڑکی کو دیکھ کر حیرت انگیز لہجے میں کہا۔
"مجھے جہاں تک یاد پڑتا ہے میں نے کبھی آپ کا علاج نہیں کیا۔"
"جی ہاں۔" لڑکی نے جواب دیا۔
"دراصل میرے چچا آپ کے زیر علاج تھے اور آج میں ان کی جائیداد کی تنہا وارث ہوں۔"

مہک سہیل..... لاہور

ارادہ

ایک لڑکی اپنی سہیلی سے کہا۔
"میں طے کر چکی ہوں کہ جب تک میری عمر بیس سال نہیں ہو جائے گی میں اس وقت تک شادی نہیں کروں گی۔" سہیلی نے کہا۔
"میں بھی طے کر چکی ہوں کہ جب تک میری شادی نہیں ہو جاتی میں اس وقت تک ہرگز بیس سال کی نہیں ہوں گی۔"

اقرا..... کراچی

دور اندیشی

"مجھ سے شادی کر لو۔" نوجوان لڑکے نے خوشامدانہ انداز میں ایک حسن فتنہ پرور سے کہا۔
"میرے والد کی تین کروڑ کی جائیداد ہے' ان کی عمر ننانوے سال ہو چکی ہے۔ زیادہ سے زیادہ سال' چھ مہینے زندہ رہیں گے۔ میں ان کی واحد اولاد ہوں۔ والد کے انتقال کے بعد ساری دولت مجھے ملے گی۔"
ایک ہی ہفتے میں حسن فتنہ پرور نوجوان لڑکے کی امی بن گئی۔

الماس علی..... کراچی

توہین

پڑوسی سے لڑتے ہوئے ایک شخص نے کہا۔
"میں نے سنا ہے کہ تم لوگوں سے کہتے پھرتے ہو کہ

میری ساس کا چہرہ میرے بلڈاگ سے ملتا ہے۔"
"ہاں کہتا ہوں پھر۔" پڑوسی نے کہا۔
اس شخص نے کہا۔ "اب ذرا کہہ کر تو دیکھو میں اپنے بلڈاگ کی توہین برداشت نہیں کر سکتا۔"
فوزیہ ثمر بٹ،ہانیہ عمران۔۔۔ گجرات

مہارت

لڑکی نے اپنے منگیتر کو بتایا "تمہیں یہ جان کر یقیناً خوشی ہوگی کہ جب ہماری شادی ہوگی تو تمہارے گھر میں ایسی عورت آجائے گی جو کھانے پکانے میں بے حد ماہر ہے۔"
"اچھا۔" منگیتر نے خوش گوار حیرت سے کہا۔
"مجھے معلوم ہی نہیں تھا کہ تم اس فیلڈ میں مہارت رکھتی ہو۔"
"میں اپنی بات نہیں کر رہی۔" لڑکی نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔
"شادی کے بعد میری امی ہمارے ساتھ رہنے کے لیے آجائیں گی۔"
مریم۔ کراچی

تقدیر

"کیا کوئی انسان کبھی اپنی تقدیر سے بھی لڑ سکتا ہے۔" ایک شخص نے دوسرے سے پوچھا، دوسرے نے جواب دیا۔
"کیوں نہیں، میں تمہیں بتاتا ہوں شادی سے پہلے میرا دوست اپنی منگیتر سے اکثر کہتا تھا کہ تم تو میری تقدیر ہو۔ لیکن شادی کے بعد اس کا اپنی بیوی سے اکثر شدید نوعیت کا لڑائی جھگڑا رہتا ہے۔"
ہانیہ عمران۔۔۔ گجرات

رازونیاز

"بہت دن بعد نظر آئے، کہاں تھے ہ؟"
"میں اسپتال میں تھا۔"
"اوہ یہ سن کر افسوس ہوا۔"
"نہیں افسوس کی کوئی بات نہیں ہے، میں نے نرس سے شادی کر لی تھی۔"
"بہت خوب، یہ تو اچھا ہوا۔"
"اچھا کہاں سے ہوا، شادی کے بعد پتا چلا کہ اس کے تین بچے ہیں۔"
"اوہ یہ تو بہت برا ہوا۔"
"نہیں کچھ ایسا برا نہیں ہوا۔ اس کے ایک کنوارے ماموں اس کے لیے بہت بڑی کوٹھی چھوڑ کر مرے تھے۔"
"چلو یہ تو اچھی بات ہے۔"
"خاک اچھی بات ہے، پچھلے دنوں آگ لگ گئی اور کوٹھی بالکل تباہ ہو گئی۔"
"اوہ یہ تو بہت برا ہوا۔"
"نہیں ایسا برا بھی نہیں ہوا، میری بیوی بھی کوٹھی میں جل کر مر گئی۔"
"چلو یہ تو اچھا ہوا۔"
"ہاں یہ واقعی اچھا ہوا۔"
سونیا۔۔۔ کراچی

ازواجیات

شادی : ایک ایسا ذریعہ جس سے شوہر کو رفتہ رفتہ یہ علم ہوتا ہے کہ اس کی بیوی کیسے شوہر کی طلبگار ہے۔
شوہر : ایسا محسوس ہوتا ہے میں تنہا بوڑھا ہوتا جا رہا ہوں، میری بیوی نے گزشتہ کئی سال سے سالگرہ نہیں منائی۔
جمائی : منہ کھولنے کے لیے شادی شدہ مردوں کے لیے قدرت کا عطیہ۔
کنوارہ : جو صبح کام پر جانے کے لیے صرف ایک بندے کا ناشتا تیار کرتا ہے۔
افواہ : بیوی کی لائی ہوئی اطلاع۔
عقل مندی کا تقاضا : بیوی سے بحث میں جیت جانے کے باوجود معافی مانگ لینی چاہیے۔
ماہر نفسیات نے کہا "لڑکیاں ان مردوں سے شادیاں کرنا چاہتی ہیں جس میں ان کے باپ کی صفات موجود ہوں، تبھی تو لڑکی کی شادی پہ ان کی مائیں روتی ہیں۔"
حرمت رواکرم۔۔۔ ڈلوال

کرن کا دسترخوان

خالدہ جیلانی

ہرے مسالے کے آلو

اجزا :

آلو (چھوٹے ٹکڑوں میں) — آدھا کلو
پیاز (چھوٹے ٹکڑے) — دو عدد
ٹماٹر — دو عدد
ادرک (چوپ کرلیں) — آدھا آنچ کا ٹکڑا
سبز مرچ — تین عدد
ہرا دھنیا — ایک گڈی
نمک — حسبِ ذائقہ
کالی مرچ — حسبِ ذائقہ
تیل — کھانے کے پانچ چمچے

ترکیب :

آلو چھیل کر چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں کاٹ لیں۔ دھنیے کو اچھی طرح دھولیں، پھر باریک کاٹ لیں۔ تیل گرم کر کے پیاز فرائی کریں، حتیٰ کہ بادامی ہو جائے، پھر آلو ڈال دیں، تین، چار منٹ بھون کر ادرک اور ٹماٹر ڈال دیں۔ ساتھ ہی نمک اور کالی مرچ بھی ڈال دیں۔ پانچ منٹ تک بھونیں، اب دھنیا ڈالیں اور ذرا سا پانی ڈال کر آٹھ، دس منٹ تک پکنے دیں۔ اس دوران آلو گل جائیں گے اور پانی بالکل خشک ہو جائے گا۔ ہری مرچ ڈال کر چند لمحے بھونیں۔ مزے دار ہرے مسالے کا آلو تیار ہے، گرم گرم پیش کریں۔

دال ماش اور قیمہ

اجزا :

- ماش کی دال — ایک پاؤ (بھگو دیں)
- قیمہ — آدھا کلو
- پیاز — آدھا پاؤ
- لہسن — ایک پوتھی
- ادرک — ایک بڑا ٹکڑا
- نمک — حسبِ ذائقہ
- سرخ مرچ — ایک کھانے کا چمچہ
- ہلدی — ایک چٹکی
- ہری مرچ — چار' پانچ عدد
- گرم مسالا — ایک چائے کا چمچہ
- ہرا دھنیا — حسبِ ضرورت
- تیل — آدھا کپ

ترکیب:

پیاز لچھے دار کاٹ لیں اور گھی میں بھون کر بادامی کرلیں۔ پھر اس میں لہسن پیس کر ڈال دیں اور ساتھ ہی قیمہ دھو کر ڈال دیں۔ قیمے کو خوب بھونیں' جب قیمے کا رنگ سُرخ ہو جائے تو اس میں ہلدی' سرخ مرچ اور نمک ڈال دیں۔ تھوڑا سا پانی ڈال دیں۔ پانچ منٹ بعد جب قیمہ گھی چھوڑ دے تو دال ڈال دیں۔ اور تھوڑا بھونیں۔ پھر اتنا پانی ڈالیں کہ دال گل جائے اور پانی خشک ہو جائے اور مسالا گھی چھوڑ دے۔ اس کے بعد ہرا مسالا ڈال کر پانچ منٹ دم لگا دیں۔ تھوڑی دیر بعد اتار کر گرم مسالا چھڑک دیں اور کھانے کے لیے پیش کریں۔

سادہ سبزی پلاؤ

اجزا:

- چاول — آدھا کلو
- گوبھی — ایک پاؤ
- ناریل (پسا ہوا) — چائے کے دو چمچے
- نمک — حسبِ ذائقہ
- گرم مسالا — چائے کا ایک چمچہ
- ادرک — چوتھائی چھٹانک
- پیاز — دو عدد
- آلو — آدھا پاؤ
- ہرا مسالا — حسبِ پسند
- تیل — آدھی پیالی

ترکیب:

آلو ابال کر چھیل لیں نمک ڈال کر گھی میں تل لیں۔ ایک پین میں تیل گرم کرکے پیاز براؤن کرلیں۔ گوبھی بھی ڈال لیں سارا مسالا ڈال کر بھون کر علیحدہ رکھ لیں۔ اب چاول علیحدہ ابال لیں۔ ذرا سا نمک ڈال کر ابالنے کے بعد اوپر سے گھی ڈال دیں۔ اب دیگچی میں پہلے سبزیاں ڈالیں' پھر چاول ڈال کر دم دے دیں۔ سبزیوں کا پلاؤ تیار ہے' رائتے کے ساتھ سرو کریں۔

مصری پلاؤ

اجزا:

- چاول — آدھا کلو
- انڈے — دو عدد
- مرغی (ابلی ہوئی) — چند ٹکڑے
- گوبھی کا پھول — چند ٹکڑے
- ہری مرچ — چار عدد
- نمک — حسبِ ذائقہ
- گاجر (ابلی ہوئی) — دو عدد
- ہری پیاز (ڈنڈی کے ساتھ) — چار عدد
- تیل — ایک پاؤ

ترکیب:

چاول نمک ڈال کر دو کنی ابال لیں۔ سب سبزیاں اور مرغی کے ٹکڑے علیحدہ علیحدہ ابال کر تیار کرلیں۔ ایک دیگچی میں تیل گرم کریں۔ اب اس میں کٹی اور ابلی ہوئی سبزیاں' سبز پیاز' مرغی کے ٹکڑے اور دو تین ہری مرچ کاٹ کر ڈال دیں۔

انڈے توڑ کر ڈال دیں اور جلدی جلدی چمچہ چلائیں۔ زیادہ نہیں بھوننا۔ آخر میں ابلے ہوئے چاول ڈال کر دم لگا دیں۔ پندرہ منٹ بعد جب دم

آجائے تو اتار لیں۔

ڈرم اسٹکس

اجزا:

- چکن ڈرم اسٹک — آٹھ عدد
- آلو (ابال کر میش کریں) — آدھا کلو
- انڈے (دو سخت ابالیے) — چار عدد
- کالی مرچ (پسی ہوئی) — حسبِ ذائقہ
- نمک — حسبِ ذائقہ
- پنیر (کش کی ہوئی) — آدھی پیالی
- ہری مرچ (باریک کٹی ہوئی) — چار عدد
- لیموں کا رس — چوتھائی پیالی
- تیل (تلنے کے لیے) — حسبِ ضرورت
- بریڈ کرمبز — حسبِ ضرورت

ترکیب:

سب سے پہلے ڈرم اسٹکس کو دھو کر نمک اور لیموں کا رس لگا کر ہلکی بھاپ میں دے دیں۔ ابلے ہوئے آلوؤں میں ابلے ہوئے انڈے' پنیر' ہری مرچ اور کالی مرچ سب ملا کر ایک جان کرلیں۔ پھر اس تیار شدہ مرکب کو ہاتھ پر رکھ کر ذرا سا پھیلائیے اور گوشت والے حصے پر لگا دیں۔ اب انڈے پھینٹیں۔ پہلے ڈرم اسٹکس کو اس میں ڈبوئیں' پھر ڈبل روٹی کے چورے میں پھر ہلکی آنچ پر ڈیپ فرائی کریں۔

گولڈن ہونے پر نکال لیں' ٹماٹو کیچپ کے ساتھ گرما گرم پیش کریں۔

پنیر اور آلو کا آملیٹ

اجزا:

- آلو (ابلا ہوا) — ایک عدد
- مرغی کا گوشت (ابال کر ریشے کرلیں) — 60 گرام
- انڈے — چار عدد
- سیاہ مرچ پاؤڈر — حسبِ ذائقہ
- نمک — حسبِ ذائقہ
- مکھن — دو کھانے کے چمچے
- پنیر — تین کھانے کے چمچے

ترکیب:

آلو کو کیوبز میں کاٹ کر ایک طرف رکھ دیں۔ ایک پیالے میں انڈے' سیاہ مرچ پاؤڈر اور نمک ڈال کر پھینٹ لیں۔ اور ایک طرف رکھ دیں۔ ایک فرائنگ پین میں مکھن ڈال کر درمیانی آنچ پر گرم کریں۔ اب اس میں مرغی کا گوشت ڈال کر دو سے تین منٹ کے لیے پکائیں۔ اس کے بعد آلو شامل کرکے مزید پانچ منٹ تک پکائیں۔ اب اس فرائنگ پین میں انڈوں کا آمیزہ ڈال دیں۔ آنچ دھیمی کرکے دس منٹ پکائیں۔ جب مکمل طور پر جم جائے تو اتار لیں۔ اب اس پر پنیر چھڑک کر پہلے سے گرم گرل کے نیچے رکھ کر دو سے تین منٹ کے لیے پکائیں۔ جب پنیر پگھل جائے تو سرو کریں۔

ہریالی تکہ

اشیا:

- آلو (ابال کر پیس لیں) — آدھا کلو
- پنیر (کش کرلیں) — 400 گرام
- ساگ (ابال کر پیس لیں) — 200 گرام
- ہری مرچ (باریک کاٹ لیں) — تین عدد
- ادرک (باریک کاٹ لیں) — ایک کھانے کا چمچہ
- گرم مسالا پاؤڈر — آدھا چائے کا چمچہ
- کارن فلور — آدھا کپ
- چاٹ مسالا — حسبِ ذائقہ
- سبز دھنیا (کاٹ لیں) — حسبِ ضرورت
- نمک — حسبِ ذائقہ
- تیل (تلنے کے لیے) — حسبِ ضرورت

آلو' پنیر' ساگ' ہری مرچ' ادرک' گرم مسالا پاؤڈر' کارن فلور' سبز دھنیا' نمک اچھی طرح مکس کرلیں۔ اب ان کے کباب بنائیں۔ تیل گرم کریں اور کبابوں کو گولڈن براؤن تل لیں۔ اوپر سے چاٹ مسالا چھڑک کر گرما گرم سرو کریں۔

حسن و صحت

ادارہ

کاسمیٹکس کی تاریخ میں قدرتی مصنوعات ہمیشہ اہم رول ادا کرتی چلی آئی ہیں۔ ان مصنوعات کے ذریعہ حسن میں اضافہ کے نسخے صدیوں سے نسل در نسل منتقل ہوتے چلے آئے ہیں۔ قدرتی غذائی اشیا کو خوب صورتی میں اضافہ کے لیے استعمال کیے جانے سے قبل ہمیں ان کی خصوصیت سے آگاہ ہونا ضروری ہے۔

انڈا، بالوں کی خشکی کے لیے مفید ہے

انڈا نا صرف مسامات کو سخت بناتا ہے بلکہ جلد کو غذا بھی فراہم کرتا ہے۔ انڈے کی سفیدی پروٹین سے بھرپور ہے اور ایک قدرتی کلینزر ہے۔ دن بھر کے تھکا دینے والے کاموں کے بعد تھکن کو دور کرنے کے لیے ایک انڈے کو پھینٹ کر چہرے اور گردن پر اس کا ماسک کرلیں۔ پھر سکون سے بیس منٹ تک لیٹی رہیں۔ اس کے بعد پانی سے دھو ڈالیں۔

چکنی جلد کے لیے انڈے کی سفیدی کے ماسک میں لیمن جوس کے چند قطرے ٹپکالیں۔ خشک جلد والی خواتین انڈے کی سفیدی پر روغن یا شہد کے چند قطرے ٹپکالیں یا پھر انڈے کی زردی کا ماسک کریں۔ انڈے کی زردی بالوں کی خشکی کے لیے بھی مفید ہے۔ شیمپو کرنے سے آدھے گھنٹے قبل بالوں میں زردی کی مالش کرلیں۔ اس بات کا خیال رکھیں کہ بال دھوتے وقت زردی خشک ہونے کے بعد بہت سخت ہوجاتی ہے۔ ساتھ ہی بالوں کو کنڈیشننگ کرنے کے لیے انڈا پھینٹ کر اس میں چائے کا ایک چمچہ زیتون کا تیل ملالیں اور پھر شیمپو کرنے سے قبل اس کی مالش کرلیں۔

نمک، آنکھوں کی چمک کے لیے

نمک کو بطورِ علاج صدیوں سے استعمال کیا جاتا رہا ہے۔ نیم گرم پانی میں تھوڑا سا نمک ملا کر اس سے آنکھیں اچھی طرح دھوئیں۔ اس طرح نا صرف آنکھوں میں چمک پیدا ہوگی بلکہ ان کی سوجن بھی دور ہوجائے گی۔ متبادل صورت کے طور پر ایک گلاس نیم گرم پانی میں کھانے کا ایک چمچہ نمک ملا کر اسے حل کرلیں۔ پھر روئی کے پیڈ اس محلول سے تر کرکے دونوں آنکھوں پر رکھ لیں۔ ٹب میں نیم گرم پانی لے کر اس میں کھانے کے تین چمچے نمک ملا کر پیروں کی سکائی کریں تو بہت آرام ملتا ہے۔

دانتوں میں سفیدی پیدا کرنے کے لیے نمک اور سوڈیم بائی کاربونیٹ برابر مقدار میں لے کر ملالیں اور اس سفوف کو بطور منجن استعمال کریں۔ نمک کو جلد پر رگڑنے کے لیے بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ اس طرح نا صرف جلد ٹون ہوتی ہے۔ بلکہ دوران خون بھی تیز ہوتا ہے' یہ ہلکے اینٹی سیپٹک کا کام بھی دیتا ہے۔

سرکہ، بالوں کی خشکی دور کرنے کے لیے

بالوں کی گرد دور کرنے اور ان میں چمک پیدا کرنے کے لیے شیمپو کرنے کے بعد انہیں سرکہ سے دھویا جاتا ہے۔ سرکہ بالوں میں موجود تیزاب کی تہ کو تقویت پہنچاتا ہے۔ اس مقصد کے لیے پانی میں کھانے کا ایک چمچہ سرکہ ملا کر اس سے بالوں کو دھوئیں۔ چند لمحوں بعد سرکہ کی بو خود بخود زائل ہوجاتی ہے۔ جلد کی خشکی اور کھجلی و جلن دور کرنے کے لیے غسل کے پانی میں ایک کپ سرکہ ملالیا کریں۔

شہد، چہرے کے نکھار کے لیے

شہد کو دنیا کا بہترین قدرتی موئسچرائزر تصور کیا جاتا ہے۔ جلد میں نمی اور چکناہٹ پیدا کرنے کے لیے اسے چہرے پر بطور ماسک ملیں۔ پھر بیس منٹ بعد پانی سے دھوئیں۔

چکنی جلد کے لیے انڈے کی سفیدی پھینٹ کر اس میں شہد اور لیمن جوس کے چند قطرے ملالیں اور پھر اسے ماسک کے طور پر چہرہ پر مل لیں۔ خشک جلد کے لیے شہد میں ملک فیشل ماسک کی کریم تھوڑی سی شامل کرلیں' تاکہ اس میں موئسچر بھی پیدا ہوجائے۔ غسل کے پانی میں ایک چمچہ شہد شامل کرلینے سے ساری تھکن دور ہوجاتی ہے اور خوب کھل کر نیند آتی ہے۔

چہرہ شاداب بنانے کے لیے دودھ کا ماسک لگایا جاسکتا ہے۔ کاٹن کے پیڈ دودھ میں بھگو کر اسے چہرہ پر کریم کی طرح ملیں۔ دودھ کے ماسک کو طویل عرصہ کے لیے چہرے پر لگایا جاسکتا ہے۔

کھیرا، جلدی مسائل کے لیے

عام طور پر کھیرے کو آنکھوں کی چمک بڑھانے اور ان کی سوجن ختم کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ لیکن یہ جلد پر کلینزنگ' چکناہٹ پیدا کرنے' اسے کھینچ کر ٹائٹ کرنے اور مسامات کو تنگ کرنے کے بھی کام آتا ہے۔ کھیرے کے سلائس بنا کر انہیں جلد پر ملنے سے جلد کے مسائل پر بڑی حد تک قابو پایا جاسکتا ہے۔ دھوپ سے جل جانے کے بعد جلی ہوئی جلد پر کھیرے کے ٹکڑے ملنے سے فوری آرام آتا ہے۔

آلو، داغ دھبے دور کرنے کے لیے

کہا جاتا ہے کہ آلو اگزیما کے مرض میں بہت مفید ہے۔ اس کے استعمال سے داد اور کھجلی کے دھبے بھی دور ہوجاتے ہیں۔ اس مقصد کے لیے آلو چھیل کر ان کا جوس علیحدہ کرلیں۔ پھر اسے متاثرہ حصوں پر لگائیں۔ متبادل طریقہ کے طور پر آلو کے ٹکڑوں کو جلد پر ملیں۔ اس سے جلد سکڑتی ہے اور آنکھوں کی سوجن دور ہوجاتی ہے۔ آلو کے ان ٹکڑوں کو آنکھوں

پرپیڈ کی طرح بھی رکھا جاسکتا ہے۔

گاجر

گاجریں وٹامن اے سے بھرپور ہوتی ہیں جو صحت مند جلد کے لیے انتہائی ضروری ہے۔ گاجریں خشک اور حساس جلد کو بھی ٹھنڈک پہنچاتی ہیں۔ تھوڑے سے پانی میں گاجریں ابال کرانہیں پیس کر پیسٹ کی شکل میں کریں اور پھر اسے بطور ماسک استعمال کریں۔

گوبھی

گوبھی میں بے شمار معدنیات پائی جاتی ہیں۔ جلد کی تازگی اور نشوونما کے لیے گوبھی کو تھوڑے سے پانی میں ابال لیں، پھر اسے ٹھنڈا کر کے چہرہ کو دھونے کے کام میں لائیں۔

لیموں

لیمن جلد کی صفائی بھی کرتا ہے اور اس پر موجود تیزاب کی تہ کو برقرار بھی رکھتا ہے۔ یہ ایک قدرتی ایسٹرن جینٹ ہے۔ جو جلد کو سکیڑتا ہے۔

پپیتا

پپیتے میں ایسے انزائم (کیمیاوی مادے) شامل ہیں جو جلد کے مردہ خلیوں کو ملائم کر کے انہیں جسم سے علیحدہ کرتے ہیں۔ یہ جلد کو سکیڑتا ہے۔ اور مسامات کو تنگ کرتا ہے۔ اس کے گودے کو فیس ماسک کے طور پر بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ ماسک ہر قسم کی جلد کے لیے مناسب ہے۔

خوبانی

خوبانی میں وٹامن اے بکثرت ۔ پایا جاتا ہے۔ یہ جلد میں شباب کے آثار دوبارہ پیدا کرتی ہے اور اسے جوان بنا دیتی ہے۔ یہ جھریوں کو دور کر کے اس مقام کی جلد کو دوبارہ سکیڑ دیتی ہے۔ اسے چھیل کر اس کا گودا میش کرلیں اور جسم کے مختلف حصوں پر اسے بطور ماسک استعمال کریں۔

اسٹرابری

اسے ایک قدرتی کلینزر شمار کیا جاتا ہے۔ اسٹرابری جلد کی اڑی ہوئی رنگت اور ان پر پڑے ہوئے دھبوں کو دور کرتا ہے۔ اسے دانتوں کی صفائی کے لیے بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ اس میں وٹامن سی بھی موجود ہے جو تیزابیت کا حامل ہوتا ہے۔ اس لیے یہ جلد کو پرشباب اور جوان بھی بناتا ہے۔ اس کے ٹکڑے کر کے انہیں چہرہ کے ماسک کے طور پر بھی استعمال کیا جاتا ہے۔

منٹ

منٹ میں بیماریاں رفع کرنے اور ٹھنڈک پہنچانے کی خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ یہ جلد پر پڑے داغ دھبوں کو دور کرتا ہے اور جلدی ٹانک میں بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ جس کے باعث وہ چکنی جلد کو ٹون کر کے اس میں تازگی پیدا کرتا ہے۔ منٹ کا پاوڈر آنکھوں کے گرد پڑے حلقوں کو دور کرنے کے ۔ کام میں لایا جاتا ہے۔

باورچی خانہ کی ایسی قدرتی مصنوعات بے شمار ہیں جو آپ کے حسن میں اضافے کا باعث بن سکتی ہیں۔

✡ ✡

محمود بابر فیصل نے یہ شگفتہ سلسلہ ۱۹۷۸ء میں شروع کیا تھا۔ ان کی یاد میں ۱۹۸۱ء کے شمارے کے سوال وجواب شائع کیے جارہے ہیں۔

ذوالقرنین

جمیلہ طفیل..... کراچی

س : "کرن میں دوبارہ آمد ناول کے ذریعے ہوئی ہے کیا؟"

ج : "لوگوں کا خیال یہی ہے۔"

فائزہ یعقوب..... لاہور

س : "اجی ذوالقرنین بھیا! یہ آپ کو بیٹھے بٹھائے کیا سوجھی تھی جو چپکے سے ہی اپنی محفل کو اللہ حافظ کہہ دیا۔"

ج : "سوجھی نہیں تھی بلکہ کچھ بہنوں کے خطوط پر نکال دیے گئے تھے۔"

روبینہ شاہین..... گجرات

س : "ہمیشہ خواب حقیقت سے ٹکرا کر چکنا چور ہو جاتے ہیں پھر لوگ خواب کیوں دیکھتے ہیں؟"

ج : "اس لیے کہ خواب جھوٹے ہوتے ہیں۔"

بینا غزل..... اسلام آباد

س : "بھائی ذوالقرنین صاحب! یہ تو بتاتے جائیں کہ جب اس بزم میں آپ نے ہم بہنوں سے دوبارہ ملاقات نہ کی تو کیسا محسوس ہوا؟"

ج : "سکون، جیسے کاندھے پر سے کوئی بہت بڑا بوجھ ہٹ گیا ہو۔"

غیور فاطمہ..... کراچی

س : "اے مسٹر پہلے تو محفل میں دوبارہ آنے کی مبارکباد قبول کرو اور پھر شکریہ کی ہماری دعاؤں کی بدولت تم محفل میں نظر آرہے ہو؟"

ج : "جی آپ کا بھی شکریہ۔"

عینی طفیل..... کراچی

س : "آپ بہت ہی اداس ہوں۔ ایسے میں آپ کو نہلے پہ دہلا مارنا پڑ جائے تو کیا آپ مار سکیں گے یا منہ پر بارہ بجا کر سوالات کی فائل ایڈیٹر کی میز پر رکھ کر یہ جاوہ جا؟"

ج : "جیسے تیسے کر کے نہلے پہ دہلا مارنے کی کوشش کر ہی رہے ہیں۔"

خورشید جمال..... کراچی

س : "قرنی جان! جاتے جاتے بزم کا سارا حسن بھی لے گئے۔ آخر کیوں؟"

ج : "واپس تو آگیا لیکن بزم کا حسن آتے آتے شاید دیر لگ جائے۔"

سیما مقیم احمد..... کراچی

س : "آپ کو اس خوب صورت بزم میں میزبان بننے پر مبارک باد۔ امید ہے کہ ذوالقرنین صاحب کی طرح آپ بھی اس کو کامیابی سے چلانے کی کوشش کریں گی یا گے؟"

ج : "افسوس ہے کہ آپ کا سابق میزبان حاضر ہے فرمائیے۔"

فریدہ یاسمین..... ملتان

س : "نین یہ بتاؤ کہ کنوارے آدمی کو مکان کرائے پر کیوں نہیں ملتا؟"

ج : "اس لیے کہ آدمی کنوارا ہوتا ہے مکان نہیں۔"

شاہدہ رحمٰن مغل..... بہاول پور

س : "لڑکیوں کو تو بی بی کہا جاتا ہے مگر لڑکوں کو بیبا کیوں نہیں کہتے؟"

ج : "پنجابی میں لڑکے کو بیبا کہا جائے تو بہت سوہنا لگتا ہے۔"

صالحہ رحمان مغل..... بہاولپور

س : "آج کل کے نوجوان، نوجوان بہنوں پر آوازیں کیوں کستے ہیں؟"

ج : "نا تو آپ کے خیال میں معمر بہنوں پر آوازیں کسیں۔"

مہر نگار خان..... کراچی

س : "فریدہ خان نے تو صرف شیروانی پر ٹرخا دیا۔ مزید خدمت کے لیے ہم تیار ہیں۔ جی چاہے رنگین بنوائیے، جی چاہے سفید کیوں اب ٹھیک ہے ناں؟"

ج : "تم مجھے کچھ سلگتی لگتی ہو۔"

یاسمین طاہر انصاری..... گوجرانوالہ

س : "اگر آپ کو اپنی شادی میں بلاؤں تو کون سا تحفہ لے کر آئیں گے؟"

ج : "بے شرم کہیں کی، مشرقی لڑکی ہو کر اپنی شادی کی بات کرتی ہو۔"

نوشین ناز..... شکار پور

س : "آپ کو عید پر کس کی یاد آئی؟"

ج : "صرف اپنے بھائی جان ابن انشاء کی۔"

روبینہ شاہین..... میر پور خاص

س : "جب یاد تمہاری آتی ہے سنسان اکیلی راتوں میں، دل خون کے آنسو روتا ہے ساون بھری برساتوں میں۔"

ج : "نا تو صرف میری یاد کیوں آتی ہے۔ سنسان اکیلی راتوں میں۔"

س : "نین جی! مرد چاہے کالا ہی کیوں نہ ہو، اماں ان کی چاند سی بہو ہی ڈھونڈیں گی۔ آخر وجہ؟"

ج : "چاند میں داغ جو ہوتا ہے۔"

س : "لوگ تنہا پیدا ہوتے ہیں اور تنہا مر کر چلے جاتے ہیں۔ لیکن ہم سفر کی ضرورت کیوں محسوس کرتے ہیں؟"

ج : "پیدا ہونے سے مرنے تک کسی ساتھی کی ضرورت تو ہوتی ہی ہے نا۔"

عاصمہ نازلی..... راولپنڈی

س : "ابے او نینو! اپنی تلوار مار کر مونچھوں کو ذرا چھوٹا کرالو ورنہ فیقے بدمعاش کا پتا ہے نا؟"

ج : "اس کی کون سی اپنی اصلی ہیں۔"

س : "ذوقی! آج کل تم کچھ کچھ وہ ہوتے جا رہے ہو۔"

ج : "اچھا.....؟"

فریدہ خان..... کراچی

س : "آپ اپنی شادی میں مجھے ضرور بلائیے گا۔ مجھے شیروانی بہت اچھی سینی آتی ہے۔ آپ کی شادی میں بھی آپ کی شیروانی سی دوں گی بلا معاوضہ؟"

ج : "صرف شیروانی پر ہی ٹرخا دو گی۔"

☆ ☆

مدیرہ

نامے میرے نام

ارم سحر..... کراچی

سلام کرن..... ویسے تو میں خاموش قاری ہوں..... بہت ہی خاموشی سے کرن کی تحریروں میں لکھے الفاظ اپنے دل کے نہاں خانوں میں اتارتی آرہی ہوں۔ کبھی کبھی خاموش رہنا کتنا اچھا لگتا ہے۔ پر کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ خاموشی کی اس دبیز چادر کو اتار پھینکنے کو جی چاہتا ہے۔ قلم کے ذریعے اپنی آواز وہاں تک تو ضرور پہنچے جہاں تک ممکن ہو۔ یہ ہی سوچ کر قلم تھامنے کا ارادہ کیا ہے۔

پہلے سوچا کسی افسانے یا ناول پر زور آزمائی کی جائے اور بہت کوشش بھی کی، مگر کامیابی نہ ہو سکی۔ اس وقت ادراک ہوا لکھنا اتنا بھی آسان نہیں جتنا ہم نے سوچا تھا۔ بے اختیار تمام مصنفین کو سلام کرنے کو جی چاہا کہ وہ کس طرح اپنا خون دل جلا کر لفظوں کے دیے روشن کرتی ہیں، جس سے ہمارا دل اور زندگی منور ہو جاتی ہے۔ لکھنے کا ارادہ ملتوی کیا..... پر اپنا نام کرن میں رجسٹرڈ کروانا تھا۔ اسی لیے سوچا کیوں نہ "نامے میرے نام" میں ہی اپنا نام دے دیں..... سو اس لیے اس سلسلے میں حاضر ہیں، دیکھیں جگہ ملتی ہے یا.....

کرن تو ہمیشہ ہی چودہ کو مل جاتا ہے۔ ٹائٹل ہمیشہ کی طرح خوب صورت تھا۔ ماڈل سی گرین سوٹ میں جگمگا رہی تھی۔ تمام ناولز، افسانے ناولٹ زبردست تھے۔ سب سے پہلے "او رے پیا" نایاب کے ناول کی جانب قدم بڑھائے۔ نایاب کہانی کو پرت در پرت کھول رہی ہیں تحریم کے ساتھ اس کی زندگی کے سفر میں ہم سفر بننا اچھا لگ رہا ہے۔ اس ناول میں سب سے اچھا زرجان کی تنہائی بانٹ کر لگتا ہے جب زرجان اپنی تنہائیوں سے محوِ گفتگو ہوتا ہے تو بے ساختہ اپنی تنہائیوں کی طرف نگاہ چلی جاتی ہے، جانے کیوں؟ پر محبت کرنے والوں کی قسمت میں تنہائیوں کا ساتھ ہی لکھ دیا جاتا ہے۔ ہجر اور نارسائی کا دکھ، زیست کو اپنے حصار میں لے لیتا ہے۔ ایسی سچویشن میں ہمیشہ ایک شعر یاد آتا ہے۔

آتا ہی نہیں دل میں رہائی کا تصور
دلچسپ بہت جرم محبت کی سزا ہے

افسانے بھی سارے بہت اچھے تھے۔ مگر جس افسانے نے دل کے تاروں کو چھوا وہ سمیرا حمید کا "پہیلی" ہے۔ الجھی، سلجھی..... پر پیچ رستوں سے ہوتے ہوئے۔ آخر میں ایک دریا کی طرح بہتا ہوا محسوس ہوا۔ بالکل "سینٹ لارنس" کی طرح..... پر سکون۔

باقی سارا کرن اچھا لگا۔ اب کے لیے اتنا ہی، باقی تفصیلی تبصرہ اس خط کے اشاعت کے بعد ان شاءاللہ..... اللہ ہم سب کا حامی و ناصر ہو۔

فوزیہ ثمرین رہانیہ عمران..... گجرات

نومبر کا شمارہ چودہ کو ملا۔

گرین اور کاپر شیڈ میں ماڈل کا ڈریس اچھا لگ رہا تھا۔ ہمیشہ کی طرح حمد باری تعالیٰ، نعت رسول مقبولؐ سے دل و جان کو معطر کیا۔

"آمنہ محب مرزا" سے ملاقات اچھی رہی، دونوں میاں، بیوی بہت محنتی ہیں..... بہت لگن سے کام کر رہے ہیں، خوب صورت کپل ہے ان کا، مکمل ناول "او رے

پیا“ اس بار کی قسط اچھی رہی۔ مولی کیا انکشاف کرنا چاہ رہا ہے۔ ماہیر نے کیوں اسے مارا ۔ جو بھی تھا نایاب نے ہمیں تو تجسس میں مبتلا کردیا ہے‘ اب پورا ماہ الجھن رہے گی۔

”موسم وفا“ ام مریم کا کچھ خاص متاثر نہ کرسکا۔ کہانی بس سو‘ سو رہی۔ ”رستے جگنو ہیں“ اچھا ناولٹ تھا۔ شیریں ملک سے پوچھنا تھا۔ یہ دیوتا نما ہیرو کہاں سے ملتے ہیں۔ ہیرو کا نام حسین اور پھر خود بھی موصوف اتنے اچھے اوصاف کے مالک‘ عائشہ کی تو لاٹری نکل آئی۔ مجھے تو ویسے بھی حسین نام سے بہت عقیدت ہے۔ میرا دل کرتا ہے اس نام کا صبح و شام ورد کروں‘ حسین شاہ جیسے لوگ ہوتے ہیں جنہیں اللہ دل سے بناتا ہے۔

افسانے تقریباً“ سب ہی اچھے تھے۔ ”بے یقین مسافتیں“ سیدہ ضوربابیہ کی ہیروئن مجھے کچھ سرپھری سی لگی۔ اپنی تعریف کروانے ––– کا یہ کون سا انوکھا اسٹائل ہے جی۔ مستقل سلسلے اچھے لگے۔ نامے میرے نام میں سب ہی نے اچھا لکھا۔ اب اجازت چاہتی ہوں‘ اگلے ماہ تفصیلی تبصرے کے ساتھ دوبارہ حاضر ہوں گی۔

ساجدہ فیض..... رحیم یار خان

میں پچھلے تین سال سے کرن کی خاموش قاری ہوں اور آج پہلی مرتبہ کرن کی محفل میں حاضری دے رہی ہوں۔ اس دوران بہت سے ایسے ناول پڑھے جن کو پڑھ کے دل تبصرہ کرنے کو مچلا‘ مگر اس ڈر سے ایسا نہ کرسکی کہ کہیں میرے خط کو کرن میں جگہ نہ مل سکے اور میرا دل ٹوٹ جائے۔ ”برگ زرد ہمن کا ملے تو اچھا‘ گوری کرت سنگھار“ ان کے علاوہ بھی کئی ناول‘ ناولٹ اور افسانے متاثر کن تھے۔ ”درِ دل“ بہت بہترین جارہا ہے‘ سب ہی کردار میرے فیورٹ ہیں۔ خاص طور پر زری‘ دل آور شاہ‘ علیزے‘ آذر۔

فوزیہ یاسمین کا ”دستِ کوزہ گر“ شروع میں کچھ واضح نہیں تھا‘ لیکن اب آہستہ آہستہ سب کردار واضح ہوتے جارہے ہیں‘ ناول اور دلچسپ ہوگیا ہے۔

نایاب جیلانی سے درخواست ہے کہ پلیز ”اور رے پیا“ کا ہیپی اینڈ کیجیے گا‘ کیونکہ حریم اور ماہیر میرے فیورٹ کریکٹر ہیں۔

اور ایک اہم بات مجھے کرن بہت مشکل سے ملتا ہے‘ کبھی کسی کی منت کرنی پڑتی ہے‘ کبھی کسی کی‘ کبھی کبھی تو پورا مہینہ گزر جاتا ہے‘ تب جاکے کرن کی شکل نظر آتی ہے۔ ابھی تک پورا شمارا نہیں پڑھا اس لیے تفصیلی تبصرہ کرنے سے قاصر ہوں۔ اگر آپ کو میرا خط قابل اشاعت لگے تو پلیز ضرور‘ ضرور شائع کیجیے گا‘ مجھے مایوس بالکل نہ کیجیے گا۔

اللہ تعالیٰ کرن کو اور زیادہ ترقی عطا فرمائے اور کرن اسی طرح اپنی کرنیں بکھیرتا رہے۔ (آمین)

عنبر وسیم..... گوجرانوالہ

کرن کا عید نمبر بلاشبہ بہترین تھا۔ ”آمنہ شیخ“ کا تعلق میرے شہر گوجرانوالہ سے ہے۔ جان کر خوشی ہوئی۔ ”اور رے پیا“ نایاب سوفٹ موڈ میں بڑھا رہی ہیں۔ حریم کی ساس کا گرم و سرد رویہ اکثر روایتی ساسوں کی یاد دلا دیتا ہے۔ خداوند کریم ماہیر جیسا شوہر ہر کسی کو عطا کرے کہ بے موسم برسات میں جس کا رویہ کسی چین کلر کا کام دیتا ہے۔

”روداد قفس“ بہت اچھا سلسلہ ہے۔ اور سب سے زیادہ مزا تو مہک رباب کی تحریر ”تجھ پہ قربان.....“ پڑھ کر آیا۔ آخر تک ہم ایک چلبلی‘ البیلی ہیروئن کے تصور میں رہے۔ جس کے لیے ہیرو صاحب تمام دیواریں توڑنے کی سرتوڑ کوششیں کرتے ہیں۔ مگر یہ کیا..... آخر میں ہیرو صاحب‘ بکرا اور ہیروئن بکری۔ اپنی جاسوسی والی عادت پر دل کھول کر ہنسے۔ گویا معاملہ یہ ہوا ”کھودا پہاڑ نکلا چوہا۔“

”موسم وفا“ کچھ خاص متاثر نہ کرسکا۔ وہی اکھڑ سنجیدہ مزاج ہیرو اور مغرور ہیروئن۔ آخر میں ٹریجڈی

اور دی اینڈ۔ شیریں ملک کا ٹاپک بھی پرانا ہی تھا۔ سمیرا حمید کی پہیلی‘ واقعی پہیلی ہی تھی۔ کچھ سر پیر ہی نہ تھا۔ البتہ الفاظ کا تانا بانا مناسب تھا۔ ”شک“ ہر بڑی عمر کے شوہر کو ضرور پڑھنی چاہیے‘ اب اجازت دیں۔

امبر گل..... جھڈو سندھ

بہت دنوں کے بعد قلم ہاتھ میں تھاما ہے تو کچھ سمجھ بھی نہیں آرہا کہ کہاں سے ابتدا کروں۔ جب لکھنا چھوڑا تھا تو یہ ہی سوچ تھی کہ بس اب دوبارہ کبھی نہیں لکھنا‘ مگر نواب زادی سونگی جیسی پیاری دوست کے پیار بھرے مظاہرے نے دل کو اپنی ضد چھوڑنے پر مجبور کردیا ہے اور میں ان کی محبت کا جواب محبت سے دینے کے لیے ہی یہ خط لکھ رہی ہوں۔

ویسے کرن سے تو مجھے کوئی شکوہ نہیں‘ کیونکہ کرن نے تو اکثر یاد کیا شکوہ تو صرف اور صرف ان دوستوں سے ہے کہ جن پر مجھے بہت مان تھا۔ سوچا دیکھوں تو کون کون سی دوستیں ہیں جنہیں میری کمی محسوس ہوگی‘ مگر ایسا کچھ نہ ہوا انتظار انتظار ہی رہا اور دن اداس سے اور ان ہی اداس دنوں میں 13 دسمبر کو اچانک اک ایسی اطلاع ملی کہ جس نے مجھے اندر سے بالکل توڑ کر رکھ دیا‘ جی ثوبیہ جہانگیر میری بہت پیاری دوست بہت جلد داغ مفارقت دے گئی۔ ابھی اس کے جانے کا غم ہی اتنا شدید تھا کہ 17 جنوری کو میرے اکلوتے اور عزیز از جان ماموں کا ٹرین ایکسیڈنٹ ہوگیا۔ تقریباً“ ایک مہینے تک کومے میں رہنے کے بعد 20 فروری کو وہ بھی ہمیں چھوڑ کر چلے گئے۔ پھر تو دل کچھ ایسا اچاٹ ہوا کہ رسالوں میں میری دلچسپی صرف پڑھنے کی حد تک ہی رہ گئی۔ یوں ہی دن پر دن گزرتے چلے گئے کہ بالکل اچانک ہی مجھے ایک ایسا صدمہ ملا ہے کہ جس نے دل کو بالکل ختم ہی کرڈالا ہے۔ 20 جولائی 2011 بروز بدھ کو مجھے میری امی جان بھی چھوڑ کر چلی گئیں‘ وہ صرف میرے لیے میری ماں نہیں‘ بلکہ میری دوست تھیں‘ ایک ایسی دوست جس سے ہر دکھ سکھ شیئر کرتی امی سے لڑنا‘ جھگڑنا‘ ان کو ستانا‘ اور ان کے سارا دن کام کرنا‘ ان کے آگے پیچھے پھرنا‘ ان کے لیے کچھ نہ کچھ کرتے کرتے میرا دن کیسے گزرتا تھا مجھے پتا ہی نہیں چلتا تھا میری زندگی کا محور میری امی کی ذات تھی‘ جس کے گرد میری ساری دنیا گھومتی تھی‘ میری زندگی میں آخر اب رہ ہی کیا گیا ہے‘ پھر سوچتی ہوں تو ایک بہت ہی عزیز از جان ہستی میرے پیارے ابو جی تو ہیں نا میرے پاس‘ یہ ہی سوچ مجھے پھر سے جینے کے لیے توانا کردیتی ہے اور یہ ان کی بھی شدید خواہش تھی کہ میں دوبارہ لکھا کروں تو یہ ہی سوچ کر میں لکھ رہی ہوں اور جب میں انہیں خط دوں گی پوسٹ کرنے کے لیے تو وہ بہت خوش ہوں گے۔

میں کرن کے توسط سے ان تمام دوستوں کا شکریہ ادا کرنا چاہوں گی کہ جنہوں نے دکھ کے عالم میں میرا ساتھ دیا‘ مجھے حوصلہ دیا‘ خاص طور پر ثمرین حبیب کا۔

ج: پیاری امبر! ادارہ کرن آپ کی والدہ کے انتقال پر آپ کے دکھ میں برابر کا شریک ہے ہماری دعا ہے اللہ تعالیٰ مرحومہ کی مغفرت فرمائے اور انہیں ہمیشہ اپنے سایہ رحمت میں رکھے۔ (آمین)

آمنہ اقبال..... کراچی

کرن اٹھارہ کو ملا۔ ٹائٹل ہمیشہ کی طرح خوب صورت تھا۔ سی گرین میرا فیورٹ کلر ہے۔ گرین اور کوپر کا کامبینیشن بہت ہی خوب صورت لگا۔ حمد و نعت سے مستفید ہونے کے بعد انٹرویو کی طرف آئے۔ ”آمنہ محب مرزا“ سے شاہین کی گفتگو اچھی رہی۔ ”مجھ سے ملیے“ میں شاہین ملک سے مل کر ان کے خیالات جان کر بہت اچھا لگا۔ کاش ہم سب اپنی ذات کے کولمبس بن سکتے تو کتنا اچھا ہوتا۔ کم از کم اپنی ذات کی آگہی تو ممکن ہوتی۔ دعا ہے شاہین خود کو ڈسکور کرلیں۔

ناولز میں نایاب جیلانی کا ناول زبردست جارہا ہے۔

نایاب نے ساس بہو کے رشتے کی عکاسی بہت حقیقت پسندی سے کی ہے۔ ماہیر اور حریم کی محبت سدا یوں ہی قائم رہے۔ موبی کے ساتھ کیا مسئلہ ہے۔ اب تو واضح کر ہی دیں۔۔۔ "موسم وفا۔" ام مریم کا ناول اچھا نہیں لگا' وہی عام سی روایتی کہانی۔ کوئی خاص متاثر نہ کر سکی۔ ناولٹ میں "رستے جگنو ہیں" بہت اچھا لگا۔ "آتش دروں" کی آخری قسط کا انتظار رہے گا افسانے سارے اچھے تھے۔ "بے یقین مسافتیں" ضوباریہ ساحر نے بہت اچھا لکھا۔ سمیرا احمید کا افسانہ "پہیلی" اچھا تھا۔ باقی سلسلے بھی بہت اچھے ہیں۔

آپ سے ایک درخواست ہے۔ "جواد بشیر" کا انٹرویو شائع کریں۔ اب اجازت دیں آئندہ تفصیلی تبصرے کے ساتھ حاضر ہوں گی۔

اللہ ہم سب کا نگہبان

شہربانو اختر۔۔۔ کراچی

میں کرن تقریباً" پندرہ سال سے پڑھ رہی ہوں۔ سب سے پہلے حمد و نعت پڑھتی ہوں۔ جس سے اللہ تعالیٰ کی محبت دلوں میں پیدا ہوتی ہے۔ ناول اور افسانے بھی اچھے ہوتے ہیں۔ اکتوبر کے رسالے میں محمود بابر فیصل کی یاد میں مضمون بہت اچھا تھا۔ ان کی جواں موت پر جتنا افسوس کیا جائے کم ہے۔ اللہ ان کی مغفرت کرے۔ (آمین)

"کرن کتاب" ہر ماہ ملتی ہے' اس سے بہت فائدہ ہوتا ہے۔ میری ایک درخواست ہے کہ سردیوں میں ننگ کی کتاب ملے جیسے کہ پہلے بھی ملا کرتی تھیں' امید ہے میری خواہش کو پورا کریں گی۔

☼ ☼ ☼

نرگس علی احمد۔۔۔ کراچی

کرن نومبر کا شمارہ حسب معمول چودہ تاریخ کو ملا۔ مضطر بخاری کی نعت اور صدیق فتح پوری کی حمد نے مسحور کر دیا۔ ٹائٹل بہت پسند آیا۔ کرن کے ٹائٹل مجھے بہت اچھے لگتے ہیں۔ خوش رنگ ہنستے مسکراتے بالکل اپنی تحریروں کی طرح میرا اشارہ مہک رباب کے افسانے "تجھ پہ قربان" کی طرف ہے ہم پہلے یہ ہی سمجھے وہی روایتی سی کہانی ہے ہیرو ہیروئن والی مگر اس کہانی کے ڈائیلاگ نے تو ہنسنے پر مجبور کیا ہی تھا۔ اینڈ نے تو کھسیانے پر بھی مجبور کر دیا۔ مزا آیا یہ کہانی پڑھ کر مہک رباب ہم آپ کے طویل مکمل ناول مگر ہنستے مسکراتے کے شدت سے منتظر ہیں۔

سلسلے وار دونوں ناول دلچسپ جا رہے ہیں۔ مگر نبیلہ عزیز نے علیزے کے کردار کو بہت زیادہ اہمیت دی۔ اس قسط میں تو ان ہی کا ذکر رہا۔

فوزیہ یاسمین بھی اچھا لکھ رہی ہیں۔

نایاب جیلانی کی تو کیا بات ہے۔ ام مریم کا ناول پسند نہیں آیا۔ روشنی بخاری "روداد قفس" کے سلسلے کو بہت خوبی سے چلا رہی ہیں خواتین کی نفسیاتی' معاشرتی اور معاشی الجھنیں انہیں جس طرح جرم کرنے پر مجبور کرتی ہیں وہ اسے بہت خوبی سے بیان کر رہی ہیں۔

سفینہ یاسمین کی "آتش دروں" نے بہت بے چین کر دیا۔ شائستہ واقعی فرہاد سے محبت کرتی ہے یا یہ اس کی کوئی چال ہے اب اس کا پتا تو اینڈ پڑھ کر چلے گا۔ لہٰذا دسمبر کے شمارے کا انتظار ہے افسانوں میں مہوش اقبال نے متاثر کیا۔ ضوباریہ ساحر کا افسانہ "بے یقین مسافتیں" پڑھ کر یہ ہی خیال آیا کہ انسان کی خود سے محبت کیسے کیسے فیصلے کروا لیتی ہے۔ باقی افسانے بھی اچھے تھے۔

مستقل سلسلے تو ہوتے ہی اچھے ہیں۔ پہلی بار آپ کے شمارے میں خط لکھ رہی ہوں شائع ہوا تو خوشی ہو گی۔

اپنا بہت خیال رکھیے گا۔ اللہ حافظ۔

☼ ☼